دنیا میں سب سے زیادہ فروخت ہونے والی کتاب

تیسری لہر

ایلون ٹوفلر

ترجمہ :- تنویر اقبال

مشعل

MashalBooks.org

تیسری لہر

ایلون ٹوفلر

ترجمہ: تنویر اقبال

مشعل
آر۔ بی 5، سیکنڈ فلور، عوامی کمپلیکس
عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور 54600، پاکستان

MashalBooks.org

تیسری لہر

ایلون ٹوفلر

ترجمہ: تنویر اقبال

کاپی رائٹ اردو(c)2001 مشعل

کاپی رائٹ(c)1980ایلون ٹوفلر

ناشر: مشعل بکس

آر-بی-5، سیکنڈ فلور،

عوامی کمپلیکس، عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور-54600، پاکستان

فون وفیکس: 042-35866859

Email: mashbks@brain.net.pk

http:/www.mashalbooksorg

MashalBooks.org

فہرست

پیش لفظ	5
تعارف	9
لہروں کا ٹکراؤ	17
عظیم جدوجہد	19
دوسری لہر	33
تہذیب کی تشکیل	35
ضابطوں کی شکست وریخت	63
کاریگران قوت	82
پوشیدہ بلو پرنٹ	92
قومیت کا تصور	104
سامراجی تسلط	111
صنعتی راج کی حقیقت	128
چمکدار سیلاب	152
تیسری لہر	165
نئی نظریاتی ترتیب	167
عظیم الشان رفعتیں	172
ذرائع ابلاغ کا عدم پھیلاؤ	203
ذی شعور ماحول	220
وسیع پیمانے کی پیداوار سے ماورا	234

MashalBooks.org

الیکٹرانک گھر 253
مستقبل کے گھرانے 271
کارپوریٹ کے تشخص کا بحران 290
نئے منکشف ہوتے ضابطے 308
صانف کی آمد 336
ذہنی گرداب 366
قومیت کی شکست وریخت 393
گاندھی سیارچوں کے جلو میں 409
اختتامیہ: 431
نتائج: 443
نیا نفسیاتی دائرہ 445
مستقبل کی شخصیت 454
سیاسی مقبرہ 466
اکیسویں صدی کی جمہوریت 490

MashalBooks.org

پیش لفظ

زیرِ نظر کتاب تہذیبوں کی داستان ہے۔ زمین پر انسان کے پہلے قدم کے بعد سے آج تک جو بھی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں' انہوں نے انسان کو آگے کی جانب بڑھایا ہے۔ مصنف ہر تہذیب کے لئے لہر کا استعارہ استعمال کرتا ہے۔ لہر سمندر سے ہے۔ موج' گرداب' بھنور' طوفان' سیراب۔۔۔۔ یہ سب استعارے سمندر سے متعلق ہیں۔ سمندر کے اندر رونما ہوتی تبدیلیاں مختلف شکلیں اختیار کرتی ہیں۔ کرہ ارض کا 2/3 پہلے ہی سمندر پر مشتمل ہے۔ باقی ایک تہائی حصہ پر ایک اور سمندر موجزن ہے اور وہ ہے انسانوں کا سمندر۔ انسانی حرکات وسکنات۔۔۔۔ جسمانی اور ذہنی سرگرمیاں' معاشی اور غیر معاشی عمل' آج اور کل کا تصور' آگے۔ بڑھنے اور نیچے سے اوپر جانے کی جبلی خواہش' مقابلے اور توازن کی آرزو' ناممکن کو ممکن بنانے کی تمنا۔۔۔۔ یہ سب عوامل انسان کو جمود کا شکار نہیں ہونے دیتے' بلکہ اسے متحرک رکھتے ہیں۔ اس کے خواب اور خواہشیں توانا ہوکر' لہر کی شکل اختیار کرتی ہیں اور وہ لہر اپنے بہاؤ میں انسان کو ارتقاء کی جانب دھکیلتی جاتی ہے۔ سماجی ناہمواریاں اور پیچیدگیاں کبھی کبھی گرداب اور بھنور کی شکل اختیار کرلیتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ تاریخ کبھی واپسی کا سفر نہیں کرتی۔ شاید یہ سچ ہی ہو مگر وقت انسان سے آگے نکل جاتا ہے۔ (ماضی اور اکثر ایسا ہوا' خصوصاً پہلی لہر کی تہذیب میں' اور یوں بھی ہوا کہ انسان وقت سے آگے نکل گیا۔ پچھلے تین سو سال میں معجزے رونما ہوئے۔ انسان نے زمین کا سینہ چیرا اور پھر لامحدود خلا کا سفر اس کے سامنے آ گیا لیکن اس محیر العقول ارتقاء کے پیچھے انسان کی ہزاروں سال کی مجموعی جسمانی اور ذہنی محنت مرکوز تھی۔ کارل مارکس نے دوسو سال پہلے ایک ایسی دنیا کا تخیل پیش کیا تھا جس میں ''کوئی طبقات نہیں ہونگے' پوری دنیا میں کوئی حکومتی ڈھانچا نہیں رہے گا۔ لوگوں کی آمدنی ان کی ضروریات اور خواہشات کے مطابق ہو گی۔ انسان فطرت کے خلاف جنگ کر رہا ہو گا۔'' یہ حوالہ شاید آج بے محل لگے کیونکہ سویت انقلاب ناکامی سے دو چار ہو چکا ہے اور چین سرمایہ دارانہ معیشت کی جانب رواں دواں ہے' لیکن بین الاقوامی سماج کے پیش نظر' مقاصد کم و پیش وہی ہیں۔ آج قدیم قومیں شکست و

ریخت کا شکار ہیں اور نئی نئی قومیں ابھر رہی ہیں۔ پوری دنیا میں عمومی اور افقی دونوں طرح کی تبدیلیاں جنم لے رہی ہیں۔ تیسری لہر کی نئی تہذیب ہمارے گھروں کی دہلیز پر کھڑی ہے اور ہم حیرت سے بت بنے اسے دیکھ رہے ہیں۔

ایلون ٹوفلر کی یہ کتاب پہلی بار 1979ء میں منظر عام پر آئی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے امریکہ میں مقبولیت کی بلندیوں کو چھو لیا۔ صنعتی دور کی شکست و ریخت کے ہاتھوں' ذہنی طور پر بوکھلائے ہوئے لوگ اور ادارے اپنے وجود کی بقاء کے لئے ہر چیز اور ہر عمل میں نئی معنویت کے متلاشی تھے کیونکہ پرانے تصورات بے محل اور مفروضات بے معنی ہوتے جا رہے تھے۔ ہر شعبے میں عملی یکسانیت نے لوگوں کی زندگی بے کیف اور بے رنگ کر کے رکھ دی تھی۔ بین الاقوامی تناظر میں بھی ہولناک تباہی کے شعلوں اور دھویں کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ دور حاضر کے بڑے بڑے ماہرین کا خیال تھا کہ کرہ ارض جوہری آتش فشاں پر کھڑا ہے جو کسی بھی وقت اچانک پھٹ سکتا ہے۔

ایسے عالم میں ایلون ٹوفلر نے پرانی کہاوت ''ہر اندھیرے کے بعد اجالا آتا ہے'' کے مصداق نئی امیدوں کے چراغ جلائے' انفرادی اور اجتماعی بے سمتی کو نئی سمت' سماجی' معاشی' نفسیاتی اور مذہبی یکسانیت اور بے معنویت کو تنوع اور معنویت دی۔ غرض منفی خیالات کو مثبت سوچ میں بدل ڈالا۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ ہی میں نہیں' یورپ اور ایشیاء کے طول و عرض میں' اس کتاب نے فروخت کے پچھلے سارے ریکارڈ توڑ ڈالے۔ اب تک اس کتاب کا پچیس زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

اردو میں اس کا ترجمہ انتہائی بروقت اور برمحل ہے کیونکہ اطلاعاتی ٹیکنالوجی کا عظیم الشان سیلاب' جو تقریباً 20 سال پہلے امریکہ سے اٹھا تھا' آج اس کا طوفانی ریلا ہمارے گھر کی دیواروں کو چھو رہا ہے۔ اطلاعاتی ٹیکنالوجی کے ہاتھوں زمین کی طنابیں کھنچتی چلی جا رہی ہیں۔ عالمی گاؤں (Globel Village) وجود میں آ رہا ہے۔ ویسٹ انڈیز میں ہونے والا میچ' براہ راست ٹی وی کے ذریعے' پاکستان میں دیکھا جا رہا ہوتا ہے۔ آسیان ممالک میں معاشی بحران فوراً ہی ہماری برآمدات کو گھٹا دیتا ہے۔ امریکی حکام کا ایک سیاسی اعلان ہمارے سٹاک ایکسچینج میں زلزلہ طاری کر دیتا ہے۔ چنانچہ وہ تمام سیاسی' سماجی' معاشی' علمی' نفسیاتی اور حیاتیاتی مسائل۔۔۔ جو ترقی یافتہ معاشروں میں دو عشروں پہلے سر اٹھائے

ہوئے تھے۔۔۔۔ ہمارے جیسے ترقی پذیر قوموں کے درمیان بھی اپنے وجود کو بھرپور طریقے سے منوا رہے ہیں۔ گو ان کی نوعیت اور ان کا اسراع بہ نسبت کم شدت کے حامل ہیں۔ کیونکہ ہمارے معاشرے کا ایک بڑا حصہ ابھی تک زرعی دور میں سانس لے رہا ہے۔ تاہم ہماری نئی نسل۔۔۔۔ زبان و مکان کے فاصلے' جس کے لئے قطعی غیر اہم ہیں۔۔۔۔ لباس' فیشن' موسیقی' ادب اور جوہری سوچ کے حوالے سے نو آمدہ ''تیسری لہر'' کی لاشعوری طور پر' زبردست حمایتی نظر آتی ہے۔ ہماری پرانی اور نئی دونوں نسلوں کے درمیان ابھرتا ہوا تضاد شاید ترقی یافتہ معاشروں کے تضاد سے بھی زیادہ پیچیدہ ہو(کیونکہ ہمارے ہاں موجود گروہی اور فرقہ وارانہ عصبیت اور جہالت' ترقی یافتہ ممالک میں ناپید ہے) اور ساتھ ہی ساتھ ترقی پذیر اور ترقی یافتہ قوموں کے مابین بین الاقوامی زمینی اور خلائی وسائل۔۔۔۔ خواہ وہ ماشی ہو یا غیر معاشی۔۔۔۔ سے بھرپور استفادے کا اختلاف بھی کچھ کم خوفناک نہیں۔ ترقی یافتہ قومیں بہتر ٹیکنالوجی کے ذریعے' ترقی پذیر معیشتوں کے مقابلے کی سکت کو زندہ درگور کر کے' بین الاقوامی اجارہ داری کے مواقع فراہم کر رہی ہیں' چنانچہ ان ممالک میں بے روزگاری اور کساد بازاری ک طوفان اٹھ رہا ہے' لوگلوں کی قوت خرید ختم ہو رہی ہے۔

ان سوالات اور ایسے ہی بہت سے دوسرے سوالات کا جواب ''تیسری لہر'' کے سماجی' معاشی اور سیاسی رویوں پر منحصر ہے۔ سماجی اور معاشی افراتفری' اونچ نیچ اور تفریق کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہم' تیسری لہر کی راہ میں مزاحم ہوتے ہیں یا اس کی تخلیق میں شرکت کرتے ہیں۔ اس سوال کا عملی جواب ہمارے مستقبل کی تشکیل کرے گا۔

زیر نظر کتاب میں' مختلف نظریات اور تصورات کی وضاحت کے لئے نئی اصلاحات کا وضع کرنا ضروری تھا تاکہ قاری کتاب کے مطالعے کے دوران' انگریزی الفاظ کی نامانوسیت میں الجھے بغیر معنویت کی سبک خرام لہروں کے ساتھ بہتا چلا جائے۔

تنویر اقبال

MashalBooks.org

MashalBooks.org

تعارف

آج بین الاقوامی صورت حال یہ ہے کہ تخریب کار لوگوں کو یرغمالی بنا کر موت کا نشانہ بنا رہے ہیں۔ تیسری جنگ عظیم شروع ہو جانے کی افواہیں کرنسیوں کی قیمت کو ڈانواں ڈول کر رہی ہے۔ سفارت خانے شعلوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ مختلف ملکوں میں متعین فوجی اپنے بوٹوں کے تسمے کس رہے ہیں۔ غرض اخبارات کی ایسی شہ سرخیاں ہمیں خوف و دہشت میں مبتلا کر رہی ہیں۔ معاشی صورتحال کا حساس پیمانہ ' سونا ' اپنی قیمت میں اضافے کے ریکارڈ توڑ رہا ہے۔ بنکوں کی ساکھ داؤ پر لگی ہوئی ہے۔ افراط زر رکنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ دنیا کی حکومتیں شکست و ریخت کا شکار ہیں۔ نجومی قرب قیامت کے المیہ گیت الاپ رہے ہیں۔ عام آدمی یہ سوچ رہا ہے کہ کہیں دنیا پاگل تو نہیں ہو گئی۔ ادھر ماہرین کو یقین ہے کہ یہ سارے عوامل ایک عظیم تباہی کو دعوت دے رہے ہیں۔

زیر نظر کتاب' بالکل ہی مختلف نظریے کی حامل ہے۔ اس کے نزدیک دنیا کا ذہنی توازن خراب نہیں ہوا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان ظاہری حوادث کے پس منظر میں تحیر انگیز اور حوصلہ آمیز روشنی بھی نظر آتی ہے۔ ''تیسری لہر'' ایسے افراد کے لئے لکھی گئی ہے جو آج کی انسانی تاریخ کو اختتام کے آخری دھارے پر سمجھنے کے بجائے' انسانی جدوجہد کا آغاز جانتے ہیں۔ یہ کرہ ارض آج ایک طاقتور لہر کی لپیٹ میں ہے۔ جس سے' ایک نئی فضا اور رنگا رنگ ماحول جنم لے رہا۔ اسی بدلتی فضا میں ہمیں اپنے سارے معمولات انجام دینے ہیں۔ یعنی کھیل کود' شادی' بچوں کی دیکھ بھال' تربیت اور عمر کے ڈھلنے تک کا عمل جاری رکھنا ہے۔

اس تعجب خیز پس منظر میں تاجر برادری' معاشیات کی مخالف لہر کی طغیانی سے گتھم گتھا ہے۔ سیاست دانوں کی ساکھ ختم ہوتی نظر آ رہی ہے۔ یونیورسٹیاں' ہسپتال اور دیگر سماجی ادارے افراط زر کے زلزلے کی زد میں ہیں۔ سماجی اقدار ٹوٹ پھوٹ رہی ہیں۔ گھرانے' معبد اور ریاست کی حفاظتی کشتیاں بری طرح ہچکولے کھا رہی ہیں۔

یہ ہوش ربا تبدیلیاں عدم استحکام شکست و ریخت اور تباہی کی عکاس لگتی ہیں لیکن ذرا پیچھے ہٹ کر اگر وسیع تناظر میں دیکھا جائے تو بہت سی ایسی چیزیں سامنے آئیں گی جو عموماً نگاہ سے اوجھل رہ جاتی ہیں۔

ہم آج کی تمام تبدیلیوں کو باہم مربوط و منسلک سمجھ سکتے ہیں۔ یہ اتنی بھی بے ربط اور لایعنی نہیں۔ مثلاً جوہری گھرانے کا باہمی ٹکراؤ' توانائی کا عالمی بحران' مذہبی رجحان' کیبل ٹی وی کی توسیع' ذاتی مرضی کے اوقات کار اور نت نئی اضافی مراعات کا رواج' کیوبک سے کارسیکا تک آزادی کی تحریکوں کا پھیلاؤ۔ ان تمام عوامل میں بظاہر کو ربط و آہنگ محسوس نہیں ہوتا مگر حقیقت اس کے بالکل الٹ ہے۔ ان تمام واقعات و رجحانات میں ربط بھی ہے اور تسلسل بھی۔ دراصل یہ سب ایک وسیع تر مظہر۔۔۔۔صنعتی دور کے خاتمے اور ایک نئی تہذیب کی ابتداء۔۔۔۔کے مختلف حصے ہیں۔

جب تک ہم ان تبدیلیوں کو ایک دوسرے سے الگ الگ سمجھتے رہیں گے اور ان کی حقیقی اہمیت ہم پر آشکار نہیں ہوگی۔ ہم ان کے درمیان مربوط اور موثر ربط پیدا کر ہی نہیں پائیں گے۔ چنانچہ انفرادی حیثیت میں کئے گئے ہمارے فیصلے لایعنی اور ہماری ذات کے منافی ہوں گے۔ ہماری حکومتیں بھی بحران اور فوری نوعیت کے منصوبوں کے درمیان مسلسل ہچکولے کھا رہی ہیں۔ مستقبل کی جانب' ان کی پیش قدمی بنا کسی منصوبہ بندی کے' بے سوچی سمجھی اور اچھی امیدوں سے عاری نظر آتی ہے۔ موجودہ قوتوں کے باہمی ٹکراؤ کی درست آگہی نہ ہونے کی وجہ سے ہماری حیثیت طوفان میں گھرے ایسے بحری جہاز کے عملے کی طرح ہے جس کے پاس خطرناک چٹانوں سے بچ نکلنے کے لئے نہ قطب نما ہے اور نہ ہی کوی نقشہ۔ مختلف اور متضاد فنی صلاحیتوں کے اس دور میں وسیع و عریض گوشواروں اور اعلی تجزیوں سے عبارت ترکیب سازی نہ صرف کارآمد سمجھی جاتی ہے بلکہ واقعتاً فیصلہ کن بھی ٹھہرتی ہے۔

انہی اسباب کے پیش نظر ''تیسری لہر'' کو ہم وسیع ترکیب سازی پر مبنی ایسی کتاب قرار دیتے ہیں جس میں اس پرانی تہذیب کا خاکہ پیش کیا گیا ہے جس میں ہم میں سے متعدد افراد پروان چڑھے ہیں۔ مزید براں' ابھرتی ہوئی نئی تہذیب کا پیش منظر بھی انتہائی

MashalBooks.org

احتیاط سے سامنے لایا گیا ہے۔ مستقبل کی یہ تہذیب ایک ہمہ گیر انقلاب کی طرح ہمارے گزشتہ تمام تمام مفروضوں کو چیلنج کر رہی ہے۔ غور وفکر کے گھسے پٹے انداز' فرسودہ فارمولے مذہبی عقائد اور نظریات ہمارے لئے چاہے کتنے ہی محترم اور مفید کیوں نہ رہے ہوں' موجود حقائق سے کوئی مطابقت نہیں رکھتے۔ نئی اقدار اور ٹیکنالوجی' عالمی سیاست کے نئے آہنگ' رہن سہن کے نئے طور طریقے اور نئے ذرائع ابلاغ کے مابین تصادم کے نتیجے میں تیزی سے ابھرنے والی اس دنیا میں نئے تصورات اور تمثیلات' نئی درجہ بندیوں اور نئی سوچ کی ضرورت بڑھ گئی ہے۔ ہم کل کی دنیا کو ماضی کے کوزوں میں بند نہیں کر سکتے اور نہ ہی قدامت پرست رویے اور طریقے اب عملاً موزوں نظر آئیں گے۔

کل کی اس تحیر خیز تہذیب کے نقوش جوں جوں ان صفحات میں نمایاں ہوں گے' مروجہ یاسیت کو ختم کرنے کے لئے' ٹھوس دلائل ہمارے سامنے آتے جائیں گے۔ گزشتہ ایک عشرے سے ہماری تہذیب یاسیت اور ناامیدی کی کیفیت سے دوچار ہے۔ تیسری لہر نہ صرف یاسیت کو گناہ سمجھتی ہے بلکہ (سی۔ پی۔ سنو کے بقول) اسے قطعی غیر ضروری بھی قرار دیتی ہے۔ میں کسی بھی قسم کے توہمات کا شکار نہیں ے ہمارے گرد جو خطرات منڈلا رہے ہیں' ان کی تفصیل میں جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں پہلے ہی ان کے بارے میں بہت کچھ لکھ چکا ہوں اور آئندہ بھی لکھتا رہوں گا۔ یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے کہ جنگ' معاشی بحران اور وسیع ٹکنیکی تباہی مستقبل کی تاریخ کی شکل ہی بدل سکتی ہے۔

تاہم توانائی کے بدلتے ہوئے استعمالات اور خاندانی نو کے درمیان روابط یا جدید صنعتی طریقوں اور اپنی مدد آپ کی تحریک کے مابین ابھرنے والے تعلقات کا جائزہ لینے سے ہم پر یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ جن حالات کی وجہ سے ہمارے سروں پر خطرات کے بادل چھائے ہوئے ہیں' وہی نئی آب و تاب اور روشن صورت گری کے امکانات کو یقینی بھی بنا رہے ہیں۔

''تیسری لہر'' اسی موعودہ روشنی کی عکاس ہے۔ اس حقیقت پسندانہ کاوش کے ذریعے ہمیں تباہی و بربادی کے درمیان افزائش حیات کے موثر شواہد بھی ملتے ہیں اور یہی شواہد ہمیں یقین دلاتے ہیں کہ ذہانت اور خوش قسمتی کے جلو میں ظہور پذیر تہذیب زیادہ

MashalBooks.org

معقول، موثر اور مستحکم ہو سکتی ہے بلکہ ماضی کی نسبت زیادہ جمہوری اور شائستہ تر بھی ہو سکتی ہے۔

مستقبل قریب کے عبوری دور میں، ممکن ہے ہمیں شدید بحرانوں اور طغیانیوں کا سامنا کرنا پڑے لیکن اگر اس کتاب کی تجزیاتی سمت درست ہے تو پھر مان لیجئے کہ خوش آئند توقعات کے زبردست اسباب وعوامل ہمارے سامنے موجود ہیں۔

''تیسری لہر'' کی تصنیف کے دوران، میرے لیکچر کے سامعین اکثر مجھ سے یہ سوال کرتے تھے کہ میری یہ نئی کتاب میری پچھلی کتاب ''مستقبل کا صدمہ'' سے کس طرح مختلف ہو گی۔ واضح رہے کہ لکھاری اور قاری، دونوں ہی کتاب میں، پہلی کتاب کا عکس دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ میرا خیال ہے کہ زیرِنظر کتاب مذکورہ تصنیف سے بالکل مختلف ہے۔ ترکیبی ہیئت اور مرکزی خیال کے لحاظ سے دونوں میں واضح فرق ہے۔ یہ کہنا غلط نہیں کہ ''تیسری لہر'' میں ماضی اور مستقبل دونوں کا وسیع تر تناظر پیش کیا گیا ہے۔ اس کا دائرہ کار خاصا پھیلا ہوا ہے اور اس کی ترتیب وتشکیل بھی پہلے جیسی نہیں۔ (قاری یہ بات سمجھ سکتا ہے کہ اس تصنیف کا بنیادی خیال لہروں کا تصادم ہے)

معنوی اعتبار سے دونوں کتابوں کا فرق اور بھی واضح ہے۔ میری پچھلی تصنیف میں تبدیلیوں کا عمل ناگزیر قرار دیا گیا تھا۔ وہاں شخصی اور سماجی تبدیلی کی قدر و قیمت پر بھی زور دیا گیا تھا، لیکن ''تیسری لہر'' میں تبدیلی کے عمل کی مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے اس امر پر بھی زور دیا گیا ہے کہ بعض عناصر کو، ان کی معنویت کی وجہ سے، انتہائی تیزی سے تبدیل نہ کیا جائے۔ مزید براں، گزشتہ کتاب میں، میں نے ''مستقبل کی قبل از وقت آمد'' کے متعلق لکھا تھا لیکن ابھرتے ہوئے جدید سماج کا میں نے کوئی واضح اور مربوط نقشہ نہیں کھینچا تھا۔ اس میں تغیراتی عمل کی تشریح کی گئی تھی، سمت کی نہیں۔

موجودہ کتاب کا تجزیہ مختلف نوعیت کا ہے۔ یہاں ''اسراع'' پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی البتہ وہ سمتیں زیادہ اجاگر کی گئی ہیں جدھر یہ تبدیلیاں ہمیں کشاں کشاں لئے جا رہی ہیں۔ اس طرح پہلی کتاب کا موضوع طریق کار تھا اور اس کا موضوع تعمیر وتشکیل ہے۔ ان وجوہات کی بنا پر، دونوں کتابیں ماخذ کے بجائے، وسیع تر اکائی کی حیثیت میں ایک دوسرے

سے ہم آہنگ ہیں۔ مختلف ہوتے ہوئے بھی دونوں ایک دوسرے پر روشنی منعکس کرتی ہیں۔

تالیف کاری کے سا وسیع عمل میں نظریات اور تصورات کو عام فہم بنانے کے ساتھ ساتھ عمومیت اور اختصار کا خیال رکھا جانا بھی ضروری تھا۔ (اس عمل کے بغیر کتاب میں اتنا بے کراں مواد اکٹھا کرنا ناممکن تھا) عین ممکن ہے بعض مورخ اس کتاب میں پیش کردہ تین تہذیبی ادوار کی تقسیم سے اتفاق نہ کریں۔۔۔۔یعنی پہلی لہر کا زرعی دور، دوسری لہر کا صنعتی دور اور تیسری لہر کا ظہور پذیر دور۔۔۔۔ ظاہر ہے زرعی دور میں مختلف تہذیبوں کا جنم ہوتا رہا۔ صنعتی دور بھی مختلف ترقیاتی مرحلوں سے گزرا۔ بلاشبہ ماضی اور مستقبل کو 12'38'57 حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ایسی تقسیم میں کسی بھی اہم حصے کے غائب ہو جانے کا خطرہ رہتا ہے یا پھر ہر خاص علاقے کی اہمیت اجاگر کرنے کے لئے ہمیں ایک جلد کے بجائے پوری کی پوری لائبریری چاہئے ہو گی۔ چنانچہ ہمارے مقاصد کے لئے یہ آسان فہم تقسیم زیادہ مفید ہے۔

اس وسیع موضوع کا احاطہ کرنے کے لئے بعض آسان راستوں کے استعمال کی ضرورت بھی پڑی۔ چنانچہ میں نے اکثر اوقات تہذیب کے لئے شخصی علامت استعمال کی ہے۔ حالانکہ قارئین بخوبی آگاہ ہیں اور میں بھی جانتا ہوں کہ تہذیب بذات خود کوئی کام سر انجام نہیں دیتی بلکہ یہ سب کچھ انسان کرتے ہیں، لیکن بعض اوقات فعالیت اور تحریک کو تہذیب سے منسوب کرنے سے وقت اور الفاظ کی بچت کی جا سکتی ہے۔ اسی طرح ذہین قاری یہ حقیقت بھی اچھی طرح سمجھتا ہے کہ مورخ، ماہر مستقبلیات، منصوبہ ساز، نجومی یا پروہت مستقبل کے بارے میں کچھ نہیں جانتے اور نہ ہی جان سکتے ہیں۔ جب میں یہ کہتا ہوں کہ ''کچھ نہ کچھ'' ہونے والا ہے تو میں جانتا ہوں کہ قارئین اسے بہت زیادہ اہمیت نہیں دیں گے۔ وگرنہ اس کتاب میں تحفظات کا غیر ضروری اور لایعنی جنگل بسانا پڑ جاتا۔ تاہم سماجی پیش گوئیاں کبھی بھی اقدار کے بحث سے خارج نہیں ہوتیں اور نہ ہی ان کی نوعیت سائنسی ہوتی ہے چاہے ان کا ماخذ کمپیوٹر ہی کیوں نہ ہوں۔

''تیسری لہر'' کوئی معروضی پیش گوئی نہیں اور نہ ہی اس میں سائنسی حقائق کا زعم کارفرما ہے۔ بہر حال اس کا یہ مطلب بھی ہرگز نہیں کہ زیر نظر کتاب محض خیالی اور تصوراتی

باتوں پر مبنی ہے' اس کے برعکس ''تیسری لہر'' ایسے ٹھوس شواہد اور دلائل پر مبنی ہے جنہیں تہذیب کا نیم مرتب نمونہ یا ہمارے روابط کا مظہر بھی کہا جا سکتا ہے۔

اس کتاب میں شکستہ حال صنعتی تہذیب کا ذکر' تکنیکی دائرہ' سماجی دائرہ' اطلاعاتی دائرہ اور طاقتی دائرہ کے تناظر میں کیا گیا ہے۔ نیز ان دائروں میں رونما ہونے والی انقلابی تبدیلیوں اور ان کے باہمی روابط کا ذکر بھی ہے۔ پھر حیاتیاتی دائرہ کار اور نفسیاتی دائرہ کار کے ساتھ ان کے باہمی تعلق کو بھی واضح کیا گیا ہے۔ آخر الذکر دونوں دائرے ایسی نفسیاتی اور ذاتی رشتوں کی ساخت کو ظاہر کرتے ہیں جن کی بدولت بیرونی دنیا میں رونما ہوتی تبدیلیاں ہماری گھریلو زندگی پر اثر انداز ہوتی ہیں۔

''تیسری لہر'' کے نظریے کے مطابق' تہذیب بھی بعض عملی رویوں اور اصولوں سے استفادہ کرتی ہے۔مزید برآں' حقیقت کے اظہار اور اپنے وجود کے اثبات کے لئے تہذیب اپنے ایک بلند و برتر تصور کو فروغ دیتی ہے۔ ان اجزاء' اصولوں اور عملی رویوں کے باہمی روابط کو سمجھ لینے کے بعد ہمیں یہ حقیقت معلوم ہوگی کہ یہ سب ایک دوسرے میں کسی طرح ان تغیرات کو جنم دیتے ہیں' جن سے تبدیلی کی طاقت اور لہریں اٹھتی ہیں۔ تب ہی ہم' اپنی زندگی کا تار و پود بکھیرنے والی' تبدیلی کی عظیم الشان لہر سے آگاہی حاصل کر سکیں گے۔

یہ بات اب تک عیاں ہو چکی ہے کہ تبدیلی کی شوریدہ سر لہریں' اس کتاب کا عظیم استعارہ ہیں۔ یہ میرا تخلیقی استعارہ نہیں۔ رابرٹ ایلس نے اپنی کتاب ''تہذیبی عمل'' میں کئی صدیوں پر پھیلی ہوئی ایسی ایک لہر کا حوالہ دیا ہے جو باہمی روابط کے فروغ کا باعث بنی۔ 1837ء میں ایک مصنف نے مغربی امریکہ کے کسی قصبے کا ذکر پے در پے ابھرتی لہروں کے استعارے سے کیا تھا۔۔۔مثلاً آباد کاروں اور کسانوں کے بعد' اس خطے میں' تاجروں کی آمد کو ہجرت کی تیسری لہر سمجھا گیا1893ء میں فیڈرک جیکسن ٹرنر نے بھی اسی استعاراتی لہر کا ذکر اپنے مشہور مضمون ''امریکی تاریخ میں سرحد کی اہمیت'' میں کیا تھا' چنانچہ لہر کی تشبیہ کوئی نئی بات نہیں۔ البتہ آج کے تہذیبی انقلاب پر یہ خوب منطبق ہوتی ہے۔

مذکورہ استعارے کا استعمال خاصا مفید ثابت ہوا ہے۔ لہر کے تصور کی مدد سے بے پناہ اور خاصی بے ربط معلومات کی تنظیم سازی بھی ممکن ہے۔ اس کے ذریعے تبدیلی کے پس

منظر کا احاطہ آسان ہو جاتا ہے۔ لہر کے استعارے کے ذریعے شکوک و شبہات کا دھواں صاف ہو جاتا ہے اور اہم اشیاء تیز تر روشنی میں واضح ہو جاتی ہیں۔

میں نے تبدیلی کی ان لہروں کے متعلق سوچنا کیا شروع کیا' ان ٹکراتی' بل کھاتی' ایک دوسرے کو لپیٹتی اور ہمارے اردگرد طغیانی پھیلاتی لہروں نے تبدیلی کے متعلق' میرا نظریہ ہی بدل ڈالا۔ تعلیم و صحت' ٹیکنالوجی' سیاست اور نجی زندگی تک' ہر شعبے میں' میرے لئے صنعتی دور کی پیداوار' عارضی اور ظاہری تغیرات اور انقلابی' مستقل تبدیلیوں میں تفریق کرنا آسان ہو گیا۔ کتنا ہی بلیغ و بسیط استعارہ کیوں نہ ہو' وہ حقیقت کو جزوی طور پر ہی واضح کر سکتا ہے۔ کوئی بھی استعارہ حقیقت کی ساری سمتوں پر محیط نہیں ہو سکتا اور اس کے ذریعے حال یا مستقبل کی کوئی بھی تصویر حتمی نہیں سمجھی جا سکتی' آج سے پچیس سال پہلے' عین عالم شباب میں۔۔۔۔ ان دنوں میں مارکسی نظریات کا حامی تھا۔۔۔۔ دوسرے نوجوانوں کی طرح مجھے بھی یہ خوش فہمی تھی کہ میں سب کچھ جانتا ہوں لیکن جلد ہی مجھے پتہ چل گیا کہ میرا علم ادھورا' یک طرفہ اور فرسودہ ہے' ایک اور بھی زیادہ اہم انکشاف ہوا کہ صحیح سوال عموماً ایک غلط سوال کے صحیح جواب سے کہیں زیادہ اہم ہوتا ہے۔

میں کہہ سکتا ہوں کہ ''تیسری لہر'' جہاں کئی سوالوں کے جواب مہیا کرتی ہے وہاں اس میں بہت سے نئے سوالات بھی اٹھائے گئے ہیں۔ اس امر کا اعتراف کہ علم کبھی مکمل نہیں ہوتا اور کئی استعارہ بھی مکمل نہیں ہو سکتا' خود کو انسانیت سے متصف رکھنے کے مترادف ہے۔ یہ ادراک انتہائی پسندی کا تدارک ہے اس طرح مخالفوں کے حقوق کا احترام اور اپنی غلطی کے احتمال کا اعتراف آسان ہو جاتا ہے۔ آگہی کے ایسے امکانات اتنی وسیع تصنیف و تالیف میں اور بھی بڑھ جاتے ہیں۔ نقاد جارج سٹائز نے لکھا ہے ''افقی سوالات پوچھنے میں غلط جواب ملنے کا خدشہ رہتا ہے مگر ان سوالات کا نہ پوچھا جانا' انسانی عقل کی تنگ دامانی کے مترادف ہو گا۔''

جب نجی زندگی شکست و ریخت کا شکار ہو رہی ہو' مروجہ سماجی نظام متزلزل ہو رہا ہو اور دور افق پر ایک روشن طرز زندگی کے امکانات طلوع ہو رہے ہوں تو تباہ کن تبدیلی کے ایسے وقت میں' اپنے مستقبل کے متعلق بڑے بڑے سوالات اٹھانا محض دانش ورانہ استعجاب نہیں بلکہ اپنے وجود کی بقا کا معاملہ ہے۔

MashalBooks.org

شعوری یا لاشعوری طور پر ہم میں سے اکثر لوگ پہلے ہی نئی تہذیب کی تخلیق میں یا اس کی مزاحمت میں مشغول ہیں۔ مجھے امید ہے کہ ''تیسری لہر'' ہم میں سے ہر ایک کے لئے مشعل راہ ہو گی۔

MashalBooks.org

لہروں کا ٹکراؤ

MashalBooks.org

MashalBooks.org

باب1

عظیم جدوجہد

ایک نئی تہذیب ہماری زندگی میں جنم لے رہی ہے اور عقل کے اندھے' ہر جگہ اس کا راستہ روکنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ نئی تہذیب اپنے جلو میں' نئے گھریلو طور طریقے' کام کاج' محبت اور رہن سہن کے تبدیل شدہ انداز' ایک نئی معیشت' نئے سیاسی جھگڑے اور اس لیس بھی ماورا' ایک تبدیل شدہ شعور و آگہی لا رہی ہے۔ اس تہذیب نو کی جھلک کہیں کہیں آج بھی محسوس کی جا سکتی ہے۔ لاکھوں لوگ اپنی زندگی کو کل کے تقاضوں کے مطابق' ابھی سے ہم آہنگ کر رہے ہیں۔ لیکن مستقبل سے خوف زدہ' بہت سے لوگ ماضی کی آغوش میں پناہ لینے کی فضول اور بیکار کوشش کے ساتھ' اس دم توڑتی دنیا کو قائم رکھنا بھی چاہتے ہیں' جس میں انہوں نے جنم لیا تھا۔

یہ ابھرتی ہوئی تہذیب نو' ہمارے عہد کی واحد دھماکا خیز حقیقت ہے۔ ایک ایسی مرکزی حقیقت' جو آنے والے برسوں کو سمجھنے میں بنیادی کلید کا کردار ادا کرے گی۔ تبدیلی کی پہلی لہر' دس ہزار سال پہلے زراعت کی ایجاد کے ساتھ ابھری تھی اور دوسری لہر' کرہ ارض کو ہلا کر رکھ دینے والی تبدیلی کی لہر' صنعتی انقلاب کے ساتھ نمودار ہوئی تھی۔۔۔۔ نیا دھماکا خیز واقعہ اپنی اہمیت کے اعتبار سے ان دونوں سے کسی بھی طرح کم نہیں۔ ہم' تبدیلیوں کی ایک عظیم لہر۔۔۔۔ تیسری لہر' کی اولاد ہیں' اس غیر معمولی تبدیلی کو سمجھنے اور اس کے ابلاغ کے لئے' خلائی دور اور ابلاغیات کا زمانہ شروع ہو رہا ہے۔ بعض اسے الیکٹرانک عہد یا گلوبل ولیج کا نام دیتے ہیں۔ برزنسکی کا کہنا ہے کہ ہمیں ٹیکنی ٹرانک دنیا کا سامنا ہے۔ سوشیالوجسٹ ڈینٹل بیل ''مابعد از صنعتی معاشرے'' کی آمد کی نوید دیتا ہے۔ روسی ماہرین مستقبلیات ''سائنسی ٹیکنالوجی کے انقلاب'' کی بات کرتے ہیں۔ اور خود میں نے ''عظیم صنعتی معاشرے'' کی آمد کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے۔ پھر بھی ان میں سے کوئی بھی ترکیب یا اصلاح میرے نام سمیت' نئی تبدیلی کا احاطہ کرنے کے لئے ناکافی ہے۔ ان میں سے کچھ

MashalBooks.org

تراکیب، کسی ایک عنصر پر مرتکز ہونے کی وجہ سے، ہماری تفہیم میں وسعت پیدا کرنے کی بجائے اسے محدود کر دیتی ہیں اور بعض اصطلاحات، غیر متحرک معنویت لئے، ایک نئے معاشرے کی پرسکون آمد سے آگاہ کر رہی ہیں جو ہماری زندگیوں میں، بلا کسی تردد اور پریشانی کے وارد ہوا چاہتا ہے۔ ہماری طرف تیزی سے بڑھتی ہوئی تبدیلیوں کی مکمل طاقت، وسعت اور متحرک قوت عمل یا ان سے پیدا شدہ دباؤ اور تصادم کے متعلق، ان میں سے کوئی بھی اصطلاح ابتدائی تصویر کشی سے بھی قاصر ہے۔

انسانیت کو، اپنی پیش قدمی میں، ایک عظیم برتی جست کا سامنا ہے، عمیق ترین سماجی انقلاب اور تخلیقی بنیادوں کی از سرنو تشکیل در پیش ہے۔ غیر واضح پہچان کے باوجود، ہم ایک عظیم الشان نئی تہذیب کی بنیادیں استوار کرنے میں جت گئے ہیں۔ یہ ہے تیسری لہر کا مطلب۔

نسل انسانی ابتک تبدیلیوں کی دو عظیم لہروں سے دو چار ہو چکی ہے۔ ان میں سے ہر لہر نے سابقہ تہذیب و ثقافت کو نیست و نابود کر کے، زندگی کے ایسے طور طریقے رائج کئے، جو پچھلے دور کے انسان کی سمجھ سے بھی باہر تھے۔ تبدیلی کی پہلی لہر۔۔۔ زرعی انقلاب، نے اپنے بھرپور اظہار میں ہزاروں سال لے لیے۔ دوسری لہر۔۔۔ صنعتی تہذیب، کے عروج نے تقریباً تین سو سال کا وقت لیا۔ آج تاریخی کی رفتار پہلے سے کہیں زیادہ تیز ہے اور بہت ممکن ہے کہ تیسری لہر پوری تاریخ کو ہی اپنے تند و تیز بہاؤ کا شکار کر لے اور چند عشروں کے اندر اندر ہی اپنی تہذیب تشکیل کر ڈالے۔ اس دھماکہ خیز گھڑی میں، ہم، کرہ ارض کے ہم سفر، تیسری لہر کے تمام تر اثرات، یقیناً اپنی ہی زندگی میں محسوس کر سکیں گے۔

ہمارے خاندان ٹوٹ رہے ہیں، ہماری معیشت بھونچال کا شکار ہے، ہمارے سیاسی نظام مفلوج ہو رہے ہیں اقدار ٹوٹ پھوٹ رہی ہیں۔ غرض ہر جگہ تیسری لہر اپنا اثر دکھا رہی ہے۔ یہ طاقت کے تمام پرانے سرچشموں، ان کے استحقاق اور آج کی زبردست اشرافیہ کے بھرپور اختیارات کو چیلنج کر رہی ہے اور ان قوتوں کے خلاف میدان ہموار کر رہی ہے۔ جن سے مستقبل کی حقیقی طاقت کے حصول کی جدوجہد کی جائے گی۔

اس نئی ابھرتی ہوئی تہذیب کے کئی پہلو پرانی روایتی صنعتی تہذیب سے بالکل

متضاد ہیں۔ یہ بیک وقت انتہائی ٹیکنالوجیکل بھی ہے اور اینٹی انڈسٹریل بھی۔

تیسری لہر اپنے ہمراہ زندگی کے حقیقی نئے راستے لا رہی ہے۔ جن کی بنیاد توانائی کے متنوع' رنگارنگ اور غیر مختتم ذرائع پر ہوگی۔ ایسے پیداواری طریقے مستعمل ہوں گے۔ جن سے صنعتی اداروں کی موجودہ اسمبلی لائنز کا بڑا حصہ متروک ہو جائے گا' جسے ممکن ہے''الیکٹرانک گاؤں'' کہا جا سکے۔ ابھرتی ہوئی تہذیب ہمارے لئے سماجی رویوں کا ایک نیا ضابطہ تیار کر رہی ہے۔ یہ ہمیں معیاروں' وقت اور ماحول سے مطابقت اور مرکزیت سے بھی آگے کا راستہ دکھا رہی ہے' توانائی' زر اور طاقت کے ارتکاز سے بھی بہت آگے کا راستہ۔

نئی تہذیب' پرانے سماجی ڈھانچوں کو چیلنج کر رہی ہے۔ یہ نکر شاہی کا تختہ الٹ دے گی۔ قومی ریاستوں کے کردار کو محدود کر دے گی اور سامراجی نظام کے خاتمے کے بعد کی دنیا میں نیم خودمختار معیشتوں کو استحکام دے گی۔ اس کے لئے اسے ایسی حکومتیں درکار ہیں جو ہمارے موجودہ ادراک سے کہیں زیادہ سادہ' مستعد اور زیادہ جمہوری ہوں۔ اس تہذیب کا اپنا ایک واضح ارضی نظریہ ہے' زبان و مکاں' دلیل اور توجیہات سے مطابقت کرنے کے' اس کے اپنے طریقے ہیں۔

ان سب سے زیادہ اہم پیش رفت' جو ہمیں نظر آئے گی' یہ ہوگی کہ تیسری لہر کی تہذیب مستقبل کی صانف معیشتوں کی تشکیل کر کے صارف اور صانع (اشیاء بنانے والا) کے درمیان تاریخی بُعد سے پیدا شدہ زخم مندمل کر لے گی۔ اسی وجہ سے' ہماری تھوڑی سے دانش مندانہ مدد کے ساتھ' یہ تہذیب' معلوم تاریخ کی سب سے زیادہ اور حقیقی انسان دوست تہذیب کی صورت اختیار کر سکتی ہے۔

انقلابی ابتدا

مستقبل کے بارے میں موجودہ معروف نظریہ بظاہر دو مختلف النوع تصورات لئے ہوئے ہے۔ اکثر لوگ' اگر آنے والے کل کے بارے میں تھوڑا بہت سوچنے کی زحمت گوارا کرتے بھی ہیں۔۔۔۔ تو یہ فرض کر لیتے ہیں کہ ان کی جانی پہچانی دنیا' عرصہ دراز تک اسی طرح قائم رہے گی۔ ایک مکمل نئی تہذیب کی آمد کا سوچنا تو بہت دور کی بات ہے۔ ان کے لئے اپنی زندگی میں نئے رنگ ڈھنگ اور مختلف طور طریقوں کی آمد کے بارے میں

تصور کرنا بھی ایک امر محال ہے۔ وہ یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ تبدیلیاں ہو رہی ہیں لیکن ان کے خیال میں یہ تبدیلیاں انہیں متاثر نہیں کر پائیں گیاور نہ جانے پہچانے معاشی نظام اور سیاسی ڈھانچے کو انہیں نقصان پہنچاسکیں گی۔ وہ بڑے اعتماد سے توقع کرتے ہیں کہ مستقبل بھی موجودہ زمانے کا ایک تسلسل ہو گا۔

اس سیدھی سادی سوچ کی بھی مختلف شکلیں ہیں۔ ایک سطح پر تو یہ کاروباری لوگوں' اساتذہ' والدین اور سیاست دانوں کے فیصلوں کے پیچھے موجود بے سوچا سمجھا مفروضہ لگتا ہے دوسری سطح پر اسے زیادہ پرکشش بنانے کے لئے اعداد وشمار' کمپیوٹر کے ڈیٹا اور پیش گوئی کرنے والوں کے نہ سمجھ آنے والے غیر واضح محاروں اور تراکیب سے' اس کی تزئین بھی کی جاتی ہے۔ دونوں طرح یہ تصور ابھارنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ مستقبل کی دنیا بھی لگ بھگ آج جیسی ہی ہو گی۔۔۔۔ یعنی دوسری لہر کا پیدا کردہ صنعتی نظام' اور بھی زیادہ بڑے پیمانے پر' کرہ ارض کے گوشے گوشے میں پھیلتا جائے گا۔

حالیہ واقعات نے' مستقبل کے اس مستحکم تصور کو' بری طرح ہلا کر رکھ دیا ہے۔ اخبارات کی شہ سرخیاں مسلسل بحرانوں سے بھری پڑی ہیں۔ ایران آتش فشاں بن گیا۔ ماؤ سے انحراف شروع ہوا۔ تیل کی قیمتیں آسمان کو چھونے لگیں اور افراط زر خطرناک حد تک بڑھ گیا' دہشت گردی اتنی بڑھی کہ حکومتیں انہیں روکنے میں بے بس نظر آنے لگیں۔۔۔۔ ان سب واقعات کے نتیجے میں ایک دھندلا اور بے رنگ تصور آہستہ آہستہ مقبول ہوتا چلا گیا۔ چنانچہ لوگوں کی بہت بڑی تعداد نے۔۔۔۔ مسلسل ہیبت ناک خبریں' تباہ کن فلمیں' بائبل کی الہامی کہانیاں' مسلمہ دانشوروں کے پیدا کردہ ڈراونے خیالی مناظر کی روز مرہ خوراک سے پرورش پا کر۔۔۔۔ بظاہر یہ نتیجہ اخذ کیا کہ موجودہ معاشرہ مستقبل میں لے جایا نہیں جا سکتا کیونکہ اس صورت میں مستقبل نام کی کوئی چیز ہی نہیں ہو گی۔ جنگ و جدل کی ہولناک تباہیاں بس لمحوں کے فاصلے پر ہیں۔ زمین بڑی تیزی سے اپنے لرزہ خیز انجام کی طرف بڑھ رہی ہے۔

سطحی طور پر مستقبل سے متعلق' یہ دونوں تصورات ایک دوسرے سے بہت مختلف نظر آتے ہیں' لیکن پھر بھی یکساں نفسایاتی اور سیاسی اثرات کو جنم دے رہے ہیں۔ دونوں

ہی تصور اور خواہش کے مفلوج ہو جانے کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

اگر کل کے معاشرے کو موجودہ معاشرے کی صرف زیادہ بڑی اور ہیجان انگیز شکل ہی ہونا ہے تو اس کے لئے ہمیں کسی قسم کی تیاریوں کی کوئی ضرورت نہیں۔ دوسری جانب' اگر دنیا کو' ہماری زندگی میں' خود اپنے ہاتھوں ہی تباہ و برباد ہو جانا ہے تو اس صورت میں بھی ہمارے کرنے کے لئے کیا بچا؟ غرض دونوں تصورات دا خلیت اور انفعالیت پیدا کرتے ہیں۔ دونوں ہی ہمیں جمود کا شکار بناتے ہیں۔

پھر بھی موجودہ صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے ہم' جنگی تباہی و بربادی یا لگ بھگ ایسی ہی معاشرتی صورت کے درمیان۔۔۔۔سیدھے سادے انتخاب تک محدود نہیں ہیں۔کل کے بارے میں غور وفکر کے لئے بہت سے' زیادہ واضح اور تعمیری راستے بھی ہیں۔۔۔۔ ایسے راستے جو ہمیں مستقبل کے لئے نہ صرف تیار کرتے ہیں بلکہ زیادہ اہم یہ ہے کہ حال کو تبدیل کرنے میں ہماری مدد بھی کرتے ہیں۔

اس کتاب کی بنیاد۔۔۔۔ میں اسے ''انقلابی ابتداء'' کا نام دیتا ہوں' جس بات پر رکھی گئی ہے۔ اس کا مفروضہ یہ ہے کہ اگرچہ آنے والے کئی عشرے اپنے دامن میں ہنگامہ خیزیاں اور بے پناہ شکست و ریخت لئے ہوں گے' ممکن ہے تشدد اور خوں ریزی اور زیادہ وسیع پیمانے پر ہو' پھر بھی ہم مکمل طور پر تباہ و برباد نہیں ہوں گے۔ اس مفروضے کے مطابق' ہمارے مشاہدے میں آنے والے لرزہ خیز تبدیلیاں اچانک اور بے ہنگم انداز میں وارد نہیں ہوئیں بلکہ حقیقت میں ان کی تشکیل بہت واضح اور قابل فہم انداز میں ہوئی ہے۔ مزید براں یہ تبدیلیاں مجموعی اثرات کی حامل ہیں۔۔۔۔ یہ ہمارے رہن سہن' کام کاج' کھیل کود اور سوچ میں رونما ہونے والے عظیم الشان ہسیسی انقلاب کو آگے بڑھا رہی ہیں اور ایک معقول اور پسندیدہ مستقبل کے امکانات کو روشن کر رہی ہیں۔مختصراً موعودہ آغاز کی شروعات اس طرح ہے کہ موجودہ حالات و واقعات پور دنیا پر محیط ایک انقلاب سے کم نہیں' تاریخ ایک زبردست چھلانگ لگا رہی ہے۔

ایک اور طرح سے دیکھئے۔ یہ کتاب اس مفروضے پر آگے بڑھتی ہے کہ ہم ایک پرانی تہذیب کی آخری اور ابھرتی ہوئی نئی تہذیب کی پہلی نسل ہیں او ہماری ذاتی الجھنوں'

روحانی اذیتوں اور ذہنی بے سمتی یا پراگندگی کا سراغ براہ راست ہمارے اپنے اندر، ہمارے سیاسی اداروں، دوسری لہر کی ختم ہوتی تہذیب اور تیسری لہر کی ابھرتی ہوئی تہذیب، جو اپنی جگہ لینے کے لئے بے تاب ہے، کے باہمی تصادم میں لگایا جا سکتا ہے۔ اسے حتمی طور پر سمجھ لینے کے بعد، ہماری نظروں میں بہت سے بے معنی واقعات، یکدم با معنی اور قابل فہم ہو جاتے ہیں۔ تبدیلی کا وسیع تناظر واضح طور پر ابھرنا شروع ہو جاتا ہے۔ بقا کا عمل دوبارہ ممکن اور قابل عمل لگنے لگتا ہے۔ مختصراً، انقلابی ابتدا ہماری دانش اور ہماری خواہش کو آزادی بخشتی ہے۔

پیش قدمی کرتا ہوا کنارہ

یہ کہنا بہر حال کافی نہیں جن تبدیلیوں کا ہمیں سامنا ہے، وہ انقلاب آفرین ہوں گی۔ انہیں کنٹرول اور منضبط کرنے سے پہلے، ہمیں ان کی پہچان اور تجزیے کے لئے کوئی تر و تازہ طریقہ چاہئے۔ اس کے بغیر ہم بری طرح یاسیت کا شکار ہو سکتے ہیں۔

ایک طاقتور نئی اپروچ کو سماج کی ''پیش رو لہر'' کے تجزیے کا نام دیا جا سکتا ہے۔ یہ تاریخ کو تبدیلی کی زیر گردش لہروں کے تسلسل کے طور پر دیکھتی ہے اور یہ جاننا چاہتی ہے کہ ہر لہر کا پیش قدمی کرتا کنارہ ہمیں کہاں لئے جا رہا ہے۔ یہ اپروچ ہماری توجہ، تاریخ کے تسلسل یا بہاؤ (ان کی اہمیت کے نقطہ نظر سے) کے بجائے، اس کی رکاوٹوں اور عدم تسلسل، اختراعات، ایجادات اور شکست و ریخت پر زیادہ مرکوز کرتی ہے۔

یہ بنیادی تبدیلی کے ابھرتے ہوئے خطوط کی واضح شناخت کرتی ہے تاکہ ہم ان پر اثر انداز ہو سکیں۔

اس سادہ نظریے سے شروع کرتے ہوئے کہ انسانی سماجی ارتقاء میں، زراعت کا عروج، پہلا اہم موڑ تھا اور صنعتی انقلاب دوسری اہم پیش قدمی تھی۔ یہ ان دونوں کو ایک عظیم الشان لمحاتی کرشمہ سمجھنے کے بجائے، تبدیلی کی ایک ایسی لہر گردانتی ہے جو ایک خاص رفتار سے مسلسل حرکت پذیر ہے۔

تبدیلی کی پہلی لہر سے پہلے زیادہ تر انسان چھوٹے چھوٹے خانہ بدوش گروہوں کی شکل میں رہتے تھے۔ اور اپنی گزر اوقات معمولی کھیتی باڑی، ماہی گیری، شکار اور گلہ بانی

کے ذریعے کرتے تھے۔ اندازاً دس ہزار سال پہلے کسی مقام پر زرعی انقلاب کا آغاز ہوا اور آہستہ آہستہ اس نے تمام کرہ ارض کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور دیہاتوں انتظامی معاملوں زرعی زمینوں اور زندگی کے نئے طور طریقوں میں سرایت کر گیا۔

تبدیلی کی اس پہلی لہر کا ابھی زور ٹوٹا بھی نہیں تھا کہ سترھویں صدی کے اختتام کے ساتھ ساتھ یورپ میں صنعتی انقلاب کی ابتدا کے ساتھ ہی تبدیلی کی عظیم لہر نے پورے کرہ ارض کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس نئے عمل۔۔۔۔ صنعت سازی نے انتہائی تیز رفتاری سے ہر قوم اور ہر براعظم میں پھیلنا شروع کر دیا۔ چنانچہ تبدیلی کے دو مختلف اور واضح سلسلے مختلف رفتار لئے بیک وقت زمین پر رونما ہونے لگے۔

پہلی لہر بالآخر آج دم توڑ چکی ہے۔ جنوبی امریکہ یا پاپوانیوگنی میں چند ایک چھوٹی چھوٹی قبائلی آبادیاں ضرور ہیں جہاں زراعت ابھی نہیں پہنچی۔ لیکن بنیادی طور پر اس پہلی عظیم لہر کی قوت اپنے اختتام کو پہنچ چکی ہے۔ اسی دوران دوسری لہر نے چند ہی صدیوں میں یورپ شمالی امریکہ اور دنیا کے کئی دوسرے علاقوں کی زندگیوں میں انقلاب پیدا کرنے کے بعد ایسے ممالک میں بھی جو بنیادی طور پر ابھی زرعی ہیں اپنا بہاؤ جاری رکھا ہے۔ یہ ممالک فولاد سازی موٹر گاریاں بنانے ٹیکسٹائل ملز ریلوے لائنیں اور خوردنی اشیاء کے پراسس پلانٹ تعمیر کرنے کی سر توڑ کوششوں میں لگے ہوئے ہیں۔ صنعت سازی کا متحرک وجود اب بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ دوسری لہر کی طاقت ابھی بالکل ختم نہیں ہوئی۔

لیکن اس عمل کے جاری رہنے کے باوجود ایک زیادہ اہم عمل کا آغاز ہو چکا ہے کیونکہ دوسری جنگ عظیم کے بعد آنے والے عشروں میں صنعتی راج کی انتہائی بلندیوں کو چھونے کے بعد ایک نا قابل فہم تیسری لہر زمین کی سطح پر موجزن ہونا شروع ہوئی ہے۔ جو چیز بھی اس لہر کی زد میں آئی اس کی شکل ہی تبدیل ہو گئی۔

اس کتاب کی اغراض کے لئے ہم پہلی لہر کی ابتدا کا تعین لگ بھگ آٹھ ہزار سال قبل مسیح کریں گے۔ یہ لہر بلا شرکت غیرے 1650ء اور 1750ء کے درمیانی عرصے تک پورے کرہ ارض پر چھائی رہی۔ اس کے بعد پہلی لہر کی قوت متحرکہ ختم ہو گئی کیونکہ دوسری لہر کا بہاؤ شروع ہو چکا تھا۔ اس دوسری لہر کی پیداوار صنعتی تہذیب نے اپنے دور میں پوری

دنیا پر مکمل راج کیا اور بام عروج پر پہنچی۔ امریکہ میں تازہ ترین تاریخی موڑ تقریباً 1955ء کے عشرے میں آیا۔۔۔۔اس عشرے میں سفید پوش اور خدمات مہیا کرنے والے کارکنوں کی تعداد پہلی دفعہ صنعتی مزدوروں سے بڑھ گئی۔ اسی عشرے میں کمپیوٹر کا وسیع پیمانے پر آغاز ہوا۔ جیٹ ہوائی جہازوں کا کمرشل سفر' مانع پیدائش گولیاں اور بہت سی دوسری انتہائی موثر ایجادات کا استعمال ہونے لگا۔ مختصراً' اسی عشرے میں تیسری لہر نے ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں اپنی طاقت مجتمع کرنا شروع کر دی۔ بعدازاں' تھوڑے تھوڑے وقفے کے ساتھ' دوسری صنعتی اقوام بشمول برطانیہ' فرانس' سویڈن' جرمنی' سوویت یونین اور جاپان میں اس کا بہاؤ آن پہنچا۔ آج تیسری لہر اور دوسری لہر کا ناکارہ اور پلپلی معیشتوں اور اداروں کے مابین تصادم سے اعلیٰ ٹیکنالوجی کی حامل تمام اقوام بری طرح لرز رہی ہیں۔

یہی وہ راز ہے' جس کی آگاہی ہمارے اردگرد بپا ہوتے بہت سے سیاسی اور سماجی تنازعات کو پرمعنی بنا دیتی ہے۔

مستقبل کی لہریں

جب کسی مخصوص سوسائٹی میں' تبدیلی کی صرف ایک لہر غلبہ اختیار کر رہی ہو تو مستقبل کے ارتقائی انداز کو سمجھنا نسبتاً آسان ہوتا ہے۔لکھاری' فن کار' صحافی اور دوسرے بہت سے لوگ مستقبل کی لہر کو دریافت کرتے ہیں۔ اسی لئے انیسویں صدی کے یورپ میں بہت سے مفکرین' کاروباری قائدین' سیاست دانوں اور عام لوگوں کے ذہن میں مستقبل کا ایک واضح اور بنیادی طور پر صحیح تصور موجود تھا۔ وہ سمجھ چکے تھے کہ تاریخ ابتدائی مشینی زراعت کے مقابل' صنعتی راج کی مکمل فتح کی طرف بڑھ رہی ہے اور وہ دوسری لہر کے جلو میں آتی بہت سے تبدیلیوں کا خاصا صحیح اندازہ بھی کر چکے تھے مثلاً زیادہ طاقت ور ٹیکنالوجیز' عظیم الشان شہر' تیز رفتار ترین ذرائع نقل و حمل' بے انتہا تعلیم اور ایسی ہی کئی دوسری چیزیں۔

اس واضح تصور کے براہ راست سیاسی اثرات تھے۔ پارٹیاں اور سیاسی تحریکیں مستقبل کے سہ جہتی انداز کو سمجھ گئیں۔قبل از صنعت' زرعی مفادات' نے حملہ آور صنعتی راج کے خلاف' وسیع و عریض کاروبار کے خلاف' یونین کے کرتا دھرتاؤں کے خلاف' گناہ آلود شہروں کے خلاف آخری مقابلہ منظّم کیا۔نمو دار ہوتی ہوئی صنعتی سوسائٹی کی مرکزی کلوں کو

کنٹرول کرنے کی خواہش میں مزدور اور انتظامیہ آپس میں گتھم گتھا ہو گئے۔ مذہبی اور نسلی اقلیتیں، صنعتی دنیا میں بہتر کردار کے حصول کے لئے اپنے حقوق کی نئی تعریف متعین کرنے لگیں اور ملازمتوں، اجتماعی پوزیشنوں، شہروں میں آباد کاری، زیادہ مزدوری، وسیع تر عوامی تعلیم اور اسی طرح کی دوسری سہولتوں کا مطالبہ کرنے لگیں۔

مستقبل کے اس صنعتی تصور کے بہت اہم نفسیاتی اثرات بھی تھے۔ لوگ عدم اتفاق بھی کر سکتے تھے۔ تنازعات اور بسا اوقات خونی تصادم کا خطرہ بھی موجود تھا۔ سرد بازاری اور کاروبار میں تیزی ان کی زندگیوں کو شکست و ریخت کا شکار بھی بنا سکتی تھی۔ بہر حال صنعتی مستقبل کا مشترکہ اور عمومی تصور، نئی راہوں کے انتخاب کا تصور تھا جس کے ذریعے افراد کو یہ سمجھنا ہی کافی نہیں تھا کہ وہ کون ہیں اور کیا ہیں بلکہ انہیں ان کی آئندہ حیثیت کا شعور بھی دینا تھا۔ انتہائی سماجی تبدیلی کے عین درمیان، یہ تصور ایک نقطہ استحکام اور احساس خودی بخش رہا تھا۔

اس کے برعکس، اگر ایک سوسائٹی میں تبدیلی کی دو یا زیادہ لہریں بپا ہو رہی ہوں اور ان میں سے ابھی تک کسی کا واضح غلبہ نہ ہو، وہاں مستقبل کا تصور غیر واضح اور شکستہ ہوتا ہے چنانچہ ابھرتی ہوئی تبدیلیوں اور تضادات میں معنویت تلاش کرنا بے پناہ مشکل ہو جاتا ہے۔ لہروں کے اگلے کناروں کا ٹکراؤ ایک ایسے بپھرے ہوئے سمندر کو جنم دیتا ہے جس کے دامن میں متضاد موجیں، بھنور اور گرداب بھرے ہوتے ہیں اور ان میں کہیں زیادہ گہرے، زیادہ اہم تاریخی مدوجزر مخفی ہوتے ہیں۔

آج امریکہ اور دوسرے بہت سے ملکوں میں دوسری اور تیسری لہر کے باہمی ٹکراؤ کی وجہ سے سماجی بے چینی، خطرناک کشمکشیں اور عجیب وغریب نئے سیاسی رخ جنم لے رہے ہیں جو گروہی، نسلی، جنسی اور طبقات کی عمومی تقسیم کو ختم کر رہے ہیں۔ اس ٹکراؤ میں روایتی سیاسی ذخیرہ الفاظ بے معنی ہو رہا ہے۔ ترقی پسندوں کو رجعت پسندوں سے اور دوستوں کو دشمنوں سے علیحدہ کرنے کا عمل بہت مشکل ہو گیا ہے۔ پرانی تمام گروہ بندیاں اور گٹھ جوڑ بکھر رہے ہیں۔

مزدور یونین اور مالکان، اپنے اختلافات کے باوجود، ماحول پرستوں سے لڑنے

کے لئے یکجا ہو رہے ہیں۔ سیاہ فام اور یہودی جو کبھی امتیازی سلوک کے خلاف جنگ میں متحد تھے' ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہیں۔

بہت سی قوموں میں' آمدنی کی تقسیم نو جیسی ترقی پسندانہ پالیسیوں کا روایتی حامی مزدور طبقہ' عورتوں کے حقوق' گھریلو اخلاقیات (خاندانی ضابطوں) انتقال آبادی یا علاقائیت کے سلسلے میں آج کل عموماً ''رجعت پسندانہ'' انداز لئے نظر آتا ہے۔ روایتی بایاں بازو اکثر اوقات مرکزیت پسند' بہت زیادہ قوم پرست اور ماحول پرست کا مخالف محسوس ہوتا ہے۔

اسی اثنا میں' ویلری جسکارڈ دیستاں سے جمی کارٹر یا جیری براؤن تک' سبھی سیاست دان معاشیات سے متعلق ''قدامت پسندانہ'' طور طریقوں اور آرٹ' جنسی اخلاقیات' عورتوں کے حقوق یا ایکولوجیکل کنٹرول کے بارے میں آزاد خیالی' کے دونوں رویوں کو باہم گڈ مڈ کرتے نظر آتے ہیں۔ ایسے میں اگر لوگ پراگندہ خیالی کا شکار ہیں اور اپنی دنیا میں معنویت کی تلاش ترک کر دیتے ہیں تو اس پر قطعاً حیرت نہیں ہونی چاہئے۔

ذرائع ابلاغ' اس دوران' ایجادات' متضاد تبدیلیوں' اوٹ پٹانگ واقعات' قتل و غارت' اغوا' خلائی دھماکوں' حکومتی تعطل' کمانڈوز کے حملوں اور سکینڈلوں کے بظاہر کبھی ختم نہ ہونے والے سلسلے رپورٹ کر رہے ہیں' جن کا بظاہر کوئی باہمی تعلق دکھائی نہیں دیتا۔

سماجی زندگی کا ظاہری انتشار' شخصیت کی ٹوٹ پھوٹ میں جھلکتا ہے۔ ماہرین نفسیات اور گرد اپنی دکانداری چمکانے لگتے ہیں۔ معمولی درد سے موذی بیماریوں تک' علاج کے باہم مقابل' طریقوں کے درمیان' لوگ بے مقصد گھومتے پھرتے ہیں۔ وہ مذہب کی آغوش میں پناہ لیتے ہیں یا پھر مریضانہ تنہائی پسندی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ انہیں یقین ہوتا ہے کہ حقیقت کا وجود بے سروپا' لغو اور بے معنی ثابت نہیں ہوتا کہ موجودہ واقعات میں کوئی ربط ہی نہیں۔ حقیقت میں' اس میں ایک واضح' مخفی اسلوب موجود ہے جو تبدیلیوں کی تیسری لہر اور دم توڑتی دوسری لہر سے متعلقہ تبدیلیوں کے مابین فرق سے آگاہی حاصل کرتے ہی' ہم پر آشکار ہو جاتا ہے۔

ان متصادم لہروں سے پیدا شدہ متحارب عوامل سے آگاہی ہمیں نہ صرف متبادل مستقبل کا ایک زیادہ واضح تصور دیتی ہے بلکہ ہم پر اثر انداز سیاسی اور سماجی قوتوں کا ایکسرے

بھی پیش کرتی ہے۔ اس کا ادراک تاریخ میں ہمارے اپنے کردار اور رویوں کی پہچان بھی دیتا ہے۔ ہم میں سے ہر ایک' خواہ بظاہر وہ کتنا ہی غیر اہم کیوں نہ ہو' تاریخ کا ایک جیتا جاگتا حصہ ہے۔

تبدیلی کی ان لہروں سے پیدا شدہ باہم متحارب روئیں ہمارے کام' ہماری گھریلوں زندگی' ہمارے جنسی رویوں اور ذاتی عقیدوں میں منعکس ہوتی ہیں۔ ہماری زندگی کے طور طریقوں اور انتخابی رویوں میں ان کا بھرپور اظہار ہوتا ہے۔ کیونکہ اپنی نجی زندگی اور اپنے سیاسی اقدامات میں' شعوری یا لاشعوری طور پر' ہم امیر ملکوں کے کچھ لوگ لازماً دوسری لہر کے دم توڑتے نظام کو قائم رکھنا چاہتے ہیں یا تیسری لہر کے حامی لوگ ہیں جو ایک بالکل ہی مختلف کل کی تعمیر کر رہے ہیں اور بہت سے لوگ' دونوں لہروں کا ملغوبہ اپنے ذہنوں میں چھپائے' پراگندہ خیالی کا شکار ہیں۔

سنہری خون آشام اور مکار قاتل

دوسری اور تیسری لہروں کی گروہ بندیوں کے مابین تضاد ہی' حقیقت میں' وہ مرکزی سیاسی کشمکش یا کھینچا تانی ہے جو ہماری آج کی سوسائٹی کو توڑ رہی ہے۔ آج کی پارٹیاں یا امیدوار کچھ بھی کہتے رہیں ان کے مابین جھگڑا کم و بیش اسی بات پر ہے کہ ختم ہوتے ہوئے صنعتی نظام کی باقیات سے کون زیادہ مفاد حاصل کر سکتا ہے۔ ایک اور انداز میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ محاورتاً ڈوبتے ہوئے ٹائی ٹینک کے عرشے پر موجود کرسیوں پر قبضہ کے لئے جھگڑے میں مصروف ہیں۔

زیادہ اہم بنیادی سیاسی سوال' جیسے کہ ہم دیکھیں گے' یہ نہیں کہ صنعتی معاشرے کے آخری ایام کس کے قبضہ میں رہتے ہیں بلکہ یہ ہے کہ اس کی جگہ لینے کے لئے تیزی سے ابھرتی ہوئی نئی تہذیب کی تشکیل کون کرتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی سیاسی کج بحثی اور نوک جھونک میں ابھی ہماری توانائی اور توجہ صرف ہو رہی ہوتی ہے کہ اسی سطح کے نیچے ایک اور کہیں زیادہ زبردست جنگ کی بساط بچھ رہی ہوتی ہے۔ ایک جانب صنعتی ماضی کے حامی ہوتے ہیں اور دوسری جانب جنم لیتے ہوئے کروڑوں انسان ہیں جو یہ تسلیم کرتے ہیں کہ دنیا کے فوری مسائل۔۔۔۔ خوراک' توانائی' تخفیف اسلحۂ آبادی' غربت' ذرائع' بیماریاں' ماحول' بزرگوں

کے مسائل' شہری برادری کی شکست و ریخت' پیداواری منفعت بخش کام کی ضرورت۔۔ کسی بھی طرح موجودہ صنعتی نظام کے دائرہ کار میں حل ہیں کئے جا سکتے۔

یہی آویزش تو آنے والے کل کی خاطر ''عظیم جدوجہد'' ہے۔

دوسری لہر کے مستقل مفادات اور تیسری لہر کے حامیوں کے درمیان یہ تنازعہ' ہر قوم کی سیاسی زندگی میں' پہلے ہی' ایک برقی رو کی طرح موجود ہے۔ یہاں تک کہ دنیا کے غیر صنعتی ملکوں میں بھی تیسری لہر کی آمد سے' تمام پرانے جنگی خطوط بزور قوت از سر نو کھینچے گئے ہیں۔ قدیم زراعتی مفادات' حقیقتاً صنعتکار اشرافیہ کے خلاف جاگیردارانہ مفادات' چاہے سرمایہ دارانہ نظام ہو یا سوشلسٹ میں' صنعتی راج کا خاتمہ قریب دیکھ کر ایک نیا رخ اختیار کر رہے ہیں۔ اب جبکہ تیسری لہر کی تہذیب ظہور پذیر ہو رہی ہے' کیا تیز رفتار صنعت کاری نو آبادیاتی نظام اور غربت سے آزادی کا کوئی اشارہ دیتی ہے۔۔۔ یا حقیقت میں' کہیں یہ مستقل محتاجی کا سامان تو نہیں کر رہی؟

اس وسیع تناظر میں موجود پس منظر سے اختلاف کے بعد ہی ہم اخباری سرخیوں کو معنویت دینے' ہماری اپنی ترجیحات کی تلاش' اپنی زندگیوں میں تبدیلی کو منضبط کرنے کے لئے عاقلانہ پالیسیوں کی تدوین کا آغاز کر سکتے ہیں۔

تادم تحریر' اخبارات کے پہلے صفحات۔۔۔ ایران میں اعصابی تناؤ اور امریکی یرغمالی' جنوبی کوریا میں پے در پے پرفریب قتل' سونے پر سٹے کا خاتمہ' امریکہ میں سیاہ فاموں اور یہودیوں کی نا چاقی' مغربی جرمنی کے فوجی اخراجات میں زبردست اضافہ' لانگ آئی لینڈ میں وسیع آتش زدگیاں' خلیج میکسیکو میں میں تیل کے بہت بڑے ذخیرے کا ضائع ہونا' ایٹمی تیاریوں کے خلاف تاریخ کی عظیم ترین ریلی اور امیر غریب اقوام کے مابین ریڈیائی لہروں کے کنٹرول پر زبردست تصادم۔۔۔ جیسی رپورٹوں سے بھرے نظر آتے ہیں۔ احیائے مذہب کی لہریں لیبیا' شام اور امریکہ میں بری طرح تباہی مچا رہی ہیں' جدید فسطائیت کے کٹر حامیوں کا دعویٰ ہے کہ پیرس میں ہونے والا ایک سیاسی قتل انہی کا کارنامہ ہے۔ ادھر جنرل موٹرز کی جانب سے برقی موٹر کاروں کے لئے مطلوبہ ٹیکنالوجی میں اہم پیش رفت کی نوید ہے۔ ایسی غیر مربوط خبروں کے تراشے کسی نئے باہمی ربط یا ان سے جنم لیتی کسی نئی ترتیب کا

MashalBooks.org

اعلان کر رہے ہیں۔ ایک دفعہ ہم یہ محسوس کر لیں کہ صنعتی نظام کے محافظوں اور اس کے جانی دشمنوں کے مابین مخاصمانہ جدوجہد اب بڑھتی جا رہی ہے تو دنیا کو سمجھنے کے لئے' ہمارے پاس ایک طاقتور' نئی راہ کھل جاتی ہے۔ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ۔۔۔۔ چاہے ہم کسی قوم کی پالیسیاں تشکیل دے رہے ہوں۔ کسی کارپوریشن کا لائحہ عمل بنا رہے ہوں یا خود اپنی ذاتی زندگی کے مقاصد طے کر رہے ہوں۔۔۔۔ دنیا کو بدلنے کے لئے ہمارے پاس ایک نیا آلہ ہے۔

اس آلے کو استعمال کرنے کے لئے' بہر حال ہمیں پرانی صنعتی تہذیب کو فروغ دینے والی تبدیلیوں اور نئی اور پرانی دونوں لہروں کو لازماً سمجھنا چاہیئے۔ دوسری لہر کا صنعتی نظام' جس میں ہم میں سے بہت سے لوگوں نے جنم لیا تھا اور تیسری لہر کی تہذیب' جس میں ہمیں اور ہمارے بچوں کو اپنی زندگیاں گزارنا ہیں۔

اگلے ابواب میں' ہم تبدیلی کی پہلی دونوں لہروں کا بنظر غائر مطالعہ کریں گے تاکہ خود کو تیسری لہر کے متعلق تحقیق و جستجو کے لئے تیار کر سکیں۔ ہمیں پتہ چلے گا کہ دوسری لہر کی تہذیب محض بہت سے اجزاء کا حادثاتی اجتماع یا ملغوبہ نہیں تھا بلکہ جز بجز تشکیل پاتا ایسا نظام تھا جس کے اجزاء کے مابین ردعمل کو کم و بیش' قبل از وقت سمجھا جا سکتا تھا اور صنعتی زندگی کے بنیادی رجحانات' سیاسی اختلافات اور ثقافتی ورثہ سے قطع نظر ہر ملک میں تقریباً ایک جیسے ہی تھے۔ یہی وہ تہذیب ہے جسے آج کے ''رجعت پسند'' چاہے ان کا تعلق بائیں بازو سے ہو یا دائیں سے' دونوں ہی بچانے کی کمر توڑ کوشش میں ہیں۔ اور اسی دنیا کو تاریخ کی تیسری لہر کی تہذیبی تبدیلی کا خطرہ درپیش ہے۔

MashalBooks.org

MashalBooks.org

دوسری لہر

MashalBooks.org

MashalBooks.org

باب2

تہذیب کی تشکیل

لگ بھگ تین ساڑھے تین سو سال پہلے ایک دھماکا سنائی دیا' جس کی تباہ کن لہروں نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا' قدیم معاشروں کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا اور ایک بالکل نئی تہذیب کو جنم دیا۔ یہ لرزہ خیز دھماکہ بلاشبہ صنعتی انقلاب کا دھماکہ تھا۔ اس عظیم مدوجزر کے نتیجے میں دوسری لہر کی شکل ابھرنے لگی جس نے ماضی کے تمام اداروں کو توڑ پھوڑ کر' کروڑوں انسانوں کی زندگی اور رہن سہن کو تبدیل کر دیا۔

ہزاروں سالوں پر محیط پہلی لہر کی تہذیب کی حکمرانی کے دور میں دنیا کی آبادی کو دوطرح کے حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا تھا''غیر مہذب'' اور''تہذیب یافتہ'' نام ونہاد غیر مہذب قومیں' چھوٹے چھوٹے گروہوں اور قبیلوں کی شکل میں رہتی تھیں اور مویشیوں کے گلوں' شکار یا ماہی گیری پر انکی گزر بسر ہوتی تھی اور زرعی انقلاب کا کوئی اثر ان تک نہیں پہنچا تھا۔ اس کے برعکس''مہذب'' دنیا' بالاختصار' کرہ ارض کا وہ حصہ تھی جہاں لوگوں کی اکثریت نے کھیتی باڑی کرنا شروع کر دی۔ کیونکہ جہاں کہیں زراعت کو عروج ہوا' تہذیب کی بنیاد پڑنا شروع ہو گی۔ چین اور ہندوستان سے بینین اور میکسیکو تک' یونان اور روم میں تہذیبوں کے(لامتناہی اور رنگا رنگ) عروج و زوال اور شکست وریخت کا سلسلہ جاری رہا۔ صوری اختلافات کے باوجود ان سب تہذیبوں میں بنیادی یکسانیت موجود تھی۔ معیشت' زندگی' ثقافت' خاندانی نظام اور سیاست کی بنیاد زمین ہی رہی۔ ان سب میں زندگی گاؤں کی سطح پر منظم تھی۔ سادہ تقسیم کار' ہر جگہ موجود تھی اور بعض واضح ذاتیں اور طبقات بن گئے تھے مثلاً اشرافیہ' پجاری' فوجی' کاشت کار' غلام یا کمی وغیرہ۔ ہر جگہ صرف طاقت کی حکمرانی تھی۔ زندگی میں کسی شخص کا مقام اس کی پیدائش کے حوالے سے طے پاتا تھا اور ان سبھی معاشروں میں معیشت غیر مرتکز تھی چنانچہ ہر قبیلہ اپنی ضروریات کی اشیاء خود بناتا تھا۔

بہت سے استثناء بھی تھے۔۔۔۔تاریخ میں کوئی چیز بھی سادہ اور قطعی نہیں ہوتی۔

MashalBooks.org

ایسی تجارتی ثقافتیں بھی تھیں جن کے جہاز رانوں نے سمندر عبور کئے اور بڑے بڑے زرعی نظاموں کے ارد گرد زبردست مرکزی بادشاہتیں تشکیل پائیں۔ اس قسم کی اختلاف صورتوں کے باوجود یہ کہنا قرین انصاف ہوگا کہ بظاہر یہ علیحدہ علیحدہ تہذیبیں دراصل ایک ہی مظہر یعنی پہلی لہر سے پیدا شدہ زرعی تہذیب کی خصوصی شکلیں ہیں۔ اس لہر کے مطلق العنانی کے زمانے میں بسا اوقات پیش آمدہ چیزوں کی متعلق بعض اشارے میں ملے۔ قدیم یونان اور روم میں بڑے پیمانے کی پیدوار دینے والی فیکٹریاں اپنی ابتدائی شکل میں موجود تھیں۔ ایک یونانی جزیرے میں چار سو سال قبل مسیح اور برما میں سو سال قبل مسیح تیل نکالا جاتا تھا۔ بابل اور مصر میں وسیع نوکر شاہی خوب پھلی پھولی۔ ایشیاء اور جنوبی امریکہ میں عظیم الشان شہری آبادیوں نے جنم لیا۔ جہاں زر بھی تھا اور اس کا باقاعدہ لین دین بھی۔ کیتھے سے کالائس تک' صحراؤں' سمندروں اور پہاڑوں کے درمیان سے گزرتے تجارتی راستے بھی موجود تھے۔ کارپوریشنز اور قومیں' اپنی ابتدائی شکل میں دیکھی جا سکتی تھیں۔ یہاں تک کہ قدیم سکندریہ میں بھاپ کے انجن کی حیرت انگیز کارکردگی بھی سامنے آ گئی تھی۔ لیکن دور دور تک کوئی چیز ایسی موجود نہیں تھی جسے صنعتی تہذیب کا نام دیا جا سکتا۔ مستقبل کی ان جھلکیوں کو' کہنے کی حد تک تاریخ کے حیران کن واقعات سے تعبیر کیا جا سکتا ہے جو مختلف زمانوں میں مختلف جگہوں پر ظہور پذیر ہوئے۔ انہیں کسی نظام کے تحت مربوط کرنے کی کوشش نہیں کی گئی اور نہ ہی ایسا کرنا ممکن تھا۔ اسی لئے 1650ء سے 1750ء کے درمیانی وقفہ سے پہلے کے دور کو ہم پہلی لہر کی دنیا کہہ سکتے ہیں۔ غیر مہذب خطوں اور صنعتی مستقبل کی جھلکیوں کے باوجود زرعی تہذیب پوری زمین پر مکمل حاوی تھی۔ لگتا تھا یہی تہذیب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے انسان کا مقدر ہے۔

یہ تھی وہ دنیا جس میں صنعتی انقلاب بپا ہوا' دوسری لہر کی ابتداء ہوئی اور جس کے ذریعے ایک حیران کن' طاقتور اور بے پناہ مضطرب توانا تہذیب نے جنم لیا۔ صنعتی راج صرف دھوئیں چھوڑتی فیکٹریوں اور چیزوں کو باہم جوڑنے کا نام ہی نہیں تھا بلکہ ایک زرخیز' کثیر جہتی سماجی نظام تھا جس نے انسانی زندگی کے ہر رخ کو چھوا اور گزرے دور (پہلی لہر) کی ہر مخصوص شکل پر دھاوا بولا۔ جہاں اس نے ڈیٹرائٹ کے مضافات میں عظیم دلو رن

فیکٹری کی تعمیر کی' وہاں کھیتوں میں ٹریکٹر' دفتروں میں ٹائپ رائٹر اور کچن میں ریفریجریٹر بھی پہنچایا۔اسی نے روزانہ اخبارات' سینما' زیر زمین راستے اور ڈی سی 3 کے تحفے دیئے۔ اسی کے طفیل شش جہت کا تصور اور بارہ سازوں کی موسیقی دریافت ہوئی۔ باہاز وٹامن کی گولیاں اور زندگی کا طویل دورانیہ بھی ہمیں اسی دور میں ملے۔ کلائی کی گھڑی اور بیلیٹ بکس کا عالم گیر رواج ہوا۔ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اس عہد نے ان سب چیزوں کو باہم مربوط کر ڈالا۔۔۔ ایک مشین کے کل پرزوں کی طرح انہیں آپس میں یکجا کر دیا' تاکہ وہ ایک طاقتور ترین' مربوط اور توسیع پذیر سماجی نظام کی تشکیل کر سکیں۔ اس طرح دنیا نے پہلی دفعہ دوسری لہر کی تہذیب کو ابھرتے دیکھا۔

جبری حل

جوں جوں دوسری لہر مختلف معاشروں میں متحرک ہوئی' زرعی ماضی کے محافظوں اور صنعتی مستقبل کے کارندوں کے درمیان طویل خونیں معرکہ آرائی شروع ہو گئی۔ پہلی اور دوسری لہروں کی اس باہمی جنگ میں جہاں اور بہت کچھ ملیا میٹ ہوا' وہاں اکثر اوقات راہ میں آنے والی غیر مہذب اقوام کا بھی مکمل صفایا ہو گیا۔

امریکہ میں اس کشمکش کا آغاز ان یورپی لوگوں کی آمد کے ساتھ ہی شروع ہو گیا جو پہلی لہر کی زرعی تہذیب کو مستحکم کرنا چاہئے تھے۔ سفید فام زرعی مدوجزر' انتہائی بے رحمی سے انڈین سے اس کا سب کچھ چھینتا ہوا' کھیت کھلیانوں اور زرعی دیہاتوں کو مجتمع کرتا ہوا' بحرالکاہل کے دور دراز کناروں تک جا پہنچا۔

پھر ابتدائی صنعت کاروں نے' جو مستقبل کی دوسری لہر کے حامی تھے' کاشتکاروں کو سختی سے کچل ڈالا۔ نیو انگلینڈ اور وسطی اٹلانٹک ریاستوں میں فیکٹریاں اور شہر پھیلنا شروع ہو گئے۔ انیسویں صدی کے وسط تک شمال مشرقی علاقہ بہت تیز رفتاری سے صنعتی خطہ بن کر ابھرا' جہاں آتشیں اسلحہ' گھڑیاں' کاشتکاری کے آلات' ٹیکسٹائل' سینے کی مشینیں اور دوسری اشیاء بن رہی تھیں جبکہ باقی سارے براعظم پر ابھی تک زرعی مفادات کی حکمرانی تھی۔

1861ء لگ بھگ' پہلی او دوسری لہر کی قوتوں کے درمیان معاشی اور سماجی کشیدگی اپنی انتہا کو پہنچ گئی اور ان میں فوجی تصادم کا آغاز ہو گیا۔ بہت سے لوگوں کا خیال تھا

کہ یہ خانہ جنگی صرف غلامی کے اخلاقی مسئلے پر یا محصولات کے معمولی معاشی مسائل کی وجہ سے بپا ہوئی۔ بات اتنی سی نہیں تھی بلکہ اس خانہ جنگی کی بنیاد دراصل یہ بڑا سوال تھا۔ اس نو زائدہ دولت مند براعظم پر کسانوں کی حکومت ہوگی یا صنعت کاروں کی؛ پہلی لہر کی قوتیں اس پر حکمران ہونگی یا دوسری لہر کی؟ مستقبل کا امریکی معاشرہ بنیادی طور پر زرعی ہوگا یا صنعتی؟ شمالی افواج کی فتح کے ساتھ ہی یہ مسئلہ طے ہوگیا۔ امریکی ریاستوں میں صنعت کاری کا عمل یقینی ہوگیا۔ اس وقت کے بعد سے، معاشیات، سیاسیات، سماجی اور ثقافتی زندگی میں زراعت شکست کھاتی چلی گئی اور صنعت چھاتی چلی گئی۔ دوسری لہر گرجتی ہوئی آگے آئی تو پہلی لہر کا زور ٹوٹتا چلا گیا۔

تہذیبوں میں اسی طرح کا تصادم ہر جگہ ہونے لگا۔ 1868ء میں شروع ہونے والے، جاپان میں میجی خاندان کی بحالی کے عمل نے، زرعی ماضی اور صنعتی مستقبل کے مابین اسی جدوجہد کو، بغیر کسی غلطی کے، خالص جاپانی انداز میں، ایک بار پھر دہرایا۔ 1876ء میں جاگیرداری کا خاتمہ، 1877ء میں سات سوما قبیلے کی بغاوت، 1889ء میں مغربی طرز کے آئین کا نفاذ۔۔۔۔ یہ سب جاپان میں پہلی اور دوسری لہروں کے باہمی تصادم کی جھلکیاں تھیں۔۔۔۔ عظیم صنعتی قوت کے طور پر ابھرتے جاپان کے راستے کی جانب کئے گئے اقدامات تھے۔

روس میں بھی پہلی اور دوسری لہر کی قوتوں میں ٹکراؤ ہوا۔ 1917ء کا روسی انقلاب، امریکی خانہ جنگی کا روسی انداز تھا۔ یہ کیونزم کی جنگ نہیں تھی، جیسا کہ بظاہر لگا بلکہ ایک بار پھر اس کی وجہ صنعت کاری ہی بنی۔ جونہی بالشویکوں نے غلامی کی آخری نشانیاں اور جاگیردار حکمران ملیا میٹ کردیئے، انہیں زراعت کو پس منظر میں دھکیل دیا اور شعوری طور پر صنعتی نظام کی رفتار کو تیز سے تیز تر کرنا شروع کر دیا، وہ دوسری لہر کے ساتھ بن گئے۔

غرض ایک کے بعد ایک ملک میں، پہلی اور دوسری لہر کے مفادات کے درمیان وہی کشمکش شروع ہوگئی، جس کے نتیجے میں سیاسی بحران اور انتشار، ہڑتالوں، بغاوتوں اور جنگوں کا راستہ ہموار ہوگیا۔ انیسویں صدی کے درمیان تک، بہرحال پہلی لہر کی طاقتیں دم توڑ چکی تھیں اور دوسری لہر کی تہذیب دنیا پر اپنے پنجے گاڑ رہی تھی۔

MashalBooks.org

آج دنیا کے شمالی نصف کرے میں' پچیس اور پینسٹھ متوازی زاویئوں کے درمیان ایک صنعتی بیلٹ پوری آب وتاب سے موجود ہے شمالی امریکہ میں تقریباً پچیس کروڑ انسان زندگی کا صنعتی رہن سہن اختیار کئے ہوئے ہیں۔ مغربی یورپ میں سکنڈے نیویا رک سے جنوب میں اٹلی تک' ایک چوتھائی ارب انسان صنعتی نظام کے تحت رہ رہے ہیں۔ مشرقی جانب' یورپی روسی صنعتی علاقہ ہے۔۔۔۔ مشرقی یورپ اور سوویت یونین کا مغربی حصہ۔۔۔ اور یہاں بھی لگ بھگ چوتھائی ارب انسان صنعتی معاشروں میں اپنی زندگی گزار رہے ہیں اور آخر میں ہم ایشیائی صنعتی ریجن کی طرف آتے ہیں جو جاپان' ہانگ کانگ' سنگاپور' تائیوان' آسٹریلیا' نیوزی لینڈ اور شمالی کوریا اور چین کے مرکزی علاقے' اور یہاں بھی کوئی چوتھائی ارب صنعتی لوگ بستے ہیں۔ یہ سب مل ملا کر ایک ارب انسان ہیں جو صنعتی تہذیب کے پرورده ہیں' یعنی دنیا کی کل آبادی کا ایک چوتھائی۔

زبان' ثقافت' تاریخ اور سیاست کے شدید اور ایسے پیچیدہ اختلافات کہ جن پر' بہت سی جنگیں لڑی جا چکی ہیں۔۔۔۔ کے باوجود' دوسری لہر کے تمام معاشروں میں مشترکہ خصوصیات نظر آتی ہیں۔ بلاشبہ' جانے پہچانے اختلافات کی تہہ میں یکسانیت کی ایک ٹھوس چٹان مخفی ہے۔

آج کی متصادم' تبدیلی کی لہروں سے آگہی کے لئے' ہمیں تمام صنعتی قوموں کے متوازی ڈھانچوں۔۔۔۔ دوسری لہر کی تہذیب کے مخفی دائرہ عمل کی واضح شناخت کے قابل ہونا چاہئے۔ کیونکہ یہ صنعتی دائرہ کار ہی تو' اب شکست وریخت کا شکار ہو رہا ہے۔

جاندار بیڑیوں

کسی بھی تہذیب کی' چاہئے وہ نئی ہو یا پرانی' پہلی ضرورت توانائی ہوتی ہے۔ پہلی لہر کے معاشروں نے جاندار بیڑیوں۔۔۔۔ انسانی یا حیوانی بدن کی طاقت ۔۔۔۔سے' یا سورج' آندھی اور پانی سے اپنی توانائی حاصل کی۔ درختوں کو کاٹ کر' کھانا پکانے اور حرارت پیدا کرنے میں استعمال کیا جاتا تھا۔ آبی چرخیوں کی مدد سے پن چکیاں چلائی جاتیں۔ بعض آبی چرخیاں آبی مدوجزر کی طاقت سے چلتی تھیں۔ بادبانی چکیاں کھلیانوں میں استعمال ہوتیں' جانور ہل چلاتے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ انقلاب فرانس کے زمانے میں' یورپ میں

MashalBooks.org

اندازاً 14 ملین گھوڑوں اور 24 ملین بیلوں سے توانائی حاصل کی جاتی تھی۔ پہلی لہر کے تمام معاشروں نے توانائی کے ایسے ذرائع استعمال کئے جو دوبارہ قابل استعمال ہو جاتے تھے۔ انسان جنگلات کاٹتا' قدرت مزید جنگلات کے ذریعے ان کی کمی پوری کر دیتی۔ ہوا' جس سے وہ بادبان بھرتے تھے۔۔۔۔ دریا' جن سے ان کے چپو یا پن چکیاں چلتیں۔۔۔۔ فضا اور ماحول میں ان کی بے بہا مقدار موجود تھی۔ یہاں تک کہ جانور اور انسان بھی متبادل ''غلام توانائی'' کے طور پر موجود تھے۔

اس کے برعکس دوسری لہر کے تمام معاشروں نے کوئلے' گیس اور تیل۔۔۔۔ زیر زمین موجود' غیر متبادل ایندھن کے ذخائر کو استعمال کرنا شروع کر دیا۔ 1712ء میں نیو کامن کے ہاتھوں سٹیم انجن کی کارآمد ایجاد کے بعد' اس انقلابی تبدیلی کا مطلب یہ ہوا کہ پہلی بار' ایک تہذیب نے قدرتی سرمائے سے مہیا ہونے والے منافع پر گزر بسر کرنے کی بجائے اس سرمائے پر بھی ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا۔

توانائی کے ان زمینی ذخائر تک رسائی نے صنعتی تہذیب کو ایک مخفی سب سڈی مہیا کر دی جس نے معاشی ترقی کی رفتار تیز کر ڈالی۔ اس دن سے آج تک' جہاں کہیں بھی دوسری لہر پہنچی' قوموں نے اس مفروضے کی بنیاد پر۔۔۔۔ کہ زمین میں چھپے' سستے ایندھن کے ذخائر کبھی بھی کم یاب یا ختم نہیں ہوں گے' بلند و بالا ٹیکنالوجیکل اور معاشی ڈھانچوں کی تعمیر کر ڈالی۔ سرمایہ دارانہ اور اشتراکی صنعتی معاشروں میں' مشرق اور مغرب میں یہی تبدیلی یکساں طور پر نظر آتی ہے۔۔۔۔ بکھری ہوئی توانائی کی جگہ مرتکز توانائی' متبادل کی بجائے غیر متبادل' بہت سے مختلف ذرائع ایندھن کی جگہ چند ایک ایندھن کا استعمال۔ ایندھن کے معدنی ذخائر نے دوسری لہر کے تمام معاشروں میں توانائی کی بنیاد فراہم کی۔

ٹیکنالوجی کا بچہ دانی

توانائی کے ایک نئے نظام کی طرف یہ جست' ٹیکنالوجی میں زبردست پیش رفت کے مترادف تھی' پہلی لہر کے معاشروں نے ان اشیاء پر تکیہ کیا' جنہیں دو ہزار سال پہلے وٹروں ویَیس نے ''ضروری ایجادات'' کا نام دیا تھا۔ لیکن یہ ابتدائی رولرز' لکڑی یا لوہے کے پھانے' گوپھن' انگور کا رس نکالنے والے پریس' لیورز اور چیزوں کو اوپر کھینچنے والی کلیں' سب

کے سب زیادہ تر انسانی یا حیوانی عضلات کو مزید تقویت دینے کے لئے استعمال ہوتے تھے۔

دوسری لہر نے ٹیکنالوجی کو ایک بالکل ہی نئی سطح پر لا کھڑا کیا ہے اس نے دھڑا دھڑ برقی اور مکینکل مشینیں' متحرک اجزاء' بیلٹس' پائپ' بیئرنگس اور نٹ پیچ وغیرہ کو جنم دینا شروع کر دیا۔۔۔۔ ہر ایک کی علیحدہ علیحدہ اور باہم پیوست حرکت اور آواز۔۔۔۔! اور ان نئی مشینوں نے کمزور انسانی یا حیوانی اعضاء سے کہیں زیادہ کام کر ڈالا۔ صنعتی تہذیب نے وہ ٹیکنالوجی اور محسوس کرنے والے مشینی آلات عطا کئے جو خود انسان کی نسبت کہیں زیادہ صحیح اور جامع انداز میں سن اور دیکھ سکتے اور لمس کو جانچ سکتے تھے۔ ایسی مشینوں کی ایجاد نے۔۔۔۔ جن کے ذریعے نت نئی مشینوں کو جنم دینے کا لامتناہی سلسلہ شروع ہوا۔۔۔۔ جدید ٹیکنالوجی کو گویا ایک بچہ دانی فراہم کر دی۔ ایک زیادہ اہم بات یہ ہوئی کہ اس نے کارخانہ بنانے کے لئے' ایک ہی چھت تلے' مشینوں کو باہم مربوط نظاموں کے تحت منسلک کر دیا' تاکہ بالآخر' فیکٹری کے اندر ہی اسمبلی لائن قائم کی جا سکے۔

ٹیکنالوجی کی اسی بنیاد پر' دوسری لہر کی تہذیب کو' اس کی حقیقی شکل میں لانے کے لئے بہت سی صنعتیں نمودار ہو گئیں۔ پہلے پہل کوئلے' ٹیکسٹائل اور ریلوے لائنوں کا سلسلہ چلا' پھر فولاد سازی' کاریں بنانے' ایلومینیم' کیمیاوی اشیاء اور دیگر ساز و سامان کی صنعتیں ابھریں۔ عظیم صنعتی شہر وجود میں آنے لگے۔ ٹیکسٹائل میں لِگی اور مانچسٹر' کاریں بنانے میں ڈیٹرائٹ' فولاد سازی میں ایسن اور بعد ازاں میگنی ٹوگورسک اور اسی طرح کی سینکڑوں دوسری صنعتیں۔

ان صنعتی مراکز سے لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں ایک جیسی اشیاء۔۔۔۔ شرٹس' جوتے' موٹر گاڑیاں' گھڑیاں' کھلونے' صابن' شیمپو' کیمرے' مشین گنیں اور برقی موٹریں بن بن کر نکلنا شروع ہوئیں۔ توانائی کے نئے نظام سے حاصل طاقت کے ذریعے نئی ٹیکنالوجی نے وسیع پیداواری عمل کے لئے راستے کھول دیئے۔

شنگرفی پگوڈا

بہر حال' ڈسٹری بیوشن سسٹم میں متوازی تبدیلیوں کے بغیر وسیع پیمانے پر پیداوار بے معنی تھی۔ پہلی لہر کے معاشروں میں' چیزیں عموماً دست کاری کے عمل کا نتیجہ ہوتی تھیں۔ روایتی طریقے سے ایک وقت میں ایک چیز بنائی جاتی تھی۔تقسیم کے متعلق بھی کم و بیش یہی بات صحیح تھی۔

یہ سچ ہے کہ مغرب میں قدیم جاگیردارانہ نظام میں دراڑیں پڑنے کے دوران ہی تاجروں نے بڑی بڑی اور پرشکوہ تجارتی کمپنیاں قائم کر لی تھیں۔ ان تجارتی کمپنیوں نے دنیا کے گرد تجارتی راستے کھولے اور بحری جہازوں اور اونٹ بردار کاروانوں کے کانوائے منظم کئے۔ یہ تاجر شیشہ' کاغذ' سلک' چائے' جائفل' شراب' اون' نیل اور جائفل کا پوست وغیرہ فروخت کرتے تھے۔ ان میں سے اکثر اشیاء صارفین تک چھوٹے چھوٹے سٹورز یا گاؤں گاؤں پھرنے والے پھیری یا ریڑھی فروشوں کے ذریعے پہنچتی تھیں۔ کمزور کاروباری رابطے اور دقیانوسی رسل و رسائل منڈی کو بری طرح متاثر کرتے تھے۔ یہ چھوٹی سطح کے دکاندار اور پھیری فروش معمولی مقدار میں ہی اشیاء مہیا کر پاتے تھے۔ کبھی ایک چیز اور کبھی دوسری چیز مہینوں بلکہ بعض اوقات سالوں تک دستیاب نہیں ہوتی تھی۔

دوسری لہر نے اس کھوکھلے اور حد سے زیادہ بوجھل ڈسٹری بیوشن سسٹم میں ایسی تبدیلیاں پیدا کیں جو اپنے طور طریقوں میں پیداواری عمل میں کی گئی معروف پیش رفت سے کسی بھی طرح کم انقلابی نہیں تھیں۔ ریلوے لائن' شاہراہیں اور نہریں ساحلی علاقوں سے دور دراز کے مقامات کو باہم ملانے میں کامیاب ہو گئیں اور صنعتی راج کے ساتھ ہی ''کاروباری محلات'' یعنی ابتدائی ڈیپارٹمنٹل سٹورز نے جنم لیا۔ کارندوں' تھوک فروشوں' کمیشن ایجنٹوں اور صنعتکاروں کے نمائندوں کا ایک پیچیدہ نیٹ ورک ابھر کر سامنے آیا۔
1871ء میں جارج ہنٹنگٹن نے۔۔۔۔ جس نے نیویارک میں اپنے پہلے سٹور پر سرخ شنگرفی رنگ کروایا تھا اور اس میں کیشئر کا جالی دار کمرہ چینی پگوڈے کی شکل کا رکھا تھا' ڈسٹری بیوشن کے عمل کو اسی طرح آگے بڑھایا جس طرح بعد میں ہنری فورڈ نے فیکٹری کے معاملے میں کیا تھا۔ عظیم اٹلانٹک اور پیسفک ٹی کمپنی کے نام سے دنیا میں سٹورز کا ایک عظیم الشان جال بنا کر اس نے ڈسٹری بیوشن کو ترقی کے ایک بالکل ہی نئے مرحلے پر لا کھڑا کیا۔

MashalBooks.org

روایتی ڈسٹری بیوشن کی جگہ وسیع پیمانے کی ڈسٹری بیوشن اور وسیع تجارت نے حاصل کر لی اور پھر اس نے مشین ہی کی طرح خود کو۔۔۔۔تمام صنعتی معاشروں میں ایک جانا پہچانا اور مرکزی جز تسلیم کرا لیا۔

ہمارے مشاہدے میں آنے والی تمام تبدیلیوں کو اگر یک جا کر لیا جائے تو یہ ایک ایسی ہیسّتی تبدیلی ہے جسے غالباً تکنیکی دائرہ کہا جا سکتا ہے۔ تمام معاشرے۔۔۔۔خواہ وہ قبائلی ہوں' زرعی ہوں یا صنعتی۔۔۔۔توانائی استعمال کرتے ہیں۔ وہ چیزیں بناتے ہیں' ان چیزوں کی تقسیم کرتے ہیں۔ تمام معاشروں میں نظام توانائی' پیداواری نظام اور نظام تقسیم کسی بڑے نظام کے باہم مربوط اجزاء ہیں۔ یہ بڑا نظام ہی تکنیکی دائرہ ہوتا ہے اور سماجی ترقی کی ہر سطح پر اس کی اپنی ایک مخصوص شکل ہوتی ہے۔

جونہی دوسری لہر نے کرہ ارض کو اپنی گرفت میں لیا۔ زرعی تکنیکی دائرے کی جگہ صنعتی تکنیکی دائرہ نے لے لی۔ نا قابل احیاء توانائیوں کو براہ راست ایک وسیع پیمانے کے نظام پیداوار سے مربوط کر دیا گیا' جس نے جواباً ایک اعلیٰ ترقی یافتہ وسیع ڈسٹری بیوشن سسٹم کے تحت چیزیں باہر نکالنا شروع کر دیں۔

موثر اور منظّم کنبہ

دوسری لہر کے اس تکنیکی دائرے کو بہر حال ایک مساوی انقلابی ''سماجی دائرے'' کی حاجت تھی۔ اسے سماجی تنظیم کی بالکل مختلف شکلیں درکار تھیں۔

صنعتی انقلاب سے پہلے' مثلاً خاندان کی شکلیں ہر علاقے میں مختلف تھیں' لیکن جہاں کہیں زراعت نے قدم جمائے وہاں لوگوں نے بڑے بڑے اور کثیر نسلی گھرانوں میں۔۔۔۔ ایک ہی چھت تلے چچاؤں' انکی بیویوں' سسرالی رشتہ داروں' دادا دادی یا بہت سارے کزنز کے ساتھ رہنا شروع کر دیا۔ سب کے سب ایک معاشی پیداواری یونٹ کے طور پر مل جل کر کام کرتے۔۔۔۔ ہندوستان میں ''مشترکہ خاندان'' سے لے کر بالکنز کے ''زدروگا'' اور مغربی یورپ میں ''توسیع شدہ خاندان'' تک' سب کے سب معاشی اکائی ہوتے تھے۔ اپنی سرزمین سے گہرے رشتے کی بدولت' یہ خاندان غیر متحرک تھے۔

جیسے جیسے دوسری لہر نے پہلی لہر کے معاشروں میں جگہ بنانی شروع کی' خاندان

تبدیلی کا دباؤ محسوس کرنے لگے۔ ہر گھرانے میں' لہروں کے پیش قدم کناروں کے ٹکراؤ نے والدین کے اختیارات پر تنازعات اور جھگڑوں کی شکل اختیار کر لی۔ بچوں اور والدین کے مابین تعلقات کی نوعیت بدل گئی۔ احترام کے نئے انداز اپنائے گئے۔ جونہی معاشی پیداوار کھیتوں سے فیکٹری میں منتقل ہوئی' اہل خاندان کا ایک اکائی کے طور پر کام کرنا ناممکن ہو گیا۔ فیکٹری میں مزدور کارندے مہیا کرنے کے لئے خاندان کے بنیادی کام نئے اور ہنر مند اداروں کو تفویض کر دیئے گئے۔ بچے کی تعلیم اسکول کے حوالے کر دی گئی۔ بوڑھوں کی دیکھ بھال دارالغرباء' بوڑھوں کے گھر یا نرسنگ ہوم جیسے اداروں کے سپرد ہوئی۔ بات یہ تھی کہ نئے معاشرے کو حرکت پذیری چاہئے تھی۔ اسے ایسے کارندوں کی ضرورت تھی جو کام کے سلسلے میں ایک جگہ سے دوسری جگہ آ جا سکیں۔

بوڑھے رشتہ داروں' بیماروں' معذوروں اور بچوں کی ایک لمبی چوڑی فوج کے بوجھ تلے دبی توسیع شدہ فیملی' کچھ بھی رہی ہو مگر وہ متحرک بالکل نہیں تھی۔ آہستہ آہستہ اور اذیت ناک انداز میں اسی وجہ سے خاندانی ڈھانچے میں تبدیلی آنا شروع ہوئی۔ کچھ تو شہروں کا رخ کرنے سے خاندان ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوئے اور کچھ معاشی بد حالی نے ان کا حلیہ بگاڑ دیا۔ اس طرح خاندانوں کو غیر ضروری رشتہ داروں سے چھٹکارا ملا۔ وہ حجم میں کہیں چھوٹے مگر زیادہ متحرک اور نئے تکنیکی دائرے کی ضرورتوں کے زیادہ مطابق ہو گئے۔

باپ' ماں اور چند بچوں پر مشتمل' نام ونہاد جوہری کنبہ۔۔۔۔ مزید رشتہ داروں کے بوجھ سے مبراء' ایک معیار بن گیا۔ تمام صنعتی معاشروں میں' خواہ وہ سوشلسٹ ہوں یا سرمایہ دارانہ' اسے سماجی طور پر ''جدید'' ماڈل کے طور پر تسلیم کر لیا گیا۔ جاپان میں بھی جہاں بزرگوں کو غیر معمولی اہمیت اور احترام دیا جاتا تھا' وسیع و عریض' باہم مربوط کثیر نسلی گھرانے۔۔۔۔ دوسری لہر کے پیش رفت کے ساتھ ساتھ۔۔۔۔ بکھرنے شروع ہو گئے۔ زیادہ سے زیادہ جوہری اکائیاں نمودار ہونے لگیں۔ قصہ مختصر' جوہری کنبہ' دوسری لہر کے تمام معاشروں کی خصوصی پہچان بن گیا' بالکل اسی طرح جیسے زیر زمین ایندھن کے ذخیرے' اسٹیل کے کارخانے یا مشہور سٹور کے جال اس لہر کی شناخت بنے۔

پوشیدہ نصاب تعلیم

کام جیسے ہی کھیتوں اور گھروں سے باہر منتقل ہوا' بچوں کو فیکٹری کے طور طریقے سے مانوس کرنے کا کام شروع ہو گیا۔ ابھرتے ہوئے صنعتی برطانیہ کی ابتدائی کانوں' ملوں اور فیکٹریوں کے مالکان نے۔۔۔۔ اینڈریو اور نے 1835ء میں لکھا۔۔۔۔ یہ سمجھ لیا تھا کہ نوجوانی کی عمر گزر جانے کے بعد' محنت کش چاہے وہ زرعی شعبے سے ہو یا دستکاری کے پیشے سے' فیکٹری کے لئے مفید کارندہ نہیں بن سکتا۔

اگر نوجوان افراد پہلے سے صنعتی نظام کے لئے تیار کیا جائے تو اس سے بعد میں صنعتی نظم و ضبط کے بہت سے مسائل با آسانی حل ہو جائیں گے۔''نتیجتاً'' وسیع پیمانے پر تعلیم کی صورت میں' دوسری لہر کے تمام معاشروں کو ایک اور مرکزی ڈھانچا میسر آ گیا۔

فیکٹری کے انداز و اطوار کی حامل' وسیع پیمانے پر تعلیم نے بنیادی پڑھائی' لکھائی' حساب کتاب' تھوڑی بہت تاریخ اور دوسرے مضامین سکھائے۔ یہ تھا ایک ''ظاہری نصاب'' لیکن اسکی تہہ میں کہیں زیادہ بنیادی اہمیت کا حامل' نظر نہ آنے والا یا ''پوشیدہ نصاب'' موجود تھا۔ ابتداء میں ہی نہیں بلکہ آج کی اکثر صنعتی قوموں میں بھی یہ کورس تین اجزاء پر مشتمل تھا۔ وقت کی پابندی' فرماں برداری' رٹا بازی یعنی متواتر ایک ہی کام کو بار بار دہرانا۔ فیکٹری لیبر کو عموماً اور خاص طور پر اسمبلی لائن کے کام میں' پابندی وقت کا مظاہرہ کرنے والے کارکن چاہئیں تھے۔ انتظامیہ کے احکامات کو بے چون و چرا تسلیم کر لینے والے کارندے مطلوب تھے' اسے ایسے مرد اور خواتین درکار تھے جو مشینوں کے ساتھ یا دفتروں میں انتہائی تابعداری سے' ظالمانہ حد تک بار بار دہرائے جانے والے افعال سرانجام دینے کے لئے تیار ہوں۔

چنانچہ انیسویں صدی کے وسط سے بعد ازاں' جیسے جیسے دوسری لہر مختلف ممالک کو اپنی لپیٹ میں لیتی گئی' انتہائی سنگدلانہ تعلیمی ارتقاء نظر آتا محسوس ہوا۔ بچے چھوٹی چھوٹی عمروں میں اسکول جانے لگے۔ تعلیمی سال طویل سے طویل تر ہونے لگے۔ (1878ء اور 1956ء کے درمیانی عرصے میں' امریکہ میں یہ تعلیمی عرصہ 35% تک بڑھ گیا) لازمی تعلیم کے سالوں کی تعداد' غیر معمولی حد تک بڑھا دی گئی۔

وسیع پیمانے کی عوامی تعلیم' واضح طور پر' ایک اہم انسانی پیش رفت تھی۔ 1829ء میں نیویارک شہر کے مکینوں اور کاریگروں کے ایک گروپ نے باقاعدہ اس کا اظہار کیا۔

MashalBooks.org

''زندگی اور آزادی کے بعد ہم تعلیم کو انسان کے لئے عظیم ترین نعمت سمجھتے ہیں۔'' درحقیقت' دوسری لہر کے تعلیمی اداروں نے نسل در نسل نوجوان افراد کو' مشینی انداز میں' ایک ایسی قابل استعمال اور منظّم مزدور طاقت میں تبدیل کر دیا جو الیکٹرو مکینیکل ٹیکنالوجی اور اسمبلی لائن کے لئے درکار تھی۔

جوہری کنبے اور فیکٹری سٹائل سکول نے یکجا ہو کر' صنعتی معاشرے میں نوجوان افراد کے کردار کی تیاری کے لئے ایک مکمل نظام تشکیل دے دیا۔ اس معاملے میں بھی دوسری لہر کے تمام معاشرے' خواہ وہ سرمایہ دارانہ تھے یا اشتراکی' شمالی تھے یا جنوبی' ایک ہی طرح کے تھے۔

لافانی وجود

دوسری لہر کے تمام معاشروں میں ایک تیسرا ادارہ ابھرا' جس نے پہلے دو اداروں کے سماجی کنٹرول کو وسعت دی۔ یہ وہ ایجاد تھی جسے کارپوریشن کا نام دیا گیا۔ اس وقت تک مثالی کاروباری ادارے کسی فرد' خاندان یا کچھ حصہ داروں کی ملکیت ہوتے تھے۔ کارپوریشن کا وجود تو تھا مگر نہ ہونے کے برابر' یہاں تک کہ امریکی انقلاب کے زمانے تک' بقول ایک کاروباری تاریخ دان آرتھر ڈیونگ' ''کوئی شخص بھی ہی نہیں سمجھ سکا تھا'' کہ کارپوریشن۔۔۔۔ پارٹنر شپ یا انفرادی ملکیت کی نسبت۔۔۔۔ مرکزی تنظیمی شکل اختیار کر لے گی۔ 1800ء تک پورے امریکہ میں صرف 335 کارپوریشنیں تھیں' ان میں سے اکثر نہریں بنانے اور محصول اکٹھا کرنے کی بظاہر عوامی سرگرمیوں کے لئے وقف تھیں۔

وسیع پیمانے کی پیداوار نے یہ سب بدل کر رکھ دیا۔ دوسری لہر کی ٹیکنالوجیز کو سرمائے کے اتنے بڑے ذخائر درکار تھے جن کا مہیا کرنا ایک اکیلے آدمی یا ایک چھوٹے سے گروہ کے بس سے باہر تھا۔ چونکہ مالکوں یا حصہ داروں کو ہر سرمایہ کاری کے لئے اپنا سب کچھ داؤ پر لگانا پڑتا' اس لئے وہ بڑے یا رسکی منصوبوں پر اپنی تمام رقم ڈبو دینے سے ہچکچاتے تھے ان کا حوصلہ بڑھانے کے لئے محدود ذمہ داری کا تصور متعارف کرایا گیا۔ اگر کارپوریشن تباہ ہو جاتی تو سرمایہ کار کو صرف اپنی اس رقم سے ہاتھ دھونے پڑتے جو اس نے کاروبار میں لگائی تھی اور بس۔ اس نئی اختراع نے سرمایہ کاری کے سیلاب کے سارے راستے کھول

MashalBooks.org

دیئے۔ اسی پر بس نہیں، عدالتوں نے کارپوریشن کو ایک ''لافانی وجود'' تسلیم کر لیا۔۔۔۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کارپوریشن اپنے اصلی سرمایہ کاروں کے بعد بھی اپنا وجود رکھ سکتی ہے۔ اس کے نتیجے میں یہ مفہوم پیدا ہوا کہ کارپوریشن طویل دورانئے کے منصوبے بنا سکتی ہے اور پہلے سے کہیں زیادہ بڑے پراجیکٹس اپنے ہاتھ میں لے سکتی ہے۔

1901ء تک دنیا کی پہلی بلین ڈالر کارپوریشن ۔۔۔۔ یونائیٹڈ اسٹیٹس سٹیل ۔۔۔۔ ناقابل تصور حد تک اثاثوں کے زبردست ذخیرے کے ساتھ منظر عام پر آئی۔ 1911ء تک اس طرح کے تقریباً آدھی درجن ادارے وجود میں آ گئے۔ درحقیقت تمام صنعتی اقوام میں، بشمول سوشلسٹ اور اشترا کی معاشروں کے، بڑی کارپوریشنیں معاشی زندگی کی ایک اندرونی خصوصیت بن گئیں۔ سوشلسٹ معاشروں میں ان کی شکل مختلف ضرور تھی مگر ان کی روح (ادارے/تنظیم کے معنوں میں) ہر جگہ ایک جیسی تھی۔ یہ تینوں ادارے۔۔۔۔ جوہری کنبہ، فیکٹری سٹائل سکول اور عظیم الجثہ کارپوریشن۔۔۔۔ یک جا ہو کر دوسری لہر کے تمام معاشروں کی پہچان کے سماجی ادارے بن گئے۔

اور دوسری لہر کی لپیٹ میں آئی دنیا میں ہر طرف۔۔۔۔ جاپان، سوئٹرز لینڈ، برطانیہ، پولینڈ، امریکہ اور سوویت یونین میں۔۔۔۔ زیادہ تر لوگ ایک معیاری زندگی کی مخفی قوتوں کی پیروی کرنے لگے۔ جوہری کنبے کی تشکیل کرنے لگے، باجماعت فیکٹری سٹائل سکول کی طرف چل پڑے اور پھر کسی نجی یا سرکاری کارپوریشن کی ملازمت میں چلے گئے۔ غرض زندگی کے ہر دور میں دوسری لہر کا کوئی نہ کوئی بنیادی ادارہ ان پر حاوی تھا۔

میوزک فیکٹری

ان تین مرکزی اداروں کے ارد گرد بہت ساری دوسری تنظیمیں نمودار ہو گئیں۔ حکومتی وزارتیں، سپورٹس کلب، چرچ، چیمبر آف کامرس، مزدور یونین، پیشہ ور تنظیمیں، سیاسی جماعتیں، لائبریریاں، مذہبی گروہ، تفریحی گروپس اور ایسے ہی ہزاروں دوسرے ادارے، دوسری لہر کے جلو میں کھٹ کھٹ کرتے منظر عام پر آ گئے اور انہوں نے ہر گروپ کا دوسرے گروپ یا ادارے کے لئے خدمات، روابط اور توازن کے سلسلے میں ایک پیچیدہ تنظیمی تعلق بھی پیدا کر دیا۔ پہلی نظر میں ان گروپوں کی ورائٹی خاصی اوٹ پٹانگ اور الجھن آمیز محسوس ہوتی

ہے لیکن قریبی مشاہدے سے' ان کا مخفی ڈیزائن آشکار ہو جاتا ہے' دوسری لہر کے ممالک میں یکے بعد دیگرے' فیکٹری کو پروڈکشن کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور مستعد ایجنسی سمجھنے والے سماجی موجدوں نے' اس کے اصولوں کو دوسرے اداروں میں بھی لاگو کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ سکولوں' ہسپتالوں' جیلوں' حکومتی نوکر شاہی اور دوسری کئی اداروں نے فیکٹری کی بہت سی خصوصیات کو اپنا لیا۔۔۔۔ مثلاً اس کی تقسیم محنت' اس کا مقدس ڈھانچا' اس کا آہنی اور غیر جذباتی تشخص وغیرہ۔

یہاں تک کہ فیکٹری کے بعض اصول ہمیں آرٹ میں بھی نظر آتے ہیں۔ ایک خاص پیٹرن کے لئے کام کرنے کی بجائے' جیسا کہ زرعی تہذیب کی طویل حکمرانی میں روایت رہی' موسیقاروں' فنکاروں' موسیقی کمپوزرز اور ادیبوں کو کھلی منڈی کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا اور وہ نا معلوم گاہک کے لئے زیادہ سے زیادہ ''پراڈکٹس (اشیاء) بنانے میں لگ گئے اور چونکہ یہ تبدیلی دوسری لہر کے ہر ملک میں رونما ہوئی اس لئے فنکارانہ پروڈکشن کا پورا ڈھانچا ہی بدل کر رہ گیا۔

موسیقی اس کی شاندار مثال مہیا کرتی ہے۔ دوسری لہر کی آمد کے ساتھ ہی لندن' وی آنا' پیرس اور دوسری جگہوں پر کنسرٹ ہال تعمیر ہونے لگے۔ ان کے ساتھ ہی باکس آفس اور تفریحی تنظیم۔۔۔۔ وہ تاجر جو پروڈکشن میں سرمایہ لگاتے تھے اور بعد ازاں ثقافتی صارفین کو ٹکٹ بیچتے تھے۔۔۔۔ کا تصور بھی آیا۔ تفریحی منتظم جتنے زیادہ ٹکٹ بیچ دیتا' ظاہر ہے اتنے ہی زیادہ اس کے پیسے بنتے۔ چنانچہ سیٹوں کی تعداد زیادہ سے زیادہ رکھی جانے لگی۔ زیادہ بڑے کنسرٹ ہالوں کو زیادہ اونچی ساؤنڈز۔۔۔۔ ایسا میوزک جو ہال کے آخری کونے میں بھی واضح طور پر سنا جا سکے' کی ضرورت پیش آ گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چیمبر میوزک کی جگہ کثیر آلاتی موسیقی کی کئی شکلیں وجود میں آ گئیں۔

کرٹ ساکس اپنی تحقیق ''تاریخ آلات موسیقی'' میں کہتا ہے۔ ''طبقہ امراء کی ثقافت سے جمہوری کلچر تک کے سفر نے اٹھرویں صدی میں چھوٹی چھوٹی بیٹھکوں کی جگہ بڑے سے بڑے وسیع کنسرٹ ہالوں کو دے دی' جہاں زیادہ گونجتی آواز کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس وقت تک چونکہ زیادہ گونج پیدا کرنے والی کوئی ٹیکنالوجی وجود میں نہیں آئی تھی۔

MashalBooks.org

اس لئے زیادہ سے زیادہ آلات اور سازندے اکٹھے کر کے آواز کا مطلوبہ حجم پیدا کیا گیا۔ نتیجتاً جدید کثیر آلاتی آرکسٹرا معرض وجود میں آیا اور اسی صنعتی ادارے کے ذریعے یہ ممکن ہوا کہ بیتھوون، مینڈل سون، شوبرٹ اور براہمز نے اپنی عظیم الشان کثیر آلاتی موسیقی تخلیق کی، آرکسٹرا ے اندرونی ڈھانچے میں تو فیکٹری کی بعض خصوصیات صاف نظر آتی ہیں۔ابتداء میں آرکسٹرا میں کوئی لیڈر نہیں ہوتا تھا یا قیادت مختلف سازندوں میں باری باری گھوما کرتی تھی۔ بعدازاں سازندے بعینہ فیکٹری کے یا نوکر شاہی کے دفتروں کے کارکنوں کی طرح مختلف محکموں، آلاتی سیکشن میں تقسیم کر دیئے گئے جن کا مجموعی پیداوار (موسیقی) میں اپنا اپنا حصہ ہوتا، ان میں رابطے رکھنے کے لئے ایک رہنما موجود ہوتا اور بالآخر انتظامی ڈھانچے کے تحت، باقاعدہ ایک وائلن ساز یا سیکشن کے لیڈر کو ان کے باہمی ربط کا کام سونپ دیا گیا۔ یہ ادارہ اپنی پراڈکٹ اچھی خاصی وسیع مارکیٹ میں بیچ دیتا اور آخر کار اس کی پیداوار میں فونو گراف ریکارڈ کے اضافے کے ساتھ ہی میوزک فیکٹری وجود میں آ گئی۔

آرکسٹرا کی تاریخ۔ دوسری لہر کے سماجی دائرے کے بمعہ اس کے تین بنیادی اداروں اور ہزار ہاقسم کی تنظیموں کی تشکیل سے متعلق صرف ایک توضیح پیش کرتی ہے۔

ان سب تنظیموں کو صنعتی تکنیکی دائرے کی ضروریات اور اسٹائل کے مطابق استعمال کیا گیا۔لیکن تہذیب بہر حال ایک تکنیکی دائرے اور اس کے مماثل سماجی دائرے سے کہیں زیادہ وسیع وعریض تناظر رکھتی ہے۔خبروں (اطلاعات) کی پیدائش اور ان کی تقسیم کے لئے، تمام تہذیبوں کو ایک ابلاغی دائرہ بھی چاہئے اور یہاں بھی، دوسری لہر کے جلو میں آنے والی تبدیلیاں بڑی اہمیت کی حامل تھیں۔

اخبار کی تہلکہ خیزی

ہر انسانی گروہ، ابتدائی دور سے آج تک انفرادی اور بالمشافہ رابطے پر تکیہ کرتا رہا ہے لیکن ہر دور میں زمانے اور مقام کے پار پیغامات پہنچانے کے سسٹم کی ضرورت تھی۔ ایرانیوں کے بارے میں کہا جاتا ہے انہوں نے مینار یا مقامات اذان تعمیر کر لئے تھے جن کی بلندی پر گونج دار اور اونچی آواز والے آدمی متعین ہوتے تھے تاکہ وہ اونچی آواز میں ایک مینار سے دوسرے مینار تک پیغامات پہنچا سکیں۔ رومنوں نے ''کرسس پبلکس'' کے نام سے

پیغام رسانی کا ایک وسیع جال بنا رکھا تھا۔1305ء سے اٹھارویں صدی کی ابتداء تک کے زمانے میں ٹیکس ہاؤس نے گھوڑ سوار پیغام رسانوں کی ایک سروس تشکیل دے رکھی تھی جو پورے یورپ پر محیط تھی۔1628ء تک اس کے ملازمین کی تعداد بیس ہزار کے قریب تھی۔ اس کے پیغام رساں نیلی اور نقرئی وردی میں ملبوس۔۔۔ شاہوں' جرنیلوں' تاجروں اور قرض دینے والوں کے پیغامات لئے' پورے یورپ میں چلتے پھرتے نظر آتے۔

پہلی لہر کی تہذیب کے دوران اس طرح کے راستے صرف امراء اور اہل اقتدار کے لئے کھلے تھے۔ عام لوگوں کی' ان ذرائع تک کوئی رسائی نہیں تھی۔ لورین زیعاکس کا کہنا ہے کہ ''دوسرے ذریعوں سے خطوط بھیجنے کی کوشش کو شبہ کی نظر سے دیکھا جاتا تھا یا۔۔۔ حکمرانوں کی جانب سے ان پر مکمل پابندی تھی۔'' مختصراً' بالمشافہ رابطوں اور خبروں کے باہمی تبادلے کا راستہ سب کے لئے کھلا تھا لیکن ایک خاندان یا گاؤں کی حدود سے باہر پیغام رسانی کے لئے نئے سسٹم کے استعمال کی ممانعت تھی اور اسے صرف سماجی اور سیاسی کنٹرول کے مقاصد کے لئے ہی استعمال کیا جاتا تھا۔ اس لئے یہ طریقے اشرافیہ کے ہاتھ میں موجود بہت موثر ہتھیار تھے۔

دوسری لہر' یکے بعد دیگرے جن جن ملکوں میں پھیلتی گئی وہاں وہاں اس نے پیغام رسانی کے اس اجارہ دارانہ نظام کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ اس کی وجہ قطعاً نہیں تھی کہ اہل طاقت و ثروت اچانک ہی بڑے رحم دل اور فیاض ہو گئے بلکہ دوسری لہر کی ٹیکنالوجی اور فیکٹری کی وسیع پروڈکشن کو اسی وسیع پیمانے پر متحرک پیغام رسانی کی ضرورت محسوس ہوئی' جس کا پورا کرنا پرانے ذرائع کے بس سے باہر تھا۔

ابتدائی اور پہلی لہر کے معاشروں میں' معاشی پیداوار کے لئے مطلوبہ اطلاعات نسبتاً آسان تھیں اور قرب و جوار میں ہی دستیاب ہوتی تھیں۔ یہ عموماً زبانی یا اشاراتی شکل میں ہوتی تھیں۔ دوسری لہر کی معیشتوں کو' اس کے برعکس' مختلف مقامات پر ہونے والے کام کے مابین زبردست ربط کی ضرورت پڑی۔ انہیں صرف خام مال ہی نہیں بلکہ بہت ساری اطلاعات تیار کرنا اور انکی محتاط تقسیم کا کام بھی سرانجام دینا ہوتا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ جیسے ہی مختلف ملکوں میں دوسری لہر نے زور پکڑا تو سبھی ملکوں میں

MashalBooks.org

ڈاک سروس کے قیام کے لئے ایک دوڑ سی لگ گئی۔ پوسٹ آفس ایک تصوراتی ایجاد تھی۔ یہ بات آج ذہنوں سے اتر گئی ہے مگر اس کی ابتداء نے عجیب مجنونانہ جوش وخروش کا احساس بھی یقیناً دیا تھا۔ ایک امریکی خطیب ایڈورڈ ایورٹ نے واشگاف الفاظ میں کہا۔''میں پوسٹ آفس کے آغاز کو' عیسائیت کے بعد کا درجہ دینے پر مجبور ہوں کیونکہ یہ ہماری جدید تہذیب کا دایاں بازو ہے۔''

وجہ یہ تھی کہ پوسٹ آفس نے صنعتی دور کے روابط کے لئے پہلا کھلا اور وسیع چینل مہیا کر دیا۔1837ء تک برطانوی پوسٹ آفس' اشرافیہ کی پیغام رسانی کے ساتھ ساتھ' تقریباً 88 ملین خطوط سالانہ۔۔۔۔اس وقت کے حساب سے رابطوں کا برفانی طوفان' کی ترسیل بھی کر رہا تھا۔1960ء کی دہائی میں جب صنعتی دور اپنے عروج پر تھا اور تیسری لہر کا بہاؤ شروع ہوا تو یہ تعداد دس بلین سے بھی بڑھ چکی تھی۔ اسی سال امریکی پوسٹ آفس قوم کے ہر مرد' عورت اور بچے کے لئے اندرونی ڈاک کے 335 خطوط تقسیم کر رہا تھا۔

صنعتی انقلاب کے جلو میں موجود ڈاک پیغام کی طغیانی دوسری لہر کے نتیجے میں پیدا شدہ اطلاعات کے حقیقی حجم کے بہاؤ کی طرف محض ایک اشارہ ہے۔ لگ بھگ اتنی ہی بڑی تعداد میں بڑی بڑی تنظیموں کے اندرونی پیغام رسانی کے نظاموں کے تحت پیغامات کی ترسیل ہونے لگی۔ میموز وہ خطوط ہیں جو کبھی عوامی ''رابطوں کے چینلز'' تک نہیں پہنچتے۔ 1955ء میں جب دوسری لہر امریکہ میں بام عروج پر تھی' تین بڑی کارپوریشنوں میں سے ہودر کارپوریشن فائل کے انبار لگانے میں سب سے آگے تھی۔ پتہ یہ چلا کہ ان تینوں اداروں میں انکے ہر تنخواہ دار ملازم کی بالترتیب چونتیس ہزار' چھپن ہزار اور چونسٹھ ہزار ڈاکومنٹس اور میموز فائل میں موجود تھے۔صنعتی معاشروں کے بے مہابا اطلاعاتی ضرورتوں کو صرف تحریر کے ذریعے پورا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ رابطوں کے مسلسل بڑھتے ہوئے بوجھ کو ہلکا کرنے کے لئے انیسویں صدی میں ٹیلی فون اور ٹیلی گراف ایجاد کر لئے گئے۔1960ء کے زمانے میں امریکی روزانہ 256 ملین فون کالیں۔۔۔۔تقریباً 93 بلین کالیں سالانہ کر رہے تھے اور دنیا کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ ٹیلیفون سسٹم اور نیٹ ورک پر عموماً انکے حجم سے کہیں زیادہ بوجھ ہوتا تھا۔ ان نظاموں کے ذریعے بیک وقت پیغام رساں اور وصول کنندہ پیغامات بھیج سکتے

MashalBooks.org

اور وصول کر سکتے تھے لیکن ایک ایسے معاشرے کو۔۔۔ وسیع پیمانے کی پیغام رسانی کے راستے بھی مطلوب تھے۔۔۔ ایسے ذرائع ابلاغ، جن کے ذریعے ایک آدمی بیک وقت بہت سے لوگوں کو پیغام دے سکے۔ قبل از صنعتی دور میں مالک، بوقت ضرورت، اپنے ملازموں میں سے کسی کے بھی گھر جا کر، ذاتی طور پر مل سکتا تھا لیکن صنعتی آجر کے لئے اپنے ہزاروں کارکنوں سے فرداً ذاتی رابطہ رکھنا ممکن ہی نہیں تھا۔ تاہم بڑے تاجر یا تقسیم کار کے لئے اپنے گاہکوں سے کسی حد تک رابطہ ممکن تھا۔ دوسری لہر کے معاشرے نے۔۔۔ ایک ہی پیغام کو دوسرے بہت سے لوگوں تک پہنچانے کے، فوری، ارزاں، تیز رفتار اور قابل اعتبار۔۔۔ طاقتور ذرائع کی ایجاد اچانک ہی نہیں کر لی۔ یہ ذرائع اس کی حقیقی ضرورت تھے۔ ڈاک خانے کے ذریعے ایک ہی پیغام لاکھوں لوگوں تک بھیجا جا سکتا تھا مگر اس میں تیز رفتاری نہیں تھی۔ ٹیلیفون کے ذریعے پیغامات برقی رفتاری سے پہنچ سکتے تھے لیکن لاکھوں لوگوں تک بیک وقت، اسکے ذریعے ترسیل ناممکن تھی۔ اس خلا کو وسیع ذرائع ابلاغ (میڈیا) سے پر کیا گیا۔

آج بلاشبہ وسیع اشاعت والے اخبارات اور رسالے، ہر صنعتی معاشرے میں، روز مرہ زندگی کا عمومی معمول بن چکے ہیں۔ بہر طور ان مطبوعات کے قومی سطح پر پھیلاؤ کے ذریعے، بہت سی نئی صنعتی ٹیکنالوجیز اور معاشرتی اشکال کی مخصوص پیش رفت منعکس ہوئی۔ چنانچہ جین لوئی سرون شرائبر لکھتا ہے کہ کئی چیزوں کے بیک وقت یکجا ہونے سے یہ ممکن ہو سکا۔

۔۔۔''یورپ کے سائز کے برابر وسیع ملک میں، مطبوعات کی ٹرانسپورٹ، ایک ہی دن کے اندر ممکن بنانے کے لئے ریل گاڑیاں، ایسے پرنٹنگ پریس جو لاکھوں کروڑوں کاپیاں چند گھنٹوں میں چھاپ سکتے ہوں۔ تار اور ٹیلیفون کا ایک صحیح نیٹ ورک۔۔۔ اور سب سے بڑھ کر، انہیں پڑھنے والے تعلیم یافتہ عوام اور اپنی اشیاء کی وسیع پیمانے پر ڈسٹری بیوشن کی خواہش مند صنعتیں۔''

ماس میڈیا میں۔۔۔ اخبارات اور ریڈیو سے لے کر فلموں اور ٹیلی ویژن تک، ہمیں ایک بار پھر فیکٹری کے بنیادی اصولوں کی تجسیم کارفرما نظر آتی ہے۔ یہ سبھی ایک جیسے

MashalBooks.org

پیغامات لاکھوں ذہنوں تک پہنچاتے ہیں' بالکل کسی فیکٹری کی طرح۔ لاکھوں گھروں میں استعمال کے لئے ایک جیسی اشیاء تیار کی جاتی ہیں۔مخصوص معیار کے ساتھ وسیع پیمانے پر تیار کئے گئے ''حقائق'' دراصل مخصوص معیار کی' وسیع پیمانے پر تیار کی گئی اشیاء ہی کی طرح ہیں جو چند ایک مرتکز تصور فیکٹریوں سے تیار ہو کر لاکھوں صارفین تک پہنچتے ہیں۔ذرائع اطلاعات کے اتنے وسیع اور طاقتور سسٹم کے بغیر'صنعتی معاشروں' سرمایہ دارانہ یا سوشلسٹ دونوں میں' یکساں طور پر ایک واضح دائرہ ابلاغ۔۔۔۔ایسے ذرائع ابلاغ' جن کے ذریعے انفرادی اور اجتماعی پیغامات' اشیاء یا خام مال ہی کی طرح' انتہائی مستعدی سے تقسیم کئے جا سکتے تھے۔۔۔۔ابھر کر سامنے آیا۔اس دائرہ ابلاغ نے تکنیکی دائرے اور سماجی دائرے کے ساتھ یک جان ہو کر'معاشی پیداوار اور نجی رویوں کو مجتمع کرنے میں مدد کر کے اہم خدمات انجام دیں۔

ان سب سے ہر دائرے نے ایک وسیع نظام میں بنیادی کردار ادا کیا اور حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بھی دائرہ دوسرے دائروں کے بغیر اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتا تھا۔تکنیکی دائرے نے پیدائش دولت اور اس کی تخصیص کی سماجی دائرے نے' اپنے ہزارہا متعلقہ اداروں کے ساتھ' سسٹم میں افراد کے کردار کا تعین کیا اور دائرہ ابلاغ نے تمام سسٹم کو فعال بنانے کے لئے ضروری اطلاعات کا تعین کیا۔ اس طرح مشترکہ طور پر ان سب نے معاشرے کا بنیادی ڈھانچا تشکیل دیا۔ چنانچہ دوسری لہر کی تمام اقوام کے عمومی ڈھانچے کا خاکہ۔۔۔۔ بلاامتیاز انکے ثقافتی یا موسمی اختلافات کے' بلاتفریق انکے مذہبی یا نسلی ورثے کے اور اسا سے بھی قطع نظر کہ وہ خود کو سرمایہ دار کہلاتے ہیں یا اشتراکی۔۔۔۔ہمیں ملتا جلتا ہی نظر آتا ہے۔

یہی متوازی ڈھانچے یکساں طور پر سوویت یونین' ہنگری' مغربی جرمنی' فرانس اور کینیڈا میں کارفرما نظر آئے۔ ان میں مناسب حد تک سیاسی' سماجی اور ثقافتی اختلافات کا رنگ بھی نمایاں تھا۔ پہلی لہر کے پرانے ڈھانچے کے محافظوں اور ماضی کے تمام دردناک مسائل کا حل نئی تہذیب میں ڈھونڈنے والوں کے درمیان زبردست اور تندوتیز سیاسی' ثقافتی اور معاشی جنگوں کے بعد' ہر جگہ ان ڈھانچوں نے جنم لیا۔

دوسری لہراپنے دامن میں وسیع انسانی امیدیں اکٹھی کیئے آئی۔ پہلی دفعہ مردوں اورعورتوں نے یہ یقین کرنے کی جرات کی کہ غربت، بھوک، بیماری اورظلم کوختم کیا جا سکتا ہے۔ مثالیت اورتصور پرست مصنفین اور فلاسفروں۔۔۔۔ ایسے مورلے اور رابرٹ اوون سے سینٹ سائمن، فوریئر، پرودھان، لوئیس بلانک، ایڈورڈ بیلامے اور بہت سے دوسرے۔۔۔۔کو ابھرتی ہوئی صنعتی تہذیب میں وہ قوت جھلکتی نظر آئی جو ایک طرف امن، توازن، سب کے لئے روزگار، دولت کی یا مواقع کی منصفانہ تقسیم فراہم کر سکتی تھی تو دوسری طرف پیدائش کی بنیاد پرخصوصی استحقاق کا خاتمہ اور ان تمام حالات کا مکمل خاتمہ، جو ابتدائی انسانی زندگی کے ہزاروں لاکھوں سال تک غیر متبدل اور زرعی تہذیب کے ہزاروں برس میں بھی لافانی محسوس ہوتے رہے۔

اگر آج ہمیں یہ صنعتی تہذیب، ہماری تصوراتی دنیا سے کم تر لگتی ہے۔ اگر یہ ہمیں حقیقت میں جابرانہ، بے کیف، غیر معین اور مبہم، جنگ جو اور نفسیاتی طور پر متشدد لگتی ہے تو۔۔۔۔ہمیں یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ ایسا کیوں ہے۔ ہم اس سوال کا جواب صرف اسی صورت میں دینے کے قابل ہو سکتے ہیں جب ہم اس عظیم الشان کٹاؤ پر نظر ڈال لیں جس نے دوسری لہر کی نفسیات کو دو متصادم حصوں میں تقسیم کر دیا۔

غیر محسوس کٹاؤ

دوسری لہر نے، کسی جوہری ردعمل کے تسلسل کی طرح ہماری زندگی کو، جو اس سے پہلے غیر منقسم تھی، بری طرح دوھصوں میں تقسیم کر دیا، اس کے نتیجے میں، اس نے ایک عظیم غیر محسوس کٹاؤ ہماری معیشت میں، ہماری نفسیات میں اور یہاں تک ہماری جنسی زندگی میں بھی داخل کر دیا۔ ایک سطح پر، صنعتی انقلاب نے حیرت انگیز حد تک ایسا مجتمع معاشرتی نظام تخلیق کیا جس کی اپنی واضح ٹیکنالوجیز تھیں، معاشرتی ادارے تھے اور ذرائع اطلاعات تھے۔۔۔۔ اور وہ سب کے سب پوری قوت سے باہم منسلک تھے، لیکن ایک اور سطح پر، اس نے زندگی کے رہن سہن میں معاشی اضطراب، سماجی مزاحمت اور نفسیاتی ابتری پیدا کر کے معاشرے کے اندرونی اتحاد کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔

دوسری لہر کے دوران اس غیر محسوس کٹاؤ نے ہماری زندگی میں کیا تراش خراش

کی؟ ۔۔۔۔ اسے سمجھ لینے کے بعد ہی ہم اس تیسری لہر کے جامع اثرات کی قدر کر سکتے ہیں جو آج ہماری تشکیل نو کا آغاز کر رہی ہے۔

دوسری لہر نے انسانی زندگی کو جن دو حصوں میں منقسم کر دیا' وہ تھے پیداوار اور اصراف۔ مثال کے طور پر ہم روایتاً خود کو اشیاء بنانے والے یا اشیاء صرف کرنے والے سمجھتے ہیں۔ یہ ہمیشہ سے سچ نہیں تھا۔ صنعتی انقلاب سے پہلے خوراک' اشیاء اور خدمات ۔۔۔۔ جو بھی انسان پیدا کرتا تھا ۔۔۔۔ کا زیادہ تر حصہ پیدا کرنے والے' ان کے خاندان یا قدر زائد کو اپنے استعمال کے لئے ہڑپ کرنے والی اشرافیہ ۔۔۔۔ خود ہی صرف کر لیتے تھے۔

زیادہ تر زرعی معاشروں میں لوگوں کی بہت بڑی اکثریت ان کسانوں کی تھی جو چھوٹے چھوٹے اور نیم تنہا قبیلوں کی صورت میں منتشر زندگی گزارتے تھے۔ ناکافی خوراک پر ان کا گزارہ تھا۔ وہ اتنا ہی غلہ پیدا کرتے تھے جو ان کے زندہ رہنے اور انکے آقاؤں کی خوشنودی کے لئے کافی ہوتا' خوراک کو طویل عرصہ تک ذخیرہ کرنے کے ذرائع کی کمیابی' دور دراز تک اپنی اشیاء کی نقل و حمل کے لئے سڑکوں کی غیر موجودگی اور اس حقیقت سے آگہی کہ پیداوار میں کوئی بھی اضافہ' غلاموں کا مالک یا جاگیردار صبط کر لے گا ۔۔۔۔ کی بناء پر' ان میں ٹیکنالوجی کو بہتر کرنے یا پیداوار میں اضافہ کرنے کی کسی بڑی تحریک کی صلاحیت ہی نہیں تھی۔ تجارت کا البتہ وجود تھا۔ ہمیں پتہ ہے کہ چند ایک نڈر اور منچلے تاجر اونٹوں' بیل گاڑیوں اور کشتیوں کے ذریعے اشیاء ہزاروں میل تک لے جایا کرتے تھے۔ شہر بننے شروع ہوئے تو خوراک کے معاملے میں ان کا انحصار دیہاتوں پر تھا۔ 1519ء میں جب ہسپانوی میکسیکو آئے تو انہوں نے ٹلاٹیلولکو میں ہزاروں انسانوں کو مرتیوں' قیمتی دھاتوں' غلاموں' سنڈلز' کپڑے' چاکلیٹ' رسیوں' مرغوں' سبزیوں' خرگوشوں' کتوں اور ہزارہا اقسام کے مٹی کے برتن کی خرید و فروخت میں مصروف پایا۔ ہسپانوی حیرت زدہ رہ گئے۔ ''دی فگر نیوز لیٹر'' کے پرائیویٹ خطوط ۔۔۔۔ جو سولہویں اور سترھویں صدی میں جرمن بینکاروں کے لئے تیار کئے گئے تھے ۔۔۔۔ اس وقت کی تجارت کے اسکوپ کی شاندار عکاسی کرتے ہیں کوچین (ہندوستان) سے ایک خط' ایک یورپی تاجر کی جدوجہد کا بڑی تفصیل سے ذکر کرتا ہے جو سیاہ مرچیں خرید کر یورپ لے جانے کے لئے پانچ بحری جہاز لایا تھا۔ ''مرچوں کا اسٹور ایک

شاندار کاروبار ہے' وہ وضاحت کرتا ہے'' لیکن اس کے لئے زبردست حوصلے اور احتیاط روی کی ضرورت ہے۔ اسی تاجر نے لونگیں' جائفل' آٹا' دارچینی' جاوتری اور دیگر جڑی بوٹیاں بھی سمندری راستے سے یورپ بھیجیں۔

یہ بات ہے کہ پیداوار کا زیادہ تر حصہ' زرعی غلام اور کسان اپنے فوری ذاتی استعمال میں لے آتے تھے اور یہ ساری تجارت' اسکے مقابلے میں' بہت ہی معمولی نوعیت کی تھی۔ یہاں تک کہ سترھویں صدی میں بھی۔۔۔۔ اس دور کے عظیم تاریخی محقق' فرینڈ براوؤڈل کے مطابق۔۔۔۔ فرانس اور سپین سے ترکی تک' بحیرہ روم کا وسیع وعریض علاقہ 60 سے 70 ملین آبادی کی ضروریات پوری کرتا تھا۔ اس آبادی کا 90% حصہ ساحلوں کے ساتھ ساتھ آباد تھا اور یہ لوگ تجارت کے لئے اشیاء کی معمولی مقدار تیار کرتے تھے۔ براڈل لکھتا ہے'' بحیرہ روم کی 60% سے 70% پیداوار کبھی منڈی کی معیشت میں داخل ہی نہیں ہوئی۔'' اور اگر بحیرہ روم کے علاقے کا یہ حال تھا تو شمالی یورپ کے متعلق کیااندازہ لگایا جائے' جہاں کی پتھریلی زمین اور برفیلے موسم کی وجہ سے' فالتو پیداوار کا حصول' کسانوں کے لئے کہیں زیادہ دشوار اور مشکل تھا۔

صنعتی انقلاب سے پہلے' دو شعبوں پر مشتمل' پہلی لہر کی معیشت سے مناسب آگاہی' ہمیں تیسری لہر کو سمجھنے میں صحیح مدد دے سکتی ہے۔ ایک شعبے میں لوگ اپنے ذاتی استعمال کی اشیاء پیدا کرتے تھے اور دوسرے شعبے میں لوگ اشیاء تجارت یا تبادلے کی غرض سے تیار کرتے تھے۔ پہلا شعبہ بہت بڑا تھا اور دوسرا نہ ہونے کے برابر۔ اسی لئے اکثر لوگوں کے لئے پیداوار اور صرف کے دونوں عوامل زندگی کے رہن سہن میں بری طرح گڈمڈ تھے۔ یہ اکائی اتنی مکمل تھی کہ یونانی' رومن اور وسطی دور کے یورپی باشندے ان دونوں کے درمیان تفریق نہیں کر پاتے تھے۔ ان کے پاس تو صارف کے مفہوم کا کوئی لفظ بھی نہیں تھا۔ پہلی لہر کے تمام عرصے میں آبادی کے ایک بہت معمولی حصے کا منڈی پر انحصار تھا' زیادہ تر لوگوں کی زندگی میں منڈی کا کوئی تصور ہی نہیں تھا۔ تاریخ دان آر۔ایچ۔ٹانی کے الفاظ میں'' قدرتی معیشت کی دنیا میں مالی لین دین کی وقعت ہی نہیں تھی۔''

دوسری لہر نے صورت حال کو بری طرح تبدیل کر دیا۔ مکمل خودکفیل افراد اور

Mashalbooks.org

برادریوں کے بجائے' اس نے تاریخ میں پہلی بار ایسی صورت حال پیدا کر دی جس میں ہر طرح کے خوراک' اشیاء اور خدمات کے بے تحاشا ذخیرہ فروخت' بارٹر اور تبادلے کے لئے موجود تھا' اس نے چیزوں کے ذاتی استعمال کا تصور حقیقتاً ختم کر کے رکھ دیا اور ایک ایسی تہذیب کو جنم دیا جس میں کوئی بھی شخص یہاں تک کہ کسان بھی' خود کفیل نہیں رہ سکا۔ خوراک' اشیاء اور خدمات کے سلسلے میں غرض ہر شخص کسی اور شخص کا محتاج ہو کر رہ گیا۔

مختصراً' صنعتی راج نے پیداوار اور صرف کا اکٹھ توڑ ڈالا اور صانع اور صارف کو علیحدہ علیحدہ کر دجیا۔ پہلی لہر کی مجتمع معیشت' دوسری لہر کی منقسم معیشت میں تبدیل ہو گئی۔

مارکیٹ کا مطلب

اس بنیاد تقسیم کے نتائج بہت اہم تھے۔ اب بھی ہم انہیں بمشکل ہی سمجھ پاتے ہیں۔ سب سے پہلے مارکیٹ کا مقام۔۔۔ جو کبھی بالکل معمولی اور سطحی قسم کا تھا۔۔۔ زندگی کا انتہائی جاذب نظر محور بن گیا۔ معیشت مارکیٹ کی بنیاد پر استوار ہو گئی اور ایسا سرمایہ دارانہ اور سوشلسٹ' دونوں ہی صنعتی معیشتوں میں وقوع پذیر ہوا۔

مغربی معیشت دان مارکیٹ کے متعلق سوچتے ہوئے اسے خالصتاً زندگی کی سرمایہ دارانہ حقیقت سمجھتے ہیں اور عموماً اس اصطلاح کو ''منافع کی معیشت'' کے مترادف کے طور پر استعمال کرتے ہیں' حالانکہ تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ تبادلہ۔۔۔ اور اسی کے ساتھ مارکیٹ بھی۔۔۔ کا نظام منافع کے تصور سے کہیں پہلے اور اس کے بغیر وجود میں آ چکا تھا۔ مارکیٹ' اپنے حقیقی معنوں میں تبادلے کے ایک نیٹ ورک سے زیادہ کچھ نہیں۔ یہ ایک ایسا سوئچ بورڈ ہے اور ہمیشہ رہا ہے جس کے ذریعے اشیاء یا خدمات' پیغامات کی طرح اپنے موزوں مقامات تک پہنچ جاتی ہیں۔ یہ قدرتی طور پر سرمایہ دارانہ نہیں ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں' مصنف یا مصور صرف پیسے کے لئے لکھتا یا رنگ بکھیرتا ہے۔ بالکل اسی طرح پولش' چیک یا سوویت ناول نگار' مصور یا ڈرامہ رائٹر بنگلے' بونس' نئی کار یا کمیاب اور نادر اشیاء جیسی معاشی سہولتوں کے حصول کی خاطر اپنی تخلیقی آزادی بیچ دیتا ہے۔

یہ بدعنوانی پیداوار کی صرف سے علیحدگی میں' جبلی طور پر' مضمر ہے۔ صارف اور صانع کو دوبارہ جوڑنے کے لئے' اشیاء کو صانع سے صارف تک پہنچانے کے لئے' مارکیٹ

کنٹرولرز کا تقرر کرتی ہے۔۔۔۔قطع نظر اس کے کہ وہ ان اختیارات یا طاقت کو جائز ثابت کرنے کے لئے کتنا مبالغہ کر سکتے ہیں۔

پیداوار کے صرف سے اس علیحدگی نے۔۔۔۔ جو تمام صنعتی یا دوسری لہر کے معاشروں کی واضح خصوصیت بن گئی۔۔۔۔شخصیت کے بارے میں ہماری نفسیات اور ہمارے مفروضوں تک کو متاثر کیا۔ رویئے کو لین دین کے ترازو میں تولا گیا۔ دوستی، رشتہ داری، قبائلی یا جاگیردارانہ وفا اور جان نثاری کی بنیاد پر استوار معاشرے کے بجائے، دوسری لہر کے دور میں حقیقی یا عقلی معاہدوں کی جکڑ بندیوں پر مبنی تہذیب ظہور پذیر ہوئی۔اب تو میاں بیوی بھی شادی کے معاہدوں کے بات کرتے ہیں۔

ان دونوں کرداروں۔۔۔۔صارف اور صانع، کے درمیان رکھنے نے بیک وقت ایک دوہری شخصیت کو جنم دیا۔ایک شخص کو (صانع کی حیثیت میں) خاندان، اسکول اور باس کی جانب سے عدم اطمینان، نظم وضبط، ارتکاز، اعتدال، فرماں برداری اور اشتراک عمل کا سبق دیا گیا جبکہ اسی شخص کو (صارف کے طور پر) بیک وقت فوری تسکین، جمع تفریق کرنے کی بجائے لذت پسندی، نظم وضبط سے لاپرواہی اور انفرادی خوشیوں کی تکمیل، غرضیکہ ایک بالکل ہی مختلف انسان بننے کی تعلیم دی گئی۔

مغرب میں، خاص طور سے، ایڈورٹائزنگ کی تمام قوت کو بھرپور تربیت دی گئی کہ وہ ہر صارف کو، رقم بعد میں ادا کریں، جیسے محرکات کے ذریعے خریداری پر مجبور کریں اور اس عمل کے ذریعے، معیشت کے پہیوں کو متحرک رکھ کر قومی خدمت سرانجام دیں۔

جنسی شکست وریخت

بالآخر اسی عظیم کٹاؤ نے۔۔۔۔جس نے دوسری لہر کے معاشروں میں صانع کو صارف سے جدا کر دیا تھا۔۔۔۔کام بھی حصوں میں تقسیم کر ڈالا۔ انفرادی حیثیت میں، اس نے گھریلو رہن سہن، جنسی رویوں اور ہماری داخلی زندگیوں پر گہرا اثر ڈالا۔

صنعتی معاشرے میں سب سے زیادہ عمومی اور غیر متغیر جنسی معاملات میں مرد کو فعال اور عورت کو منفعل دا خلیت پسند سمجھا جاتا ہے۔ اگر اس میں سچ کا ذرا سا بھی شائبہ موجود ہے تو اس کی وجہ سے غالباً متعین حیاتیاتی حقیقت کی بجائے، غیر محسوس کٹاؤ کے نفسیاتی

MashalBooks.org

اثرات میں پنہاں ہے۔ پہلی لہر کے معاشروں میں زیادہ تر کام کھیتوں یا گھروں میں انجام پاتا تھا۔ تمام اہل خانہ مل کرُ ایک معاشی اکائی کی طرح' محنت ومشقت کرتے تھے اور پیداوار کا زیادہ تر حصہ گاؤں یا علاقے ہی میں صرف کر دیا جاتا تھا۔ عملی زندگی اور گھریلو زندگی باہم جڑی ہوئی اور غیر منقسم تھی اور چونکہ ہر گاؤں بڑی حد تک خود کفیل تھا اس لئے ایک جگہ کسانوں کی کامیابی کا اس بات سے کوئی سروکار نہ تھا کہ دوسری جگہ کیا واقعات ہو رہے ہیں۔ یہاں تک کہ پیداواری یونٹ کے اندر بھی اکثر کارکن مختلف طرح کے کام سرانجام دیتے تھے۔ کاموں میں یہ ادل بدل موسمی حالات' کسی کی بیماری یا ذاتی مرضی کی وجہ سے چلتا رہتا تھا۔ صنعتی دور سے پہلے کی تقسیم کار بہت ہی دقیانوسی تھی۔ چنانچہ پہلی لہر کے زرعی معاشروں میں کام' نچلی سطحوں پر باہمی انحصار سے متصف تھا۔

دوسری لہر کے بہاؤ نے' برطانیہ' فرانس' جرمنی اور دوسرے ممالک کو اپنی لپیٹ میں لیا تو کام کھیت اور گھر سے نکل کر فیکٹری میں منتقل ہو گیا۔ اس نے کہیں اونچے پیمانے پر باہمی انحصار کا تصور متعارف کرایا۔ اب کام کو مجتمع کوششوں' تقسیم محنت' رابطہ اور بہت سی مختلف طرح کی فنی صلاحیتوں کی ضرورت تھی۔ اس کی کامیابی کا تمام تر انحصار۔۔۔ دور دراز پھیلے ہوئے ہزاروں افراد' جن میں سے اکثر نے کبھی ایک دوسرے کو دیکھا بھی نہیں تھا۔۔۔ کے ممد و معاون رویوں کی محتاط شیڈیولنگ پر تھا۔ بعض مخصوص حالات میں' ایک بڑی سٹیل مل یا گلاس فیکٹری کی ایک آٹو پلانٹ کو مطلوبہ اشیاء کی فراہمی میں ناکامی کے اثرات تمام صنعت یا علاقائی معیشت میں محسوس ہوتے ہیں۔

نچلی اور بالائی سطح کے باہمی انحصار کے کام نے ذمہ داریوں اور معاوضے کے معاملے میں شدید تنازعات پیدا کر دیئے۔ ابتدائی زمانے کے فیکٹری مالکان' مثال کے طور پر' اپنے ملازمین کی غیر ذمہ داری کی شکایت کرتے تھے۔۔۔ کہ انہیں فیکٹری کی استعداد کار کی کوئی پروانہیں یا یہ کہ وہ ضرورت کے وقت غائب ہو جاتے ہیں' گھوڑ دوڑ میں لگ جاتے یا نشے میں دھت نظر آتے ہیں۔ دراصل شروع کے صنعتی مزدور دیہاتی لوگ تھے جو نچلی سطح کے باہمی انحصار کے عادی تھے اور انہیں مکمل پیداواری عمل میں اپنے کردار یا انکی غیر ذمہ داری کی وجہ سے نقصانات' برویک ڈاؤن اور غلط کارکردگی کے بارے میں سرے سے کوئی

آ گہی تھی ہی نہیں اور چونکہ انکی مزدوری قابل رحم حد تک کم تھی اس لئے بھی ان میں محتاط روی کا کوئی محرک نہیں تھا۔

کام کے ان دونوں نظاموں کی باہمی کشمکش میں' کام کے نئے انداز فتح یاب نظر آئے۔ زیادہ پیداوار فیکٹری اور دفتر میں منتقل کر دی گئی۔ لوگ دیہاتی علاقے سے نکلنے لگے۔ لاکھوں کارکن' اعلی سطح کے باہم دست نگر' نیٹ ورک کے جزوی بن گئے۔ دوسری لہر کا کام پہلی لہر سے منسلک پرانی دقیانوسی شکل پر مکمل غالب آ گیا۔

خود کفالت پر انحصار باہمی کی یہ فتح' بہر حال ادھوری رہی۔ ایک جگہ کام کا پرانا ڈھنگ انتہائی ڈھٹائی سے جاری رہا اور یہ جگہ تھی گھر۔

ہر گھر' ایک غیر مرتکز اکائی کی حیثیت میں' حیاتیاتی پیدائش' بچوں کی پرورش اور ثقافتی تسلسل کے عمل میں مصروف رہا۔ اگر ایک گھرانہ افزائش نسل میں ناکام رہتا یا اپنے بچوں کی پرورش یا ان کی عملی زندگی کے لئے مناسب تربیت نہ کر پاتا تو اس کی ان ناکامیوں کی وجہ سے پڑوسی گھرانے کے معمولات کسی خطرے سے دو چار نہیں ہوتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں گھریلو کام کاج معمولی سطح کی انحصار باہمی کی سرگرمی رہا۔ گھریلو عورتیں' ہمیشہ کی طرح بہت سے اہم معاشی فرائض سرانجام دیتی رہیں۔ وہ چیزیں بناتیں مگر یہ پیداوار سیکٹر الف (خود اپنے کنبے کے استعمال) کے لئے ہوتی' مارکیٹ کے لئے نہیں۔

جیسے ہی شوہر آہستہ آہستہ گھر سے نکل کر براہ راست معاشی سرگرمی میں مصروف ہو گیا' عورت گھر میں رہ کر بالواسطہ معاشی سرگرمی میں لگ گئی۔ آدمی نے تاریخی طور پر زیادہ ترقی یافتہ نوعیت کے کام کی ذمہ داری سنبھالی تو عورت نے گھر میں زیادہ پرانے اور دقیانوسی نوعیت کے کام نمٹانے شروع کر دیئے۔ اس طرح مرد خود تو مستقبل کی طرف بڑھ گیا اور عورت ماضی میں ہی رہ گئی۔

اس تقسیم نے شخصیت اور داخلی زندگی میں ایک شکست و ریخت پیدا کر دی۔ فیکٹری اور دفتر کی عوامی اور اجتماعی نوعیت باہمی ربط اور تکمیل کی ضرورت اپنے ہمراہ معروضی تجزیئے اور معروضی تعلقات کی اہمیت لائیں۔ مردوں کو بچپن سے ہی دکان دارانہ کردار کے لئے تیار کیا جاتا تھا' جہاں انہیں باہمی انحصار کی دنیا میں چلنے پھرنے کا موقع ملتا۔ خارجیت

MashalBooks.org

پسند بننے میں ان کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ عورتیں' جنہیں پیدا ہوتے ہی افزائش نسل' بچوں کی پرورش اور گھریلو محنت مشقت کے لئے تیار کیا جاتا تھا اور وہ یہ سارے کام خاصی حد تک سماجی تنہائی میں سرانجام دیتی تھی۔۔۔۔ انہیں ''داخلیت پسندی'' کا سبق دیا گیا۔ انہیں عموماً معقول اور تجزیاتی سوچ سے۔۔۔۔ جو خارجیت پسندی یا معروضیت کا خاصا ہے۔ عاری سمجھا جاتا تھا۔

یہ تعجب کی بات نہیں کہ جن عورتوں نے گھریلو تنہائی سے پیچھا چھڑا کر' باہمی انحصار پر مبنی پیداوار میں حصہ لیا انہیں اپنا عورت پن کھو دینے' سرد مزاج ہو جانے' سخت جانی اور خارجیت پسندی کے طعنے دیئے گئے۔

صنعتی اختلافات اور غیر متغیر (جامد) صنعتی رویئے' مردوں کی پیداوار کے حوالے سے اور عورتوں کو صرف سے منسلک کر کے' ان کی گمراہ کن شناخت کے ذریعے اور زیادہ شدید ہو گئے حالانکہ مرد صرف بھی کرتے تھے اور عورتیں پیداوار میں بھی حصہ لیتی تھیں۔ مختصراً عورتیں دوسری لہر کے دنیا پر چھانے سے طویل عرصہ پہلے ہی زیادتی کا شکار تھیں' اسی لئے جدید ''اصناف کی جنگ'' میں' کام کے ہر دو سٹائل کے مابین تضاد میں اور اس سے بھی آگے پیداوار اور صرف کی باہم علیحدگی میں' واضح جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔ منقسم معیشت نے صنعتی شکست و ریخت کو بھی خاصا تیز کر دیا۔

ہمارے اب تک کے مشاہدے کے حاصل یہ ہے کہ جب بھی کسی جگہ غیر محسوس کٹاؤ کے نتیجے میں صانع اور صارف' دو مختلف شخصیتوں میں بٹے' بہت سی اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ دونوں کے ملاپ کے لئے مارکیٹ کی تشکیل یا توسیع کرنا پڑی۔ نئے سیاسی اور سماجی تضادات ابھرے آئے۔ نئے صنعتی کردار متعین کرنے پڑے لیکن اس تقسیم کے مضمرات دور ازکار نوعیت کے تھے۔ اس کا یہ مطلب بھی تھا کہ دوسری لہر کے تمام معاشروں کو اسی انداز میں کام کرنا ہو گا۔ انہیں بعض بنیادی ضروریات کا خیال رکھنا ہو گا۔ چاہے پیداوار کا مقصد منافع ہے یا نہیں چاہے ذرائع پیداوار عوامی ملکیت ہیں یا نجی' چاہے مارکیٹ ''آزاد'' ہے یا ''منصوبہ بند'' چاہے سرمایہ دارانہ نظام ہے یا اشتراکیت۔۔۔۔ ان سب باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

پیداوار کو ذاتی استعمال کے بجائے تبادلے کی خواہش کو پورا کرنے اور اسے معاشی سوئچ بورڈ یا مارکیٹ کے ذریعے پھیلانے کے لئے دوسری لہر کے بعض اصولوں کی پاس داری ضروری تھی۔

ایک دفعہ ان اصولوں کی واضح پہچان ہو جائے تو تمام صنعتی معاشروں کی مخفی Dynamics کھلی کتاب کی طرح نظر آ جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ہم با آسانی دوسری لہر کے لوگوں کی سوچ کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ کیونکہ یہی اصول' بنیادی قواعد کے ساتھ مجتمع ہو کر' دوسری لہر کی تہذیب کے رویوں کے متعلق اشاراتی کتاب بنتے ہیں۔

باب 3

MashalBooks.org

ضابطوں کی شکست وریخت

ہر تہذیب کا ایک مخفی ضابطہ۔۔۔قواعد یا اصولوں کا ایک مجموعہ ہوتا ہے جو ایک متواتر ڈیزائن کی طرح اس کی تمام سرگرمیوں میں جاری وساری ہوتا ہے۔ دنیا جیسے ہی صنعتی نظام کی لپیٹ میں آئی' اس کا منفرد مخفی ڈیزائن نظروں کے سامنے آ گیا۔ یہ چھ باہم منسلک اصولوں کا ایسا مجموعہ تھا جس نے لاکھوں انسانوں کے رویے کی منضبط کر ڈالا۔ پیداوار اور صرف کی علیحدگی کے نتیجے میں' ان اصولوں کی فطری افزائش نے صنعف سے کھیل تک اور کام سے جنگ تک' زندگی کے ہر رخ متاثر کیا۔

آج ہمارے سکولوں' کاروباروں اور حکومتوں میں موجود تندوتیز تضاد' حقیقتاً انھی آدھے درجن اصولوں کے گرد گھومتا ہے۔ کیونکہ دوسری لہر کے لوگ جبلی طور پر ان کا نفاذ اور دفاع کرتے ہیں اور تیسری لہر کے لوگ انہیں چیلنج کرتے اور ان پر حملہ آور ہوتے نظر آتے ہیں لیکن اس طرح بات ہمارے موضوع سے دور چلی جائے گی۔

تشکیل معیار

دوسری لہر کے اصولوں میں سے سب سے زیادہ جانا پہچانا اصول تشکیل معیار کا ہے۔ ہر کسی کو پتہ ہے کہ صنعتی معاشرے لاتعداد ہم جنس اور ہم شکل اشیاء پیدا کرتے ہیں۔ شاید بہت سے لوگوں نے محسوس کیا ہو کہ ہم نے کوکا کولا کی بوتلوں' لائٹ بلبوں اور خود کار ٹرانسمشن میں تشکیل معیار سے کہیں آگے کی بات کی ہے۔ سب سے پہلے اس نظریئے کی اہمیت کو سمجھنے والا تھیوڈور ویل تھا جس نے صدی کے اختتام پر امریکن ٹیلی فون اینڈ ٹیلی گراف کمپنی بنائی تھی۔

1860ء کے آخری سالوں میں ریلوے ڈاک کلرک کی حیثیت سے کام کرتے ہوئے ویل نے یہ محسوس کرلیا تھا کہ کوئی بھی دو خطوط اپنی منزل مقصود تک' پوری نہیں ایک

ہی راستے سے پہنچیں۔ خطوط کے گٹھے' آگے پیچھے مختلف سمتوں میں سفر کرتے اور عموماً ہفتوں یا مہینوں کے بعد اپنی منزل پر پہنچ پاتے۔ ویل نے معیاری راستے کا نظریہ متعارف کرایا۔۔۔۔ ایک جگہ جانے والے تمام خطوط ایک ہی راستے سے جائیں۔۔۔۔ اس طرح اس نے پوسٹ آفس میں انقلابی تبدیلیوں کی ابتدا کی۔ بعدازاں' جب اس نے اے ٹی اینڈ ٹی کی تشکیل کی تو اس نے ہر امریکی گھر میں ایک جیسا ٹیلی فون پہنچانے کا پروگرام بنایا۔

ویل نے صرف ٹیلی فون سیٹ اور اس کے دوسرے اجزاء کا یکساں معیار ہی نہیں رکھا بلکہ اے ٹی اینڈ ٹی کے کاروباری طریق کار اور انتظامی امور میں بھی معیار قائم کیا۔ 1908ء کے ایک اشتہار میں اس نے چھوٹی ٹیلی فون کمپنیوں کو اپنی کمپنی میں مدغم کرنے کی حمایت میں یہ دلیل دی کہ ''معیار قائم کرنے کے لئے ایک کلیرنگ ہاؤس'' چاہئے جو ''مشینری'' لائنوں اور ترسیلی پائپوں کے ساتھ ساتھ اس نظام کو چلانے کے طریق کار اور قانونی کام میں کم اخراجات کو یقینی بنائے گا۔ یہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں کہ اس سے ''آپریٹنگ اور اکاؤنٹنگ'' کا یکساں نظام وجود میں آ جائے گا۔ ویل نے سمجھ لیا تھا کہ دوسری لہر کے ماحول میں کامیابی کے لئے''سافٹ ویئر۔۔۔۔ طریق کار اور انتظامی معمولات کو ہارڈ ویئر کے ساتھ ساتھ ایک معیار پر رکھنا ہوگا۔''

ویل ان معیار پسندوں میں سے صرف ایک ہے جنہوں نے صنعتی معاشرہ تشکیل دیا۔ فریڈرک ونسلو ٹیلر ایک اور معیار پسند تھا جو پہلے ایک مکینک تھا' بعد میں صلیبی مجاہد بن گیا۔ اس کا کہنا ہے کہ ہر مرحلے میں کارکن کے کام کا معیار مقرر کر کے' کام کو سائنٹیفک بنایا جا سکتا ہے۔ اس صدی کے ابتدائی عشروں میں' ٹیلر نے یہ طے کر دیا کہ ہر کام کو کرنے کا ایک بہترین (معیاری) طریقہ ہے۔ اس کام کو سرانجام دینے کا ایک بہترین (معیار) اور اوزار ہوتا ہے اور ایک مخصوص (معیاری) وقت میں اسے مکمل کیا جا سکتا ہے۔

اس فلسفے سے مسلح ہو کر' وہ دنیا کا عظیم صنعتی گرو بن گیا۔ وہ اپنے دور میں اور بعد میں بھی فرائڈ' مارکس اور فرینکلن کا ہم پلہ سمجھا جاتا تھا۔ اپنے کارکنوں کے بدن سے پیداوار کا ایک ایک اونس نچوڑ لینے والے سرمایہ دار مالکان ہی ٹیلرازم کے اکیلے معترف نہیں تھے بلکہ اس نظریئے کی استعداد کے متعلق ماہرین' پیس ورک سکیم دینے والے اور قیمتوں میں

اتار چڑھاؤ لانے والے بھی پسندیدہ رائے رکھتے تھے۔ کمیونسٹ بھی اس جوش وخروش میں ان کے ساتھ شامل تھے۔ حقیقتاً لینن نے ٹیلر کے طریقوں کو سوشلسٹ پیداوار میں اختیار کرنے پر خاصا زور دیا۔ لینن بھی۔۔۔۔ جو صنعت کاری کا حامی پہلے تھا اور سوشلسٹ بعد میں۔۔۔۔ معیار قائم کرنے کا پر جوش حمایتی تھا۔

دوسری لہر کے معاشروں میں ملازمتوں کے طریقوں اور فرائض کا آہستہ آہستہ ایک معیار بنتا گیا۔ سول سروس میں خصوصاً موزوں امیدواروں کی شناخت اور ناموزوں افراد کی چھٹائی کے لئے معیاری ٹسٹ کا استعمال ہونے لگا۔ تمام صنعتوں میں تنخواہوں کے 1 سکیلوں کے ساتھ ساتھ، مختلف سہولتوں لنچ کے وقفے، چھٹیوں اور شکایات کے طریقوں کا بھی ایک معیار بنادیا گیا۔ نوجوانوں کو ملازمتوں کی مارکٹ کے لئے تیار کرنے کے لئے کارپردازان تعلیم نے معیاری تعلیمی نصاب ڈیزائن کئے۔

بائی نیٹ اور ٹرمن جیسے لوگوں نے معیاری ذہانت کے ٹسٹ تخلیق کر لئے۔ سکول میں گریڈ دینے کی پالیسی، داخلے کے طریق کار اور دستاویزی قواعد کا بھی اسی طرح معیار بنایا گیا۔ متعدد مواقع یا چناؤ کے ٹسٹ خود بخود ذہن میں ابھرنے لگے۔

ذرائع ابلاغ نے اسی دوران، تصور کو معیاری بنانے کی زبردست تشہیر کی تاکہ لاکھوں لوگ ایک جیسے اشتہارات، ایک جیسی خبریں اور کہانیاں پڑھیں۔ مرکزی حکومتوں نے ذرائع ابلاغ کے اثر ونفوذ کے ہمراہ اقلیتی زبانوں کو اس طرح دگیدا کہ مقامی اور علاقائی بولیاں بلکہ پوری زبانیں تک صفحہ ہستی سے تقریباً غائب ہو گئیں۔ ویلش اور السی ٹین اس کی واضح مثالیں ہیں۔

''معیاری''، امریکن، انگلش، فرنچ یا اس مقصد کے لئے روسی زبان نے بھی ''غیر معیاری'' زبانوں کو ٹھکانے لگا دیا۔ ملک کے مختلف حصے ایک جیسے نظر آنے لگے۔ مثلاً ہم شکل پٹرول پمپ، اشتہاری بورڈ اور یکساں گھر ہر طرف نمودار ہو گئے۔ روزمرہ کی زندگی کے ہر رخ میں ''معیار'' کا اصول نظر آنے لگا۔ اس سے بھی زیادہ گہری سطح پر صنعتی تہذیب کو معیاری اوزان اور پیمائش کے پیمانوں کی ضرورت تھی۔ یہ کوئی حادثاتی بات نہیں تھی کہ فرانسیسی انقلاب۔۔۔۔ جس کے نتیجے میں فرانس میں صنعتی دور کا آغاز ہوا۔۔۔۔ کے پہلے

MashalBooks.org

اقدامات میں سے ایک، صنعتی دور سے پہلے کے یورپ میں مستعمل دقیانوسی اور الٹے سیدھے پیمائش کے یونٹوں کی جگہ اعشاری نظام اورایک نئے کیلنڈر کے اجزا کی کوشش تھی۔ دوسری لہر کے ساتھ ساتھ یکساں پیمانے دنیا کے زیادہ تر حصے میں رائج ہوتے گئے۔

اس کے علاوہ اگر وسیع پیمانے کی پیداوار کو مشینوں تیار اشیاء اور ان کے مرحلہ وار طریقوں میں ''معیار'' مطلوب تھا تو مسلسل وسعت پذیر مارکیٹ کو بھی یکساں زر اور قیمتوں میں بھی متعلقہ معیار کی اشد ضرورت تھی۔ تاریخی طور پر، زر بینکوں، پرائیویٹ افراد اور بادشاہ کی طرف سے جاری ہوتا تھا۔ انیسویں صدی میں بھی امریکہ کے بعض حصوں میں نجی زر کا استعمال جاری تھا۔ کینڈا میں تو اس کا استعمال 1935ء میں کہیں جا کر ختم ہوا۔ بہرحال آہستہ آہستہ، صنعتی اقوام نے تمام غیر سرکاری کرنسی کا خاتمہ کر کے، ان کی جگہ واحد معیاری کرنسی کا نظام قائم کر دیا۔

انیسویں صدی کی ابتداء تک صنعتی ممالک میں اشیاء کی خرید وفروخت کرنے والوں کے درمیان قیمتوں پر اسی قسم کی تکرار معمول کی بات تھی جو کبھی قدیم قاہرہ کے بازاروں کا خاصہ تھا۔ 1825ء میں شمالی آئرلینڈ کے ایک نوجوان تارک وطن، اے ٹی سٹیوارٹ نے نیویارک آ کر خشک اشیاء کا سٹور کھولا اور ہر چیز کی مقررہ قیمت متعارف کرا کر گاہکوں اور کاروباری حریفوں کو یکساں حیران کر دیا۔ اس یک قیمتی پالیسی، معیاری قیمت نے سٹیوارٹ کو اپنے دور کے کاروباری شہزادوں میں شامل کر دیا اور وسیع پیمانے کی ڈسٹری بیوشن کے ارتقاء کی راہ میں حائل بنیادی رکاوٹ کو بھی صاف کر دیا۔

ترقی یافتہ دوسری لہر کے مفکرین، اپنے دوسرے متعدد اختلافات کے باوجود باہم پر یقین تھے کہ معیار سازی کی کارکردگی متاثر کن تھی۔ چنانچہ دوسری لہر نے کئی سطحوں پر، معیار سازی کے اصولوں کا بلا جھجک نفاذ کر کے فرق اور اختلاف کو ختم کر دیا۔

مہارت / تخصیص کار

دوسری لہر کے معاشروں میں سرایت کرنے والا دوسرا عظیم اصول۔۔۔۔ مہارت یا تخصیص کار کا تھا۔ دوسری لہر نے جتنا زیادہ زبان، آرام و آسائش اور طرز زندگی کے فرق یا تفاوت کو ختم کیا، اتنی ہی زیادہ بوقلمونی اور رنگا رنگی کی ضرورت کام کے دائرے میں اسے

محسوس ہوئی۔ تقسیم محنت کے عمل کو تیز تر کر کے دوسری لہر نے عمومی ہر فن مولا کسان کی جگہ معمولی اور چھوٹے چھوٹے کام کے ماہر کارکن کو دے دی جو ٹیلر کے نظریئے کے مطابق بار بار صرف ایک ہی کام کرتا تھا۔

1720ء کے زمانے میں مشرقی ہند کی تجارت کے فوائد کے متعلق ایک برطانوی رپورٹ نے یہ نکتہ پیش کیا کہ تخصیص کار کے ذریعے ''وقت اور محنت کے نسبتاً کم نقصان'' کے ساتھ کام مکمل کرایا جا سکتا ہے۔1776ء میں آدم سمتھ نے ''دولت اقوام'' اس گونج دار دلیل کے ساتھ شروع کی کہ ''تقسیم محنت کے اثرات' محنت کی پیداواری قوتوں میں عظیم ترین اصلاح لگتے ہیں۔

سمتھ' کلاسیکی انداز میں ایک پن کی تیاری بیان کرتا ہے۔ پرانے سٹائل کا ایک کاریگر' جو کام کے سارے ضروری مراحل خود ہی انجام دیتا تھا' پورے دن میں بمشکل مٹھی بھر پن۔۔۔۔ زیادہ سے زیادہ بیس پن اور بعض اوقات ایک بھی نہیں۔۔۔۔ تیار کر پاتا تھا۔ اس کے برعکس سمتھ' ایک فیکٹری کے دورے کا حال بتاتا ہے۔ وہاں ایک پن بنانے کا عمل اٹھارہ افعال میں بٹا ہوا تھا۔ یہ عمل دس ماہر کاریگروں کے ذریعے اس طرح انجام پاتا کہ ان میں سے ہر ایک کام کا عمل ایک یا چند مرحلے مکمل کرتا۔ وہ سب کے سب مل کر روزانہ اڑتالیس ہزار سے زیادہ پن بنا سکتے تھے یعنی چار ہزار آٹھ سو پن فی کاریگر۔

انیسویں صدی تک جوں جوں فیکٹری میں زیادہ سے زیادہ کام شفٹ ہونے لگا ہر جگہ پن کی کہانی' زیادہ بڑے پیمانے پر بار بار دھرائی جانے لگی اور مہارت کے انسانی اخراجات بھی اسی طرح بڑھنے لگے۔ صنعتی راج کے نقادوں نے الزام لگایا کہ زیادہ ماہرانہ کام کی مستقل تکرار آہستہ آہستہ کارکن کو انسانی صفات سے عاری کر دیتی ہے۔

1908ء میں جب ہنری فورڈ نے ماڈل ٹی کی تیاری شروع کی تو ایک یونٹ کی تکمیل میں اٹھارہ مختلف امور کے بجائے 7882امور سرانجام دینے پڑے۔ فورڈ نے یہ محسوس کیا کہ ان 7882 ماہرانہ کاموں میں سے 949 کاموں کے لئے مضبوط' صحت مند اور عملاً جسمانی طور پر مکمل انسان مطلوب تھے۔3338امور کے لئے عمومی جسمانی طاقت کے لوگ درکار تھے اور باقی ماندہ تمام کام ''عورتوں اور بڑے بچوں کے ذریعے'' کرایا جا سکتا

تھا۔ اس نے بڑے ظالمانہ انداز میں اپنی بات آگے بڑھائی۔ ''ہم نے یہ نتیجہ نکالا کہ ان امور کے لئے۔۔۔۔670 بغیر ٹانگوں والے' 2637 ایک ٹانگ والے' بغیر بازوؤں والے دو آدمی' 715 ایک بازو والے اور دس اندھے آدمیوں کو استعمال کیا جا سکتا ہے۔''

مختصراً ماہرانہ کام کے لئے ایک پورے آدمی کی ضرورت ہی نہیں تھی بلکہ اسکا صرف ایک جزو مطلوب تھا۔ مہارت کی انتہا' اتنی ظالمانہ بھی ہو سکتی ہے۔ اس سے زیادہ گہرا مشاہدہ بطور دلیل پیش نہیں کیا گیا۔ ایک مشق' جسے نقاد و سرمایہ دارانہ نظام سے معنون کرتے تھے' سوشلسٹ نظام کی بھی ایک داخلی خصوصیت بن گئی کیونکہ دوسری لہر کے تمام معاشروں میں موجود' محنت کی انتہائی تخصیص یا مہارت کی جڑیں پیداوار کی صرف سے علیحدگی میں چھپی تھیں۔ سوویت یونین' پولینڈ' مشرقی جرمنی یا ہنگری آج تخصیص یا مہارت کی تکمیل کے بغیر' جاپان یا امریکہ ہی کی طرح' اپنی فیکٹریاں نہیں چلا سکتے۔ امریکی محکمہ محنت نے 1977ء میں بیس ہزار مختلف قابل شناخت پیشوں کی فہرست چھاپی تھی۔

علاوہ ازیں' سرمایہ دار یا سوشلسٹ' دونوں طرح کی صنعتی ریاستوں میں تخصیص کے ساتھ پیشہ ورانہ شکل بھی انتہائی تیزی سے ابھری۔ ماہرین کے کسی گروہ کو جب بھی اپنے فن اور علم پر اجارہ داری کا موقع میسر آیا اور وہ نوواردوں کو اس میدان سے دور رکھنے میں کامیاب رہے' پیشے معرض وجود میں آ گئے۔ دوسری لہر کی پیش قدمی کے ساتھ ساتھ' مارکیٹ نے صاحب علم اور گاہک کے درمیان مداخلت کر کے انہیں صانع اور صارف میں تقسیم کر دیا۔ چنانچہ دوسری لہر کے معاشروں میں صحت کو مریض کی عاقلانہ ذاتی دیکھ بھال۔۔۔۔ ذاتی استعمال کی پیداوار۔۔۔۔ کے نتیجے کے بجائے ایک ایسی شے سمجھا گیا' جو ڈاکٹر اور صحت بخش اہلکار مہیا کرتے تھے۔ اسکول میں تعلیم' مفروضہ طور پر' استاد ''پیدا'' کرتا تھا اور طالب علم اسے ''صرف'' کرتا تھا۔

لائبریرین سے سیلز مین تک' ہر طرح کے پیشوں کے گروپ خود کو پیشہ ور کہلانے کا حق حاصل کرنے کے لئے ہنگامے کرنے لگے اور اپنی تخصیص کے دائرہ کار میں معیار' قیمتیں اور داخلے کی شرائط مقرر کرنے کا اختیار مانگنے لگے اور آج کل تو مائیکل پرٹ شک' چیئر مین امریکی فیڈرل تجارتی کمیشن کے بقول ''ہماری ثقافت پر پیشہ ور حضرات کا غلبہ ہے' وہ ہمیں

اپنا موکل سمجھتے ہیں اور ہمیں ''ضروریات'' سے آگاہ کرتے ہیں۔'' دوسری لہر کے معاشروں میں تو سیاسی ہنگامہ آرائی کو بھی ایک پیشہ سمجھا گیا۔ چنانچہ لینن نے یہ دلیل دی تھی کہ عوام بغیر پیشہ ورانہ مدد کے انقلاب نہیں لا سکتے۔ اس نے وضاحت کی۔ ''انقلابیوں کی تنظیم کی ضرورت تھی، جس کی رکنیت ان لوگوں تک محدود ہو جن کا پیشہ ہی انقلابی کا ہے''۔

اشتراکیوں، سرمایہ داروں، ناظموں استادوں، مذہبی رہنماؤں اور سیاست دانوں کے مابین، دوسری لہر نے پہلے سے کہیں زیادہ شاندار، تقسیم محنت کے بارے میں ایک عمومی ذہنیت اور رجحان پیدا کر دیا۔

1851ء میں عظیم کرسٹل پیلس کی نمائش میں پرنس البرٹ کی طرح، انہیں پختہ یقین تھا کہ ''تہذیب کے متحرک قوت تخصیص ہے۔ سو عظیم معیار کار اور عظیم ماہرین ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے چل پڑے۔

وقت کی ہم آہنگی یا مطابقت

پیداوار اور صرف کے مابین بڑھتی ہوئی خلیج نے دوسری لہر کے لوگوں کے وقت سے متعلق رویے میں ایک لازمی تبدیلی کی۔ مارکیٹ پر مبنی نظام میں، چاہے وہ منصوبہ بند ہو یا آزاد، وقت زر کے برابر ہوتا ہے۔ قیمتی مشینوں کو بیکار رہنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی اور ان کے کام کرنے کا اپنا ایک آہنگ ہوتا ہے۔ صنعتی تہذیب کے تیسرے اصول۔۔۔ وقت سے ہم آہنگی یا مطابقت۔۔۔ نے اسی سے جنم لیا۔

سابقہ معاشروں میں بھی کام کو بڑی احتیاط سے، مناسب وقت میں منظّم کیا جاتا تھا۔ فوجی لشکر اپنے دشمن کو گھیرنے کا کام انتہائی ہم آہنگی سے کرتے تھے۔ ماہی گیروں کو کشتی چلانے اور اپنے جال کا رخ متعین کرنے کی کوشش میں باہمی رابطہ رکھنا پڑتا تھا۔ جارج تھامسن نے کئی سال پہلے یہ بتا دیا تھا کہ کس طرح دوران کار گیتوں سے محنت کی احتیاج جھلکتی تھی۔ ملاحوں کے لئے، وقت کی نشان دہی۔۔۔ او۔۔۔ وپ، جیسی سادہ دو یک صوتی آواز سے ہوتی تھی۔ پہلا صوتی جز و تیاری کا وقت ظاہر کرتا، دوسرا صوتی آہنگ انتہائی مشقت کے لمحات کا اظہار ہوتا۔ کشتی کے رخ کی تبدیلی، اس نے محسوس کیا، کشتی چلانے سے کہیں زیادہ مشقت کا کام تھا۔ ''مشقت کے لمحات طویل وقفوں میں پھیلے ہوتے ہیں۔''

آئرش ملاحوں کو ہی دیکھ لیں' کشتی موڑتے وقت' ان کا ہو۔لی۔ہو۔ ہپ چلانا' آخری کوشش کے لئے ایک خاصی طویل تیاری ظاہر کرتا ہے۔

جس دور میں دوسری لہر کے جلو میں ابھی مشینری نہیں آئی تھی اور کارکنوں کے گیت فضا میں گونجتے تھے' کاوشوں میں اس طرح کی زیادہ تر ہم آہنگی جسمانی اور قدرتی ہوتی تھی۔ موسموں کا آہنگ' حیاتیاتی مراحل' زمین کی گردش اور دل کی دھڑکن اسے روانی بخشتے تھے۔ لیکن دوسری لہر کے معاشرے اس کے برعکس مشینوں کی گونج سے متحرک ہونے لگے۔

جوں جوں فیکٹری کی پیداوار پھیلی' مشینری کے بلند اخراجات اور محنت کے باہمی قریبی انحصار کو کہیں زیادہ شفاف اور خوبصورت ہم آہنگی کی ضرورت پڑی۔ اگر کارکنوں کے ایک گروپ نے مجوزہ کام کی تکمیل میں دیر کر دی تو ان کے بعد میں آنے والے گروپ بھی تاخیر کا شکار ہوں گے۔ چنانچہ پابندی وقت' جو زرعی معاشروں میں کبھی بھی بہت اہم نہیں تھی' ایک سماجی ضرورت بن گئی اور کلاک اور ہاتھ کی گھڑیاں بے پناہ استعمال ہونے لگیں۔ 1790ء تک برطانیہ میں ان کا رواج عام ہو چکا تھا۔ برطانوی مورخ ای۔ پی۔ تھامپسن کے الفاظ ہیں'' ان کا رواج عین اس وقت ہوا جب صنعتی انقلاب کو محنت کی کہیں زیادہ' وقت سے ہم آہنگی' درکار تھی۔''

یہ محض اتفاق نہیں تھا کہ صنعتی ثقافت میں بچوں کو' ابتدائی عمر میں ہی وقت بتانا سکھایا جاتا تھا۔ طالب علموں کو گھنٹی بجنے پر سکول آنے کی عادت ڈالی گئی تاکہ بعدازاں فیکٹری یا آفس میں کبھی سائرن کی بجتے ہی' انکی حاضری یقینی ہو۔ کاموں کو وقت کا پابند کیا گیا اور اس کے تسلسل کو قابل پیائش لمحات میں تقسیم کر دیا گیا۔ ''نو بجے سے پانچ بجے تک'' نے لاکھوں لوگوں کے لئے ایک نیا آہنگ ترتیب دے دیا۔

یہ ہم آہنگی صرف کام کی زندگی ہی میں نہیں آئی۔ دوسری لہر کے تمام معاشروں میں' نفع یا سیاسی اہمیت سے قطع نظر' سماجی زندگی بھی وقت کی پابند ہوگئی اور اس نے خود کو مشینی ضروریات کے مطابق ڈھال لیا۔ چند گھنٹے آرام و آسائش کے لئے نکالے گئے۔ کام کے شیڈیولز میں معیاری دورانیے کی چھٹیاں (طویل رخصت)' مختصر چھٹیاں یا کافی کے

وقفے شامل کیے گئے۔

بچے تعلیمی سال کا آغاز اور اختتام یکساں اوقات میں کرتے۔ ہسپتالوں میں تمام مریضوں کو ناشتے کے لئے بیک وقت اٹھا دیا جاتا۔ ذرائع رسل و رسائل (ٹرانسپورٹ) رش کے اوقات میں تیزی سے متحرک ہو گئے نشریاتی اداروں نے تفریحی پروگراموں کے لئے ''پرائم ٹائم'' جیسے مخصوص اوقات مقرر کر دیئے۔ ہر کام کے اپنے بہت مصروف اوقات ہوتے' جو اس کے سپلائرز اور تقسیم کاروں کی ضروریات سے ہم آہنگ ہوتے تھے۔ فیکٹری کے عمل کو تیز کرنے والوں اور ان کا پروگرام ترتیب دینے والوں سے لے کر ٹریفک پولیس اور قارئین وقت تک میں وقتی ہم آہنگی پیدا کرنے والے تخصیص کار ابھر آئے۔

اس کے برعکس بعض لوگوں نے نئے صنعتی نظام الاوقات کے خلاف مزاحمت کی' یہاں بھی صنعتی اختلافات ابھر کر سامنے آئے۔ جو لوگ دوسری لہر کے عمل میں شریک ہوئے۔۔۔ بنیادی طور پر مرد۔۔۔ گھڑی کے وقت کے مطابق چلنے کے عادی ہو گئے۔

دوسری لہر کے شوہر تسلسل سے یہ شکایت کرتے کہ ان کی بیویاں انہیں انتظار کراتی ہیں' انہیں وقت کا کوئی احساس ہی نہیں۔ وہ ہر وقت کپڑے پہننے اور بننے سنورنے میں لگی رہتی ہیں۔ اسی لئے وہ ہر جگہ تاخیر سے پہنچتے ہیں۔ عورتیں بنیادی طور سے گھریلو کام کاج میں بلا شرکت غیرے اور بے ترتیب انداز میں مصروف رہتی تھیں۔ انہیں وجوہات کی بنا پر شہری آبادی دیہاتی لوگوں کو سست اور نا قابل اعتبار جان کر حقارت کی نظر سے دیکھنے لگی۔ ''یہ وقت پر کبھی نظر نہیں آئیں گے' آپ سمجھ نہیں سکتے کہ آیا وہ اپنے وعدے کے پابند بھی رہیں گے یا نہیں۔''

دوسری لہر کے بلند انحصار باہمی پر مبنی کام اور پہلی لہر کے گھر اور کھیت میں مرتکز کام کے مابین فرق کی وجہ سے ایسی شکایات کی بھر مار نظر کے سامنے آتی ہے۔ دوسری لہر کے مکمل غلبے کے بعد زندگی کے انتہائی جذباتی معاملات بھی صنعتی نظام الاقات کے پابند ہو کر رہ گئے۔ امریکہ' سوویت یونین' سنگاپور' سویڈن' فرانس' ڈنمارک' جرمنی اور جاپان میں' غرض ہر جگہ پورا کنبہ بیک وقت بیدار ہوتا' کھانا کھاتا' خرید وفروخت کرتا' گھر واپس آتا' بستروں میں گھستا اور سو جاتا' یہاں تک جنسی تعلقات میں بھی کم وبیش وہی وقتی مطابقت پیدا

ہو گئی۔ اس طرح تمام تہذیب میں معیار اور تخصیص کے ساتھ ساتھ وقت سے ہم آہنگی کا اصول بھی کارفرما ہو گیا۔

ارتکاز

مارکیٹ کے عروج نے دوسری لہر کی تہذیب کے ایک اور اصول کو جنم دیا اور وہ تھا اصول ارتکاز۔ پہلی لہر کے معاشرے توانائی کے دور دور تک بکھرے ہوئے ذرائع پر گزر بسر کر لیتے تھے لیکن دوسری لہر کے معاشرے تقریباً مکمل طور پر زیر زمین موجود ایندھن کے انتہائی مرتکز اور مجتمع ذخائر کے محتاج ہو کر رہ گئے۔ دوسری لہر کے معاشروں نے صرف توانائی کے ارتکاز پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ دیہی علاقے کے لوگوں کو اکٹھا کر کے انہیں دوبارہ بڑے بڑے شہری مراکز میں آباد کر کے گویا آبادیوں کو بھی مرتکز کیا۔ اس نے کام کو بھی مجتمع کر ڈالا۔ پہلی لہر کے معاشروں میں تو کام ہر جگہ کیا جا سکتا تھا۔ گھر میں ذ گاؤں میں' کھیتوں میں' غرض ہر جگہ لیکن دوسری لہر کے معاشروں میں زیادہ تر کام فیکٹریوں میں ہونے لگا' جہاں ہزاروں افراد ایک ہی چھت کے نیچے اکٹھے کر دیئے جاتے تھے۔

یہ نہیں تھا کہ صرف توانائی اور کام ہی میں ارتکاز پیدا کیا گیا۔ سٹین کوہن نے برطانوی سوشل سائنس کے جریدے ''نیا معاشرہ'' میں لکھے گئے اپنے ایک مضمون میں یہ واضح کیا کہ۔۔۔ معمولی استثنا کے ساتھ' صنعتی راج سے پہلے۔۔۔ ''غریبوں کو گھر میں یا رشتہ داروں کے ساتھ رکھا جاتا تھا' مجرموں کو جرمانے' کوڑوں اور ایک جگہ سے دوسری جگہ نہ جانے کی پابندی کی صورت میں سزائیں دی جاتیں۔ پاگلوں کو ان کے خاندان کے ساتھ رکھا جاتا یا انکی غربت کی صورت میں کمیونٹی ان کی مدد کرتی۔ غرض اس قسم کے گروہ' مختصراً ساری کمیونٹی میں بکھرے ہوئے تھے۔''

صنعتی راج نے صورت حال میں انقلاب برپا کر دیا۔ انیسویں صدی کی ابتداء کو واقعتاً عظیم قید و بند کا زمانہ قرار دیا گیا ہے۔ اس زمانے میں مجرموں کو علیحدہ علیحدہ رکھا گیا۔ بچوں کو اکٹھا کر کے سکولوں میں بھیج دیا گیا۔ بالکل اسی طرح جیسے کارکنوں کو فیکٹریوں میں مجتمع کر دیا گیا تھا۔

سرمائے کے بہاؤ میں بھی ارتکاز واقع ہوا چنانچہ دوسری لہر کی تہذیب نے عظیم

الجنٹہ کارپوریشن کو اور اس سے بھی کہیں آگے' ٹرسٹ یا اجارہ داری کو جنم دیا۔1960ء کے درمیان' امریکہ کی تین بڑی آٹو کمپنیاں تمام امریکی کاروں کی پیداوار کا 95% حصہ پیدا کر رہی تھیں۔ جرمنی میں چار کمپنیاں۔۔۔۔ فاکس ویگن' ڈائمل بینز' اوپل (جی ایم) اور فورڈ ورک۔۔۔۔ اکٹھے 91% پیداوار دے رہی تھیں۔ فرانس میں رینالٹ' سٹرون' سمکا اور پیوگٹ حقیقتاً 100% پیداوار کر رہی تھیں۔ اٹلی میں فسٹ اکیلی ہی تمام کاروں کی 90% پیداوار دے رہی تھی۔

اسی طرح امریکہ میں ایلومینیم' بیئر' سگریٹیں اور ناشتے کی اشیاء کی پیداوار 80% حصہ چار یا پانچ کمپنیاں' اپنے اپنے شعبے میں' بنا رہی تھیں۔ جرمنی میں پلاسٹر بورڈ اور ڈائیز کا 92%۔ فوٹو فلم کا 98%' صنعتی سلائی مشینوں کا 91%' غرض ہر متعلقہ شعبے میں چار یا اس سے بھی کم کمپنیوں کے ذریعے بنایا جا رہا تھا۔ اس طرح اعلیٰ سطح کی مرتکز صنعتوں کی فہرست طویل تر ہوتی چلی گئی۔

سوشلسٹ انتظامیہ بھی ارتکاز پیداوار کی استعداد کی قائل ہو چکی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ سرمایہ دار ملکوں میں بہت سے اشتراکی مفکرین نے سرمایہ دارانہ معیشت میں بڑھتے ہوئے صنعتی ارتکاز کا خیر مقدم کیا' کیونکہ ان کے نزدیک ریاستی کنٹرول کے تحت مکمل اور حتمی صنعتی ارتکاز کی جانب یہ ایک ضروری مرحلہ تھا۔ لینن نے تمام شہریوں کے کارکن بننے اور ایک بہت بڑے سنڈیکیٹ۔۔۔۔ ریاست کی ملازمت میں چلے آنے کا نظریہ پیش کیا۔ نصف صدی بعد ایک سوویت معیشت دان لے لیوفینا نے ووپ روسی اکنامیکی کے ایک مضمون میں یہ رپورٹ دی کہ ''دنیا میں سب سے زیادہ مرتکز صنعت سوویت یونین کے پاس ہے۔''

ماسکو اور مغرب کے مابین نظریاتی اختلافات سے کہیں زیادہ دوسری لہر کی تہذیب کا اصول ارتکاز۔۔۔۔ توانائی' آبادی' کام' تعلیم یا معاشی تنظیم' غرض ہر جگہ۔۔۔۔ گہرائی میں اور زیادہ گہرائی میں اترتا چلا گیا۔

زیادہ سے زیادہ اضافہ

پیداوار اور صرف کی تقسیم نے دوسری لہر کے تمام معاشروں میں ایک طرح کا حد

MashalBooks.org

درجہ میکروفیلیا۔۔۔ بھاری بھرکم پن اور ترقی سے ٹیکسن لوگوں کے جنونی لگاؤ جیسا۔۔۔ رجحان بھی پیدا کر دیا۔ اگر یہ سچ ہے کہ فیکٹری میں طویل پیداوار کے نتیجے میں اخراجات فی اکائی کم ہو جاتے ہیں تو اسی مناسبت سے دوسری سرگرمیوں میں بڑے پیمانے کی پیداوار میں بھی کفایتیں ہونگی۔ ''بڑاپن'' یا بڑائی اعلیٰ کارکردگی کے مترادف سمجھا جانے لگا۔ اور ''زیادہ سے زیادہ اضافہ'' اس طرح پانچواں بنیادی اصول بن گیا۔

شہر اور قومیں اس بات پر فخر محسوس کرنے لگے کہ ان کے پاس طویل ترین سکائی سکرپیر اور عظیم ترین ڈیم ہیں یا گالف کورس کی سب سے بڑی منی ایچر (MINIATURE) ہے۔ چونکہ بڑائی یا وسعت ترقی کا نتیجہ تھی اس لئے زیادہ تر صنعتی حکومتوں، کارپوریشنوں اور دوسری تنظیموں نے ترقی کے تصور کی، وحشیانہ جذبے کے ساتھ، تقلید کی۔ جاپانی کارکن اور انتظامیہ، میٹسو شیٹا الیکٹرک کمپنی میں اکٹھے ہو کر روزانہ یہ گیت گاتے تھے۔

پیداوار کو بڑھانے کے لئے، اپنی بہترین صلاحیتیں استعمال کر رہے ہیں
دنیا کے لوگوں کو اپنی اشیاء بھیج رہے ہیں
کبھی ختم نہ ہونے والے اور مسلسل بنیادوں پر
جیسے فوارے سے پانی اچھلتا اور بکھرتا ہے
پھلو پھولو، صنعت، پھلو پھولو، پھلو پھولو!
ہم آہنگی اور خلوص!
میٹسو شیٹا الیکٹرک!

1960ء میں جب امریکہ روایتی صنعتی نظام کے مرحلے سے آگے نکل گیا اور وہاں تبدیلی کی تیسری لہر کے ابتدائی اثرات محسوس ہونے لگے تو اس وقت اس کی پچاس عظیم ترین صنعتی کارپوریشنوں کا پھیلاؤ اتنا بڑھ چکا تھا کہ ان میں سے ہر ایک کارپوریشن میں اوسطاً اسی ہزار کارکن ملازم تھے۔ اکیلی جنرل موٹرز میں 5لاکھ 95ہزار لوگ کام کر رہے تھے اور ویل کی اے ٹی اینڈ ٹی میں 7لاکھ 36ہزار مرد وزن ملازم تھے۔ اس کا مطلب ہے کہ اس سال، اگر اوسط گھرانے کا سائز 3.3 رہا ہو تو صرف اسی ایک کمپنی کی تنخواہوں پر

2 ملین افراد کی گزر بسر ہو رہی تھی (ہملٹس اور واشنگٹن جب ایک قوم کی بنیاد رکھ رہے تھے تو پورے ملک کی آبادی 4 ملین تھی) بعدازاں AT&T کے ملازمین کی تعداد کا یہ تناسب اپنی جسامت میں کہیں زیادہ بڑھ گیا۔ (1970ء میں اس کے ملازمین 9 لاکھ 56 ہزار تھے' جس میں سے ایک لاکھ 36 ہزار افراد صرف 12 ماہ کے وقفے میں ملازم رکھے گئے۔)

امریکن ٹیلی فون اور ٹیلی گراف' ایک خصوصی کیس تھا اور امریکی بلاشبہ ''بڑے پن'' یا وسعت کے کچھ زیادہ ہی عادی تھے لیکن میکرو فیلیا پر صرف امریکیوں ہی کی اجارہ داری نہیں تھی۔ 1963ء میں فرانس میں ایک ہزار چار سو کمپنیوں میں۔۔۔۔ تمام کمپنیوں کا بمشکل 1/4% حصہ۔۔۔۔ ساری قوت کار کا 38% حصہ کام کر رہا تھا۔ جرمنی' برطانیہ اور دوسرے ملکوں کی حکومتوں نے زیادہ بڑی کمپنیاں تشکیل دینے کے لئے باہمی انضمام کی بھرپور حصلہ افزائی کی۔ پس پشت یہ یقین کارفرما تھا کہ بڑے پیمانے کی پیداوار کے ذریعے دیو قامت امریکی کمپنیوں سے مقابلے میں مدد ملے گی۔

صرف یہی نہیں تھا کہ بڑے پیمانے کی پیداوار کے نتیجے میں منافع شرح میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ مارکس نے ''صنعتی اداروں کے افزائشی پیمانے کو ان کی مادی قوت کے وسیع ارتقاء'' کے ساتھ منسلک کیا تھا۔ لینن نے جواباً یہ دلیل دی کہ ''عظیم الجثہ تجارتی ادارے' ٹرسٹ اور سنڈیکیٹس وسیع پیمانے کی پیداواری ٹیکنکس کو اپنی ترقی کے انتہا پر پہنچا چکے ہیں''۔ سوویت انقلاب کے بعد اس کا پہلا بزنس آرڈر۔۔۔۔ روسی معاشی زندگی کو۔۔۔۔ ممکنہ عظیم ترین اداروں کو کم سے کم تعداد میں مستحکم کرنے کے متعلق تھا۔ اسٹالن نے افزائش کے پیمانے پر اور شدت سے زور دیا اور بہت سے نئے پراجیکٹ تعمیر کئے۔۔۔۔ میگنی ٹو گورسک کا اسٹیل کمپلیکس' زیپوروز سٹال میں بھی ایک اور سٹیل پراجیکٹ' بالخاش کا تانبہ پگھلانے کا پلانٹ' خارکوف اور سٹالن گراڈ میں ٹریکٹر کا پلانٹ۔ وہ کسی خاص امریکی انسٹالیشن کا حجم باقاعدہ معلوم کرتا اور پھر اس سے بھی بڑے پراجیکٹ کی تعمیر کا حکم دے دیتا۔

ڈاکٹر لیون ایم ہرمن' سوویت معاشی منصوبہ بندی میں بڑائی یا وسعت کے جنون کے متعلق لکھتا ہے۔ ''سوویت یونین کے مختلف حصوں میں' حقیقتاً مقامی سیاست دان۔۔۔۔ دنیا کے عظیم ترین پراجیکٹس۔۔۔۔ کی تشکیل کی دوڑ میں بری طرح شامل ہو چکے تھے۔

1938ء میں کیمونسٹ پارٹی نے بڑائی یا وسعت کے اس مریضانہ انداز کے خلاف خبردار بھی کیا لیکن نتیجہ لا حاصل رہا۔'' آج بھی سوویت اور مشرقی یورپی کیمونسٹ رہنما' ہرمن کے بقول ''بڑائی اور وسعت کی بری عادت'' کے اسی طرح شکار ہیں۔ بھاری بھرکم پیمانے پر اسی یقین نے دوسری لہر سے استعداد کی ماہیت کے متعلق مفروضات اخذ کئے لیکن صنعتی راج کا میکرو فیلیا صرف پلانٹس کی تعمیر تک میں محدود نہیں رہا۔ اس کی جھلک طرح طرح کے سینکڑوں اعداد و شمار کے مجموعے۔۔۔ خام قومی پیداوار نامی ایک شماریاتی تصویر۔۔۔ میں نظر آئی۔ خام قومی پیداوار سے مراد کسی معیشت میں پیدا کردہ تمام اشیاء و خدمات کی قدر کو باہم جمع کر کے اس کے پیداواری ''پیمانے'' کو جانچنا تھا۔ دوسری لہر کے معیشت دانوں کے اس آل میں خاصی خامیاں تھیں۔ خام قومی پیداوار کے نقطہ نظر سے اس بات کی قطعی کوئی اہمیت نہیں تھی کہ آیا پیداوار خوراک' تعلیم اور صحت سے متعلقہ خدمات کی تھی یا جنگی سازو سامان کی۔ افراد کی ملازمت' چاہئے وہ کسی گھر کی تعمیر کے لئے ہو یا اسے ڈھا دینے کے لئے' دونوں صورتوں میں' خام قومی پیداوار میں اضافہ کرتی' حالانکہ ایک عمل کے ذریعے گھروں کی تعداد میں اضافہ ہوتا اور دوسرے عمل سے ایک گھر کم ہو جاتا۔ خام قومی پیداوار' چونکہ صرف مارکیٹ کی سرگرمی یا تبادلے کے عمل کو ناپتی تھی' اس لئے اس نے بلا اجرت پیداوار پر مبنی' معیشت کے ایک بہت بڑے سیکٹر کو سرے سے نظر انداز ہی کر دیا۔ مثلاً بچوں کی دیکھ بھال اور گھریلو کام کاج وغیرہ۔

ان خامیوں کے باوجود' دوسری لہر کی حکومتیں ذ دنیا میں ہر جگہ' ہر قیمت پر خام قومی پیداوار میں اضافہ کرنے کی۔۔۔ طبعی اور سماجی تباہ کاری کا خطرہ مول لے کر بھی' پیداوار کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے کی۔۔۔ اندھی دوڑ میں شریک ہو گئیں۔ صنعتی ذہنیت میں میکرو فیلیا کا اصول اتنی زیادہ گہرائی میں جا کر جم گیا کہ کوئی اور بات اس سے زیادہ معقول لگتی ہی نہیں تھی۔ اس طرح زیادہ سے زیادہ اضافے کا اصول بھی معیار' تخصیص اور دوسرے صنعتی تحتی اصولوں میں شامل ہو گیا۔

مرکزیت

بالآخر تمام صنعتی قوموں نے مرکزیت کو ایک شاندار فن کی شکل دے دی۔ چرچ کو اور پہلی لہر کے بہت سے حکمرانوں کو طاقت کو مجتمع کرنا بہت اچھی طرح آتا تھا لیکن ان کے معاملات بہت ہی غیر پیچیدہ معاشروں سے منسلک تھے۔ وہ موجودہ صنعتی معاشروں کی بنیادیں مجتمع کرنے والے مردوں اور عورتوں کے برعکس نا پختہ شوقین مزاجوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔

تمام پیچیدہ معاشروں کو مجتمع اور غیر مجتمع دونوں طرح کے افعال کا ملغوبہ چاہئے ہوتا ہے۔ لیکن بنیادی طور پر' پہلی لہر کی منتشر معیشت۔۔۔۔جس میں ہر مقامی آبادی زیادہ تر اپنی ہی ضروریات کی اشیاء پیدا کرنے کی ذمہ دار تھی۔۔۔۔ کی دوسری لہر کی مجتمع قومی معیشتوں میں تبدیلی' اجتماعی قوت کے بالکل ہی نئے طریقوں کی طرف لے گئی۔ یہ طریقے انفرادی کمپنیوں' صنعتوں اور پھر پوری ہی معیشت میں رائج ہو گئے۔

ابتدائی ریلوے اسکی ایک کلاسیکی تصویر پیش کرتی ہے۔ دوسرے کاروباروں کے مقابلے میں' اپنے زمانے کا یہ سب سے وسیع وعریض کاروبار تھا۔1850ء کے امریکہ میں صرف اکتالیس فیکٹریاں ایسی تھیں جن کا سرمایہ دو لاکھ پچاس ہزار ڈالر یا اس سے زیادہ تھا۔ لیکن اس کے برعکس نیویارک سنٹرل ریلوے کا سرمایہ'1860ء کے قریب30ملین ڈالر تک پہنچ چکا تھا۔ اتنے دیوقامت کاروبار کو چلانے کے لئے نئے انتظامی طریقے مطلوب تھے۔

چنانچہ ابتدائی ریلوے انتظامیہ کو ہمارے اپنے دور کے خلائی پروگرام کے منتظمین کی طرح نئی دریافت کرنا پڑیں۔ انہوں نے تکنیکس' کرایوں اور شیڈیولز میں معیار قائم کیا۔ انہوں نے سینکڑوں میل پر محیط' فاصلوں پر ہونے والے افعال میں مطابقت اور ہم آہنگی پیدا کی۔ انہوں نے تخصیص کی بنیاد پر نئے پیشے اور ڈیپارٹمنٹس تشکیل دئے اور اپنے نیٹ ورکس کی سطح میں زیادہ سے زیادہ اضافے کے لئے زبردست جدوجہد کی اور ان سب کاموں کی انجام دہی کے لئے۔۔۔۔اطلاعات اور ہدایات پر مبنی۔۔۔۔تنظیم کی نئی شکلیں معرض وجود میں لائے۔

ملازمین کو''لائن اور سٹاف'' میں تقسیم کر دیا گیا۔ ریل کی نقل و حرکت' انکی باربرداری' نقصانات' گم شدہ سامان' مرمت' انجن مائلز وغیرہ کے متعلق اعداد وشمار پر مبنی

MashalBooks.org

رپورٹ روزانہ تیار کی جاتی اور یہ ساری اطلاعات' انتظامیہ کی ایک مجتمع زنجیر کے ذریعے جنرل سپرنٹنڈنٹ تک پہنچتیں جو فیصلے کر کے اپنے احکامات اسی طرح لائن تک بھیجتا۔

ایک کاروباری مورخ' الفریڈ۔ڈی۔ چانڈلر جونیر کی تصویر کشی کے مطابق ریلوے جلد ہی دوسرے بڑے اداروں کے لئے ایک ماڈل بن گیا اور مجتمع انتظامیہ کو دوسری لہر کی تمام اقوام میں ایک ترقی یافتہ اور مہذب آلہ کار سمجھا جانے لگا۔سیاست میں بھی دوسری لہر نے مرکزیت کی حوصلہ افزائی کی، امریکہ میں 1780ء کے لگ بھگ کنفیڈریشن کی ڈھیلی ڈھالی' غیر مجتمع دفعات کی جگہ ایک زیادہ مرکزیت پسند آئین کے نفاذ کی جنگ اس کی بہترین مثال ہے۔ پہلی لہر کے دیہاتی مفادات نے قومی حکومت میں ارتکاز اختیارات کے خلاف شدید مزاحمت کی جبکہ دوسری لہر کے تجارتی مفادات نے اس کی بھرپور حمایت کی۔ہملٹن نے ''وفاق پسند'' میں یا کسی اور جگہ بھی یہ دلیل دی کہ ایک مضبوط مرکزی حکومت نہ صرف فوجی اور خارجہ پالیسی کی وجوہات کی بنا پر ضروری ہوگئی تھی بلکہ یہ معاشی ترقی کے لئے بھی لازمی تھی۔ چنانچہ اس جنگ کا ماحصل 1787ء کا آئین ایک کھلی ڈلی مصالحت تھی۔ ابھی پہلی لہر کی قوتیں چونکہ خاصی طاقتور تھیں اس لئے آئین نے اہم اختیاروات مرکزی حکومت کو دینے کی بجائے' ریاستوں کے لئے محفوظ رکھے۔ زیادہ طاقتور اور با اختیار مرکز سے بچنے کے لئے اسنے مقنّنہ' انتظامیہ اور عدلیہ کے اختیارات کی علیحدگی کا منفرد نظریہ بھی روشناس کرایا۔لیکن آئین میں ایسی لچکدار زبان استعمال کی گئی' جس کے ذریعے بالآخر وفاقی حکومت کو بے پناہ توسیعی اختیارات حاصل ہو جاتے۔

جوں جوں صنعتی ارتقاء سیاسی نظام کو عظیم تر مرکزیت کی طرف دھکیلتا رہا' توں توں' واشنگٹن میں حکومت روز افزوں اختیارات اور ذمہ داریاں سمیٹتی چلی گئی اور مرکز میں زیادہ سے زیادہ فیصلے کرنے کی اجارہ داری قائم کرتی گئی۔ جبکہ وفاقی حکومت کے اختیارات' کانگریس اور عدلیہ سے' تینوں برانچوں میں سے سب سے زیادہ مرکز پسند' انتظامیہ کی طرف شفٹ ہوگئے۔ یہاں تک کہ نکسن کے زمانے میں' مورخ آرتھر شلے سنگر (جو خود بھی کبھی جانا پہچانا مرکزیت پسند تھا) امپیریل پریذیڈنسی پر زبردست حملے کر رہا تھا۔

امریکہ سے باہر' سیاسی مرکزیت کی حمایت میں دباؤ اور بھی زیادہ تھے۔ سویڈن'

جاپان، برطانیہ یا فرانس کے ایک فوری جائزے سے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ امریکی نظام میں مقابلتاً مرکزیت ہے ہی نہیں۔ ''مارکس یا حضرت عیسیٰؑ کے بغیر'' کا مصنف جین فرینکوئز ریول۔۔۔۔ سیاسی احتجاج پر حکومتوں کا کیا ردعمل ہوتا ہے۔۔۔۔ کی وضاحت کرتے ہوئے یہ نکتہ اٹھاتا ہے۔ ''اگر فرانس میں کسی جلوس پر پابندی لگ جاتی ہے تو پابندی کے ذریعے کے متعلق کبھی کوئی شک و شبہ نہیں ہوتا۔ اگر سوال کسی بہت بڑے سیاسی مظاہرے کا ہے تو یہ حرکت مرکزی حکومت کی ہے۔'' اس کا کہنا ہے۔ ''البتہ امریکہ میں اگر کسی مظاہرے پر پابندی لگ جائے تو ہر شخص کا پہلا سوال یہی ہوتا ہے کہ ''پابندی کس نے لگائی؟'' ریول وضاحت کرتا ہے کہ عموماً یہ کوئی مقامی خودمختار اتھارٹی ہوتی ہے۔

انتہائی سیاسی مرکزیت، البتہ مارکسٹ صنعتی اقوام میں دیکھی گئی۔ 1850ء میں مارکس نے ''ریاست کے ہاتھوں میں طاقت یا اختیارات کی فیصلہ کن مرکزیت'' کا نعرہ دیا۔ اینگلز نے اپنے پیشرو ہملٹن کی طرح، عدم مرکزیت کی حامل کنفیڈریشنز کو بدترین رجعت تقری سے تعبیر کیا۔ بعدازاں سوویتوں نے، صنعتی ترقی کو تیز تر کرنے کے لئے، اعلیٰ ترین مرکزی سیاسی اور معاشی ڈھانچے کی تشکیل کی جانب اس طرح قدم بڑھائے کہ معمولی معمولی پیداواری فیصلے بھی مرکزی منصوبہ سازوں کے کنٹرول میں دے دیئے۔ کسی زمانے کی غیر مرتکز معیشت کو آہستہ آہستہ مرکوز کرنے میں ایک فیصلہ کن ایجاد ''مرکزی بینک'' جس کے نام سے ہی اس کا مقصدہ آشکار ہو جاتا ہے، نے بڑی مدد دی 1694ء میں صنعتی دور کے آغاز کے ساتھ ہی۔۔۔۔ ابھی نیوکامن سٹیم انجن کے کل پرزے جوڑنے میں لگا ہوا تھا۔۔۔۔ ولیم پیٹرسن نے بینک آف انگلینڈ کی داغ بیل ڈال دی اور اس طرح یہ بنک، دوسری لہر کے تمام ملکوں میں، اسی طرح کے مرکزی اداروں کے لئے مثالی نمونہ بن گیا۔ کوئی ملک، زر اور کریڈٹ کے کنٹرول کے لئے، اس مشین کے مساوی اپنا ادارہ تعمیر کئے بغیر دوسری لہر کا مرحلہ مکمل نہیں کر سکتا تھا۔

پیٹرسن کا بینک حکومتی بانڈز فروخت کرتا تھا، حکومتی ضمانت پر کرنسی جاری کرتا تھا اور بعدازاں اس نے دوسرے بینکوں کے قرضے جاری کرنے کے عمل کو معیاری قواعد و ضوابط کا پابند بھی بنایا۔ بالآخر اس نے موجودہ مرکزی بینک کے سارے فرائض: ترسیل زر کا

MashalBooks.org

مرکزی کنٹرول سنبھال لئے۔1800ء میں انھی مقاصد کے لئے بینک ڈی فرانس تشکیل دیا گیا۔ اس کی پیروی میں ریخس بنک (Reichs Bank) 1875ء میں عالم وجود میں آیا۔

امریکہ میں پہلی اور دوسری لہر کی طاقتوں کی باہمی آویزش' آئین کے نفاذ کے فوراً ہی بعد' مرکزی بینکنگ کے مسئلے پر ایک زبردست محاذ آرائی کی صورت اختیار کر گئی۔ دوسری لہر کی پالیسیوں کے زبردست مداح ہملٹن نے برطانوی ماڈل پر ایک قومی بینک کی تشکیل پر زور دیا۔ جنوب اور مغربی کناروں نے۔۔۔۔ جو ابھی تک زراعت ہی سے چمٹے ہوئے تھے۔۔۔۔ اس کی مخالفت کی۔ بہرحال' صنعتی ارتقاء کی طرف گامزن شمال مشرقی کی حمایت سے' قانون سازی کے ذریعے وہ امریکی بنک کو معرض وجود میں لانے میں کامیاب ہو گیا۔ یہی بینک موجودہ فیڈرل ریزروسسٹم کا پیشرو تھا۔

مارکیٹ کی سرگرمیوں کی سطح اور نرخ میں باقاعدگی پیدا کرنے پر' حکومت کی جانب سے مامور مرکزی بینکوں نے۔۔۔۔ چور دروازے سے' غیر سرکاری اور محدود دائرہ کار کی منصوبہ بندی کی ایک سطح' سرمایہ دارانہ معیشتوں میں متعارف کرائی۔ دوسری لہر کے معاشروں۔۔۔۔ خواہ وہ اشتراکی ہوں یا سرمایہ دارانہ دونوں ہی۔۔۔۔ کی رگ رگ میں زر کا پھیلاؤ جا پہنچا۔ دونوں ہی نے اپنی ضروریات کی تکمیل کے لئے زر کا ایک پمپنگ اسٹیشن پیدا کر ڈالا۔ مرکزی بینکنگ اور مرکزی حکومت' ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے' آگے کی سمت گامزن ہو گئے۔ مرکزیت' دوسری لہر کی تہذیب کا ایک اور غالب اصول تھا۔ چنانچہ چھ رہنما اصولوں کا ایک سیٹ یا ''پروگرام'' ہمیں کسی نہ کسی سطح پر' دوسری لہر کے تمام ملکوں میں کارفرما نظر آتا ہے۔ یہ چھ اصول۔۔۔۔ معیار' تخصیص' وقت سے ہم آہنگی' ارتکاز' زیادہ سے زیادہ اضافہ اور مرکزیت۔۔۔۔ صنعتی معاشرے کے دونوں حصوں۔۔۔۔ سرمایہ دار اور اشتراکی۔۔۔۔ میں نافذ کئے گئے۔ ان اصولوں سے روگردانی ناممکن تھی کیونکہ ان کی نشوونما صانع اور صارف کے مابین پیدا شدہ بنیادی شگاف اور مارکیٹ کے لمحہ بہ لمحہ پھیلتے ہوئے کردار کی مرہون منت تھی۔ جواباً انہیں اصولوں نے' ایک دوسرے کو تقویت دے کر' بڑے بے رحمانہ انداز میں نوکر شاہی کو پروان چڑھایا اور بعض بے حد بھاری بھرکم' انتہائی غیر لچکدار اور بے

MashalBooks.org

پناہ طاقتور بیوروکریٹک تنظیموں کی تشکیل کر کے۔۔۔جن کا دنیا نے کبھی تصور بھی نہیں کیا ہو گا۔۔۔ بیچارے فرد کو' کافکا کی' بڑے خوفناک اداروں سے معمور' تصوراتی دنیا میں' بھٹکنے کے لئے تنہا چھوڑ دیا۔ اگر آج ہم اپنی بے بسی اور لاچارگی کے اسباب ڈھونڈنے نکلیں تو ہمارے سارے مسائل کے ڈانڈے' اس مخفی کوڈ سے جا ملیں گے۔ جس کی بدولت دوسری لہر کی تہذیب تشکیل و ترتیب میں آئی، دوسری لہر کی تہذیب پر' ان چھ اصولوں پر مبنی کوڈ' کی بڑی گہری چھاپ ہے۔ لیکن آج' جیسا کہ ہم جلد ہی دیکھیں گے' ان بنیادی اصولوں میں سے ہر ایک' تیسری لہر کی قوتوں کے شدید حملوں کی زد میں ہے۔ درحقیقت یہ دوسری لہر کی اشرافیہ ہے جو ابھی تک ان اصولوں کو۔۔۔ کاروبار میں' بینکنگ میں' مزدور تعلقات میں' حکومت میں' تعلیم میں اور ذرائع ابلاغ میں غرض ہر جگہ نافذ کئے ہوئے ہے۔ کیونکہ ایک نئی تہذیب کا ابھار پرانی تہذیب کے تمام مستقل مفادات کو چیلنج کر رہا ہے۔

فوری طور پر پیش آمدہ تبدیلیوں میں' تمام صنعتی معاشروں کی اشرافیہ کا۔۔۔ جو قواعد و ضوابط بنانے کی بہت ہی عادی ہے۔۔۔ بعینہ وہی کردار ہوگا جو ماضی میں جاگیردار طبقے کا رہا تھا۔ بعض نظرانداز ہو جائیں گے' بعض کے تحت الٹے جائیں گے' بعض کے پاس خالی خولی ٹھاٹھ باٹھ رہ جائیں گے اور بعض۔۔۔ سب سے ذہین اور حالات سے مطابقت پیدا کر لینے والے۔۔۔ تیسری لہر کی حمایت میں سرگرم ہو کر' اس کے رہنما بن کر ابھریں گے۔

یہ سمجھنے کے لئے کہ تیسری لہر کے غلبے کے بعد' کل معاملات کون چلائے گا' ہمیں پہلے بجا طور پر یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ آج معاملات کس کے ہاتھ میں ہیں۔

باب 4

کاریگرانِ قوت

''معاملات کون چلاتا ہے؟'' یہ سوال' دوسری لہر کا مخصوص سوال ہے۔ کیونکہ صنعتی انقلاب کی آمد سے پہلے اس طرح کے سوال اٹھانے کی کوئی خاص وجہ نہیں تھی۔ چاہے لوگ بادشاہوں یا جادوگروں کے زیر سایہ رہتے ہوں یا جنگی سرداروں' سورج دیوتا یا مذہبی پروہتوں کی عمل داری میں' انہیں یہ شبہ کبھی نہیں ہوتا تھا کہ ان کا حاکم کون ہے۔ شکستہ حال کسان نظریں اوپر اٹھاتا تو اسے افق پر شاہی محل یا خانقاہ کی دھندلی سی مگر شاندار جھلک نظر آ جاتی۔ اقتدار اور طاقت کا معمہ حل کرنے کے لئے' اسے کسی سیاسی ماہر یا اخباری پنڈت کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں تھی۔ ہر شخص جانتا تھا کہ اختیارات کس کے پاس ہیں۔

جہاں کہیں دوسری لہر نے قبضہ جمایا' وہاں' بہرحال' ایک نئی طرح کی' منتشر اور بے چہرہ قوت ابھری۔ وہ بااختیار لوگ' ایک نامعلوم ''وہ'' بن گئے۔ ''وہ'' کون تھے؟

تشکیل کار

صنعتی نظام نے جیسے ہم دیکھ چکے ہیں' معاشرے کو ہزاروں باہم منسلک اجزاء۔۔۔ فیکٹریوں' چرچ' سکولوں' تجارتی یونین جیلوں' ہسپتالوں اور ایسے ہی دوسرے اداروں۔۔۔ میں توڑ پھوڑ دیا۔ اس نے چرچ' ریاست اور فرد کے مابین موجود حاکمانہ حد فاصل کو توڑ ڈالا۔ علم کو خصوصی شعبوں میں تقسیم کر دیا' محنت کے عمل کے ہزاروں چھوٹے چھوٹے حصے کر ڈالے۔ خاندانوں کو توڑ کر' ان کا سائز چھوٹا کر دیا۔ اس سارے عمل کے ذریعے' صنعتی نظام نے مقامی بھائی چارے کی زندگی اور ثقافت کو بری طرح بکھیر کر رکھ دیا۔ کسی نہ کسی کو تو' ان سب چیزوں کو' کسی شکل میں دوبارہ مجتمع کرنا ہی تھا۔

اس ضرورت نے ماہرین کی بہت سی مختلف اقسام کو جنم دیا' جن کا بنیادی کام ہی' ان سب چیزوں کی دوبارہ تشکیل و تدوین تھا۔ یہ لوگ خود کو ایگزیکٹوز' ایڈمنسٹریٹرز' کمشنرز' کو

آرڈی نیٹرز' صدر' نائب صدر' افسر شاہی کے کل پرزے' یا انتظامیہ کہلاتے تھے۔ انہوں نے ہر کاروبار ہر حکومت اور ہر معاشرتی سطح پر قبضہ جمالیا اور انہوں نے خود کو اس نظام کا ایک ناگزیر حصہ ثابت بھی کیا۔ یہی لوگ تشکیل کار تھے۔ انہوں نے قواعد وضوابط تشکیل دیئے اور کاموں کی تفویض کی۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ کس کو کتنی اجرت دی جائے۔ انہوں نے ہی منصوبے بنائے' معیار مقرر کئے اور ترقیاں دیں یا روک لیں۔ انہوں نے پیداوار' تقسیم' ٹرانسپورٹ اور ذرائع ابلاغ کو باہم مربطو کیا اور اداروں کے باہمی تعلقات کے اصول وضع کئے۔ مختصراً انہوں نے معاشرے کے اجزاء کو باہم جوڑ کے' ایک صورت دی۔ ان کے بغیر دوسری لہر کا نظام ہرگز ہرگز چل نہیں سکتا تھا۔

مارکس نے انیسویں وسط میں یہ سوچا تھا کہ جو کوئی بھی آلات اور ٹیکنالوجی۔۔۔۔ ذرائع پیداوار پر قابض ہوگا' وہی معاشرے کا کرتا دھرتا ہوگا۔ اس کا کہنا تھا کہ چونکہ کام کی بنیاد باہمی انحصار پر تھی اس لئے کارکن پیداوار میں خلل انداز ہوکر' اپنے آقاؤں سے یہ آلات چھین سکتے ہیں۔ ایک دفعہ وہ ان ذرائع پر قابض ہو گئے تو معاشرتی اقتدار ان کے قدموں میں ہوگا۔

لیکن یہاں تاریخ' مارکس کے ساتھ' ایک چال چل گئی۔ کیونکہ اسی باہمی انحصار کی بدولت' ایک نئے گروپ۔۔۔۔ جنھوں نے سسٹم کو منظم صورت دی۔۔۔۔ زبردست استحکام اور عروج حاصل ہوا۔ آخیر میں قوت و اقتدار نہ مالکوں کو ملا اور نہ ہی کارکنوں کو۔ ہوا یہ کہ تشکیل کار' ان دونوں پر حاوی ہو گئے۔ یہ طاقت ذرائع پیداوار کی ملکیت کی مرہون منت نہیں تھی بلکہ ان ذرائع پیداوار پر کنٹرول کی وجہ سے تھی۔ اب اس معنویت کی طرف آتے ہیں۔

کاروبار میں' فیکٹری مالکان' کاروباری منتظمین' مل اونرز اور آئرن ماسٹرز ابتدائی تشکیل کار تھے۔ مالک عموماً اپنے چند معاونوں کے ساتھ' غیر ہنر مند مزدوروں کی خاصی بڑی تعداد میں باہمی رابطے اور کمپنی کو نسبتاً بڑی معیشت کے ساتھ مربوط کرنے کے عمل کو سرانجام دے لیتا تھا۔

چونکہ اس زمانے میں' مالک اور تشکیل کار' ایک ہی فرد ہوتا تھا اس لئے یہ قطعاً

MashalBooks.org

تعجب کی بات نہیں کہ مارکس نے دونوں تصورات کو گڈ مڈ کر کے' سارا زور ملکیت کی اہمیت پر ڈال دیا۔ پیداواری عمل کی پیچیدگیوں اور تخصیص اور مہارت پر مبنی تقسیم محنت کے ساتھ ساتھ' کاروبار میں منتظمین اور ماہرین کی نا قابل یقین حد تک نشوونما مشاہدہ میں آئی' یہ لوگ مالک اور کارکنوں کے درمیان آ گئے۔ کاغذی کاروائیاں بے پناہ بڑھ گئیں۔ جلد ہی بڑی کمپنیوں میں' مالک یا بڑے حصہ دار سمیت' کسی بھی شخص کے لئے تمام سرگرمیوں کو سمجھنا محال ہو گیا۔ مالک کے فیصلوں کی تشکیل اور انجام کار کنٹرول' سسٹم کو مربوط کرنے والے ماہرین کے ہاتھوں میں آ گیا۔ اس طرح ایک ایسی انتظامی اشرافیہ نے جنم لیا' جس کی طاقت کا انحصار ملکیت کی بجائے' اس کے تنظیمی مراحل کے کنٹرول پر تھا۔

انتظامیہ کی طاقت بڑھی تو سٹاک ہولڈر کی اہمیت کم ہو گئی۔ کمپنیوں میں زیادہ وسعت پیدا ہوئی تو ایک ہی گھرانے کے مالکان نے منتشر شیئر ہولڈرز کے بڑے بڑے گروپس کو شیئر بیچ ڈالے۔ ان شیئر ہولڈرز کی اکثریت کاروبار کی حقیقی سرگرمیوں سے بالکل ہی نا واقف تھی۔ آہستہ آہستہ شیئر ہولڈرز' نہ صرف روزمرہ کے معاملات میں بلکہ طویل عرصے پر محیط کاروباری اہداف اور لائحہ عمل کے متعلق بھی اپنے ہی متعین کردہ مینجرز کے محتاج ہو کر رہ گئے۔ بورڈ آف ڈائریکٹرز' نظریاتی طور پر سے مالکان کے نمائندے' ان سرگرمیوں سے دوری کے باعث بے خبر اور لاعلم ہو گئے' جن کی رہنمائی کرنا ان کے فرائض میں شامل تھا۔ جوں جوں انفرادی سرمایہ کاری ک بجائے بالواسطہ نجی سرمایہ کاری۔۔۔ پنشن فنڈ' میوچل فنڈ اور بینکوں کے ٹرسٹ فنڈز جیسے اداروں کے ذریعے۔۔۔ میں اضافہ ہونے لگا' توں توں صنعت کے حقیقی ''مالکان'' کا کنٹرول ختم ہوتا چلا گیا۔

تشکیل کاروں کی نئی قوت کا بڑا واضح اظہار' غالباً ڈبلیو مائیکل بلو مین تھال سابق امریکی وزیر خزانہ نے کیا ہے۔ حکومت میں آنے سے پہلے مین تھال بینڈکس کارپوریشن کے سربراہ تھے۔ ایک دفعہ ان سے سوال کیا گیا کہ کیا وہ بینڈکس کے مالک بننا پسند کریں گے تو ان کا جواب تھا۔ ''ملکیت قطعی غیر اہم ہے۔۔۔۔ اصل چیز تو اس کا کنٹرول ہے۔ انتظامیہ کے سربراہ کی حیثیت میں' میرے پاس کیا اختیارات ہیں۔ اگلے ہفتے شیئر ہولڈرز کی میٹنگ ہے اور میرے پاس ان کے 97% ووٹ ہیں۔ حالانکہ میرے پاس صرف آٹھ ہزار

شیئرز ہیں۔ میرے نزدیک کنٹرول زیادہ اہم ہے۔۔۔۔۔ دیوقامت حیوان پر کنٹرول حاصل کرنا اور اس کی تعمیری استعمال۔ یہ ہے میری خواہش' بجائے اس کے کہ میں وہ احمقانہ حرکتیں کرتا پھروں' جو دوسرے مجھ سے کرانا چاہتے ہیں۔''

کاروباری معاملات زیادہ تر کمپنی کے تنخواہ دار مینجرز یا دوسرے لوگوں کی رقم استعمال کرنے والے مالی منتظمین کے ذریعے طے ہونے لگے۔ کارکنوں کا تو ذکر ہی کیا' مالکوں کا بھی ان معاملات سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ تشکیل کاروں نے سارا انتظام خود سنبھال لیا۔

بالکل اسی طرح کا متوازی سلسلہ سوشلسٹ اقوام میں بھی موجود تھا۔ 1921ء کے لگ بھگ' لینن نے خود اپنی ہی سوویت افسر شاہی پر شدید اعتراضات کئے۔ ٹراٹسکی نے 1930ء میں جلاوطنی کے ایام میں یہ الزام لگایا کہ پانچ سے چھ ملین مینجرز' ایک ایسے طبقے کی شکل اختیار کر گئے تھے جو کسی بھی قسم کی پیداواری محنت میں براہ راست شریک نہیں تھے بلکہ صرف انتظام چلاتے تھے' نادر شاہی فرمان یا احکامات جاری کرتے' لوگوں میں معافیاں اور سزائیں بانٹتے تھے۔ ''ممکن ہے ذرائع پیداوار ریاست کی ملکیت ہوں'' اس نے الزام لگایا۔۔۔ مگر ریاست نے نوکر شاہی کی ''ملکیت'' ہے۔ 1950ء میں میلوون ڈیلاس نے ''نیا طبقہ'' میں یوگوسلاویہ میں انتظامی اشرافیہ کی بڑھتی ہوئی طاقت پر زبردست حملہ کیا۔ مارشل ٹیٹو' جس نے ڈیلاس کو قید میں ڈال دیا تھا' خود بھی ''ٹیکنو کریسی' نوکر شاہی' طبقاتی دشمن'' کے بارے میں شاکی تھا۔ اور انتظامیت کا یہی خوف ماؤ کے چین میں مرکزی موضوع تھا۔

غرض سوشلسٹ اور سرمایہ دارانہ دونوں ہی نظاموں میں تشکیل کاروں نے انتہائی موثر قوت حاصل کر لی۔ کیونکہ ان کے بغیر نظام کے مختلف اجزاء' باہم اشتراک سے کام کر ہی نہیں سکتے تھے۔ مشین چل ہی نہیں سکتی تھی۔

تشکیل ساز انجن

اکیلے کاروبار یا ایک پوری صنعت کی تشکیل و تربیت' اس ساری صناعی کا۔۔۔ جو معرض وجود میں ابھی آنا تھی۔۔۔۔ صرف ایک معمولی سا جزو تھا۔ جدید صنعتی معاشرے نے'

MashalBooks.org

جیسا کہ ہمارے مشاہدے میں بھی ہے' مزدور یونین اور تجارتی ایسوسی ایشنز سے لے کر چرچ' سکول' مراکز صحت اور تفریحی گروپس تک' لاتعداد ایسے اداروں کو جنم دے دیا' جنہیں قابل فہم قواعد وضوابط کے ایک دائرہ کار میں اپنے اپنے کام سرانجام دینے پڑتے تھے۔ قوانین کی ضرورت محسوس ہوئی۔ مزید براں اطالاعاتی دائرے' سماجی دائرے اور تکنیکی دائرے کی باہمی شیرازہ بندی بھی کی جانا تھی۔ دوسری لہر کی تہذیب کی تشکیل و ترتیب کی ضرورت کے نتیجے میں عظیم ترین رابطہ کار۔۔۔۔ نظام کی تشکیل کا انجن۔۔۔۔ وسیع حکومت سامنے آیا۔ تشکیل و تکمیل کی بھوک اس نظام کا خاصا تھی اسی وجہ سے دوسری لہر کے ہر معاشرے میں وسیع حکومتوں کا تصور ابھرا۔

سیاسی بزرجمہروں نے بار بار چھوٹی حکومت کی حمکایت میں نعرہ لگایا مگر اقتدار میں آتے ہی' انہی رہنماؤں نے حکومت کا سائز کم کرنے کی بجائے اور زیادہ وسیع کیا۔ دوسری لہر کی تمام حکومتوں کا اعلی ترین مقصد صنعتی تہذیب کی تعمیر اور اس کی بقا رہا ہے۔ یہ بات سمجھ میں آتے ہی رہنماؤں کے مندرجہ بالا قول وفعل کا تضاد با آسانی قابل فہم بن جاتا ہے۔ اس ایک عہد کے سامنے چھوٹے موٹے سارے اختلافات آنکھوں سے اوجھل ہو گئے۔ دوسرے مسائل کے متعلق جماعتوں اور سیاست دانوں میں تنازعات ضرور پیدا ہوئے ہونگے مگر اس معاملے میں ان سب کا مکمل اتفاق رائے تھا۔ چاہے وہ کوئی بھی راگ الاپ رہے ہوں لیکن وسیع تر حکومت ان کے مخفی پروگرام کا ایک لازمی حصہ تھا کیونکہ صنعتی معاشرے' لازمی تشکیل کے امور کی ادائیگی کے لئے حکومت پر انحصار کرتے ہیں۔

ایک سیاسی کالم نگار' کلے ٹن' فریچی کے الفاظ میں امریکی وفاقی حکومت کی نشوونما کبھی نہیں رکی' یہاں تک کہ حالیہ تین ری پبلیکن حکومتوں کے تحت بھی نہیں۔''وجہ بڑی سادہ تھی کہ ہو دینی بھی' سنگین اور خطرناک نتائج کا سامنا کئے بغیر اسے توڑ پھوڑ نہیں سکتا تھا۔''

آزاد مارکیٹ کے حامیوں کا کہنا ہے کہ حکومتیں کاروبار میں مداخلت کرتی ہیں۔ لیکن اگر یہ سب کچھ صرف نجی کاروباری اداروں پر چھوڑ دیا جاتا تو شاید صورت حال اس سے بالکل مختلف ہوتی اور صنعتی ارتقاء کی رفتار بہت ہی آہستہ ہوتی۔ حکومتوں نے ریلوے کو بڑی تیزی سے ترقی دی۔ انہوں نے بندر گاہیں' سڑکیں' نہریں' اور شاہراہیں تعمیر کیں۔

انہوں نے ڈاک کی سروس چلائی اور ٹیلی گراف' ٹیلی فون اور نشریاتی نظاموں کی تعمیر و ترویج کی۔ انہوں نے تجارتی ضابطے تدوین کئے اور مارکیٹوں کا معیار تشکیل دیا۔ انہوں نے صنعت کو سہارا دینے کے لئے' خارجہ پالیسی کے دباؤ اور محصولات کا استعمال کیا۔ کسانوں کو کھیتوں سے باہر نکالا اور اس طرح صنعتی مزدوروں کی رسد بڑھا دی اور عموماً ملٹری چینلز کے ذریعے توانائی اور ترقی یافتہ ٹیکنالوجی کو سب سڈائز کیا۔ غرض ہزارہا مواقع پر حکومتوں نے تشکیل ساز امور کی ذمہ داری اس طرح نبھائی کہ دوسرے ادارے یہ کر ہی نہیں سکتے تھے اور شاید کرتے بھی نہیں۔

حکومت ذرائع کو تیزی سے استعمال میں لا سکتی تھی کیونکہ اپنی زبردست قوت اور ٹیکس کی آمدنی کے ذریعے وہ تمام کام سرانجام دے سکتی تھی جو نجی اداروں کے بس کی بات ہی نہیں تھے۔ حکومتیں' نظام میں پیدا ہونے والے خلا کو پر کرنے کے لئے مناسب اقدامات کر کے' صنعتی ارتقاء کو نئی حرارت بخش سکتی تھیں تا کہ نجی کمپنیاں اپنے پیداواری عمل کو ممکن اور منافع بخش بنا سکیں۔ حکومتیں متوقع تشکیل و تدوین کا کام کر سکتی تھیں۔

وسیع پیمانے کی تعلیم کے سسٹم کی ترویج کے ذریعے نہ صرف حکومتوں نے صنعتی ورک فورس میں' نوجوان کاریگروں کے آئندہ کردار کے تعین میں ان کی مدد کی (یہ بھی حقیقتاً صنعت ہی کے فائدے میں تھا) بلکہ ساتھ ہی ساتھ' جوہری کنبے کی تشکیل و ترویج کی حوصلہ افزائی بھی کی۔ کنبے کو تعلیمی اور دوسرے روایتی فرائض سے آزاد کر کے' حکومتوں نے فیکٹری نظام کی ضروریات کے ساتھ' خاندانی ڈھانچے کی مطابقت کے عمل کو تیز تر کر دیا۔ اس طرح حکومتوں نے بہت سی مختلف سطحوں پر دوسری لہر کی ہمہ جہتی تہذیب کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کی۔ یہ قطعاً حیرانی کی بات نہیں کہ تشکیل سازی کی اہمیت بڑھنے کے ساتھ ساتھ حکومت کی ہیئت اور سٹائل دونوں ہی میں تبدیلی آ گئی۔ صدر' وزرائے اعظم' مثال کے طور پر خود کو تخلیقی' سماجی اور سیاسی رہنما کے بجائے محض منتظمین سمجھنے لگے۔ شخصیت اور انداز و اطوار سے وہ تقریباً ان افراد کا متبادل لگنے لگے جو بڑی بڑی کمپنیاں اور پیداواری ادارے چلا رہے تھے۔ جمہوریت اور سماجی انصاف کے بلند بانگ دعویداروں' صنعتی دنیا کے نکسنز کارٹرز' ہیتھز' برزلیفس' جیسکارڈز اور اوہیراز۔۔۔۔ نے مستعد انتظامیہ کی نسبتاً بہتر شکل کے وعدے پر

MashalBooks.org

اقتدار حاصل کر لیا۔

غرض ساری دنیا کے سوشلسٹ اور سرمایہ دار صنعتی معاشروں میں ایک ہی طرح کا پیٹرن ابھرا' بڑی بڑی کمپنیاں یا پیداواری اداروں اور ایک وسیع و عریض حکومتی مشین اور ذرائع پیداوار پر کارکنوں کا قبضہ ہونے کے بجائے' جیسا کہ مارکس کی پیش گوئی تھی یا آدم سمتھ کے پیروکاروں کی خواہشات کے مطابق' ارتکاز قوت سرمایہ داروں کے پاس ہی رہنے کے بجائے' ایک بالکل ہی نئی طاقت ان دونوں کو چیلنج کرنے کے لئے پیدا ہوگئی۔ کاریگران قوت نے ''ذرائع تشکیل و تدوین'' پر قبضہ جما لیا اور اس کے ساتھ ہی سماجی' سیاسی اور معاشی کنٹرول بھی سنبھال لیا۔ دوسری لہر کے معاشروں پر تشکیل کاروں کی حکومت رہی۔

طاقت کے اہرام

ان کاری گران قوت نے خود کو۔۔۔۔ اشرافیہ اور ماتحت اشرافیہ کے۔۔۔۔ مقدس گروہوں میں منظم کر دیا۔ ہر صنعت اور حکومتی شعبے نے' جلد ہی اپنے اپنے اداروں۔۔۔۔ اپنے اپنے طاقتور ''وہ'' کو جنم دیا۔ کھیل۔۔۔۔ مذہب ۔۔۔۔ تعلیم۔۔۔۔ ہر ایک کے اپنے اپنے طاقت کے اہرام تھے۔ سائنس کی انتظامیہ دفاع کی انتظامیہ ثقافتی انتظامیہ وجود میں آ گئیں۔ دوسری لہر کے معاشروں میں طاقت سینکڑوں' ہزاروں بلکہ لاتعداد ایسے ہی خصوصی مہارت کے حامل اشراف میں بانٹ دی گئی۔

جواباً ان ماہرین اشراف نے خود کو ان عمومیت (کلیت) پسند اشراف۔۔۔۔ جن کی رکنیت ہر طرح کی تخصیص پر خطِ تنسیخ پھیر دیتی تھی۔۔۔۔ کے ساتھ مجتمع کیا، مثلاً سوویت یونین اور مشرقی یورپ میں کمیونسٹ پارٹی کے اراکین' ہوا بازی سے لے کر موسیقی اور فولاد سازی تک' ہر شعبے میں موجود تھے۔ یہ اراکین' ایک ماتحت اشرافیہ سے دوسری کی جانب پیغام رسانی کرتے ہوئے' افواہ سازی کا ذریعہ بن جاتے تھے' کیونکہ ہر طرح کی اطلاعات انکی پہنچ میں تھیں اور ماتحت اشرافیہ کے ماہرین کو متحرک کرنے کے قابل رشک طاقت بھی انہی کے ہاتھ میں تھی۔ سرمایہ دار ملکوں میں' ممتاز کاروباری لوگ اور قانون دان ذرا غیر رسمی انداز میں' کسی شہری کمیٹی یا بورڈ کے لئے کام کرتے ہوئے' کم و بیش یہی فرائض انجام دیتے تھے۔ پتہ یہ چلا کہ دوسری لہر کی تمام اقوام میں تشکیل سازوں' افسر شاہی اور منتظمین کے ایسے

ماہر گروپس موجود ہیں جنہوں نے خود کو کلیت پسند تشکیل سازوں کے ساتھ مجتمع کر لیا۔

عظیم اشرافیہ

بالآخر سرمایہ کاری کا تعین کرنے والی ''عظیم اشرافیہ'' نے اور بھی بلند سطح پر تشکیل سازی کو بالجبر نافذ کر دیا۔ چاہے مالیات میں ہو یا صنعت میں' پینٹا گون میں ہو یا سوویت منصوبہ بندی کرنے والی افسر شاہی میں' صنعتی معاشرے میں بڑی سرمایہ کاری کا تعین کرنے والوں نے ان حدود کی نشان دہی بھی کر دی جن کے اندر اندر، خود تشکیل سازوں کو کام کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ ایک بار حقیقتاً بڑے پیمانے کی سرمایہ کاری کا فیصلہ کر لیا گیا، چاہے منی پولیس میں یا ماسکو میں، اس نے مستقبل میں چناؤ کے مواقع کو محدود کر دیا۔ کمیاب ذرائع کی صورت میں کوئی بھی شخص بیس سمر فرنیسز یا کریکنگ پلانٹس یا اسمبلی لائنز کو۔۔۔ جب تک ان پر صرف شدہ سرمایہ واپس وصول نہ ہو چکا ہو۔۔۔ بلاوجہ ہی ختم نہیں کر سکتا۔ ایک بار وجود میں آنے کے بعد سرمائے کے اس مجتمع ذخیرے نے وہ پیرا میٹرز طے کر دیئے، مستقبل کے مینجرز یا تشکیل کار جن کے اندر محدود ہو کر رہ گئے۔ بے جلد چہرہ فیصلہ سازوں کے انہی گروہوں نے، سرمایہ کاری کے لیورز کو کنٹرول کر کے تمام صنعتی معاشروں میں عظیم اشرافیہ کی تشکیل کی۔ اس طرح دوسری لہر کے ہر معاشرے میں اشرافیہ کی متوازی عمارت معرض وجود میں آ گئی اور۔۔۔ مقامی اونچ نیچ کے ساتھ۔۔۔ ہر بحران اور سیاسی گڑ بڑ کے نتیجے میں، طاقت کی اسی مخفی ہیئت نے دوبارہ جنم لے لیا۔ نام، نعرے، پارٹی لیبل اور امیدوار بدل گئے، انقلاب آئے یا ختم ہو گئے، نئے نئے چہرے بڑے بڑے مہا گنی ڈیسکوں کے پیچھے نمودار ہوتے رہے لیکن اقتدار کا بنیادی ڈھانچہ وہی رہا۔

پچھلے تین سو سال میں بارہا مختلف ملکوں میں یکے بعد دیگرے باغیوں اور اصلاح پسندوں نے۔۔۔ سماجی انصاف اور سیاسی مساوات پر مبنی نئے معاشرے کی تشکیل کے لئے اقتدار پر قبضے کی کوششیں کیں۔ وقتی طور پر ایسی تحریکوں نے آزادی کے خوش کن وعدوں کے ذریعے کروڑوں افراد کی جذباتی وابستگی بھی جیت لی۔ انقلاب پسندوں کو، بسا اوقات کسی حکومت کا تختہ الٹنے کے لئے استعمال کیا جاتا رہا۔ لایکن ہر بار نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ ہر دفعہ باغیوں نے اپنے پرچم تلے بھی خود اسی طرح کا اشرافیہ، ماتحت اشرافیہ اور عظیم

اشرافیہ کا۔۔۔۔ ڈھانچہ تشکیل دے ڈالا، کیونکہ یہ تشکیلی ڈھانچہ اور اس کے حکمران کاریگران قوت دوسری لہر کی تہذیب کے لئے اتنے ہی لازم و ملزوم تھے جتنا کہ فیکٹریاں، معدنی ایندھن یا جوہری گھرانے۔ صنعتی راج اور اس کی موعودہ کامل جمہوریت، دراصل ایک دوسرے کی ضد تھے۔

انقلابی عمل یا کسی اور طریقے سے، صنعتی اقوام کو آزاد مارکیٹ سے مرکزی منصوبہ بندی کے تناظر میں آگے پیچھے کیا جا سکتا تھا۔ وہ سرمایہ دار معیشت سے سوشلسٹ معیشت کی طرف پیش رفت یا اس سے مراجعت کر سکتی تھیں۔ لیکن واضح شکل صورت والے چیتے کی طرح، وہ اپنے نشانات کو تبدیل نہیں کر سکتی تھیں۔ وہ تشکیل سازوں کی طاقتور تنظیم کے بغیر، چل ہی نہیں سکتی تھیں۔

آج جیسے جیسے تبدیلی کی تیسری لہر، انتظامی قوت کے اس قلعے پر اپنے حملے شروع کر رہی ہے اس طاقتور نظام میں ابتدائی شگاف پڑنے لگے ہیں۔ فیصلہ سازی میں شمولیت، کارکن، صارفین اور شہریوں کے کنٹرول اور متوقع جمہوریت کے لئے انتظامی امور میں شرکت کے مطالبات، یکے بعد دیگرے، ہر قوم میں زور پکڑتے جا رہے ہیں۔ انتہائی ترقی یافتہ صنعتوں میں، مروجہ طریقوں سے ہٹ کر اور وقتی ضروریات پر مبنی نئے تنظیمی طور طریقے جنم لے رہے ہیں۔ اختیارات کے عدم ارتکاز کے لئے دباؤ میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور مینجرز نیچے سے آنے والی اطلاعات کے زیادہ محتاج ہوتے جا رہے ہیں۔ اسی لئے اشرافیہ خود بھی نسبتاً غیر مستقل اور غیر محفوظ ہوتی جا رہی ہے۔ یہ سب صنعتی نظام میں پیدا ہونے والے مدوجزر کی ابتدائی وارننگز ہیں، پیش آمدہ انقلاب کی جانب محض اشارے ہیں۔

ان صنعتی ڈھانچوں کی شکست و ریخت کا آغاز کر کے تیسری لہر نے سماجی اور سیاسی انقلاب کے لئے عظیم الشان مواقع کا راستہ کھول دیا ہے۔ آنے والے چند ہی سالوں میں نئے اور شاندار ادارے ہمارے ناکارہ، پرتشدد اور دقیانوسی تشکیل ساز ڈھانچوں کی جگہ لے لیں گے۔ نئے تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں اپنے فرسودہ سیاسی نظام کا مشاہدہ کرنے کے لئے اس کے ایکسرے کی ضرورت ہے کہ یہ دوسری لہر کی تہذیب کے چوکھٹے میں کس طرح فٹ ہوا، اس نے صنعتی راج اور اس کی اشرافیہ کی کس طرح خدمت کی، اس

کے بعد ہی یہ بات ہمارے لئے قابل فہم ہو گی کہ اب یہ نظام ہمارے لئے موزوں اور قابل برداشت کیوں نہیں رہا۔

MashalBooks.org

باب5

پوشیدہ بلو پرنٹ

ایک فرانسیسی کے لئے امریکی صدارتی مہم کے منظر سے زیادہ پریشان کن مشاہدہ کوئی نہیں: ہاٹ ڈاگ کا مزے لے لے کر اڑایا جانا' جذباتی طریقے سے پیٹھ ٹھونکنا' شیر خواروں کو پیار کرنا۔ والہانہ جوش وخروش سے فنڈز اکٹھے کرنا، شور شرابا، تقریریں، ٹیلی ویژن پر اشتہارات اور ان کے جلو میں پرائمری پارٹی انتخابات اور کنونشن۔۔۔۔ اور یہ سب کچھ جمہوریت کے نام پر کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس امریکی۔ فرانسیسی انتخابات کے طور طریقوں سے واقف نہیں اور اس سے بھی کہیں آگے برطانوی چناؤ کا سیدھا سادا انداز، جرمنی کا دو درجن جماعتوں پر مشتمل کھلا ڈلا انتخاب اور آسٹریلین ترجیحی ووٹ کا نظام یا جاپانیوں کا اپنے مختلف الخیال گروہوں کے مابین انداز ہم آہنگی۔۔۔۔ غرض یہ سب کچھ ان کی سمجھ سے خاصی باہر کی چیزیں ہیں۔ یہ تمام سیاسی سسٹم، خوفناک حد تک ایک دوسرے سے مختلف محسوس ہوتے ہیں۔ سوویت یونین اور مشرقی یورپ میں یک جماعتی الیکشن یا نام نہاد انتخابات تو کچھ ہی نا قابل فہم لگتے ہیں۔ سیاست کی حد تک کوئی بھی دو صنعتی اقوام، ایک جیسی محسوس نہیں ہوتیں لیکن علاقائی تعصّبات کی عینک اتار کر دیکھنے سے اچانک یہ معلوم ہو گا کہ سطحی اختلافات کے نیچے، انتہائی طاقتور مماثل کا ایک پورا سیٹ موجود ہے۔ حقیقت میں محسوس یوں ہوتا ہے جیسے دوسری لہر کے تمام قوموں کے سیاسی نظام ایک ہی پوشیدہ بلو پرنٹ کے مطابق تشکیل دیئے گئے تھے۔

دوسری لہر کے انقلابیوں نے جب پہلی لہر کی اشرافیہ کا فرانس، امریکہ، روس، جاپان اور دوسری اقوام میں تختہ الٹا تو انہیں نئے تحریری آئین، نئی حکومتوں کی تشکیل اور تقریباً سارے ہی نئے سیاسی اداروں کی تعمیر کی ضرورت محسوس ہوئی۔ تخلیقی جوش اور ولولے سے متاثر ان لوگوں نے نئے خیالات اور نئے ڈھانچوں پر خوب بحث وتمحیص کی۔ ہر جگہ

نمائندگی کی ہیئت پر اچھی خاصی لے دے ہوئی۔ کس کو کس کی نمائندگی کرنی چاہئے؟ کیا نمائندوں کو پابند کر دیا جائے کہ لوگ انہیں کس طرح ووٹ دیں یا۔۔۔ اس معامل میں نمائندوں کو اپنی رائے کا استعمال کرنا چاہئے؟ رکنیت کا عرصہ طویل ہو یا مختصر؟ سیاسی جماعتوں کا کیا کردار ہونا چاہئے؟

ان تنازعات اور مباحثوں کے نتیجے میں ہر ملک میں ایک نیا سیاسی ڈھانچہ وجود میں آیا۔ ان ڈھانچوں پر گہری نظر ڈالنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ پرانی لہر کے مفروضوں اور صنعتی دور کے نسبتاً نئے تصورات کی باہمی آمیزش کے نتیجے میں تعمیر ہوئے۔

ہزار ہا سال پر محیط زرعی دور کے بعد دوسری لہر کے سیاسی نظام کے بانیوں کے لئے زمین کی بجائے محنت، سرمائے، توانائی اور خام مال پر مبنی ایک معیشت کا تصور خاصا مشکل کام تھا۔ زمین ہمیشہ ہی زندگی کا مرکز اور محور رہی تھی۔ اسی لئے یہ قطعاً مقام حیرت نہیں کہ ہمارے مختلف انتخابی نظاموں میں جغرافیائی تجسیم خاصی گہری نظر آتی ہے۔ امریکہ میں، سینیٹرز اور کانگریس مین، نیز برطانیہ اور دوسرے صنعتی ممالک میں ان کے ہم منصب ابھی تک کسی خاص سماجی طبقے یا پیشہ ور، مذہبی، جنسی یا مخصوص طرز زندگی پر مبنی گروپنگ کے نمائندوں کے طور پر منتخب نہیں ہوتے بلکہ زمین کے ایک خاص علاقے کے باشندوں کے نمائندے کے طور پر ایک جغرافیائی ضلع سے منتخب ہوتے ہیں۔ پہلی لہر کے لوگ عموماً غیر متحرک ہوتے تھے، اس لئے صنعتی دور کے سیاسی نظاموں کے معماروں کی یہ سوچ فطری تھی کہ لوگ اپنی زندگیاں ایک ہی مقام پر گزار دیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی انتخابی قواعد میں مقام انتخاب (ووٹ کے حلقے) میں رہائش پذیری بہت اہم ہے۔ پہلی لہر کی زندگی بہت سست روتھی ذرائع ابلاغ اتنے دقیانوسی اور ابتدائی شکل کے تھے کہ فلاڈیلفیا میں براعظمی کانگریس کا ایک پیغام نیویارک تک پہنچنے میں پورا ہفتہ لگ جاتا تھا۔ جارج واشنگٹن کی ایک تقریر کو اندرونی علاقوں تک پہنچتے پہنچتے ہفتوں یا مہینوں کا وقت لگا۔1865ء کے زمان میں بھی لنکن کے قتل ہو جانے کی خبر، لندن بارہ دن کے بعد پہنچی۔اسی ان کہے مفروضے کی بنیاد پر کہ معاملات آہستہ رو ہوتے ہیں۔۔۔ کانگریس اور برطانوی پارلیمان جیسے اداروں کو ''استدلال پسند'' سمجھا جاتا تھا جن کے پاس بے بہا وقت تھا اور وہ اپنے مسائل پر سوچ

MashalBooks.org

بچار کے لئے پورا پورا وقت لیتے بھی تھے۔

پہلی لہر کے زیادہ تر لوگ جاہل اور انجان تھے۔ چنانچہ وسیع تناظر میں یہ فرض کر لیا گیا کہ عام ووٹروں کے بجائے، اگر نمائندوں کا انتخاب، خاص طور پر تعلیم یافتہ طبقات سے کیا جائے تو بلا شبہ، وہ زیادہ دانش مندانہ فیصلے کریں گے۔

بہر حال پہلی لہر کے ان مفروضوں کو ہمارے سیاسی اداروں میں شامل کرتے ہوئے دوسری لہر کے انقلابیوں کی نگاہیں مستقبل پر بھی جمی ہوئی تھیں، چنانچہ ان کے تعمیر کردہ ڈھانچے میں ان کے دور کی انتہائی جدید ٹیکنالوجی کے کئی تصورات کی جھلک صاف محسوس ہوتی ہے۔

تکنیکی مہارت کا خبط

ابتدائی صنعتی دور کے کاروباری حضرات، دانش ور اور انقلاب پسند واقعتاً مشینری سے ہپناٹائز ہو گئے تھے۔ وہ بھاپ کے انجن، دیوار گیر گھڑیوں، کھڈیوں، پمپوں اور پسٹنوں سے بے پناہ متاثر تھے چنانچہ انہوں نے اپنے دور کی سادہ میکانکی ٹیکنالوجیز کی بنیاد پر ایسی ہی دیگر لا تعداد اشیاء بنا ڈالیں۔ یہ محض اتفاق نہیں تھا کہ بنجمن فریلنکن اور تھامس جیفرسن جیسے لوگ سائنس دان اور موجد ہونے کے ساتھ ساتھ سیاسی انقلابی بھی تھے۔ وہ نیوٹن کی عظیم دریافتوں اور زبردست ثقافتی ہلچل کے دور میں پھلے پھولے۔ نیوٹن نے فلکیات پر تحقیق کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا کہ تمام کائنات کا ایک بہت بڑا کلاک ورک ہے جو انتہائی مکینکل باقاعدگی سے کام کر رہا ہے۔ لامیٹری۔۔۔ ایک فرانسیسی معالج اور مفکر نے 1748ء میں خود انسان کو ہی مشین قرار دے دیا۔ آدم سمتھ نے بعد ازاں مشین کی مطابقت کو معاشیات کے ساتھ نتھی کر دیا۔ ان کا دعویٰ تھا کہ معیشت ایک سسٹم ہے اور یہ سسٹم ''بہت سے جہتوں میں مشینوں سے ملتے جلتے ہیں۔''

جیمز میڈیسن نے ان مباحث کی تشریح و توضیح۔۔۔ جو امریکی آئین پر منتج ہوئے۔۔۔ کے دوران ''سسٹم'' کو ''ری ماڈل'' کرنے، سیاسی طاقت ''ڈھانچے'' کو تبدیل کرنے اور سرکاری افسروں کا ''مسلسل فلٹریشن'' کے ذریعے چناؤ کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ آئین تو خود ہی کسی عظیم الجثہ کلاک کے اندرونی افعال کی طرح ''چیکس اینڈ

بیلنسز'' سے بھرا پڑا تھا، جیفرسن نے ''حکومت کی مشینری'' پر اظہار خیال کیا۔

امریکی سیاسی سوچ فلائی وہیلز، چینز، گیئرز اور چیک اینڈ بیلنس کی گونج میں مسلسل ارتقاء پذیر رہی چنانچہ مارٹن وان بیورن نے ''سیاسی مشین'' ایجاد کی اور نتیجتاً نیویارک شہر کو اس کی ٹویڈ مشین، ٹینیسی کو اس کی کرمپ مشین، نیوجرسی کو ہیگ مشین حاصل ہو گئیں۔ امریکی سیاست دانوں کی نسلیں موجودہ دور تک کانگریس اور ریاستی قانون ساز اداروں کے ذریعے سیاسی ''بلیو پرنٹس'' ' ''انجینئرڈ الیکشن'' سٹیم رولر ڈیا ''ریل روڈ'' بل تیار کرتی رہیں۔ انیسویں صدی میں برطانیہ میں لارڈ کرامر نے ایک ایسی شاہی حکومت کا تصور پیش کیا جو ''مشین کے مختلف حصوں کی فاعلانہ ہم آہنگی کو یقینی بنائے گی۔''

ایسا نہیں ہے کہ یہ میکانکی ذہنیت صرف سرمایہ دارانہ نظام کا ہی خاصا تھی۔ مثلاً لینن نے بڑی وضاحت سے یہ بات کہیں کہ ''ریاست کا وجود ایک ایسی مشین سے زیادہ کچھ نہیں جسے سرمایہ دار، کارکنوں کو دبانے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ ٹراٹسکی نے ''بورژوا سماجی میکا مکیت کے تمام وہیلز اور سکریوز'' کے بارے میں نہ صرف اپنی رائے دی بلکہ ایسے ہی میکانکی حالات میں انقلابی پارٹی کے فرائض تک کی تفصیلی نشان دہی کر ڈالی۔ ریاست کو ایک طاقتور ''آپریٹس'' کا نام دیتے ہوئے اس نے خیال ظاہر کیا کہ ''کسی بھی میکنزم کی طرح یہ اپنی ذات میں غیر متحرک ہے۔۔۔۔ عوام نے تحریک کے ذریعے۔۔۔۔ اس کے بے جان اندرونی اعضاء پر قابو پانا ہے اس سے پہلے کہ مشین اپنے فرائی وہیلز کو متحرک کرے، سٹیم کی جاندار طاقت کو مشین کے اندرونی کل پرزوں پر ہر صورت قبضہ کرنا ہوگا۔

اتنی میکانکی سوچ کے حامل اور مشین کی استعداد اور طاقت پر اندھا اعتقاد رکھنے والے، دوسری لہر کے معاشروں، سرمایہ دارانہ ہو یا سوشلسٹ، دونوں ہی کے انقلابی قائدین نے متوقع طور پر ایسے سیاسی ادارے تشکیل دیئے جنکی خاصی خصوصیات ابتدائی صنعتی مشینوں کی خصوصیات سے مشابہ ہیں۔

نمائندگی کی زنبیل

نٹ بولٹ کے ذریعے مجتمع کئے گئے انکے یہ ڈھانچے نمائندگی کے ابتدائی اصول پر مبنی تھے۔ ہر ملک میں انہوں نے بعض معیاری پرزوں کا یقینی استعمال کیا۔ یہ حصے یا

پرزے، اپنی ادھوری شکل میں، نمائندگی کی ایک عالمی زنبیل میں سے نکلنا شروع ہوئے۔ یہ کل پرزے کچھ اس طرح تھے۔

1۔ ووٹ سے مسلح افراد۔

2۔ ووٹ مجتمع کرنے والی پارٹیاں۔

3۔ امیدوار، جو ووٹ جیتنے کی صورت میں فوراً ہی ووٹرز کے نمائندے بن جاتے۔

4۔ قانون ساز ادارے (پارلیمان، ڈائٹس، کانگریسز، بنڈستاگ یا اسمبلیاں) جن میں ووٹنگ کے ذریعے نمائندے قانون سازی کرتے تھے۔

5۔ انتظامیہ (صدور، وزرائے اعظم، پارٹی کے سیکریٹریز) جو پالیسی کی شکل میں، قانون سازمشین کے لئے خام مال مہیا کرتیں اور پھر منظور شدہ قوانین کا نفاذ کرتیں۔

ووٹ، نیوٹن کے اس میکنزم کا بنیادی ''جوہر'' تھے۔ ووٹ مجتمع کرنا پارٹیوں کا کام تھا جو نظام میں ہمی جہتی تنظیم کی حیثیت سے کام کرتی تھیں۔ وہ مختلف ذرائع سے ووٹ اکٹھے کرتیں اور انہیں انتخابی مشین میں ڈال دیتیں جو پارٹی کی قوت یا آمیزش کے تناسب سے انہیں مجتمع کر کے، اپنے پیداواری عمل کا نتیجہ ''لوگوں کی عوامی خواہش'' کی شکل میں۔۔۔ وہ بنیادی ایندھن جومفروضہ طور پرحکومت کی مشینری کو طاقت بخشتا تھا۔۔۔ وہ بنیادی ایندھن جومفروضہ طور پرحکومت کی مشینری کو طاقت بخشتا تھا۔۔۔ سامنے لے آتا۔

اس زنبیل کے کل پرزوں کو اکٹھا کر کے مختلف ملکوں میں، مختلف طریقوں سے استعمال کیا گیا۔ بعض جگھوں پر اکیس سال سے زیادہ عمر کے ہر فرد کو ووٹ کا حق دیا گیا، بعض علاقوں میں صرف سفید فام مردوں کو چناؤ کے عمل میں شریک کیا گیا۔ ایک ملک میں یہ سارا عمل، ایک آمر کے کنٹرول کو مزید مضبوط بنانے کا ذریعہ بنا۔ کہیں اور منتخب حکام نے حد سے زیادہ اختیارات پر قبضہ جما لیا۔ کہیں دو جماعتی نظام تھا اور کہیں کثیر جماعتی اور کہیں صرف یک جماعتی سسٹم تھا، بہر حال تاریخی رجحان بڑا واضح ہے کل پرزوں یا حصوں میں تبدیلی یا انکی اولا بدلی کے باوجود تمام صنعتی اقوام کی عمومی سیاسی مشینری کی تعمیر میں وہی بنیادی کٹ استعمال ہوتی رہی۔

اگر چہ کمیونسٹ ''بورژوا جمہوریت'' اور ''پارلیمنٹرین ازم'' پر مسلسل حملہ آور ہوتے رہے۔ انہوں نے اسے مخصوص طبقات کا ماسک قرار دیا کیونکہ اس میکنزم کے ذریعے سرمایہ دار اپنے ذاتی مفادات کے تحفظ اور حصول کو یقینی بناتے تھے لیکن۔۔۔ اس کے باوجود۔۔۔ تمام سوشلسٹ صنعتی قوموں نے جلد از جلد کم وبیش اسی طرح کی ''نمائندگی کی مشینیں'' لگا ڈالیں۔

دور نمائندگی کے مابعد، کسی دور ازکار زمانے میں ''براہ راست جمہوریت'' کے وعدے پر قائم رہتے ہوئے انہوں نے فی الوقت زیادہ ''سوشلسٹ نمائندہ اداروں'' پر انحصار کیا۔ ہنگری کا کمیونسٹ مصنف اورٹو بہاری، ان اداروں کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتا ہے۔ ''انتخابات کے دوران محنت کش عوام کی خواہشات کے اثرات حکومتی شعبوں میں پوری طرح محسوس ہوتے ہیں اور ووٹ کے ذریعے، ان میں نئی جان پڑ جاتی ہے۔'' پراودا کے ایڈیٹروی۔جی۔افاناسیف اپنی کتاب ''معاشرے کا سائنسی انتظام وانصرام'' میں ''جمہوری مرکزیت'' کی تعریف میں مندرجہ ذیل کوشامل کیا ہے۔ ''محنت کش عوام کا اقتدار اعلیٰ۔۔۔ حکومتی اداروں اور لیڈروں کے انتخابات اور ان کی عوام کے سامنے جواب دہی۔''

جس طرح فیکٹری پورے صنعتی تکنیکی دائرے کا سمبل بن گئی تھی، بالکل اسی طرح نمائندہ حکومت (چاہے کتنی ہی بگڑی ہوئی شکل کی کیوں نہ ہو) ہر ترقی یافتہ قوم کی سٹیٹس سمبل قرار پائی۔ حقیقتاً بعض غیر صنعتی اقوام نے بھی۔۔۔ نوآبادکاروں کے دباؤ میں آکر یا اندھی تقلید کے چکر میں۔۔۔ ایسے ہی عمومی میکانزم کے قیام کے لئے دوڑ لگا دی اور انہوں نے بھی نمائندگی کی اسی عالمی زنبیل سے استفادہ کیا۔

ارضی قانون فیکٹری

ایسا نہیں تھا کہ یہ ''جمہوری مشینیں''، صرف قومی سطح تک ہی محدود تھیں بلکہ یہ ریاستی، صوبائی اور مقامی سطحوں بلکہ نچلی سطح پر قصبے یا گاؤں کی کونسل تک پہنچا دی گئیں۔ آج صرف امریکہ میں لگ بھگ پانچ لاکھ منتخب سرکاری حکام ہیں اور پچیس ہزار آٹھ سو انہتر، میٹروپولیٹن علاقوں میں مقامی حکومت کی اکائیاں ہیں' ان میں سے ہر ایک کا اپنا انتخابی طریق کار ہے، انتخابات ہیں اور نمائندہ ادارے ہیں۔ اسی طرح کی ہزاروں نمائندگی کی

مشینیں نان میٹروپولیٹین علاقوں میں اور ہزاروں لاکھوں سے زیادہ تعداد میں، پوری دنیا میں زورشور سے چلے جا رہی ہیں۔ وسئس ضلعوں اور فرانسیسی تعلقوں میں، برطانوی دیہی علاقوں اور کینیڈا کے صوبوں میں، پولینڈ کی اکائیوں اور سوویت یونین کی جمہوریتوں میں، سنگاپور اور حیضہ میں، اوسا کا اور اوسلو میں۔۔۔۔غرض ہر جگہ امیدوار عہدے کے لئے انتخاب لڑتے ہیں اور طلسمی انداز میں ''نمائندوں'' کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔محتاط اندازے کے مطابق اسی طرح کی ایک لاکھ سے زیادہ مشینیں، صرف دوسری لہر کے ممالک میں، قوانین، احکامات، ضابطے اور قواعد بنانے میں دھڑا دھڑ مصروف ہیں۔

نظریاتی طور پر جس طرح ہر انسان اور ہر ووٹ ایک منفرد جوہری اکائی تھا اسی طرح ان تینوں میں سے ہر سیاسی اکائی۔۔۔۔قومی، صوبائی اور مقامی۔۔۔۔بھی منفرد اور جوہری تسلیم کی گئی۔ ہر ایک کی اپنی اپنی محتاط طریقے سے۔متعین حدود تھیں اسکے اپنے اختیارات تھے اور اپنے اپنے حقوق وفرائض تھے۔ یہ تمام اکائیاں انتہائی فطری انداز میں بالائی سطح سے نچلی سطح تک، قوم سے ریاست یا علاقے یا مقام حاکمیت تک ایک دوسرے سے جڑی ہوئی تھیں۔لیکن جوں جوں صنعتی نظام طاقت ور ہوتا گیا اور معیشت تیزی سے تشکیل پذیر ہونے لگی ان سیاسی اکائیوں میں سے ہر ایک کے فیصلوں کے اثرات، ان کی اپنی حدود سے باہر ظاہر کر کر، دوسرے سیاسی اداروں کو جوابی ردعمل کے لئے مجبور کرنے لگے۔

جاپانی ٹیکسٹائل کی صنعت کے متعلق ایک قومی کانفرنس کا فیصلہ شمالی کیرولینا میں روزگار اور شکاگو میں فلاحی خدمات کو متاثر کر سکتا تھا۔ غیرملکی گاڑیوں پر کوٹہ نافذ کرنے کے متعلق کانگریس کا ووٹ، نگویا یا ٹورین میں مقامی حکومتوں کے لئے اضافی کام نکال سکتا تھا۔ چنانچہ سیاست دانوں کے لئے ایسے فیصلے کرنا ناممکن سے ناممکن ہوتا چلا گیا، جن کے اثرات ان کی اپنی واضح متعین حدود سے باہر کے حالات کو اپ سیٹ نہ کریں۔ بیسویں صدی کے وسط تک لاکھوں بظاہر مقتدر یا آزادہ سیاسی اتھارٹیز۔۔۔۔ دنیا کے ہر گوشے میں پھیلی ہوئی۔۔۔۔معیشت کے پھیلاؤ کے ذریعے، حد سے زیادہ بڑھے ہوئے سفر، مائیگریشن اور ذرائع ابلاغ کے ذریعے ایک دوسرے سے باہم منسلک ہو چکی تھیں تاکہ وہ ایک دوسرے کو

مسلسل متحرک اور پر جوش رکھ سکیں۔ نمائندگی کی زنبیل سے حاصل شدہ کل پرزوں کے ذریعے نمائندگی کے ہزاروں تعمیر شدہ میکانزم، بڑھتے بڑھتے نظر نہ آنے والی واحد سپر مشین۔ ارضی قانون فیکٹری کی تشکیل تک آن پہنچے۔ اب صرف یہ دیکھنا باقی رہ جاتا ہے کہ کس طرح اس ارضی سسٹم کے لیورز اور کنٹرول وہیلز کا استعمال ہوا۔۔۔۔ اور کس کے ذریعے۔

دوبارہ اعتماد کی روایت

دوسری لہر کے انقلابیوں کے خواب آزادی کے نتیجے میں برآمد ہونے والی نمائندہ حکومت سابقہ نظام اختیارات کے مقابلے میں ایک حیرت انگیز پیش رفت تھی۔ سٹیم انجن یا ہوائی جہاز کی ایجاد سے کہیں زیادہ اپنے ہی انداز کی عظیم ٹیکنالوجیکل فتح تھی۔ نمائندہ حکومت نے وراثتی حکمرانی کے بغیر اپنے منصب تسلسل کو ممکن بنا دیا۔ اس نے معاشرے کے اعلیٰ اور ادنیٰ طبقات میں باہمی رابطوں کے راستے کھولے۔ اس نے مختلف گروپوں کے درمیان موجود اختلافات کو طے کرنے کے لئے ایک اکھاڑہ فراہم کیا۔ اکثریت کی حکمرانی اور ایک آدمی ایک ووٹ کے نظریئے کے تحت، اس نے معاشرے کے تشکیل ساز انجن کو چلانے والے کاریگران قوت سے مفادات کے حصول میں غریب اور کمزور طبقات کی مدد کی۔ انہی وجوہات کی بنا پر نمائندہ حکومت کی توسیع تاریخ میں ایک زبردست انسانیت پسند کامیابی ہے۔ لیکن ابتدا ہی سے یہ اپنے وعدے کی تکمیل نہیں کر پائی، اسکی اپنی تعریف۔۔۔۔ حکومتی کنٹرول عوام کے ذریعے۔۔۔۔ تصور کی حد تک ہی محدود رہی، کبھی عمل پذیر نہ ہوسکی۔ اس نے کہیں بھی صنعتی اقوام کے تحتی ڈھانچے۔۔۔۔ ماتحت اشرافیہ، اشرافیہ اور عظیم اشرافیہ کے ڈھانچے۔۔۔۔ کو واقعتاً تبدیل نہیں کیا۔ حقیقت یہ تھی کہ انتظامی اشرافیہ کے کمزور ہوتے ہوئے کنٹرول کے باوجود بھی نمائندگی کی عمومی مشینری تشکیل کا ایک بنیادی ذریعہ بن گئی۔ سچ کے ذریعے انہوں نے خود کو اقتدار میں قائم رکھا۔

چنانچہ انتخابات، اس سے قطع نظر کہ کون جیتا، اشرافیہ کے لئے ایک طاقتور ثقافتی فریضہ ادا کرنے لگے۔ ہر شخص کے ووٹ کی حد تک انتخابات نے مساوات کا ایک عجیب تصور دیا۔ ووٹ کے عمل نے دوبارہ اعتماد کے حصول کی عوامی ریت کی داغ بیل ڈالی' لوگوں

کو یہ احساس دیا کہ مواقع منظّم انداز میں' مشینی باقاعدگی کے ساتھ اور معقول طریقے سے پیدا کئے جا رہے ہیں۔ انتخابات دراصل شہریوں کے لئے کفایتاً اس یقین دہانی کا ذریعہ تھے کہ وہ اب بھی با اختیار ہیں۔۔۔۔کم از کم نظریاتی طور پر انہیں لیڈروں کو منتخب کرنے یا مسترد کرنے کا اختیار تو تھا۔ سرمایہ دارا اور سوشلسٹ، دونوں طرح کے ممالک میں یہ رسم اتعماد، بہت سے انتخابات کے حقیقی نتائج سے کہیں زیادہ اہمیت کی حامل تھی۔ تشکیل ساز اشرافیہ نے پارٹیوں کی تعداد کو کنٹرول کر کے یا ووٹ کی اہلیت میں ردوبدل کر کے ہر جگہ سیاسی مشینری کو مختلف انداز میں چلایا۔ لیکن انتخابی رسم۔۔۔۔کوئی اسے تکلیف دہ مذاق بھی کہہ سکتا ہے۔۔۔۔ بہر حال ہر جگہ ادا کی گئی۔ اگرچہ سوویت یونین اور مشرقی یورپ کے انتخابات میں 99% سے 100% تک کی حیرت انگیز اکثریت کے نتائج ایک عمومی سلسلہ تھے مگر پھر بھی یہ حقیقت ظاہر کرتی ہے کہ ''آزاد دنیا'' کی طرح مرکزی منصوبہ بند معاشروں میں بھی بار بار اعتماد کے حصول کی اہمیت کچھ کم نہیں تھی۔ انتخابات کے ذریعے نچلی سطح سے' احتجاجی غباروں کی ہوا نکل جاتی تھی۔ مزید برآں، جمہوری اصلاح پسندوں اور انقلابیوں کی جدوجہد کے باوجود تشکیل ساز اشرافیہ نے نمائندہ حکومت کے نظاموں پر اپنا حق حقیقی قبضہ برقرار رکھا۔۔۔۔ کیوں؟۔۔۔۔ اس سوال کی وضاحت کے لئے بہت سے نظریات پیش کئے جا چکے ہیں۔ لیکن ان میں سے اکثر نظریات، نظام کی مکانکی ہیئت کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ اگر ہم دوسری لہر کے سیاسی سسٹم کا مشاہدہ، ایک سیاسی سائنس دان کے بجائے ایک انجینئر کی آنکھوں سے کریں تو اچانک عموماً نظروں سے اوجھل رہ جانے والی ایک بنیادی حقیقت ہمارے سامنے آ کھڑی ہوتی ہے۔

صنعتی انجینئرز' مشین کی بنیادی طور پر دو مختلف قسموں کے درمیان' عموماً امتیاز روا رکھتے ہیں۔ ایک وہ مشینیں جو رک رک کر' وقفے سے چلتی ہیں۔ انہیں BATCH PROCESSING مشینیں کہا جاتا ہے اور دوسری وہ مشینیں، جو بلا کسی مداخلت کے مسلسل چلتی رہتی ہیں۔ انہیں ''مسلسل بہاؤ'' کی مشینیں کہا جاتا ہے۔ پہلی مشین کی مثال، ایک عام سا پنچ پریس ہے۔ کارکن دھاتی پلیٹوں کا ایک جتھا لا کر اس میں داخل کر دیتا ہے۔ وہ ایک وقت میں ایک یا کئی پلیٹوں کو مطلوبہ شکل میں ڈھالتا ہے۔ جب جتھا ختم ہو جاتا ہے

MashalBooks.org

تو نئے جتھے کے لائے جانے کے دوران مشین رکی رہتی ہے۔ دوسری طرح کی مشین کی مثال آئل رفائن ری کی ہے جو ایک بار شروع ہو کر، چلنا بند نہیں کرتی، چوبیس گھنٹے آئل، اس کے پائپوں، ٹیوبوں اور چیمبرز میں سے گزرتا رہتا ہے۔

اگر ہم ارضی قانون فیکٹری پر نظر دوڑائیں تو یہ اپنے چناوٴ کے دورانسے کے باعث، ہمیں باکل ایک کلاسیکل وقفہ جاتی عمل سے مماثل محسوس ہوتی ہے۔ عوام کو مخصوص اوقات میں، امیدواروں کے درمیان انتخاب کرنے کی اجازت ہوتی ہے جس کے بعد عمومی ''جمہوری مشین'' کی دوبارہ حرکت بند کر دی جاتی ہے۔ اب اس کا موازنہ مختلف منظّم مفادات' پریشر گروپس اور طاقت کے کھیل میں شریک کے اثر ورسوخ کے مسلسل بہاوٴ سے کیجئے۔ کارپوریشنوں، حکومتی ایجنسیوں، محکموں اور وزارتوں کی جانب سے ماہرین اور مشیر، کمیٹیوں کے سامنے دلائل کے انبار لگا دیتے ہیں، فیصلہ سازوں کے گرد گھیرا ڈالتے ہیں ایک ہی طرح کے ریسپشن اور بینکوئٹس میں شریک ہوتے ہیں۔ واشنگٹن میں کاک ٹیل کے ساتھ اور ماسکو میں واڈکا کے ساتھ ایک دوسرے کا جام صحت تجویز کرتے ہیں۔ معلومات لیتے ہیں اور اثر ورسوخ کی تیز حرکت پذیری کے ذریعے۔۔۔۔ روزانہ کی بنیاد پر۔۔۔۔ فیصلہ سازی کے عمل پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

مختصراً اشرافیہ نے، جمہوری وقفہ جاتی عمل کے ساتھ ساتھ (اور بعض اوقات متضاد مقاصد کے لئے) چلانے کے لئے ایک طاقتور مسلسل بہاوٴ کی مشین تخلیق کر ڈالی۔ ان دونوں مشینوں کے ایک ساتھ مشاہدے سے ہمارے لئے یہ سمجھنا آسان ہو جاتا ہے کہ ریاستی طاقت، حقیقتاً کس طرح ارضی قانون فیکٹری میں استعمال کی گئی، جب تک نمائندگی کا کھیل کھیلا جاتا رہا، لوگوں کے پاس مواقع کا یہی بہترین دورانیہ ہوتا تھا جس میں وہ ووٹ کے ذریعے حکومت اور اس کے کارناموں کی منظوری یا استرداد کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کر سکتے تھے۔ کاریگران قون، اس کے برعکس ان کارگزاریوں پر مسلسل اثر انداز ہو سکتے تھے۔ انجام کار، سماجی کنٹرول کا ایک اور بھی زیادہ کارآمد آلہ، اصول نمائندگی کے اندر تشکیل دیا گیا کیونکہ دوسرے لوگوں کی نمائندگی کے لئے چند لوگوں کا محض انتخاب، اشرافیہ میں چند اور اراکین کا اضافہ کر دیتا۔ مثلاً جب کارکنوں نے یونین سازی کے حق کے لئے اپنی

جدوجہد کا آغاز کیا۔ انہیں بری طرح خوف زدہ کیا گیا۔ ان پر سازش کرنے مقدمات چلائے گئے، کمپنی کے جاسوس تعاقب میں لگ گئے، انہیں پولیس یا کرائے کے ٹٹوؤں کے ہاتھوں زدوکوب کرایا گیا۔ انہیں باہر کے لوگ سمجھا گیا کیونکہ نظام میں ان کی نمائندگی یا تو تھی ہی نہیں یا ناکافی تھی۔

لیکن ایک بار اپنا وجود منوا لینے کے بعد انہی یونینوں نے تشکیل کاروں کا ایک نیا گروپ۔۔۔۔ مزدور انتظامیہ۔۔۔۔ بنا ڈالا، جس کے اراکین صرف کارکنوں کی نمائندگی کے بجائے کاروباری اور حکومتی معاملات میں اپنے طبقے اور حکومت کے درمیان رابطہ کار بن گئے۔ جارج منیز اور جارج سیگوئز نے اپنے مبالغہ آمیز تصورات کے باوجود خود کو تشکیل کار اشرافیہ کا اہم رکن منوالیا۔ سوویت یونین اور مشرقی یورپ کے خود ساختہ یونین لیڈروں کا کوئی کردار نہیں تھا، وہ صرف کاریگران قوت تھے۔ نظریاتی طور پر، دوبارہ انتخابات کا سامنا کرنے کی ضرورت اس بات کی ضامن تھی کہ نمائندے ایماندار رہیں گے اور اپنے منتخب کرنے والوں کے مفادات کا خیال رکھیں گے۔ لیکن کہیں بھی اس کے ذریعے، طاقت کے ڈھانچے میں نمائندوں کے انجذاب کو روکا نہیں جا سکا، ہر جگہ نمائندوں اور ان کا انتخاب کرنے والوں کے مابین فاصلے بڑھتے ہی گئے۔

نمائندہ حکومت۔۔۔۔ جس کے بارے میں بتایا گیا کہ ہم اسے جمہوریت کا نام دیں۔۔۔۔ مختصراً ایک ایسی صنعتی ٹیکنالوجی تھی جس نے عدم مساوات کو یقینی بنایا۔ نمائندہ حکومت دراصل مصنوعی نمائندگی تھی۔ اگر ہم لمحہ بھر کو پیچھے مڑ کر اس کا خلاصہ دیکھنے کے لئے اچٹتی نظر ڈالیں تو پتہ چلتا ہے کہ یہ تہذیب زیر زمین ایندھن، فیکٹری کی پیداوار، جوہری کنبے، کارپوریشن، وسیع پیمانے کی تعلیم اور وسیع ذرائع ابلاغ کی مرہون منت ہے۔ پیداوار اور صرف کے کے مابین مسلسل بڑھتی ہوئی خلیج اس کی بنیاد ہے۔ اس کا سارا انتظام اشرافیہ کے ایک ایسے سیٹ کے ذریعے چلتا رہا، جن کا کار منصبی ہی اس تمام نظام کی تشکیل تھا، اس نظام میں نمائندہ حکومت کو فیکٹری کا سیاسی مترادف سمجھا گیا اور درحقیقت یہ تھی بھی ایک فیکٹری جہاں اجتماعی تشکیل ساز فیصلے بنائے جاتے تھے۔ دوسری فیکٹریوں کی طرح اسے بھی بالائی سطح سے کنٹرول کیا جاتا تھا اور یہ بھی دوسری اکثر فیکٹریوں کی طرح۔۔۔۔ ارتقاء پذیر

تیسری لہر کا شکار بن کر۔۔۔۔ تیزی سے فرمودہ ہوتی جا رہی ہے۔

اگر دوسری لہر کے سیاسی ڈھانچے آج کی پیچیدگیوں کا مقابلہ نہ کر سکنے کی وجہ سے تیزی سے فرسودہ اور متروک ہوتے جا رہے ہیں تو اس مشکل کے ایک حصے کا ذمہ دار، جیسا کہ ہم دیکھیں گے، دوسری لہر کا ایک اور اہم ادارہ ہے اور وہ ہے قومی ریاست۔

MashalBooks.org

باب6

قومیت کا تصور

اباکو ایک جزیرہ ہے۔ اس کی آبادی چھ ہزار پانچ سو افراد پر مشتمل ہے اور یہ فلوریڈا کے ساحل کے قریب ہی، باہا ماز کا ایک حصہ ہے۔ چند سال پہلے امریکی کاروباریوں، اسلحہ فروشوں، آزاد تجارت کے حامیوں، ایک سیاہ فام انٹیلی جنس ایجنٹ اور برطانوی دارالعوام کے ایک رکن نے یہ فیصلہ کیا کہ یہ مناسب وقت ہے کہ اباکو اپنی آزادی کا اعلان کر دے۔

ان کا منصوبہ یہ تھا کہ وہ جزیرے کا انتظام سنبھال لیں گے اور جزیرے کے ہر مقامی باشندے سے، انقلاب کے بعد، ایک ایکڑ زمین مفت دینے کا وعدہ کر کے، باہاماز کی حکومت سے قطع تعلق کر لیں گے۔ (اس وعدے کے بعد بھی ترقیاتی معماروں اور اس پراجیکٹ کے سرمایہ کاروں ک استعمال کے لئے ڈھائی لاکھ ایکڑ سے زیادہ زمین بچ رہے گی) ان کا حتمی خواب اباکو میں ایک ایسی مثالی انتظامیہ کا قیام تھا، جہاں کوئی ٹیکس نہ ہو اور جہاں اشتراکی غلبے سے خوف زدہ دولت مند کاروباری افراد آ کر پناہ لے سکیں۔

آزاد تجارت کے لئے افسوس، اباکو کے مقامی باشندوں نے اپنی زنجیریں اتار پھینکنے کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی اور اس طرح موعودہ نئی قوم پیدا ہوتے ہوتے رہ گئی۔

بہر حال، ایک ایسی دنیا میں جہاں قوم پرست تحریکیں اقتدار کے لئے مزاحمت کر رہی ہوں اور جہاں لگ بھگ 152 ریاستیں اقوام کی تجارتی ایسوسی ایشن، اقوام متحدہ کی رکنیت کا دعویٰ کرتی ہوں، ایسے مزحیہ اور معنی خیز اشارے بھی با مقصد اور مفید ثابت ہوتے ہیں۔ وہ ہمیں قومیت کے تصور کو چیلنج کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ کیا اباکو کے چھ ہزار سو باشندے، چاہے چند کج رو کاروباری وہاں سرمایہ کریں یا نہ کریں، ایک قوم کی تشکیل کر سکتے

ہیں؟اگر سنگا پور' اپنی تئیس لاکھ آبادی کے ساتھ ایک قوم ہے تو نیویارک شہر اپنی اسی لاکھ آبادی کے ساتھ ایک قوم کیوں نہیں؟ لغو اور بے سرو پا باتیں' اس قسم کے سوالات' تیسری لہر کے دوسری لہر کی تہذیب کی حقیقی بنیادوں کو منہدم کرنے کے بعد، نئی اہمیت کے حامل ہونگے کیونکہ قومی ریاست بھی اس تہذیب کی بنیادوں میں سے ایک تھی' اور ہے۔

جب تک ہم قوم پرستی کے مسئلے کے ارد گرد چھائی ہوئی فصاحت و بلاغت کی دھند کو صاف نہ کر لیں' ہم اخباری سرخیوں کو کوئی معنویت نہیں دے سکتے اور نہ ہی پہلی اور دوسری لہر کی تہذیبوں کے مابین تصادم کو سمجھ سکتے ہیں جبکہ کہ تیسری لہر بھی ان سے ٹکرا رہی ہے۔

بدلتے گھوڑے

دوسری لہر کے یورپ میں پھیلنے سے پہلے دنیا کے اکثر علاقوں میں قومیں اپنی صحیح شکل میں معرض وجود میں نہیں آئی تھیں، تاہم وہ قبیلوں، جاگیروں، جوگوں، ریاستوں، صوبوں اور بادشاہتوں کی مختلف شکلوں میں کسی حد تک منظّم ضرور تھیں۔''بادشاہ اور شاہزادے''ایک سیاسی تجزیہ نگار ایس ای فائنز لکھتا ہے''معمولی اختیارات کے حامل تھے''سرحدوں کا پتہ ہی نہیں چلتا تھا، حکومتی حقوق قطعی غیر واضح تھے، ریاستی اختیارات کا کوئی معیار مقرر نہیں تھا، پروفیسر فائنز بتاتے ہیں: ایک گاؤں میں اس کا مقصد، بادبانی چکی کا ٹول لینے، دوسرے گاؤں میں کسانوں سے ٹیکس حاصل کرنے اور کسی اور جگہ پادری کو مقرر کرنے سے زیادہ اور کچھ نہیں تھا۔مختلف علاقوں میں پھیلی ہوئی جائیداد کے مالک کسی بھی فرد کو مختلف جاگیرداروں کا فرماں بردار رہنا پڑتا تھا۔ عظیم ترین حکمران بھی چھوٹی مقامی کمیونٹی حکومتوں کے باہم مجتمع سلسلوں پر حکومت کرتے رہے۔سیاسی کنٹرول میں ابھی تک یکسانیت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ والٹیئر نے اس سارے کا تجزیہ خوب کیا۔یورپ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سفر کرتے ہوئے اس نے شکوہ کیا، گھوڑے تبدیل کرنے اور مختلف قوانین کا سامنا کرنے کی رفتار کم وبیش ایک جیسی تھی۔صرف آنکھ کے مشاہدے سے اس طنز کی گہرائی سمجھنا ذرا مشکل ہے کیونکہ گھوڑے بدلنے کی مسلسل ضرورت میں بلاشبہ ٹرانسپورٹ اور ذرائع رسل و رسائل اور ابلاغ کی ابتدائی سطح جھلکتی تھی۔۔۔۔جس کی وجہ سے وہ حدود

جن پر طاقتور ترین حکمران اپنا موثر کنٹرول رکھ سکتا تھا، فاصلاتی اعتبار سے خاصی محدود ہی رہتی تھیں۔ جتنا دارالحکومت سے فاصلہ بڑھا، اتنی ہی ریاستی حاکمیت کمزور ہوتی گئی۔ لیکن سیاسی تشکیل سازی کے بغیر معاشی تشکیل ناممکن تھی۔ دوسری لہر کی نئی اور مہنگی ٹیکنالوجیز اسی صورت میں پر کشش اور مفید نظر آ سکتی تھیں اگر وہ مقامی مارکیٹ کی ضرورت سے زیادہ اشیاء کی پیداوار کرتیں۔ لیکن اگر ایک کاروباری آدمی کو اپنی کمیونٹی سے باہر نکل کر مختلف ڈیوٹیز، ٹیکس، مزدور سے متعلق قواعد وضوابط اور مختلف کرنسیوں کے اجھاؤ کا سامنا کرنا پڑتا تو وہ بھلا کسی طرح ایک وسیع علاقے میں خرید وفروخت کا سلسلہ جاری رکھتا۔ نئی ٹیکنالوجیز کے اخراجات برداشت کرنے کے لئے مقامی معیشتوں کو ایک قومی معیشت میں منضبط کرنے ضروری ہو گیا۔ اس کا مطلب تھا سرمائے اور اشیائے ضرورت کے لئے قومی تقسیم کار اور قومی مارکیٹ۔ لیکن اس کے لئے قومی سیاسی استحکام کی بھی ضرورت تھی۔

آسان انداز میں یوں کہہ لیں کہ دوسری لہر کی معاشی وحدتوں کے ارتقاء کو ہم آہنگ کرنے کے لئے دوسری لہر کی ایک سیاسی وحدت کی ضرورت تھی۔

جوں جوں دوسری لہر کے معاشروں نے قومی معیشتوں کی تعمیر شروع، عوامی شعور میں ایک بنیادی تبدیلی واضح طور پر نظر آئی۔ پہلی لہر کے معاشروں میں چھوٹے پیانے کی مقامی پیداوار نے علاقائی رجحان رکھنے والے لوگوں کی ایک نسل پروان چڑھائی۔۔۔۔ جن میں سے اکثر اپنے پڑوسی علاقوں اور ہر قریبی دیہاتوں میں ہی مگن رہے تھے۔ صرف چند مٹھی بھر لوگوں۔۔۔۔ کچھ شرفاء اور پادریوں، بکھرے ہوئے تاجروں، فن کاروں اور دانش وروں کے سماجی گروہوں اور اجرتی قاتلوں۔۔۔۔ کے مفادات، البتہ ان کے گاؤں کی حدود سے باہر بھی ہوتے تھے۔

دوسری لہر نے انتہائی تیزی سے لوگوں کی ایک کثیر تعداد کو وسیع وعریض دنیا کے رحم وکرم پر ڈالا۔ بھاپ اور کوئلے پر مبنی ٹیکنالوجیز کے ساتھ اور بعدازاں بجلی کی دریافت سے، فرینک فرٹ میں کپڑا بنانے والے، جنیوا میں گھڑیاں تیار کرنے والے مانچسٹر میں ٹیکسٹائل میں مصروف صنعتکار کے لئے مقامی مارکیٹ کی ضروریات سے کہیں زیادہ اشیاء کی پیداوار کرنا ممکن ہو گیا۔ اسے دور دراز علاقوں سے خام مال کی ضرورت بھی پڑتی تھی۔

MashalBooks.org

ہزاروں میل دور ہونے والے مالیاتی واقعات سے فیکٹری کا کارکن بھی متاثر ہونے لگا۔ کام کی نوعیت دور دراز کی مارکیٹ کی محتاج ہوگئی۔

چنانچہ آہستہ آہستہ نفسیاتی افق کا پھیلاؤ بڑھنے لگا۔ نئے وسیع تر ذرائع ابلاغ نے دور از کار علاقوں کی معلومات اور انکی تصوراتی کشش کا حجم بہت بڑھا دیا۔ ان تبدیلیوں کے نتیجے میں مقامیت کا رنگ دھندلا پڑتا گیا اور قومی شعور حرکت پذیر ہوا۔

امریکی اور فرانسیسی انقلابوں کے ساتھ شروع ونے والے اور انیسویں صدی میں جاری وساری قوم پرستی کے جنون نے دنیا کے تمام صنعتی علاقوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ جرمنی کی معمولی، جدا جدا، باہم تنازعات میں الجھی ہوئی تین سو پچاس چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو ایک قومی مارکیٹ۔۔۔ مادر وطن۔۔۔ میں مجتمع ہونے کی ضرورت محسوس ہوئی، اٹلی۔۔۔ چھوٹے چھوٹے حصوں میں بٹا ہوا تھا اور کہیں آسٹریا کے ہاپس برگز اور ہسپانوی بوربنز کا قبضہ تھا۔۔۔ کو بھی متحد ہونا پڑا۔ ہنگری والوں، سربوں، کروٹس، فرانسیسیوں اور دوسرے تمام لوگوں میں اچانک اپنے اپنے ہم قوموں کے لئے شدید جذبہ محبت و اخوت جنم لینے لگا۔ شاعروں نے قومی حمیت کو خوب جنجوڑا۔ مورخوں نے ماضی کے گم شطدہ ہیرو، ادبی تخلیقات اور لوک کہانیاں اور گیت دریافت کرڈالے۔ موسیقاروں نے قومی جذبات ابھارنے والی دھنیں ترتیب دیں اور یہ سب کچھ عین اس وقت ہوا، جب یہ صنعتی دور کا لازمی تقاضا بنا۔

ایک دفعہ ہم تشکیل سازی کی صنعتی احتیاج کا مطلب سمجھ لیں تو قومی ریاست کا مفہوم آسانی سے واضح ہو جاتا ہے قومیں کوئی ''روحانی اتحاد'' ۔۔۔ جیسا کہ سپنگلر نے انہیں موسوم کیا۔۔۔ یا ''ہم خیال برادریاں'' یا ''سماجی روحیں'' ہرگز نہیں۔ نہ ہی وینان کے محاروے میں ''یادوں کا زبردست ورثہ'' ہیں اور نہ ہی اور ٹیگا کے اصرار کے مطابق ''مستقبل کا مشترکہ تصور'' ان کی بنیاد بنتا ہے۔

ہم جسے جدید قوم کہتے ہیں یہ دوسری لہر کا ایک لازمی تصور ہے۔ ایک واحد مجتمع سیاسی حاکمیت، جو ایک مجتمع معیشت پر قائم کی جاتی ہے یا اس سے منسلک کر دی جاتی ہے۔ مقامی طور پر خود کفیل تتر بتر معیشتوں کا بے ہنگم اکٹھ، نہ تو ایک قوم کو وجود میں لا سکتا ہے اور نہ

ہی لاتا ہے اور اسی طرح مقامی معیشتوں کے ایک ڈھیلے ڈھالے انبار کی چوٹی پر براجمان، ایک منضبط اور متحدہ سیاسی نظام ایک جدید قوم تشکیل نہیں دے سکتا۔ ایک متحدہ سیاسی نظم اور ایک متحد سیاسی نظم ایک دونوں کے باہم ویلڈ ہونے۔۔۔۔ نے ایک جدید قوم کو وجود بخشا۔

امریکہ، فرانس، جرمنی اور باقی ماندہ یورپ میں صنعتی انقلاب کے ذریعے پیدا شدہ قومی بیداری کی لہر کو۔۔۔۔ سیاسی تشکیل کاری کی سطح۔۔۔۔ دوسری لہر کی ہم سفر معاشی تشکیل کاری کی تیزی سے بلند ہوتی ہوئی سطح سے ہم آہنگ کرنے کی کاوشوں کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے اور یہی وہ کاوشیں تھیں۔۔۔۔ کوئی شاعرانہ یا روحانی اثرات نہیں تھے۔۔۔۔ جو دنیا کو واضح قومی وحدتوں کی تقسیم کی طرف لے گئیں۔

سنہری کیل (SPIKE)

جب ہر حکومت نے اپنی مارکیٹ اور اپنی سیاسی حاکمیت کو توسیع دینا چاہی تو اسے بیرونی حدود۔۔۔۔ زبان کے اختلافات، ثقافتی، سماجی، جغرافیائی اور حکمت عملی کی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا۔ موجود ٹرانسپورٹ، ذرائع ابلاغ اور توانائی کی رسد اور اس کی ٹیکنالوجی کی پیداواری صلاحیت۔۔۔۔ ان سب نے مل کر ان حدود کا تعین کیا کہ کتنے بڑے علاقے پر ایک واحد سیاسی ڈھانچے کے ذریعے موثر حکومت کی جا سکتی ہے۔ اکاؤنٹنگ کے طریقوں کی پیچیدگیاں، بجٹ کے کنٹرول اور انتظامی طور طریقے ان سب عوامل نے بھی یہ فیصلہ کیا کہ سیاسی تشکیل کاری کی پہنچ کتنی دور تک ہو سکتی ہے۔

انہی حدود کے اندر اندر، تشکیل کار اشرافیہ کاروباری اور حکومتی دونوں ہی، اتنی بڑی معاشی مارکیٹ اور ان کی وجہ سے اتنی ہی زیادہ دولت زیادہ بڑھانے کی کوشش کی تو انہیں صرف فطری حدود سے ہی واسطہ نہیں پڑا بلکہ دشمن اقوام سے بھی ان کا پالا پڑ گیا۔ ان رکاوٹوں کو توڑنے کے لئے تشکیل کار اشرافیہ نے اعلیٰ ٹیکنالوجی استعمال کی۔ مثلاً انہوں نے خود کو انیسویں صدی کی ''فاضلاتی دوڑ''۔۔۔۔ ریلوے لائنوں کی تعمیر کے کام میں لگا دیا۔

ستمبر 1825ء میں برطانیہ میں سٹاکٹن سے ڈارلنگٹن تک ریلوے لائن بچھا دی گئی۔ مئی 1835ء میں براعظم میں برسلز کو میلائنز سے ملا دیا گیا۔ اسی ستمبر میں بیوریا میں نورن برگ۔۔۔۔ فرتھ لائن بھی بچھا دی گئی، اس کے بعد پیرس اور سینٹ جرمین کی باری

ائی۔ دور دراز مشرق کی جانب اپریل1838ء میں زار کوسیلو کو سینٹ پٹیرز برگ سے مربوط کر دیا گیا۔ اگلے کم وبیش تین عشروں میں ریلوے کے کارکن ایک علاقے کو دوسرے سے ملانے کے کام میں لگ رہے۔

فرانسیسی مورخ چارلیس موراز لے اس کی وضاحت کرتا ہے۔ ''وہ ممالک جو 1830ء میں پہلے ہی متحد تھے، ریلوے کی آمد کے ساتھ ان کا اتحاد زیادہ مستحکم ہو گیا۔۔۔۔ جو ملک ذہنی طور پر ابھی تیار نہیں تھے، انہیں سٹیل کے نئے راستے نظر آئے جو ان کے گرد اپنا شکنجہ کس رہے تھے۔۔۔۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ہر ممکنہ قوم، ریلوے کی تعمیر سے پہلے پہلے اپنے وجود کا حق منوانے کی جلدی کر رہی تھی تا کہ اسے ٹرانسپورٹ سسٹم کے ذریعے بھی ایک قوم تسلیم کیا جا سکے۔ اسی سسٹم نے یورپ کی سیاسی سرحدیں، ایک صدی سے زیادہ عرصہ تک کے لئے متعین کر دیں۔

امریکہ میں حکومت نے نجی ریلوے کمپنیوں کو وسیع وعریض اراضی، گرانٹ میں دے ڈالی۔ مورخ کی حیثیت سے بروس میزلش انتہائی متاثر ہو کر لکھتا ہے۔ ''اس یقین کی بنیاد پر کہ بین البراعظمی ریلوے لائن، اٹلانٹک اور پسیفک ساحلوں کے مابین یکجہتی کو مزید استوار کرے گی'' سنہری کیلیں ٹھونکی جاتی رہیں۔ اس طرح پہلی بین البراعظمی ریلوے کی تکمیل نے ایک حقیقی قومی مارکیٹ۔۔۔۔ براعظم کی سطح پر تشکیل۔۔۔۔ کے لئے راستے کھول دیئے اور اسی کے ذریعے قومی حکومت کا واضح تر اور حقیقی کنٹرول بھی وسیع ہوا۔ واشنگٹن اپنی حاکمیت منوانے کے لئے براعظم میں کہیں بھی فوراً اپنی افواج کو حرکت میں لا سکتا تھا، اسی وجہ سے یکے بعد دیگرے ہر ملک میں ایک نیا طاقت ور وجود''قوم'' کی شکل میں ظاہر ہوا اور اس طرح دنیا کا نقشہ سرخ، گلابی، اورنج، زرد، یا سبز جیسے صاف اور منفرد رنگوں میں تقسیم ہو گیا اور قومی ریاست کا نظام دوسری لہر کی تہذیب کا ایک بنیادی ڈھانچہ بن گیا۔

قوم کی تہ میں صنعتی راج کا وہی جانا پہچانا اصول کارفرما تھا: تشکیل سازی کی جانب سبقت لیکن تشکیل سازی کی سبقت، ہر قومی ریاست کی سرحدوں میں ہی ختم نہیں ہو پائی کیونکہ صنعتی تہذیب اپنی طاقت کی پرورش کے لئے سرحدوں میں بند نہیں رہ سکتی۔ نظام

زر میں باقی ماندہ دنیا کو منسلک کئے بغیر اور اس نظام کو اپنے مفادات کے لئے کنٹرول کئے بغیر اس مسابقت کا وجود قائم رہ ہی نہیں سکتا تھا۔

یہ کس طرح ممکن ہوا۔۔۔۔ تیسری لہر کی دنیا سے جنم لینے والی دنیا کو سمجھنے کے لئے اس سے آگہی بہت اہم ہے۔

MashalBooks.org

باب 7

سامراجی تسلط

کوئی بھی تہذیب، تضاد کے بغیر نہیں پنپتی۔ دوسری لہر کی تہذیب نے جلدی ہی پہلی لہر کی دنیا پر وسیع پیمانے پر حملے شروع کر دیئے، ان پر فتح حاصل کی اور لاکھوں۔۔۔۔ بلکہ بالآخر کروڑوں انسانوں پر اپنی مرضی ٹھونس دی۔

دوسری لہر سے بہت پہلے، سولہویں صدی کے آغاز سے پہلے یہ یورپی حکمرانوں نے وسیع نوآبادیاتی سلطنتوں کی تعمیر شروع کر دی تھی۔ ہسپانوی پادری اور مبلغین، فرانسیسی شکاری اور برطانوی، ڈچ اور پرتگالی یا اطالوی مہم جو ، پوری دنیا میں پھیل کر آبادیوں کو تاخت و تاراج کر رہے تھے یا غلام بنا رہے تھے، وسیع وعریض علاقوں پر قابض ہو کر اپنے حکمرانوں کو (لوٹ کا مال) خراج کی صورت میں بھیج رہے تھے۔ بعدازاں رونما ہونے والے واقعات کے مقابلے میں بہر حال یہ سب قطعی معمولی نوعیت کا تھا۔ ابتدائی مہم جوؤں اور فاتحین کے ذریعے وطن بھیجا جانے والا خزانہ واقعتاً ایک نجی بوٹی تھا۔ اس سے جنگی اخراجات اور ذاتی عیاشیاں ۔۔۔۔ سرمائی محل، رنگین، بے کار، آرام دہ درباری زندگی کے مصارف۔۔۔۔ ہی پورے ہو سکتے تھے۔ لیکن نوآبادی پر قابض ملک کی، بنیادی طور پر، خود کفیل معیشت سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔

نظام زر اور مارکیٹ کی معیشت کی عمومی غیر موجودگی میں اسپین کی جھلتی اور تپتی زمین پر یا برطانیہ کے دھند میں لپٹے کھلیانوں میں زندگی گزارنے والے کسانوں کے پاس ملک سے باہر برآمد کرنے کے لئے شاذ و نادر ہی کچھ ہوتا تھا۔ وہ مقامی ضروریات کے لئے بھی بمشکل ہی غلہ اگا پاتے تھے۔ انہیں غیر ممالک میں خریدے گئے یا مسروقہ خام مال کی بھی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ ان کے لئے زندگی کا کسی نہ کسی طرح گزرتے رہنا ہی کافی تھا۔ سمندر پار کی فتوحات نے عام باشندوں۔۔۔۔ کسانوں۔۔۔۔ کے بجائے حکمران طبقے اور

MashalBooks.org

شہروں کو دولت مند بنایا۔ اس حد تک پہلی لہر کا سامراج ابھی بہت معمولی اہمیت کا حامل تھا۔۔۔۔ کیونکہ وہ ابھی تک معیشت کی شکل اختیار نہیں کر سکا تھا۔

دوسری لہر نے اس نسبتاً چھوٹے پیمانے کے دھندے کو بڑے کاروبار میں تبدیل کر دیا۔ اس لہر کے ہاتھوں معمولی سامراج عظیم سامراج کی شکل میں تبدیل ہو گیا۔اس جدید سامراج کا مطمح نظر، سونے یا جواہرات، مصالحے اور سلک کے چند صندوق بھر کر وطن واپس لانا نہیں تھا۔ یہ وہ سامراج تھا جس نے بالآخر۔۔۔۔ نائٹریٹ، کاٹن، پام آئل، ٹن، ربر، باکسائٹ اور ٹنگسٹن کے۔۔۔۔ بھرے ہوئے جہاز بار بار بھیجنا شروع کر دیئے۔ یہ وہ سامراج تھا جس نے کانگو میں تانبے کی کانیں کھودیں اور عرب میں آئل رگس تعمیر کیں۔ یہی وہ سامراج تھا جس نے نو آبادیات سے خام مال (خون کی طرح) نچوڑا، اس کو مختلف مراحل سے گزارا اور اکثر اوقات تیار اشیاء واپس انہی نو آبادیات میں، زبردست منافع کے ساتھ فروخت بھی کر ڈالیں۔ مختصراً' یہ سامراج مزید مقامی یا نجی نوعیت کا نہیں رہا بلکہ صنعتی قوم کے بنیادی معاشی ڈھانچے میں اس طرح شکل پذیر ہوا کہ لاکھوں عام کارکنوں کے کام کی نوعیت اسی ڈھانچے کی مرہون منت بن گئی۔

اور ملازمتوں پر ہی بس نہیں ہوئی' نئے خام مال کے علاوہ یورپ کو خوراک کی بڑھتی ہوئی مقدار کی ضرورت بھی تھی۔ جوں ہی دوسری لہر کی قوموں نے مینوفیکچرنگ کا رخ کیا' دیہاتی مزدوروں کو فیکٹریوں میں منتقل کیا گیا تو انہیں غیر ممالک سے زیادہ خوراک۔۔۔۔ انڈیا، چین، افریقہ، ویسٹ انڈیز اور وسطی امریکہ سے گائے اور بکرے کا گوشت، دالیں، کافی، چائے اور چینی۔۔۔۔ کی درآمد پر مجبور ہونا پڑا۔ جواباً ایک وسیع پیمانے کی مینوفیکچرنگ پھلی پھولی۔ نئی صنعتی اشرافیہ کو وسیع تر منڈیوں اور سرمائے کے تازہ مخارج کی تلاش ہوئی۔1880-90ء کے عشروں میں یورپی سیاست دان، بغیر کسی شرمندگی کے اپنے مقاصد کا اظہار کرتے تھے۔''صنعت وتجارت ہی تو اصل سلطنت ہے۔'' یہ دعویٰ برطانوی سیاست دان جوزف چیمبرلین نے کیا تھا۔ فرانسیسی وزیر اعظم جیولز فیری قطعیت اور وضاحت میں اس سے بھی آگے نکل گئے۔ انہوں نے کہا: فرانس کو کیا چاہئے! اپنی صنعتوں، برآمدات اور سرمائے کے لئے نکاسی کے مزید راستے، تجارتی گرم بازاری اور سرد بازاری کے معاشی چکر

MashalBooks.org

اور خوفناک بے روزگاری کے تصور سے لرزاں، یورپی لیڈروں کے نیندیں عرصہ دراز تک حرام ہوتی رہیں کہ اگر نو آبادیاتی پھیلاؤ کا خاتمہ ہو گیا تو بے روزگاری، مسلح انقلاب کو ان کے گھر کا راستہ دکھا دے گی۔

عظیم سامراج کے پھیلاؤ کی بنیادی وجوہ صرف معاشی ہی نہیں تھیں۔ فوجی حکمت عملی کی اہمیت، مذہبی جوش، آئیڈیلزم اور مہم جوئی۔۔۔ ان سب کا برابر کا حصہ تھا اور ایک اہم کردار۔۔۔ سفید فام یا یورپی برتری کے مسلمہ مفروضے پر مبنی۔۔۔ نسل پرستی کا تھا۔ بعض لوگوں نے سامراجی فتوحات کو قدرت کی جانب سے عائد کردہ ذمہ داری قرار دیا۔ کپلنگ کے بامعنی محاورے ''سفید فام آدمی کا بوجھ'' نے عیسائیت اور ''تہذیب و تمدن'' کے پھیلاؤ کی یورپی خواہش اور جذبے کو، گویا دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ تہذیب سے مراد بلاشبہ یہاں دوسری لہر کی تہذیب ہے کیونکہ نو آبادکار پہلی لہر کی تہذیب کو۔۔۔ چاہے وہ کتنی ہی شاندار اور ہمہ جہتی کیوں نہ رہی ہو۔۔۔ دقیانوسی اور غیر ترقی یافتہ سمجھتے تھے، خصوصاً دیہاتی لوگ اگر گہری کھالوں کا لباس پہنے نظر آتے تو انہیں بے وقوف سمجھا جاتا' وہ ''مکار اور بے ایمان'' تھے۔ وہ ''تدبیر کے قائل نہیں'' تھے۔ وہ ''زندگی کی قدر'' نہیں کرتے تھے۔ اسی قسم کے رویوں نے دوسری لہر کی قوتوں کے لئے۔۔۔ اپنی راہ میں رکاوٹ بننے والے لوگوں کو تباہ و برباد کر دینے کا جواب نسبتاً آسان بنا دیا۔

''مشین گن کی سماجی تاریخ'' میں جان ایلس بتاتا ہے کہ کس طرح یہ نیا حیرت انگیز خطرناک ہتھیار انیسویں صدی میں تکمیل کو پہنچا اور اسے ''مقامی'' آبادیوں پر پہلی دفعہ آزمایا گیا۔ اسے سفید فام یورپی فرد کے خلاف اس لئے استعمال نہیں کیا گیا کیونکہ اپنے جیسے (انسان) کو اس سے مارنا' سپورٹس مین شپ کے خلاف سمجھا جاتا تھا۔ نو آبادیاتی لوگوں پر گولیاں برسانا' جنگ سے زیادہ شکار کھیلنا سمجھا جاتا تھا۔ اسی طرح کے دوسرے معیار رکھے گئے تھے۔ ''ماتا بلیوں' درویشوں یا تبتیوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ ڈالنے کو' ایک حقیقی فوجی آپریشن کے بجائے ذرا خطرناک قسم کا شکار سمجھا جاتا تھا۔''

خرطوم سے دریائے نیل کے پار جاتے ہوئے ورمان کے مقام پر 1898ء میں اس باکمال ٹیکنالوجی کی ہلاکت آفرینی کا اس وقت مظاہرہ ہوا' جب مہدی کی زیر قیادت

جنگجو درویش، چھ میکسم مشین گنوں سے مسلح برطانوی دستوں کے ہاتھ شکست کھا گئے۔ ایک چشم دید گواہ لکھتا ہے۔ ''یہ مہدیت اور اس کی عظمیت کا آخری دن تھا۔۔۔۔ میدان کارزار کے بجائے وہاں پھانسی گھاٹ کا منظر تھا۔'' اس واقعے میں اٹھائیس برطانوی موت کے گھاٹ اترے جبکہ گیارہ ہزار درویش جاں بحق ہوئے۔۔۔۔ گویا ہر برطانوی فرد کے مقابل 392 نو آبادیاتی باشندوں کی ہلاکت۔ ایلس لکھتا ہے:''برطانوی جذبے کی فتح اور سفید فاموں کی عمومی برتری کی یہ ایک اور مثال بن گئی، برطانوی، فرانسیسی، جرمن، ڈچ اور دیگر یورپی اقوام کے پوری دنیا میں چھا جانے کے عمل میں نسل پرستی، مذہبی جوش اور دیگر جواز تو تھے ہی مگر ایک زبردست حقیقت ان کے پیچھے بھی موجود تھی۔ دوسری لہر کی تہذیب، تنہائی میں اپنا وجود قائم نہیں رکھ سکتی تھی۔ اسے باہر کی دنیا میں موجود سستے وسائل میں مخفی فوائد کے شدت سے ضرورت تھی اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ اسے ایک تشکیل شدہ بین الاقوامی مارکیٹ چاہیئے تھی، جس کے ذریعے ان فوائد کا مستقل حصول ممکن ہو۔

باغ میں گیس پمپس

پوری دنیا کو ایک مارکیٹ کی شکل دینے کی زبردست خواہش جس نظریئے پر مبنی تھی، ڈیوڈ ریکارڈو نے اس کی بہترین وضاحت کی کہ تقسیم محنت کا اصول فیکٹری کے کارکنوں کے ساتھ ساتھ قوموں پر بھی لاگو ہونا چاہیئے۔ اپنے کلاسیکی انداز میں اس نے توضیح کی کہ اگر برطانیہ ٹیکسٹائل کی صنعت میں تخصیص کر لے اور پرتگال شراب بنانے میں، تو دونوں ملکوں کو فائدہ ہوگا۔ ہر ایک اپنا کام بہترین طرح سے کرے گا، چنانچہ ''بین الاقوامی تقسیم کار'' مختلف قوموں کو ان کے خاص کردار تفویض کر کے ہر ایک قوم کو امیر کر دے گی۔

یہ نظریہ آنے والی نسلوں میں عقیدے کی شکل اختیار کر گیا اور آج بھی چھایا ہوا ہے، حالانکہ اس کی رمزیت کا عمومی نوٹس کبھی لیا ہی نہیں جاتا۔ کیونکہ جس طرح تقسیم کار نے کسی بھی معیشت میں، تشکیل سازی کی زبردست ضرورت پیدا کی اور نتیجتاً ایک تشکیل سازی مطلوب تھی اس کے ساتھ ہی ایک عالمی اشرافیہ وجود میں آ جاتی۔ یہ اشرافیہ دوسری لہر کی اقوام کے ایک چھوٹے سے گروپ پر مشتمل تھی، جو تمام عملی مقاصد کے لئے باقی ماندہ دنیا کے بڑے بڑے حصوں پر باری باری قابض رہ سکتی تھیں۔

ایک واحد مجتمع عالمی مارکیٹ تخلیق کرنے کی جدوجہد میں کامیابی کو۔۔۔۔ پورے یورپ میں دوسری لہر کے پھیل جانے کے بعد کی۔۔۔۔ عالمی تجارت کے حیرت انگیز پھیلاؤ سے ناپا جا سکتا ہے۔1750ء اور 1914ء کے درمیان عالمی تجارت میں اضافہ کا اندازہ پچاس گنا کے قریب لگایا گیا ہے۔اس عرصے میں یہ تجارت 700ملین ڈالر سے بڑھ کر 40بلین ڈالر ہوگئی۔ اگر ریکارڈو کا نظریہ صحیح تھا تو اس عالمی تجارت کے فوائد کم و بیش ہر علاقے میں پہنچنے چاہئیں تھے۔ درحقیقت یہ خوش کن یقین یا نظریہ۔۔۔۔ کہ تخصیص ہر کسی کو فائدہ پہنچائے گی۔۔۔۔ ایماندارانہ مقابلے کے تصور پر مبنی تھا۔

محنت اور وسائل کا انتہائی کارآمد استعمال، کاروباری معاہدوں میں فوجی یا سیاسی قوت کے ممکنہ خطرات کی عدم موجودگی، مساوی حیثیت کے حامل افراد یا گروہوں کی باہمی کاروباری ترسیل۔۔۔۔ اس نظریئے کے مفروضات تھے۔مختصراً اس نظریئے میں کوئی چیز نظر انداز نہیں ہوئی۔۔۔۔ سوائے حقیقی زندگی کے۔ تانبے، کوکا یا دوسرے وسائل پر مذاکرات عموماً یک طرفہ ہوتے تھے۔ میز کی ایک جانب بنیادفطرت یورپی یا امریکی تاجر بیٹھتے تھے۔ بڑی بڑی کمپنیاں، وسیع مالیاتی نیٹ ورک، طاقتور ٹیکنالوجیز اور مضبوط قومی حکومتیں، ان کی پشت پناہی کے لئے ہمہ وقت تیار تھیں۔۔۔۔ اور دوسری جانب، ممکن ہے کوئی مقامی حاکم یا قبیلے کا سربراہ موجود ہو، جس کے لوگ بمشکل نظام زر سے تھوڑے بہت واقف ہونگے اور جن کی معیشت چھوٹے پیمانے کی زراعت یا دیہاتی دستکاری پر مشتمل ہوگی۔ ایک جانب ایک زورآور، غیرملکی، میکانکی طور پر ترقی یافتہ تہذیب کے ایجنٹ۔۔۔۔ اپنی برتری کا یقین لئے اور اس کو ثابت کرنے کے لئے مشین گنوں جیسے ہتھیاروں کا استعمال کرنے کے لئے ہمہ وقت تیار۔۔۔۔ بیٹھے ہوتے اور دوسری جانب، تیرکمان اور نیزوں سے مسلح، چھوٹے چھوٹے قبیلوں اور ریاستوں کے نمائندے موجود ہوتے۔

عموماً مقامی حکمرانوں یا علاقائی ناظموں کو مغربی لوگوں کے پاس لایا جاتا۔ انہیں رشوتوں اور ذاتی مفادات کا لالچ دے کر ساتھ ملا لیا جاتا۔ مقامی محنت کشوں کا زبردست استحصال کیا جاتا، مقامی مزاحمتوں کو بزور طاقت دبا دیا جاتا اور مقامی قوانین کو نوآبادکاروں کے مفاد میں تبدیل کر دیا جاتا۔ نوآبادی پر قبضہ کے بعد، سامراجی طاقت اپنے کاروباری

لوگوں کے عموماً خام مال کی ترجیحی قیمتیں مقرر کر دیتی اور مخالف اقوام کے تاجروں کا راستہ روکنے کے لئے شدید ترین رکاوٹیں پیدا کر دیتی تا کہ خام مال کی قیمتوں میں اضافہ ممکن نہ رہے۔

ان حالات میں یہ ہرگز مقام تعجب نہیں کہ صنعتی دنیا، خام مال یا توانائی کے وسائل۔۔۔کھلی مارکیٹ کی قیمتوں سے کہیں کم۔۔۔ارزاں قیمتوں پر حاصل کرتی رہی۔ قیمتوں کو خریداروں کے مفاد میں پہلی قیمت کے (نام ونہاد) قانون کو بنیاد بنا کر مزید کم کر دیا جاتا۔ دوسری لہر کی اقوام کو مطلوب کئی طرح کا خام مال اس کے مالکوں۔۔۔پہلی لہر کی آبادیوں کے لئے، حقیقتاً ناکارہ تھا۔ افریقی کسانوں کو کرومیم کی قطعی ضرورت نہیں تھی۔ صحرائی ریت کے نیچے موجود سیاہ سیال سونا، عرب شیخوں کے کسی کام کا نہیں تھا۔

جہاں کسی مخصوص شے کی گذشتہ تجارتی تاریخ کا وجود نہ رہا ہو، وہاں اس کی پہلی ترسیل پر مقرر کردہ قیمت اہم تر تھی اور یہ قیمت عمومی معاشی عوامل یعنی صرف (اخراجات)، منافع یا مقابلے کی بجائے اضافی فوجی یا سیاسی طاقت کے زور پر طے پاتی تھی۔ کسی مقابلے کی عدم موجودگی میں مسلح فوجی دستوں کے درمیان گھرے ہوئے جاگیردار یا قبائلی سردار کے لئے۔۔۔ناکارہ مقامی وسائل کی۔۔۔کوئی بھی قیمت قابل قبول ہو سکتی تھی اور یہ پہلی قیمت ایک بار نچلی سطح پر قائم ہونے کے بعد تمام متعلقہ قیمتوں کو بھی روکے رکھتی۔

جوں ہی یہ خام مال صنعتی اقوام کو ارسال کیا جاتا اور حتمی اشیاء میں استعمال ہو جاتا تو اس کی ارزاں ابتدائی قیمت، تمام تجارتی مقاصد کے لئے وہیں منجمد کر دی جاتی۔ انجام کار، ہر شے کی ایک عالمی قیمت مقرر ہونے کے بعد۔۔۔''بلامقابلہ'' ارزاں سطح پر مقرر شدہ پہلی قیمت (خام مال کیض۔۔۔کا فائدہ تمام صنعتی اقوام کو پہنچا۔ سامراجی زعماء آزاد تجارت و حرفت کے بے شک جتنے بھی دعوے کرتے رہے ہوں، حقیقت یہ تھی کہ مختلف وجوہات کی بنا پر دوسری لہر کی قوموں کو''نامکمل مقابلے'' کی جادوگری کے ہاتھوں بے بہا منافع حاصل ہوا۔

آزاد معیشت کے پر جوش مبلغین اور رکارڈو کے حامیوں کو ایک طرف رکھتے ہوئے حقیقت یہی ہے کہ توسیع پذیر تجارت کے ثمرات ہمہ جہتی ہرگز نہیں تھے۔ ان کا بہاؤ،

MashalBooks.org

پہلی لہر کی دنیا سے دوسری لہر کی جانب تھا۔

مارجرین کی کاشت

صنعتی طاقتوں نے اس بہاؤ کو ممکن العمل بنانے کے لئے عالمی مارکیٹ کو وسعت دینے اور اس کی تشکیل میں شدید محنت کی۔ تجارت جیسے ہی قومی سرحدوں کو عبور کرتی باہر آئی، ہر قومی مارکیٹ، علاقائی یا براعظمی مارکیٹ کے باہم منسلک، ایک عظیم وجود کا حصہ بن گئی اور بالآخر دوسری تہذیب کے چلانے والے تشکیل کار اشرافیہ کے تصوراتی واحد نظم تبادلہ کا جزو قرار پائی۔ زر کا ایک جالا پوری دنیا کے گرد بُن دیا گیا۔

باقی ماندہ دنیا کو اپنا گیس پمپ، باغ، کانیں اور ارزاں محنت کی رسد سمجھتے ہوئے دوسری لہر کی دنیا نے دنیا کی غیر صنعتی آبادیوں کی سماجی زندگی میں گہری تبدیلیاں لانا شروع کر دیں۔ ہزارہا سال سے موجود، خود کفالتی طور طریقوں پر استوار ثقافتیں۔۔۔۔ جو اپنی خوراک کے لئے کسی کی محتاج نہ تھیں۔۔۔۔ عالمی نظام تجارت میں زبردستی جذب کر لی گئیں۔ انہیں تجارت کرنے یا خودکشی کر لینے پر مجبور کیا گیا۔ ٹن کی کانیں اور ربڑ کی فصلیں جونہی صنعتی مقاصد کے لئے مخصوص کی گئیں، اچانک بولیویا اور ملایا کے لوگوں کا معیار زندگی، نصف کرے کی دوری پر واقع صنعتی معیشتوں کی ضروریات سے مربوط کر دیا گیا۔

گھریلو استعمال کی ایک بے ضرر سی چیز، مارجرین، ایسی ہی ایک ڈرامائی ورت پیش کرتا ہے۔ مارجرین، ابتداء یورپ میں، مقامی خام مال کے ذریعے بنایا جاتا تھا، اس کی بے پناہ مقبولیت کی وجہ سے مقامی خام مال نا کافی ہو گیا۔ 1907ء میں محققین نے دریافت کیا کہ مارجرین ناریل اور پام۔ کرنل آئل سے بھی بنایا جا سکتا ہے۔ اس یورپی دریافت کا نتیجہ یہ نکلا کہ مغربی افریقی لوگوں کے طرز زندگی میں زبردست انقلاب آ گیا۔

''مغربی افریقہ کے مرکزی علاقوں میں'' میگ نس پائیک سابق صدر برائے برطانوی انسٹی ٹیوٹ آف فوڈ' سائنس اینڈ ٹیکنالوجی' لکھتا ہے۔'' جہاں پام آئل روایتی طور پر پیدا کیا جاتا تھا۔ زمین، تمام قبیلے کی مشترکہ ملکیت تھی۔ ''پام کے درختوں کا استعمال، خاصے پیچیدہ، مقامی رسوم اور ضابطوں کے تحت کیا جاتا تھا۔ بعض اوقات، ایک درخت لگانے والے شخص کو ساری عمر کے لئے اس درخت سے حاصل شدہ پھل کا حقدار سمجھا جاتا

تھا۔ بعض جگہوں پر خواتین کو خصوصی حقوق حاصل تھے۔ پائنک کے مطابق، مغربی تاجروں نے۔۔۔۔ یورپی اور امریکی باشندوں کے لئے ایک ''آسان'' خوراک، مارجرین کی تیاری کے لئے۔۔۔۔ پام آئل کی وسیع پیمانے پر پیداوار کو منظّم کرتے ہوئے، غیر صنعتی افریقیوں کے لطیف اور پیچیدہ سماجی نظام کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔ بیلجیئن کانگو، نائیجریا، کیمرون اور گولڈ کوسٹ کے علاقوں میں زبردست پیمانے پر فصلیں اگائی گئیں۔ مغرب کو مارجرین مل گیا اور افریقی لوگ، وسیع کاشت کاری کے چکر میں، نیم غلام بن کر رہ گئے۔

ایک اور مثال ربڑ کی ہے۔ نئی صدی کے آغاز کے فوراً بعد، امریکہ میں گاڑیوں کی پیداوار کے نتیجے میں ٹائروں اور اندرونی ٹیوبوں کے لئے اچانک زبردست طلب پیدا ہو گئی۔ تاجروں نے مقامی حکام سے شدید ٹکراؤ کے بعد امیزون کے انڈین باشندوں کو، ربڑ کی پیداوار کے لئے غلام بنا ڈالا۔ ریوڈی جزو میں برطانوی کونسل، راجہ کیس منٹ نے رپورٹ بھیجی کہ 1900ء اور 1911ء کے درمیانی عرصہ میں پوٹو مایو ربڑ کی چار ہزار ٹن پیداوار، تیس ہزار انڈین لوگوں کی ہلاکت پر منتج ہوئی۔

یہ دلیل دی جاسکتی ہے کہ یہ اتفاقی واقعات تھے اور عظیم سامراج کی عمومی صورت حال ایسی نہیں تھی۔ یقیناً نو آبادیاتی طاقتیں اس حد تک ظالم اور سفاک نہیں تھیں۔ بہت سی جگہوں پر انہوں نے اپنی مقبوضہ آبادیوں کے لئے سکول اور ابتدائی مراکز صحت تعمیر کئے۔ انہوں نے سینٹی ٹیشن اور پانی کی فراہمی کو بہتر بنایا۔ بلاشبہ انہوں نے کچھ لوگوں کا معیار زندگی بھی بہتر کیا۔

نو آبادیاتی معاشروں کے ماضی کو بے پناہ دلکش اور حسین سمجھنا یا غیر صنعتی آبادیوں کی موجودہ غربت اور شکستہ حالی کے لئے تمام تر دمہ داری سامراج پر ڈال دینا بھی قطعی نا مناسب ہے۔

آب و ہوا، مقامی کرپشن اور ظلم و ستم، جہالت اور غیر ملکیوں سے نفرت۔۔۔۔ ان سب کا بھی اپنا اپنا حصہ ہے، یورپی لوگوں کے وہاں پہنچنے سے بہت پہلے، ہر طرف بخل اور جبر و استبداد کا دور دورہ تھا۔ خود کفالتی معیشت کی ٹوٹ پھوٹ، زر اور تبادلے کے لئے پیداوار کرنے کی مجبوری کی بدولت، پہلی لہر کی آبادیاں اپنا سماجی ڈھانچہ۔۔۔۔ کانوں،

کاشتکاری یا حیوانی افزائش نسل کے گرد۔۔۔ دوبارہ منظم کرنے کا حوصلہ پا کر ایسی مارکیٹ کی معاشی محتاجی میں پھنس گئیں، جس پر وہ کسی بھی طرح اثر انداز نہیں ہوسکتی تھیں۔ ان کے لیڈروں کو عموماً رشوت دی جاتی، ان کی ثقافتوں کا مذاق اڑایا جاتا اور ان کی زبانوں کو دبایا جاتا، مزید براں نو آبادیاتی طاقتوں نے مفتوحہ لوگوں میں نفسیاتی کمتری کا ایسا گہرا احساس پیدا کر دیا جو آج بھی ان کی معاشی اور سماجی ترقی کے راستے میں ایک زبردست رکاوٹ ہے۔ دوسری لہر کی دنیا میں البتہ عظیم سامراج نے پیسے کی خوب ریل پیل کر دی۔

معاشی مورخ ولیم وڈرف اسے یوں بیان کرتا ہے۔''ان علاقوں کے استحصال اور ان کے ساتھ روز افزوں بڑھتی تجارت ہی کی بدولت، یورپی گھرانوں نے دولت کی اتنی ریل پیل دیکھی، جس کا وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔'' دوسری لہر کی معیشت کے ڈھانچے کی گہرائی میں موجود۔۔۔ ہل من مزید کی خباثت انگیز فطری خواہش نے وسائل کی تلاش میں، سامراج کو کرہ ارض سے باہر نکلنے پر مجبور کر دیا۔ 1492ء میں جب کولمبس نے نئی دنیا میں اپنا پہلا قدم رکھا تھا تو دنیا کا صرف 9% حصہ یورپین اقوام کے قبضے میں تھا۔ 1801ء میں دنیا کا ایک تہائی حصہ انکی حکمرانی میں تھا۔ 1880ء میں یہ دو تہائی ہوگیا اور 1935ء تک یورپی اقوام، سیاسی طور پر سطح زمین کا 85% اور اس کی آبادی کا 70% حصہ کنٹرول کر رہی تھیں۔ دوسری لہر کے معاشرے کی طرح' پوری دنیا بھی تشکیل سازوں اور تشکیل شدگان میں منقسم ہوگئی۔

امریکیوں کے ذریعے تشکیل نو

سارے ہی تشکیل ساز مساوی حیثیت کے حامل نہیں تھے۔ دوسری لہر کی قوموں کو ابھرتے ہوئے عالمی معاشی نظام کو کنٹرول کرنے کی قیمت ایک زبردست خونیں جنگ کی صورت میں ادا کرنی پڑی۔ جرمنی کی ابھرتی ہوئی صنعتی طاقت نے برطانوی اور فرانسیسی غلبے کو پہلی جنگ عظیم میں چیلنج کر دیا۔ جنگ کی تباہ کاریوں، افراط زر اور بعدازاں سرد بازاری اور بعدازاں سرد باراری کے ہولناک چکر اور انقلاب روس۔۔۔ ان سب نے عالمی صنعتی مارکیٹ کو بری طرح ہلا کر رکھ دیا۔

ان سب تبدیلیوں کے باعث عالمی تجارت کی شرح نمو میں خوفناک کمی ہوگئی۔

MashalBooks.org

تجارتی نظم میں مزید کئی ممالک کے شامل ہونے کے باوجود بین الاقوامی تجارتی اشیاء کا حقیقی حجم بے حد کم ہو گیا۔ دوسری جنگ عظیم نے مربوط عالمی مارکیٹ کی توسیع میں مزید کمی کر ڈالی۔

دوسری جنگ عظیم کے خاتمے تک، مغربی یورپ، ہولناک تباہ کاریوں کی گہری دھند میں گم تھا۔ جرمنی زمین کے ایک مختصر سے ٹکڑے پر سکڑ کر رہ گیا۔ سوویت یونین کو نا قابل تلافی مادی اور انسانی نقصان کا سامنا کرنا پڑا۔ جاپانی صنعت بکھر کر رہ گئی۔ بڑی صنعتی قوتوں میں سے صرف امریکہ ہی خود کو معاشی نقصانات سے محفوظ رکھ سکا۔ 1946-50ء کے زمانے میں عالمی معیشت اتنی ابتر حالت میں تھی کہ غیر ملکی تجارت 1913ء سے لگا تار انتہائی زیریں سطح پر ہو رہی تھی۔

علاوہ ازیں، جنگ سے تباہ حال یورپی طاقتوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر نو آبادیاں، یکے بعد دیگرے سیاسی آزادی کا مطالبہ کرنے لگیں۔ گاندھی، ہو چی منہ، جوموکین یاٹا اور بہت سے دوسرے نو آبادیاتی مخالفین نے نو آبادکاروں کو ملک سے نکالنے کی اپنی اپنی تحریکیں شروع کر دیں۔

جنگی توپوں کے خاموش ہونے سے بھی پہلے یہ بات اظہر من الشمس ہو چکی تھی کہ جنگ کے بعد عالمی صنعتی معیشت کو نئی بنیادوں پر دوبارہ استوار کرنا ہوگا۔

دو قوموں۔۔۔۔ امریکہ اور سوویت یونین نے دوسری لہر کے نظام کی تنظیم نو اور تشکیل نو کا کام اپنے ذمے لیا۔ اس وقت تک عظیم سامراجی مہم میں امریکہ نے بڑا محدود سا کردار ادا کیا تھا۔ اپنی سرحدوں کو کھولتے ہوئے، مقامی امریکنوں کے قتل عام میں ہر دسویں فرد کی جان لی تھی اور انہیں پولیس کی سخت نگرانی میں غائب کر دیا گیا تھا۔ امریکیوں نے میکسیکو، کیوبا، یورٹوریکو اور فلپائن میں برطانوی، فرانسیسی یا جرمن سامراجی ہتھکنڈوں کی نقالی بھی کی۔ اس صدی کے ابتدائی عشروں میں لاطینی امریکہ میں امریکی ''ڈالر ڈپلومیسی'' نے چینی، کیلے، کافی، تانبے اور دوسری اشیاء کی ارزاں قیمتوں کی ضمانت کے سلسلے میں یونائیٹڈ فروٹ اور دوسری کارپوریشنوں کی خاصی مدد کی۔ بہرحال، یورپی قوموں کے مقابلے میں امریکہ، عظیم سامراج جدوجہد میں ایک جونیئر پارٹنر تھا۔

MashalBooks.org

دوسری جنگ عظیم کے بعد، اس کے برعکس، امریکہ دنیا کی سب سے بڑی قرضہ دینے والی قوم کی حیثیت سے نمایاں ہوا۔ اس کے پاس اعلی ترین ٹیکنالوجی، مضبوط ترین سیاسی ڈھانچہ اور شکستہ حال حریفوں کے، نو آبادیوں سے جبری انخلا کے بعد، اس خلا کو پر کرنے کے لئے ایک نا قابل مزاحمت موقع بھی موجود تھا۔

1941ء کے شروع میں امریکی مالیاتی حکمت عملی کے مرتسین، بعد از جنگ عالمی معیشت کی تشکیل نو کے لئے امریکی مفادات سے زیادہ ہم آہنگ لائنوں پر منصوبہ بندی کا آغاز کر چکے تھے۔ 1944ء میں امریکی قیادت کے تحت منعقد ہونے والی بریٹن ووڈز کانفرنس میں چوالیس اقوام نے دو بنیادی تشکیل ساز ڈھانچوں۔۔۔۔ بین الاقوامی مانٹری فنڈ اور عالمی بینک کے سیٹ اپ پر اتفاق کیا۔ مالیاتی فنڈ نے رکن قوموں کو امریکی ڈالر یا سونے سے اپنی کرنسیاں منسلک کرنے پر مجبور کیا۔ زیادہ تر سونا، 1948ء میں تمام دنیا میں موجود ہونے کے ذخائر کا 72% حصہ، امریکہ کے پاس تھا۔ اس طرح عالمی مالیاتی فنڈ نے دنیا کی اہم کرنسیوں کے مابین بنیادی تعلق طے کر دیا۔ ابتداء، میں عالمی بینک نے یورپی ممالک کو، بعداز جنگ، تعمیر نو کے لئے فنڈز مہیا کرنا شروع کئے۔ بعدازاں اس نے غیر صنعتی ملکوں کو بھی قرضے فراہم کرنا شروع کر دیئے یہ قرضے عموماً سڑکوں، بندرگاہوں، ہوائی اڈوں اور دوسرے مختلف النوع "تحتی ڈھانچوں" کی تعمیر کے لئے ہوتے تھے تاکہ خام مال اور زرعی برآمدات کی، دوسری لہر لہر کی اقوام کی جانب، نقل و حرکت میں سہولتیں بہم پہنچ سکیں۔

جلد ہی ایک تیسرا عنصر بھی نظام میں داخل ہو گیا: ٹیرف اور تجارت پر عمومی اتفاق۔ مختصراً اسے GATT کہا گیا۔ یہ معاہدہ بھی ابتداء (امریکہ ہی نے اسکی پرزور حمایت بھی کی) تجارت کو زیادہ آزاد بنانے کے لئے کیا گیا۔ جس کے نتیجے میں غریب تر ٹیکنالوجیکل کم ترقی یافتہ ممالک کے لئے اپنی نو خیز اور نوزائیدہ صنعتوں کا تحفظ اور بھی مشکل ہو گیا۔

تینوں ڈھانچوں کو ایک قانون کے ذریعے باہم منسلک کر دیا گیا۔ اس قانون کے تحت، عالمی بینک کو کسی بھی ایسے ملک کو قرضہ دینے سے روک دیا گیا جو مالیاتی فنڈ میں

شمولیت اورGATT کے اصولوں کی پابندی سے انکاری ہو۔

اس نظام میں امریکہ کے ناقدین کے لئے، کرنسی یا محصولات میں ردو بدل کے ذریعے اپنی ذمہ داریوں کو کم کرنا مشکل ہو گیا۔ اس نے عالمی مارکیٹ میں امریکی صنعت کو مزید تقویت دی اور اسی نے ساری صنعتی طاقتوں، خصوصاً امریکہ کو پہلی لہر کے بہت سے ممالک کی معاشی منصوبہ بندی پر۔۔۔ ان کی سیاسی آزادی کے کامیابی کے بعد بھی زبردست اثرونفوذ بخشا۔

ان تینوں باہم مربوط اداروں نے عالمی تجارت کے لئے ایک واحد تشکیل ساز ڈھانچے کو جنم دیا۔ 1944ء سے 1970 تک امریکہ بنیادی طور پر اس نظم پر چھایا رہا۔ قوموں کے مابین اس نے تشکیل سازوں کو شکل دی۔

سوشلسٹ سامراج

دوسری لہر کی دنیا پر امریکی قیادت کو سوویت یونین کی ابھرتی ہوئی طاقت نے آہستہ آہستہ چیلنج کرنا شروع کر دیا۔ سوویت یونین اور دوسرے ممالک خود کو سامراج دشمن اور دنیا کے نو آبادیاتی عوام کا دوست ظاہر کرتے تھے۔ 1916ء میں اقتدار سنبھالنے سے ایک سال پہلے لینن نے سرمایہ دار اقوام کی نو آبادیاتی پالیسیوں پر ایک زبردست جارحانہ مضمون لکھا تھا۔ ''سامراج'' صدی کی انتہائی متاثر کن کتابوں میں سے ایک بن گئی جو آج بھی دنیا کے لاکھوں' کروڑوں افراد کی فکری رہنمائی کرتی ہے۔

لیکن لینن نے سامراج کو خالصتاً سرمایہ دارانہ تصور سمجھا۔ سرمایہ دار اقوام نے، اس کا اصرار تھا، محض اپنی مرضی سے نہیں بلکہ ضرورت کے تحت، دوسری اقوام کو بجرو تشدد کا نشانہ بنایا اور انہیں نو آبادی کی شکل دی۔ مارکس کے پیش کردہ ایک آہنی قانون کے مطابق، سرمایہ دار معیشتوں کے منافع جات میں وقت کے ساتھ ساتھ کمی کا ایک عمومی اور نا قابل مزاحمت رجحان ظاہر ہو گا۔ اسی بنا پر لینن نے یہ رائے ظاہر کی کہ سرمایہ دار اقوام اپنے آخری مرحلے میں اندرونی شرح منافع کی کمی کو پورا کرنے کے لئے ملک سے باہر زبردست منافعوں کے حصول کے لئے بھاگ دوڑ پر مجبور ہوئی تھیں۔ صرف سوشلزم ہی، اس نے دلیل دی، نو آبادیاتی عوام کو اس ظلم و تشدد اور تکلیف دہ صورت حال سے نجات دلا سکتا ہے کیونکہ

سوشلزم میں کوی ء ایسی تحریک پوشیدہ نہیں جو معاشی استحصال کی متقاضی ہو۔لیکن لینن کی نظر سے ایسے بہت سے عوامل اوجھل رہ گئے جو سرمایہ دار صنعتی اقوام کی طرح سوشلسٹ صنعتی اقوام میں بھی اسی طرح کارفرما تھے۔ وہ بھی عالمی نظام زر کا حصہ تھے۔ ان کی معیشتوں کی بنیاد بھی پیداوار اور صرف کے مابین علیحدگی پر تھی۔ انہیں بھی مارکیٹ چاہئے تھی (ضروری نہیں کہ وہ منافع بخش مارکیٹ ہی ہو) تا کہ وہ پیدا کار اور صارف کا رشتہ دوبارہ جوڑ سکے اور انہیں بھی اپنے صنعتی کارخانے چلانے کے لئے غیر ممالک سے خام مال منگوانے کی ضرورت تھی۔ انہی وجوہ کی بنا پر انہیں بھی ایک تشکیل شدہ عالمی صنعتی نظام چاہئے تھا جس کے ذریعے وہ غیر ممالک سے اپنی ضروریات پوری کر سکیں اور انہیں اپنی تیار اشیاء فروخت کر سکیں۔

حقیقتاً لینن نے سامراج پر حملہ آور ہونے کے ساتھ ساتھ ہی، سوشلزم کا مقصد۔۔۔''نہ صرف اقوام کو ایک دوسرے کے قریب لانا بلکہ انہیں باہم یکجا کرنا''۔۔۔۔ بھی بیان کر دیا تھا۔ ایک سوویت تجزیہ نگار ایم سینن نے ''سوشلسٹ تشکیل'' میں لکھا ہے۔ 1920ء تک لینن نے اقوام کو باہم اکٹھا کرنے کے عمل کو ایک معروضی مرحلہ قرار دیا جو۔۔۔ بالآخر اور حتمی طور پر واحد عالمی مارکیٹ کی تخلیق کی جانب رہنمائی کرے گا، جسے چلانے میں ایک ہی عمومی منصوبہ کارفرما ہوگا۔ یہ ایک جیسا تیسا حتمی صنعتی تصور تھا۔

خارجی طور پر سوشلسٹ صنعتی اقوام کو بھی، سرمایہ دار اقوام کی طرح، اسی قسم کے وسائل کی احتیاج نے باہر کی طرف دیکھنے پر مجبور کیا۔ انہیں بھی اپنی تیز بڑھتی ہوئی فیکٹریوں اور شہری آبادیوں کو مہیا کرنے کے لئے کاٹن، کافی، نکل، چینی، گندم اور دوسری اشیاء کی اشد ضرورت تھی۔ سوویت یونین کے پاس (اور اب بھی) قدرتی وسائل کے لاتعداد ذخائر موجود تھے۔ اس کے پاس مینگنیز لیڈ، زنک، کوئلہ، فاسفیٹ، اور سونے کے ذخائر تھے۔ یہ ذخائر امریکہ کے پاس بھی تھے لیکن اس کے باوجود دونوں اقوام نے دوسرے ممالک سے ارزاں ترین قیمتوں پر ان کی خرید میں کوئی رکاوٹ محسوس نہیں کی۔

سوویت یونین معرض وجود میں آتے ہی عالمی نظام زر کا حصہ بن گیا تھا۔ ایک دفعہ جو قوم اس نظام میں شامل ہوئی اور اس نے کاروبار کرنے کے ''نارمل'' طریقوں کو قبول

MashalBooks.org

کرلیا، وہ خود بخود استعداد اور پیداواری صلاحیت کی روایتی تعریفوں میں جکڑی گئی۔۔۔۔ وہ تعریفیں یا حدود، جنہیں با آسانی ابتدائی سرمایہ دارانہ نظام میں تلاش کیا جا سکتا تھا۔ اسے تقریباً لاشعوری طور پر روایتی معاشی تصورات، درجات، تعریفیں، حساب کتاب کے طریقے اور پیمائش کی اکائیاں قبول کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔

سوشلسٹ مینیجرز اور معیشت دانوں نے بالکل اپنے سرمایہ دار ہم منصبوں کی طرح، اپنے خام مال کی پیداوار کے اخراجات اور باہر سے اس کی قیمت خرید کا باقاعدہ حساب کتاب کے ذریعے موازنہ کیا۔ سرمایہ دار کارپویشنوں کے روز مرہ کے فیصلوں کی طرح ان کے سامنے بھی ایک واضح صورت تھی۔ ''بناؤ یا خریدو'' کا فیصلہ او جلد ہی یہ بات واضح ہو گئی کہ بعض خام مال ملک میں بنانے کی نسبت عالمی مارکیٹ سے زیادہ سستے داموں خریدا جا سکتا ہے۔

ایک بار یہ فیصلہ کر لیا گیا تو تیز طرار سوویت خریداری ایجنٹ، پوری دنیا کی مارکیٹ میں بکھر گئے اور ان گذشتہ قیمتوں پر دھڑا دھڑ خریداری کرنے لگے جو سرمایہ دار تاجروں نے مصنوعی طریقوں سے انتہائی کم سطح پر رکھی ہوئی تھیں۔ ملایا کا ربڑ، ٹرکوں کے ذریعے انہی قیمتوں پر سوویت یونین جانا شروع ہو گیا جو غالباً برطانوی تاجروں نے انتہائی ابتدائی سطح پر اپنے لئے مقرر کی تھیں۔ اس سے بھی بد تر موجودہ سالوں میں سوویت حکام نے (جن کی گنی میں فوجیں موجود ہیں) گنی سے باکسائٹ چھ ڈالر فی ٹن کے حساب سے لیا جبکہ امریکہ 23 ڈالر فی ٹن ادا کر رہے تھے۔ بھارت نے احتجاج کیا کہ روسی، بھارتی درآمدات پر 30% زیادہ قیمت وصول کرتے ہیں اور بھارتی برآمدات پر 30% کم ادائیگی کرتے ہیں۔ ایران اور افغانستان کو بھی روسیوں نے قدرتی گیس کی بہت کم قیمت دی۔ چنانچہ سوویت یونین نے بھی اپنے سرمایہ دار حریف ملکوں کی طرح نو آبادیات پر ناروا بوجھ ڈال کر خوب فائدہ اٹھایا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو خود اس کی صنعتی ترقی کی رفتار دھیمی پڑ جاتی۔

سوویت یونین کو بھی اپنے سٹریٹجک معاملات کی وجہ سے، سامراجی پالیسیوں کی طرف پیش رفت کرنا پڑی۔ نازی جرمنی کی فوجی طاقت کو مقابل دیکھ کر اس نے سب سے پہلے بالٹک ریاستوں کو نو آبادی بنایا اور فن لینڈ کے سلسلے میں جنگ تک شروع کر دی۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد اپنی افواج اور حملے کی دھمکیوں کے ذریعے مشرقی یورپ کے اکثریتی حصے میں ''دوست'' حکومتوں کے قیام اور ان کے استحکام میں بھرپور مدد دی۔ یہ تمام ممالک صنعتی طور پر خود سوویت یونین سے زیادہ ترقی یافتہ تھے لیکن سوویت یونین نے ان کا خون چوس کر انہیں آبادیوں یا ''طفیلی ریاستوں'' کی حیثیت دے ڈالی۔

''اس بارے میں کوئی شبہ نہیں ہے'' نیو مارکسٹ معیشت دان ہاورڈ شرمن لکھتا ہے ''کہ دوسری عالمی جنگ کے فوراً بعد سوویت یونین نے مشرقی یورپ سے بعض وسائل کی خاصی تعداد بغیر کسی مساوی وسائل کے بطور قیمت دیئے، حاصل کر لی۔۔۔۔۔ کچھ تو براہ راست مال غنیمت تھا اور کچھ جنگی تاوان۔۔۔۔ کئی ایک جوائنٹ کمپنیاں، جن کے کنٹرول پر روسی بالادستی تھی، قائم کی گئیں تا کہ ان ممالک سے حاصل شدہ منافع پر بھی سوویت استحصال جاری رہ سکے۔ بہت سے ایسے غیر مساوی تجارتی معاہدے بھی ہوئے جن کے ذریعے تاوان جنگ کے حجم میں مزید اضافہ ہو گیا۔

بظاہر آج کل وہاں کوئی براہ راست لوٹ مار نہیں ہے اور جوائنٹ کمپنیاں بھی غائب ہو چکی ہیں لیکن شرمن مزید کہتا ہے۔ ''اس طرح کے خاصے ثبوت ہیں کہ ۔۔۔۔سوویت یونین کے موجودہ بہت بہتر رویوں کے باوجود۔۔۔۔ سوویت یونین اور مشرقی یورپ کے مابین، زیادہ تر تبادلہ جات، آج بھی غیر مساوی ہیں۔ طبع شدہ سوویت اعداد وشمار کے نا کافی ہونے کی وجہ سے، یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ ان ذرائع سے کتنا ''منافع'' باہر کھینچ لیا جاتا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ مشرقی یورپ میں متعین سوویت افواج کے اخراجات حقیقتاً ان سارے معاشی فوائد کو نگل جاتے ہوں لیکن ایک حقیقت غیر متنازعہ طور پر واضح ہے۔

جب امریکیوں نے بین الاقوامی مالیاتی فنڈ، جی اے ٹی ٹی (تجارتی اور محصولاتی معاہدہ) اور عالمی بینک کا ڈھانچہ تعمیر کیا تو سوویت حکمرانوں نے کونسل برائے باہمی معاشی معاونت (Comecon) تخلیق کر کے لینن کے خواب۔۔۔۔ ایک واحد منضبط عالمی معاشی نظام کی طرف پیش قدمی کی اور مشرقی یورپی ملکوں کو ایس میں شمولیت پر مجبور کیا۔ کومکون ممالک کو، روسی زبردستی کی وجہ سے، نہ صرف سوویت یونین اور رکن ممالک سے ہی

تجارت کرنا پڑتی ہے بلکہ انہیں اپنے معاشی ترقی کے منصوبے بھی منظوری کے لئے ماسکو کو پیش کرنے پڑتے ہیں۔ ماسکو نے بعینہ ابتدائی سامراجی طاقتوں کی طرح، جو کچھ وہ افریقہ، ایشیا اور لاطینی امریکہ میں کر چکے تھے، ریکارڈو کے نظریہ تخصیص کی خوبیوں پر اصرار کرتے ہوئے، مشرقی یورپ کی ہر معیشت کو خصوصی فرائض سونپے ہیں، صرف رومانیہ نے کھلم کھلا اور شدید مزاحمت کا اظہار کیا۔

رومانیہ نے یہ دعویٰ کرتے ہوئے۔۔۔۔ کہ ماسکو نے سوویت یونین کو ''پٹرول پمپس اور باغات'' میں تبدیل کرنے کی کوشش کی ہے۔۔۔۔ خود کثیر الجہت ترقی کے مقاصد، جن کا مقصد مکمل قومی صنعتی تشکیل تھا، کے حصول کی جانب اپنی حکمت عملی تیار کی۔ اس نے سوویت دباؤ کے باوجود سوشلسٹ تشکیل کے خلاف بھرپور مزاحمت کی ہے۔ قصہ مختصر دوسری عالمی جنگ کے بعد جہاں امریکہ نے سرمایہ دار صنعتی قوموں کی قیادت سنبھالی اور عالمی معاشی نظام کی تشکیل کے لئے اس کے خود کار نظاموں کی تعمیر کی، وہاں سوویت یونین نے بھی دنیا کے اپنے حلقہ اثر والے ممالک میں اسی نظام کا دوسرا حصہ تعمیر کیا۔

سامراج کی طرح کا وسیع، پیچیدہ اور مختلف الشکل کوئی بھی نادر الوجود نظریہ اتنی آسانی سے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ مورخین ابھی تک مذہب، تعلیم، صحت، ادب اور فن کے تصورات، نسلی رویوں، عوامی نفسیاتی ڈھانچے اور اس کے ساتھ ساتھ معاشیات پر اس کے براہ راست اثرات کا کھوج لگانے میں مصروف ہیں۔ بلاشبہ مختلف معاشروں پر اس کے مثبت اثرات کا کریڈٹ بھی اسے جاتا ہے۔ لیکن دوسری لہر کی تہذیب کے ارتقاء میں اس کے کردار کو ضرورت سے زیادہ اہمیت نہیں دی جا سکتی۔

ہم یہ سوچ سکتے ہیں کہ سامراج نے دوسری لہر کی دنیا میں صنعتی ارتقاء کے عمل کو بھڑکانے میں سپر چارجر کا کام دیا۔ خوراک، توانائی اور خام مال کے خارجی نفوذ کے بغیر امریکہ، مغربی یورپ، جاپان یا سوویت یونین صنعتی ارتقاء کے عمل کو کتنی تیز رفتاری سے آگے بڑھا سکتے تھے؟ اگر باکسائٹ، میگنیز، ٹن، وناڈیئم یا تابنے جیسی اشیاء کی قیمتیں، کئی پرمحیط زمانے میں 30% سے 50% زیادہ ہوتیں تو کیا حال ہوتا؟

ہزاروں حتمی اشیاء کی قیمتیں اسی حساب سے بڑھ جاتیں۔۔۔۔ اور بعض کیسوں

MashalBooks.org

میں بلاشبہ قیمتوں میں بے پناہ اضافے کی وجہ سے ان کا وسیع پیانے پر اصراف ہی ناممکن ہو جاتا۔ 1970ء کے عشرے میں تیل کی قیمتوں میں اضافہ کا شاک، اس کے زبردست اثرات کی جانب صرف معمولی سا اشارہ کرتا ہے۔ملکی متبادلات کی موجودگی کی صورت میں بھی دوسری لہر کی اقوام کی معاشی نشوونما کے تمام تر امکانات رک کر رہ جاتے۔ سامراج کی جانب سے ممکنہ طور پر دی گئی تمام مخفی امداد کے بغیر، دوسری لہر کی سرمایہ دار اور سوشلسٹ تہذیب،ممکن آج ترقی کی اس سطح پر ہوتی جہاں دنیا1920ء اور1930ء کے زمانے میں تھی۔

یہ عظیم منصوبہ اب واضح ہو جانا چاہیئے۔ دوسری لہر کی تہذیب نے کرہ ارض کی کانٹ چھانٹ کر کے اسے واضح قومی ریاستوں میں منظم کر دیا۔ باقی ماندہ دنیا کے وسائل کی احتیاج نے پہلی لہر کے معاشروں اور دنیا کے قبائلی عوام کو نظام زر سے منسلک کر دیا۔ اسی نے ایک عالمی منضبط مارکیٹ کو جنم دیا۔لیکن اس صنعتی راج کی حدود صرف معاشی، سیاسی یا سماجی نظام تک ہی محدود نہیں تھیں۔ یہ ایک طرز زندگی بھی تھا اور سوچ کا ایک انداز بھی۔ اس نے دوسری لہر کی ایک خاص ذہنیت پیدا کی اور یہی ذہنیت تیسری لہر کی قابل عمل تہذیب کی تخلیق میں ایک بنیادی رکاوٹ بن رہی ہے۔

باب 8

صنعتی راج کی حقیقت

دوسری لہر کی تہذیب نے جونہی دنیا کو اپنی گرفت میں لیا، اس نے اپنی راہ میں آنے والی ہر شے کی ہئیت ہی بدل کر رکھ دی۔ اس کے جلو میں، ٹیکنالوجی اور تجارت کے علاوہ اور بھی بہت کچھ ساتھ آیا۔ پہلی لہر کی تہذیب سے تصادم کے نتیجے میں دوسری لہر کی تہذیب نے نہ صرف لاکھوں لوگوں کے لئے ایک نئی حقیقت کو جنم دیا بلکہ اس حقیقت کے متعلق ایک نیا انداز فکر بھی پیدا کیا۔

زرعی معاشرے کی قدروں، تصورات، افسانوی تخیلات اور اخلاقیات کے ساتھ ہزاروں نکات پر متصادم ہو کر، دوسری لہر اپنے ہمراہ خدا کے۔۔۔ انصاف کے، محبت کے۔۔۔ طاقت کے۔۔۔ اور خوبصورتی کے نئے تصورات لائی، اس نے نئے نظریات، نئے رویوں اور نئے آہنگوں کو تحریک دی۔ اس نے زمان و مکان، مادے اور استدلال کے قدیم مفروضوں کو غلط قرار دے کر ان پر فوقیت حاصل کی، ایک ایسا طاقتور اور متوازن عالمی نقطہ نظر ابھر کر سامنے آیا، جس نے نہ صرف دوسری لہر کی حقیقت کی وضاحت کی بلکہ اس کا جواز، عقلی طور پر ثابت بھی کیا، صنعتی معاشرے کے اس عالمی نقطہ نظر کو ابھی تک کوئی نام نہیں دیا گیا۔ اسے غالباً بجا طور پر "صنعتی راج کی حقیقت" کا نام دیا جا سکتا ہے۔

صنعتی راج کی حقیقت، نظریات اور مفروضات کا ایک ایسا مبالغہ آمیز، رنگین مجموعہ تھا جس کے ذریعے صنعتی دور کی نئی نسل کو ان کی اپنی دنیا سے آگاہی کی تعلیم دی گئی۔ دوسری لہر کی تہذیب نے اپنے سائنس دانوں، کاروباری رہنماؤں، سیاست دانوں، فلاسفروں اور پراپیگنڈہ کرنے والوں کے ذریعے بہت سارے امور کا ان کے وسیع تناظر میں احاطہ کیا۔

MashalBooks.org

بلاشبہ کئی ایک مخالفانہ آوازیں اٹھیں، جنہوں نے صنعتی راج کی حقیقت کے غالب نظریات کو چیلنج کیا، لیکن ہم یہاں غیر اہم موجوں کو ایک جانب رکھتے ہوئے دوسری لہر کی فکر کے مرکزی بہاؤ پر متوجہ ہیں۔ ظاہری سطح پر تو یوں لگتا تھا جیسے یہاں کوئی مرکزی بہاؤ ہے ہی نہیں بلکہ محسوس یہ ہوتا تھا کہ دو طاقتور نظریاتی کرنٹس حالت تصادم میں ہیں۔ انیسویں صدی کے نصف تک ہر صنعتی قوم بہت واضح طور پر دائیں اور بائیں بازو میں، انفرادی آزادی اور آزاد تجارت کے حامیوں اور اجتماعیت اور اشتراکیت کے حامیوں میں بٹ چکی تھی۔

نظریات کی یہ جنگ، ابتداء میں تو صرف صنعتی ارتقاء کی طرف گامزن اقوام میں ہی محدود رہی لیکن جلد ہی پوری دنیا میں پھیل گئی۔ 1917ء کے سوویت انقلاب اور ایک بین الاقوامی پراپیگنڈہ مشین کی مرکزی تنظیم کے وجود میں آتے ہی، نظریاتی جدوجہد میں شدت اور زیادہ بڑھ گئی اور دوسری عالمی جنگ کے بعد جب امریکہ اور سوویت یونین عالمی مارکیٹ کی۔۔۔۔ یا اس کے خاصے بڑھے حصے اطراف سے دنیا کی غیر صنعتی اقوام میں اپنی اپنی ڈاکٹرائن کو مقبول عام بنانے کے لئے بے پناہ اخراجات کئے جا رہے تھے۔

ایک طرف اجتماعیت کی دعویدار حکومتیں تھی اور دوسری جانب نام ونہاد روشن خیال جمہوریتیں تھیں۔ جہاں دلائل پر مبنی بحث و مباحثہ لا حاصل رہتا تو بندوقوں اور بموں کے استعمال کی تیاری شروع ہو جاتی۔ کیتھولک اور پروٹسٹنٹ نظریات کے مابین۔۔۔۔ ریفارمیشن کے زمانے میں۔۔۔۔ ہونے والے عظیم ٹکراؤ کے بعد کبھی بھی دو باہم متضاد مذہبی نظریات کے درمیان اتنی واضح تقسیم نظر نہیں آئی۔

پراپیگنڈے کی گرما گرم جنگ کے دوران بہر حال یہ بات بہت کم لوگوں ن محسوس کی کہ بظاہر طرفین مختلف نظریات کا پرچار کرتے ہوئے بھی حقیقتاً ایک عظیم نظریئے کی طرف ہی بڑھ رہے تھے۔ ان کے تصورات، ان کے معاشی پروگرام اور سیاسی عقائد بے پناہ مختلف تھے مگر ان کے بہت سے ابتدائی مفروضات میں یکسانیت تھی۔ بعینہٖ کیتھولک اور پروٹسٹنٹ مشنریز کی طرح بائبل کے مختلف مطالب و معانی لینے کے باوجود دونوں ہی مسیحی تبلیغ میں مصروف تھے۔۔۔۔ مارکسٹ اور مارکس مخالف، بالکل اسی انداز میں سرمایہ دار اور سرمایہ دار مخالف، امریکہ اور روس، دونوں ہی نے افریقہ، ایشیاء اور لاطینی امریکہ۔۔۔۔ دنیا کے

غیر صنعتی علاقوں۔۔۔ کی جانب انہی بنیادی اصولوں پر اندھا اعتقاد رکھتے ہوئے پیش قدمی کی۔ دونوں ہی دوسری تمام تہذیبوں پر صنعتی راج کی برتری کے پرچارک تھے دونوں ہی صنعتی راج کی حقیقت کے پر جوش مبلغ تھے۔

ترقی کا اصول

جس عالمی نقطہ نظر کی انہوں نے تشہیر کی، وہ تین بہت ہی اندرونی طور پر، باہم منسلک، حقیقی صنعتی عقائد پر مبنی تھا۔۔۔ تین خیالات، جنہوں نے دوسری لہر کی اقوام کو نہ صرف اکٹھا کیا بلکہ انہیں باقی دنیا سے کہیں زیادہ ممتاز بھی کیا۔ ان اندرونی عقائد میں سے پہلا فطرت سے متعلق ہے۔ سوشلسٹ یا سرمایہ دار، فطرت کے ثمرات کی بندر بانٹ کے متعلق کتنے ہی شدید اختلافات کیوں نہ رکھتے ہوں لیکن اسے دیکھا دونوں نے ایک ہی انداز سے۔ دونوں کے نزدیک فطرت ایک ایسی چیز تھی جو اپنے استحصال کی منتظر تھی۔

یہ نظریہ۔۔۔ کہ مظاہر فطرت پر انسان کا قبضہ ہونا چاہئے۔۔۔ کم و بیش جینسیز کے زمانے سے چلا آ رہا ہے۔ یہ اور بات کہ صنعتی انقلاب سے پہلے یہ محض ایک اقلیتی نقطہ نظر تھا۔ اکثر ابتدائی ثقافتیں، اس کے برعکس غربت کے آگے سر تسلیم خم کرنے اور ماحول کی فطری، غیر متبادل ہیئت کے ساتھ انسانی مطابقت اور ہم آہنگی پر ہی زور دیتی رہیں۔

یہ ابتدائی ثقافتیں، خاص طور سے فطرت پر، بہت زیادہ مہربان نہیں تھیں۔ انہوں نے بھی جنگلات کی اچھی خاصی چیرا پھاڑی کی۔ انہیں آگ میں بھسم کر دیا۔ جانوروں کی خوراک کے طور استعمال کیا اور جلانے کی لکڑی کے طور پر جنگلوں کی دھجیاں بنا کر ضائع کر ڈالیں۔ لیکن ان کی ضرور رسانی کی طاقت محدود تھی۔ انہوں نے زمین پر کوئی بہت زیادہ اثرات نہیں چھوڑے اور نہ ہی انہیں کسی ایسے قطعی نظریئے کی ضرورت تھی جس کے تحت وہ اپنی ضرر رسانی کا جواز دیتے پھرتے۔

دوسری لہر کی تہذیب کی آمد کے ساتھ ہی یہ پتہ چلا کہ سرمایہ دار صنعتکار، وسیع پیمانے پر وسائل کو نکالنے پر تلے ہوئے ہیں، بے تحاشا زہر ہوا میں شامل کیا جا رہا ہے، پورے پورے علاقوں کے جنگلات ختم کئے جا رہے ہیں۔۔۔ اور یہ سب کچھ منافع کے

MashalBooks.org

حصول کے لئے تھا، بغیر یہ سوچ سمجھے کہ اس کے برے اثرات یا طویل قدرتی نتائج کیا برآمد ہونگے اس نظریئے نے۔۔۔ کہ فطرت تو ہے ہی استحصال کے لئے۔۔۔ کوتاہ نظری اور خودغرضی کو ایک آسان عقلی توجیہہ بھی مہیا کر دی۔

لیکن سرمایہ دار اس مہم جوئی میں اکیلے کبھی نہیں رہے۔ مارکسی صنعتی راج کے تشکیل سازوں نے بھی جہاں کہیں انہیں اقتدار ملا۔۔۔ اپنے اس عقیدے کے باوجود کہ منافع ہی ہر خباثت کی جڑ ہے۔۔۔ بالکل سرمایہ داروں کے سے انداز میں کام کیا۔ انہوں نے تو حقیقتاً اپنے نظریاتی لٹریچر میں بھی فطرت سے تصادم کا نظریہ تعمیر کیا۔ اشترامفکروں نے ابتدائی/قدیم لوگوں کی جو تصویر کشی کی اسکے مطابق وہ باہم مل جل کر رہنے اور فطرت سے ہم آہنگ ہونے کے بجائے فطرت کے خلاف زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ایک خوفناک جدوجہد میں مصروف نظر آتے ہیں۔ طبقاتی معاشروں کے ابھرنے کے بعد بقول ان کے ''انسان کی فطرت کے خلاف'' جنگ، بدقسمتی سے ''انسان کے انسان کے خلاف'' جنگ میں تبدیل ہوگئی۔ ایک اشتراکی غیر طبقاتی معاشرے کا حصول، انسانیت کو دوبارہ اس کے اسی پہلے والے کام پر لا کھڑا کرے گا۔۔۔ انسان کی فطرت کے خلاف جنگ کے عمل پر۔

نظریاتی تقسیم کے دونوں جانب یہی نظریہ غالب نظر آتا ہے کہ انسانیت فطرت کی مخالفت میں کمربستہ، اسے مسخر کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہے۔ یہ تصور صنعت راج کی حقیقت۔۔۔ وہ عظیم نظریہ جس کے لئے اشتراکیوں اور سرمایہ داروں، دونوں نے یکساں طور پر اپنے مفروضات قائم کئے۔۔۔ کا ایک بنیادی عنصر ہے۔

دوسرا متعلقہ تصور، دلیل کو مزید ایک قدم آگے لے گیا۔ انسان محض فطرت کے نگران نہیں تھے۔ وہ ارتقاء کے ایک طویل عمل کے بعد انتہائی کمال کو پہنچے تھے۔ ارتقاء کے نظریات پہلے بھی موجود تھے مگر یہ ڈارون تھا۔۔۔ جو انیسویں صدی کے وسط میں اپنے وقت کی سب سے ترقی یافتہ قوم میں پلا بڑھا۔۔۔ جس نے اس نقطہ نظر کو سائنسی توجیہ مہیاں کی۔ اس نے فطری انتخاب کی اندھی کارفرمائی۔۔۔ ایک ناگزیر عمل جس نے زندگی کی کمزور اور غیر مستعد شکلوں کو بڑی بے رخی سے ختم کر ڈالا۔۔۔ کا نظریہ پیش کیا۔ ڈارون کے مطابق اپنا وجود برقرار رکھنے والے جاندار ہی دراصل موزوں ترین یا اہل ترین جاندار

تھے۔ ڈارون کی تحقیقات بنیادی طور پر حیاتیاتی ارتقاء کے متعلق تھیں۔ لیکن اس کے نظریات واضح سماجی اور سیاسی اثرات کے حامل تھے، جنہیں فوری طور پر محسوس کر لیا گیا۔ چنانچہ ڈارون کے معاشرتی پیروکاروں نے یہ دلیل دی کہ فطری انتخاب کا اصول، معاشرے کے اندر بھی اسی طرح کارفرما ہے اور دولتمند ترین اور انتہائی طاقتور افراد، اسی اصول کے مطابق ارتقاء پذیر ہوتے ہیں۔ اس عمل اس دلیل کے مطابق صنعتی راج۔۔۔ اپنے اردگرد پھیلے ہوئی غیر صنعتی ثقافتوں کے مقابلے میں۔۔۔ ارتقاء کے بلند تر مرحلے میں تھا۔ سچ جانیئے تو دوسری لہر کی تہذیب باقی تمام ثقافتوں سے کہیں برتر اور اعلیٰ تھی۔

جس طرح ڈارون کے معاشرتی حامیوں نے سرمایہ دارانہ نظام کے لئے دلائل کے ڈھیر لگا، اسی طرح اس ثقافتی برتری کے ذریعے سامراج کا جواز تلاش کر لیا گیا۔ توسیع پذیر صنعتی نظم کو اپنی زندگی برقرار رکھنے کے لئے ارزاں وسائل کی ضرورت تھی، اس نظریئے نے ان وسائل کی بے نام قیمتوں پر حصول کے لئے ایک اخلاقی جواز پیدا کر دیا، چاہئے اس تگو دو میں زرعی اور نام ونہاں غیر مہذب معاشروں کا نام ونشان تک باقی نہ رہے۔ سماجی ارتقاء کے نظریئے نے، غیر صنعتی لوگوں کی پسماندگی کے سبب، ان کے ساتھ تحقیر آمیز سلوک کو عقلی اور اخلاقی جواز مہیا کر دیا۔۔۔ اسی لئے وہ بقا کے لئے نا اہل ٹھہرے۔ خود ڈارون نے غیر محسوس طور پر تسمانیہ کے (Aborigines) کے قتل عام کا ذکر کیا اور اسی دھماکہ خیز ارادی قتل عام کے زیر اثر، اس نے انتہائی پر جوش انداز میں پیش گوئی بھی کر ڈالی کہ۔۔۔ "مستقبل کے کسی دور میں۔۔۔ مہذب انسانی نسلیں، دنیا سے غیر مہذب نسلوں کا مکمل صفایا کر دیں گی"۔ دوسری لہر کی تہذیب کے دانش ور رہنماؤں کو اس بارے میں کوئی شبہات نہیں تھے کہ بقا (زندہ رہنے) کا حق کسے حاصل ہے۔

مارکس نے سرمایہ داریت اور سامراجیت پر شدید تنقید کرنے کے باوجود اس نقطہ نظر سے اتفاق کیا کہ صنعتی نظام معاشرے کی سب سے ترقی یافتہ شکل ہے اور اس ترقیاتی مرحلے کی جانب تمام معاشروں کی پیش رفت لازمی اور ناگزیر ہے۔

صنعتی راج کی حقیقت کا تیسرا بنیادعقیدہ، جس نے فطرت اور ارتقاء کو باہم منسلک کیا، ترقی کا اصول تھا۔۔۔ یہ تصور کہ تاریخ کا بہاؤ، غیر متبدل طور پر، انسانیت کے لئے

ایک بہتر زندگی کی جانب رواں ہے۔ اس نظریئے کی قبل از صنعتی دور میں بھی کافی مثالیں موجود ہیں لیکن دوسری لہر کی پیش قدمی کے بعد ہی حقیقی طور پر ترقی کا نظریہ اپنی پوری قوت سے نمودار ہوا۔

اچانک دوسری لہر کے یورپ پر چھا جانے کے بعد ہزاروں آوازیں، کورس کی صورت، خدا کی حمد اور شکر کے گیت گانے لگیں۔ لائب نز، ٹرگاٹ، کنڈورسیٹ، کانٹ، لیسنگ، جان سیٹوراٹ مل، ہیگل، مارکس، ڈارون اور اَن گنت غیر معروف مفکرین پر کائناتی رجائیت کی حقیقت آشکارا ہوئی۔ ان کے مابین مباحث کا آغاز ہوگیا کہ آیا ترقی حقیقتاً نا گزیر تھی یا کیا اسے نسل انسانی کی جانب سے کسی معاونت کی ضرورت تھی، بہتر زندگی کی تشکیل کن بنیادوں پر ہو، کیا ترقی ہمیشہ ہوتی رہے گی یا اسے ہمیشہ برقرار رکھا جا سکے گا، وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ترقی کے نظریئے پر بہر حال سب کا اتفاق تھا۔

دہریوں، مذہب پرستوں، طالب علموں، استادوں، سیاست دانوں اور سائنس دانوں، غرض سبھی نے اس نئے عقیدے کی تبلیغ کی۔ کاروباری لوگوں اور کسانوں نے یکساں طور پر ہر نئی فیکٹری، ہر نئی تیار کردہ شے، ہر نئی رہائشی تعمیرات، شاہراہ یا ڈیم کی تعمیر کو۔۔۔۔ برے سے اچھے یا اچھے سے بہتر کی جانب۔۔۔۔ غیر مزاحمانہ پیش رفت جان کر کھلے دل سے ان کا استقبال کیا۔ شاعروں، ڈرامہ نگاروں اور مصوروں نے ترقی کو الوہی حق سمجھ لیا۔ ترقی نے ہی فطرت کی تباہی و بربادی اور کم ترقی یافتہ تہذیبوں کی فتح کا جواز مہیا کیا۔

اور ایک بار پھر وہی نظریہ، آدم سمتھ اور کارل مارکس کے افکار میں متوازی طور پر جاری وساری نظر آتا ہے۔ رابرٹ بائیل بروز لکھتا ہے۔ ''سمتھ ترقی کا پیروکار تھا۔ ''دولت اقوام'' میں ترقی، انسانیت کا کوئی تصوراتی مقصد ہرگز نہیں تھا بلکہ ۔۔۔۔ ایک منزل کی طرف اس کا رخ متعین کیا گیا تھا۔۔۔۔ یہ نجی معاشی اہداف کی ضمنی پیداوار تھا۔'' مارکس کے لئے البتہ یہ نجی اہداف صرف سرمایہ داری نظام کو استوار کر رہے تھے اور اس کی تباہی کی وجوہات خود اس کے وجود میں مخفی تھیں لیکن سرمایہ داریت کا وقوع خود بھی ایک طویل تاریخ کا حصہ تھا جو بالآخر انسانیت کو سوشلزم، کمیونزم اور اس سے بھی کہیں بہتر مستقبل کی جانب لے جاتا۔

دوسری لہر کی تہذیب کے دوران انہیں تین بنیادی تصورات۔۔۔۔فطرت کے ساتھ جنگ، ارتقاء کی اہمیت اور اصول ترقی۔۔۔۔نے صنعتی راج کے ایجنٹوں کو ان کی اپنی توضیحات اور جواز کے مطابق قابل استعمال ہتھیار فراہم کئے۔

ان اعتقادات کے نیچے حقیقت سے متعلق اور بھی زیادہ گہرے مفروضات۔۔۔۔انسانی مشاہدے کی اساس کے بارے میں ان کہے عقائد۔۔۔۔کا ایک مجموعہ موجود ہے۔ ہر انسان کو ان اساسی رویوں کا لازماً سامنا کرنا چاہئے اور ہر تہذیب انہیں ایک مختلف انداز میں پیش کرتی ہے۔ ہر تہذیب کو اپنی نئی نسل کو زمان و مکان سے نبرد آزما ہونے کی تعلیم دینی چاہئے۔ اسے کسی بھی ذریعے سے خواہ وہ تخیلاتی ہو، استعاراتی ہو یا سائنسی نظریہ۔۔۔۔یہ وضاحت کرنی چاہئے کہ فطرت کسی طرح کام کرتی ہے اور اس کی بھی کوئی نہ کوئی توجیہہ ضرور ہونی چاہئے کہ اشیاء اپنی موجودہ شکل اور ترتیب کیسے قائم رکھتی ہیں۔

چنانچہ دوسری لہر کی تہذیب نے اپنی نشونما کے ساتھ زمان و مکان، مادے اور سبب و علت کے متعلق خود اپنے واضح مفروضات پر مبنی، حقیقت کا کلی طور پر ایک نیا تصور پیدا کیا۔ ماضی سے بکھرے ہوئے اجزاء چن کر، انہیں نئے طریقے سے مجتمع کر کے، تجربات اور مشاہدات کا استعمال کر کے اس نے حیرت انگیز طریقے سے یہ واضح کر دیا کہ انسان نے کس انداز میں اپنے اردگرد کی دنیا کا ادراک حاصل کیا اور وہ اپنی روز مرہ کی زندگی میں کس طرح کے رویئے اختیار کرتا تھا۔

وقت کا سافٹ ویئر

ہم کسی ابتدائی باب میں دیکھ چکے ہیں کہ صنعت سازی کس طرح مشینی آہنگ کے ساتھ، انسانی رویئے کی مطابقت کی محتاج تھی۔ وقتی ہم آہنگی، دوسری لہر کی تہذیب کے رہنما اصولوں میں سے ایک اصول تھا۔ صنعتی معاشرے کے لوگ ہر جگہ، باہر کے لوگوں کو وقت کے چکر میں پھنسے نظر آئے۔ جسے دیکھو بدحواسی میں اپنی گھڑی پر نظر جمائے دکھائی دیتا ہے۔

وقت کا یہ احساس دلانے اور اس سے ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے، بہر حال

وقت کے بارے میں لوگوں کے بنیادی مفروضات۔۔۔ وقت کے متعلق ان کے ذہنی خاکوں کو تبدیل کیا جانا ضروری تھا ''وقت کا ایک نیا سافٹ ویئر'' ضروری تھا، زرعی آبادیوں کو صرف اتنا علم چاہیئے تھا کہ فصل کب بونی ہے اور کب کاٹنی ہے، چنانچہ انہوں نے وقت کے طویل وقفوں کی پیمائش ، انتہائی منضبط طریقے پر کر ڈالی۔ لیکن چونکہ انسانی محنت کی (وقت کے ساتھ) قریبی ہم آہنگی انہیں درکار نہیں تھی۔ اسی لئے کسان لوگوں ن وقت کے مختصر دورانیئے کی اکائی کی پیمائش کے متعلق نہ کبھی سوچا اور نہ اسے منضبط کیا۔ وہ عموماً وقت کو گھنٹوں یا منٹوں کی طرح مقررہ اکائیوں میں منقسم نہیں کرتے تھے بلکہ انہیں ڈھیلے ڈھالے، غیر واضح اور غیر متعین وقفوں میں۔۔۔ مثلاً وقت کا وہ دورانیہ، جس میں کوئی گھریلو کام کیا جا سکتا ہو۔۔۔ ظاہر کرتے تھے۔ کسان ایک دورانیئے کو ''ایک گائے سے دودھ لینے کے وقت'' کا حوالہ دے سکتا تھا۔ ''ٹڈی کو تلنے کا وقفہ'' بھی ایک لمحہ گنا جاتا تھا۔ برطانوی '' PATER NOSTER WYLE''۔۔۔ دعا کے لئے ضروری وقفہ۔۔۔ یا زمینی طور پر ''پیشاب کرنے کا دورانیہ'' عموماً استعمال کیا کرتے تھے۔

غرض لوگوں کے ذہنوں میں وقت کا تصور، ایک مقام سے دوسرے مقام تک یا ایک موسم سے دوسرے موسم تک، بدلتا رہتا تھا کیونکہ ایک برادری یا گاؤں کا دوسری برادری یا گاؤں سے رابطہ یا تعلق نہ ہونے کے برابر تھا اور یہ وجہ بھی تھی کہ کام کی نوعیت کی وجہ سے، وقت کی مختصر اکائی کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ ازمنہ وسطی کے شمالی یورپ میں مثال کے طور پر دن کے اجالے کو مساوی گھنٹوں میں تقسیم کیا جاتا تھا لیکن چونکہ طلوع اور غروب آفتاب کا درمیانی وقفہ ہر روز بدلتا جاتا تھا اس لئے دسمبر کا ''گھنٹہ'' 'مارچ یا جون کے ''گھنٹے'' کی نسبت کہیں چھوٹا ہوتا تھا۔

''دعا کے لئے ضروری وقفہ'' جیسے غیر واضح وقفوں کے بجائے، صنعتی معاشروں کو گھنٹوں، منٹوں ، یا سیکنڈوں کی طرح کی۔۔۔ انتہائی متعین اور واضح اکائیاں درکار تھیں اور ان اکائیوں کو معیاری بنانا بھی ضروری تھا تا کہ وہ مختلف موسموں اور مختلف برادریوں یا علاقوں میں باہم تغیر پذیر بھی ہو سکے۔ آج پور دنیا واضح طور پر ''ٹائم زونز'' میں تقسیم شدہ ہے۔ ہم ایک ''معیاری'' وقت کا ذکر کرتے ہیں۔ دنیا کے گرد، فضا میں موجود پائلٹ ''زولو''

ٹائم۔۔۔گرین وچ مین ٹائم۔۔۔۔کا حوالہ دیتے ہیں۔ایک بین الاقوامی کنونشن کے ذریعے گرینوچ، برطانیہ، وہ مقام بن گیا، جہاں سے اوقات میں فرق کی پیمائش کی جاتا تھی۔آج مخصوص دورانیوں کے بعد کروڑوں انسان۔۔۔۔ اگرچہ ابتداء یہ یقیناً کسی ایک فرد کی خواہش رہی ہوگی۔۔۔۔ اپنی گھڑیوں کو کبھی ایک گھنٹہ آگے اور کبھی ایک گھنٹہ پیچھے کرتے ہیں۔ ہمارے اندر موجود داخلی احساس، وقت کے بھاگے جانے یا اس کی روئی کے متعلق بے شک مختلف اندازے لگا تا رہے لیکن آج کا ایک گھنٹہ واحد، باہم تغیر پذیر اور معیاری گھنٹہ ہے۔

دوسری لہر کی تہذیب نے صرف وقت کو زیادہ متعین اور معیاری حصوں میں تقسیم ہی نہیں کیا بلکہ اس نے ان وقفوں کو ایک ایسے خط مستقیم میں بھی رکھ دیا جس کی وسعت، لا محدود طور پر، پیچھے ماضی میں اور آگے کی جانب مستقبل تک میں موجود ہے۔اس نے وقت کو تسلسل بخشا۔ وقت کا ایک خط مستقیم میں تشکیل شدہ مفروضہ، حقیقتاً ہماری سوچوں میں اتنی گہرائی تک پہنچا ہوا ہے کہ ہم جیسے، دوسری لہر کے معاشروں میں پرورش پانے والے لوگوں کے لئے اس کا کوئی متبادل نظریہ ہی امر محال ہے۔ بہر حال بہت سے قبل از صنعتی دور کے معاشروں میں اور بعض پہلی لہر کے معاشروں میں آج بھی وقت کو ایک خط مستقیم کی بجائے دائرے کی شکل میں دیکھا جاتا ہے۔ مایاز سے بدھوں اور ہندوؤں تک وقت کو مدور (دائرے کی شکل کا) اور مکرر (بار بار آنے والا) سمجھا جاتا تھا۔ ان کے عقیدے کے مطابق تاریخ لامتناہی طور پر خود کو دہراتی ہے اور زندگیاں، غالباً آواگون کے تحت دوبارہ جنم لیتی رہتی ہیں۔

یہ نظریہ کہ وقت ایک عظیم دائرے کی طرح ہے۔ بار بار واقع ہوتی کلپاؤں کے ہندو تصور میں نظر آتا ہے، چار ارب سال پر محیط ہر عرصہ، برہما کے ایک دن کے برابر ہوتا ہے، جس کا آغاز تخلیق نو سے ہوتا ہے اور اس کا اختتام ہر شے کی فنا پر ہوتا ہے اور یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہتا ہے۔مدور وقت کا نظریہ افلاطون اور ارسطو کے ہاں بھی ملتا ہے۔ انہی کے شاگردوں میں سے ایک یوڈی مس نے اسی مدور دورانئے میں، بار بار ایک ہی مخصوص وقت میں اپنے زندہ وجود کی تصویر کشی کی۔ یہ آگہی فیثا غورث نے دی۔''وقت اور مشرق

انسان'' میں جوزف نیڈھم ہمیں بتاتے ہیں کہ ''یونانی نژاد اور ہندو کے لئے وقت مدور اور دائمی ہے۔'' مزید برآں چین میں جب وقت کے تسلسل کا نظریہ غالب آیا، نیڈھم کے مطابق تب بھی ابتدائی تاؤسٹ قیاسی فلاسفروں کے مابین مدور وقت خاصا مقبول تھا۔

یورپ میں بھی صنعتی ارتقاء سے قبل کی صدیوں میں وقت کے یہ متبادل نظریات بیک وقت موجود تھے۔ ''تمام عہد وسطی کے دوران'' ریاضی دان جی جے۔ وٹرو لکھتا ہے۔ ''وقت کے مدو اور مستقیم تسلسل کے تصورات باہم متصادم رہے۔ تاجر طبقے اور معیشت زر کے عروج نے ''وقت کے تسلسل'' پر مبنی تصور کو حقیقت میں استوار کیا کیونکہ جب تک اقتدار جاگیرداروں کے قبضے میں تھا، وقت کو فراواں سمجھا جاتا تھا اور اسے زمین کے غیر متبدل دائرے سے منسلک رکھا جاتا۔

دوسری لہر کے طاقت ور ہونے کے ساتھ ہی یہ قدیم تنازعہ بھی حل ہو گیا۔ خط مستقیم میں رواں وقت جیت گیا۔ ہر صنعتی معاشرے میں وقت کے تسلسل کا نظریہ غالب آ گیا۔ مشرق ہو یا مغرب۔ وقت کو ایک ایسی شاہراہ سمجھا جانے لگا جو دور از کار ماضی سے شروع ہو کر، حال میں سے ہوتی ہوئی مستقبل کی جانب بڑھتی جا رہی ہے اور وقت کا یہ تصور۔۔۔ جو صنعتی تہذیب سے پہلے کے کروڑوں انسانوں کے لئے مکمل اجنبی تھا۔۔۔ چاہے آئی بی ایم کا انتظامی ادارہ ہو یا جاپانی معاشی منصوبہ ساز ایجنسی یا سوویت اکادمی۔۔۔ سبھی کے معاشی، سائنسی اور سیاسی منصوبوں کی بنیاد بن گیا۔

یہ غیر اہم سی بات ہے، بہر حال وقت کے تسلسل یا تقدیم کا نظریہ ارتقاء اور ترقی کے حقیقی صنعتی تصورات کے لئے بنیادی شرط کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس نظریئے نے ارتقاء اور ترقی کو قابل قبول بنا دیا۔ کیونکہ اگر وقت خط مستقیم کے بجائے دائرے میں گھوم رہا ہوتا اور اگر واقعات ایک سمت حرکت پذیر ہونے کے بجائے دوبارہ وقوع پذیر ہو رہے ہوتے تو اس کا مطلب یہ تھا کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے اور ارتقاء اور ترقی تصوراتی واہموں۔۔۔ وقت کی دیوار پر بنتے سائے۔۔۔ سے زیادہ کچھ بھی نہیں تھے۔

وقت سے ہم آہنگی، معیار کی تشکیل، وقت کا خط مستقیم میں تسلسل۔ انہوں نے تہذیب کے بنیادی مفروضات کو نہ صرف متاثر کیا بلکہ عام لوگوں کی زندگی میں وقت کی کار

فرمائی کے تصور میں بھی وسیع وعریض تبدیلیاں پیدا کر ڈالیں۔ لیکن اگر وقت کی ہیئت میں یہ تبدیلی ضروری تھی تو مکانیت کو صنعتی دور کی نئی حقیقتوں میں فٹ کرنے کے لئے دوبارہ مربوط کرنا بھی بہت اہم تھا۔

مکانیت کا از سر نو ربط

پہلی لہر کی تہذیب کے طلوع سے بہت عرصہ پہلے، جب ہمارے دور از کار اجاد، زندہ رہنے کے لئے شکار، گلہ بانی، ماہی گیری یا جانوروں کے چارے کی تلاش جیسے کاموں پر انحصار کرتے تھے۔ وہ مسلسل حرکت میں رہتے تھے۔ بھوک، سردی یا ماحولیاتی حوادث کے شکار یہ لوگ۔۔۔ موسمی تغیرات یا مہم جوئی کے چکر میں حقیقتاً ''بہت زیادہ حرکت پذیر لوگ'' تھے۔۔۔ اشیاء اور جائیداد کے ناروا بوجھ سے آزاد اور سطح زمین پر دور دور تک مار کرنے والے ہلکے پھلکے مسافر!

پچاس مردوں، عورتوں اور بچوں پر مشتمل گروہ کو، اپنی خوراک حاصل کرنے کے لئے، زمین ہٹن کے جزیرے سے چھ گنا زیادہ زمین کا رقبہ چاہیۓ ہوتا تھا یا بسا اوقات وہ خانہ بدوشی کا ایک مخصوص راستہ اپنا لیتے، جس پر حالات کے مطابق وہ واقعتاً ہر سال سینکڑوں میل کا سفر کر ڈالتے۔ آج کے جغرافیہ دانوں کے کہنے کے مطابق انہوں نے ''وسیع مکانیت'' کی زندگی گزاری۔

پہلی لہر کی تہذیب نے اس کے برعکس ''مکانی کنجوسوں'' کی ایک نسل پروان چڑھائی۔ خانہ بدوشی کی جگہ زراعت نے لی تو دور از کار مسافتوں کے بجائے لہلہاتے کھیتوں اور مستقل آبادکاری کا راستہ کھلا۔ ایک وسیع وعریض علاقے میں بے آرامی سے آوارہ بھٹکنے کی بجائے، کسان اور اس کے گھرانے نے، مکانیت کے وسیع وعریض سمندر کے اندر۔۔۔ اتنا عظیم سمندر کہ انسان خود کو بونا محسوس کرے۔۔۔ زمین کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے پر، شدید محنت کرنا شروع کر دی۔

صنعتی تہذیب کی پیدائش سے ذرا پہلے کے دور میں کسانوں بے ترتیب جھونپڑوں کے ارد گرد وسیع وعریض کھلے کھلیان ہوا کرتے تھے۔ مٹھی بھر تاجروں، دانش وروں اور فوجی سپاہیوں کے سوا' افراد کی زندگی ایک چھوٹے سے دائرے میں مقید تھی۔

سورج طلوع ہوتے وقت وہ کھیتوں کا رخ کرتے، رات بھیگنے لگتی تو گھروں کو ان کی واپسی ہوتی۔ چرچ کا راستہ بہر حال انہیں آ گیا۔لیکن صرف چھ سات میل کی دوری پر واقع گاؤں تک بیل گاڑی میں بیٹھ کر چلے جانا، انہیں کبھی کبھار ہی نصیب ہوتا تھا۔ موسمی اور زمینی حالات کا تغیر وتبدیل' بلاشبہ اپنی جگہ' مگر مورخ جے آرہیل کے مطابق ''اگر ہم اکثر لوگوں کی ۔۔۔ انکی تمام زندگی میں ۔۔۔ طے شدہ طویل ترین عمومی مسافت پندرہ میل کے لگ بھگ لگا لیں تو غالبًا ہم بہت زیادہ غلطی پر نہیں ہونگے۔'' زراعت نے محدود مکانیت کی تہذیب کو جنم دیا۔

اٹھارویں صدی میں، یورپ میں چھا جانے والے صنعتی طوفان نے ایک بار پھر ''وسیع پذیر مکانیت'' کی ثقافت کو جنم دیا۔لیکن اب یہ مکانیت کم وبیش ارضی سطح کی تھی۔ اشیاء، افراد اور نظریات کی ہزار ہا میل دور تک نقل وحرکت عمل میں آئی۔ بڑی بڑی آبادیوں نے کام کی تلاش میں نقل مکانی کی، پیداوار وسیع وعریض کھیتوں میں بکھری ہوئی ہونے کے بجائے، شہروں میں مرتکز ہوگئی، بڑی بڑی بکھری ہوئی آبادیاں، چند مرکزی نقطوں پر مجتمع ہو کر سکڑ گئیں۔ قدیم دیہات ویران ہو کر موت کی نیند سو گئے۔ دھوئیں کے بادلوں اور آگ اگلتی بھٹیوں کے گھیرے میں غیر معمولی تیز رفتار صنعتی مراکز پھیلنے لگے۔

لینڈ سکیپ کی اس ڈرامائی نئی فعالیت کو شہر اور ملک کے درمیان کہیں زیادہ پیچیدہ ربط درکار تھا۔ کیونکہ خوراک، توانائی، افراد اور خام مال کا بہاؤ شہری علاقوں کی طرف کرنا تھا جبکہ تیار شدہ اشیاء، فیشن، نظریات اور مالیاتی فیصلوں کا خارجی بہاؤ بھی مطلوب تھا۔ ان دونوں کو انتہائی محتاط طریقے سے وقت اور مکانیت کے ساتھ منضبط اور مربوط کیا گیا۔ خود شہروں کے اندر مکانی شکلوں کی کہیں زیادہ اقسام درکار تھیں۔ پرانے زرعی نظام میں عموماً بنیادی طبعی ڈھانچہ ۔۔۔ ایک چرچ، کسی معزز آدمی کے محل، کچھ شکستہ حال جھونپڑیوں اور کبھی کبھار شراب خانے یا خانقاہ پر مشتمل ہوتا تھا۔ دوسری لہر کی تہذیب کو اس کی بہت زیادہ واضح تقسیم کار کی وجہ سے کہیں زیادہ مخصوص اقسام کی مکانیت مطلوب تھی اسی وجہ سے، ماہرین تعمیر نے جلد ہی خود کو دفتروں، بینکوں، پولیس سٹیشنوں، فیکٹریوں، ریلوے ٹرمینلز، ڈیپارٹ منٹل سٹورز، جیلوں، فائر ہاؤسز اور تھیٹرز کی تشکیل میں مصروف پایا، مکانیت کی ان

MashalBooks.org

مختلف النوع اقسام کو استدلالی انداز میں باہم جوڑنا بھی ضروری تھا۔ فیکٹریوں کا محل وقوع، گھر سے دکان تک درمیانی راستے۔ ریلوے لائن کی اطراف سے خشک گودی اور ٹرک کے اڈوں کا باہمی تعلق، سکولوں اور ہسپتالوں کا قیام، پانی کے پائپوں، نالیوں، بجلی گھروں، گیس لائنوں، ٹیلی فون ایکس چینجوں وغیرہ۔۔۔۔ ان سب کو مکانی طور پر پر مربوط بھی کیا جانا تھا۔ مکانیت کی کسی مختلف جہتی اور پیچ دار، شے کی طرح انتہائی محتاط تنظیم درکار تھی۔

ان مخصوص جگہوں کا عظیم الشان ربط۔۔۔۔ صحیح لوگوں کو صحیح وقت پر صحیح جگہ تک لے جانے کے لئے لازمی اور ضروری۔۔۔۔ ہم آہنگی کے زیر ویم کا حقیقی مکانی تصور تھا۔ یہ مکانیت میں موثر ہم آہنگی کی ابتداء تھی۔ کیونکہ صنعتی معاشروں کی سرگرمیوں کے لئے وقت اور مکانیت، دونوں کی بہت محتاط تشکیل درکار تھی۔

جس طرح لوگوں کو وقت کی کہیں زیادہ صحیح اور معیاری اکائیوں کا مہیا کیا جانا ضروری تھا، اسی طرح انہیں زیادہ واضح اور باہم متبادل مکانی اکائیاں بھی مطلوب تھیں۔ صنعتی انقلاب سے پہلے جب ابھی وقت کو دعا کے وقفے جیسے غیر واضح اکائیوں میں منقسم کیا جاتا تھا، مکانیت کی پیمائش بھی اوٹ پٹانگ طریقے پر کی جاتی تھی۔ ازمنہ وسطی کے برطانیہ میں مثال کے طور پر ''سڑک'' کم سے کم ساڑھے سولہ فٹ یا زیادہ سے زیادہ چوبیس فٹ کی ہوتی تھی۔ سولہویں صدی میں سڑک کی بہترین پیمائش کا طریقہ یہ رائج تھا کہ سولہ آدمیوں کو چرچ سے باہر نکلتے ہوئے بلا تفریق اکٹھا کر کے انہیں ایک قطار میں اس طرح کھڑا کر لیا جاتا کہ ''ان کا بایاں قدم ایک دوسرے کے پیچھے موجود ہوتا اور اس فاصلے کو ناپ لیا جاتا۔ اس سے بھی زیادہ غیر واضح اصطلاحات مثلاً ''ایک دن کی گھڑ سواری یا گھنٹے بھر کی چہل قدمی'' عام مستعمل تھیں۔

دوسری لہر نے جیسے ہی کام کے انداز میں تبدیلی پیدا کرنا شروع کی (اور نظر نہ آنے والے کٹاؤ نے ایک مسلسل وسعت پذیر مارکیٹ پیدا کر دی) تو ایسے ڈھیلے ڈھالے طریقے نا قابل برداشت ہو گئے۔ مثلاً تجارت میں اضافے کے ساتھ ساتھ مستحکم نیوی گیشن کی اہمیت زیادہ بڑھنے لگی اور تجارتی بحری جہاروں کے مسلسل بہاؤ میں رکھنے کے بہتر طریقے دریافت کرنے والوں کے لئے حکومتیں بڑے بڑے انعامات کا اعلان کرنے لگیں۔ زمین پر

بھی زیادہ سے زیادہ بہتر آلات پیمائش اور زیادہ واضح اکائیاں متعارف کرائی گئیں۔

مقامی روایات، قوانین اور تجارتی معاملات کی الجھاؤ دار، متضاد اور پریشان کن اقسام، جو پہلی لہر کی تہذیب میں ہر جگہ نمایاں تھیں، سے جان چھڑا کر انہیں استدلالی بنیادوں پر قائم کیا جانا تھا۔ غیر متعین اور غیر معیاری آلات پیمائش، صنعتکاروں اور ابھرتے ہوئے تاجر طبقے کے لئے روز مرہ کا درد سر تھے۔ فرانسیسی انقلابیوں نے صنعتی دور کی ابتداء کے ساتھ ہی جس طرح خود کو میٹرک سسٹم کے ذریعے معیاری فاصلاتی پیمائش اور ایک نئے کیلنڈر کے ذریعے معیاری وقت سے منسلک کیا، وہ اس وقت کے زبردست جوش وخروش کا بہترین اظہار ہے۔ انہوں نے ان مسائل کو اتنی زیادہ اہمیت دی کہ پہلے قومی کنونشن میں، جہاں وہ جمہوریہ کا اعلان کرنے کے لئے جمع ہوئے تھے، انہی پر سب سے پہلے غور وخوض کیا گیا۔

دوسری لہر کی تبدیلی، اپنے ساتھ سرحدوں میں لامحدود اضافہ اور ان کی مکانی توضیح بھی لائی۔ اٹھارویں صدی سے پہلے سلطنتوں کی سرحدیں عموماً غیر متعین ہوتی تھیں۔ وسیع وعریض علاقوں کے غیر آباد ہونے کی وجہ سے ان کی توضیح غیر ضروری جانی جاتی تھی۔ جیسے جیسے آبادی بڑھی، تجارت میں اضافہ ہوا اور ابتدائی فیکٹریاں یورپ میں چلنا شروع ہوئیں، بہت سی حکومتوں نے منظم طور پر اپنی سرحدوں کی تشکیل کی۔ محصولاتی علاقوں کی باقاعدہ وضاحت کی گئی۔ مقامی اور نجی جائیدادوں کا بھی حدود اربع معلوم کیا گیا، انہیں نشان زد کیا گیا، ان کی گرد باڑ لگوائی گئی اور ان سے کا باقاعدہ ریکارڈ رکھا گیا، نقشے زیادہ مفصل، اشتمالی اور معیاری ہوتے گئے۔

مکانیت کا ایک نیا تصور ابھرا، جو وقت کے نئے تصور سے کماحقہ مطابقت رکھتا تھا۔ جس طرح باقاعدگی اور پروگرام (شیڈیولنگ) نے وقت میں حدود و قیود کو جنم دیا، اسی طرح مکانیت کی حدود متعین کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ دیواریں بلند ہونے لگیں۔ وقت کا تناظری نظریہ، اس کے مکانی حصے میں بھی جھلکنے لگا۔

صنعتی معاشروں سے قبل زمینی یا سمندری، دونوں جگہ سے ربط راستوں پر سفر کرنا ایک عمومی دستور تھا۔ کسانوں کا راستہ، گائے کا راستہ یا ہندوستانی پگڈنڈی تمام زمین کی سطح

کے مطابق الٹ پلٹ اور پیچ دار ہوتے تھے۔ بہت سیہ دیواریں خم دار، بے ربط یا بے قاعدہ زاویوں کی شکل کی ہوتی تھیں۔ از منہ وسطی کے شہروں کی گلیاں باہم ایک دوسرے میں گھسی ہوئی، پیچ وخم لئے اور مدور شکل کی اور اونچی نیچی ہوتی تھیں۔

دوسری لہر کے معاشروں نے نہ صرف بحری جہازوں کو خط مستقیم کی شکل کے راستے پر ڈالا بلکہ ریلوے لائنوں کو بھی اس طرح تعمیر کیا کہ تاحد نگاہ ان کے چمکدار راستے متوازی سیدھی لائنوں میں نظر آتے تھے۔ جیسے امریکہ کے ایک پلاننگ افسر گریڈی کلے نے خصوصاً یہ نوٹ کیا ہے کہ یہی ریلوے لائنیں (یہ اصطلاح خود بھی خاصی معنی خیز ہے)ان نئے شہروں کا محور بنیں جو گرڈ پیٹرن (بجلی کے تاروں کا طویل اور سیدھا جال) پر تشکیل پذیر ہوئے۔ اسی گرڈ پیٹرن نے 90 ڈگری زاویوں کے خطوط مستقیم کے ساتھ مل کر لینڈ سکیپ کو مشینی باقاعدگی اور مستقیم تسلسل کی خصوصیت بخشی۔

آج پرانے علاقوں میں واقع کسی شہر پر نظر دوڑائیں تو گلیوں، چوراہوں، دائروں اور پیچیدہ انٹرسیکشنوں کے بے تحاشا الجھاؤ دکھائی دے گا لیکن انہی شہروں میں بعدازاں صنعتی دور میں تعمیر ہونے والے حصے صاف ستھرے گرڈ پیٹرن کے مطابق وجود میں آئے۔ یہی بات تمام علاقوں اور ممالک پر صادق آتی ہے۔ میکانائزیشن کے ساتھ ہی کھیتوں اور کھلیانوں میں بھی متوازی اور مسلسل خطوط نظر آنے لگے۔ صنعتی دور سے پہلے کے کسان، بیلوں ک پیچھے ہل چلاتے ہوئے گولائی کی شکل کی بے قاعدہ لکیریں سی بنا دیتے تھے۔ ایک دفعہ بیل چلنا شروع کر دیتا تو کسان اسے روکنا نہیں چاہتا تھا اور وحشی جانور، انگریزی لفظ'' S'' کی طرح کا خم زمین پر پیدا کرتے ہوئے بے قاعدہ لیکروں پر ایک طویل موڑ کاٹ کر چلتا رہتا۔ آج کوئی ہوائی جہاز کی کھڑکی سے نیچے جھانکے تو اسے مربع شکل کے کھیتوں میں پیمانے کی طرح ہل چلانے کے سیدھے خطوط نظر آئیں گے۔

سیدھے خطوط اور 90 ڈگری کے زاویوں کا باہمی ملاپ صرف زمین پر یا گلیوں میں ہی نہیں جھلکا بلکہ اکثر مردوں اور عورتوں نے اپنی انتہائی جانی پہچانی جگہوں ان کے اپنے رہائشی کمرے میں بھی اس کا مشاہدہ کیا۔ خم دار دیواریں اور غیر قائمہ زاویئے صنعتی دور کے فن تعمیر میں اب کہیں نظر نہیں آتے۔ اوٹ پٹانگ شکل کے کمروں کی جگہ صاف ستھرے مستطیل

شکل کے کیوبیکلز نے لے لی اور بلندی کی طرف ابھرتی بلڈنگیں خطِ مستقیم کو عموداً آسمان کی جانب لے گئیں۔ بڑی بڑی دیواروں پر سیدھے خطوط یا گرڈ پیٹرن کی کھڑکیاں اور ان سیدھی دیواروں کے سامنے موجود سیدھی اور طویل سڑکیں،غرض ہر جگہ خطِ مستقیم کارفرما ہو گیا۔

یوں مکانیت کے متعلق ہمارا تصور اور مشاہدہ ایک ایسے تناظری عمل سے گزرا، جو وقت کے تناظر کے متوازی تھا۔ تمام صنعتی معاشروں میں خواہ وہ سرمایہ دارانہ ہوں سوشلسٹ، مشرقی ہوں یا مغربی، تعمیراتی مکانیتوں کی تخصیص، تفصیلی نقشے، پیمائش کی یکساں اور متعین اکایوں کا استعمال اور مزید براں خطِ مستقیم ایک ثقافتی جزو۔۔۔۔صنعتی راج کی نئی حقیقت کی بنیاد۔۔۔۔بن گیا۔

حقیقت کا خام مال یا مواد

دوسری لہر کی تہذیب نے نہ صرف زمان اور مکان کے نئے تصورات تعمیر کیئے بلکہ انہیں روزمرہ کے رویوں کی تشکیل میں بھی استعمال کیا۔ اس نے ایک بڑے قدیم سوال، چیزیں کس طرح بنتی ہیں؟ کے جوابات خود اپنی طرف سے مہیا کیئے۔ اس سوال کا جواب دینے کی کوشش میں ہر ثقافت اپنی داستانیں اور تمثیلیں ایجاد کرتی ہے۔ بعض لوگوں کے نزدیک کائنات یکتائی کا ایک گرداب ہے۔ لوگ اپنے اجداد اور اخلاف کی زندگیوں کے باہمی تسلسل میں فطرت کا ایک حصہ ہیں اور فطری دنیا کے ساتھ اتنے زیادہ منسلک ہیں، جیسے وہ خود بھی حیوانوں، درختوں، چٹانوں اور دریاؤں کی حقیقی زندگی میں حصہ دار ہوں۔ بہت سے معاشروں میں مزید براں ایک فرد، بلا تخصیص جنس، نسبتاً ایک بڑے نظام۔۔۔۔ خاندان، برادری، قبیلے یا گروہ کے ایک جزو کی بجائے اپنی نجی اور خود مختار حیثیت میں اپنی شناخت کم کر پاتا ہے۔

کچھ اور معاشروں نے کائنات کی یکتائی یا وحدت کے بجائے، اس کے منقسم ہونے پر زیادہ زور دیا ہے۔ انہوں نے حقیقت کو مجتمع شکل میں دیکھنے کے بجائے اسے بہت سے انفرادی اجزاء سے تعمیر شدہ ڈھانچہ سمجھا ہے۔ صنعتی دور سے دو ہزار سال پہلے ڈیمو کریٹس نے اس وقت کا یہ غیر معمولی نظریہ پیش کیا تھا کہ کائنات بے جوڑ کل ہونے کی

MashalBooks.org

بجائے ممتاز، لافانی، نا قابل تحویل نظر نہ آنے والا اور نا قابل تقسیم۔۔۔۔ اجزاء پر مشتمل تھا۔ اس نے ان اجزاء کو جوہر کا نام دیا۔ بعد میں آنے والی صدیوں میں مادے کے نا قابل تحویل بلاکس سے تعمیر شدہ کائنات کا نظریہ بار بار منظر پر آتا رہا۔ ڈیموکریٹس کے کچھ ہی عرصے بعد چین میں موچنگ کے علاقوں میں ایک نقطے کی ظاہری تعریف یوں کی گئی کہ: چھوٹے چھوٹے حصوں میں خط کا وہ تقسیم شدہ حصہ جو مزید تقسیم نہ کیا جا سکتا ہو۔ ہندوستان میں بھی حقیقت کے ایٹم یا نا قابل تحویل اکائی کا نظریہ، حضرت عیسیٰ کی بعث کے فوراً بعد کے زمانے میں خاصا مقبول ہوا۔ قدیم روم میں شاعر لیوکریسش نے جوہری فلسفے کی خاصی توضیح وتشریح کی، بہرحال یہ نظریہ، مادے کا یہ تصور۔۔۔۔ طویل عرصے تک ایک اقلیتی نقطہ نظر کی حیثیت سے نظر انداز ہوتا رہا۔

دوسری لہر کے آغاز کے ساتھ ہی جوہر کا نظریہ مقبول ہو گیا کیونکہ باہم پیوست طاقتور اثرات کے سیلاب نے مادے کے متعلق ہمارے تصور میں انقلابی تبدیلیاں پیدا کر دیں۔

سترہویں صدی کے نصف میں پیری جاسینڈی نامی ایک مذہبی شخصیت۔۔۔۔ جو پیرس کے رائل کالج میں علم فلکیات اور فلسفے کا استاد تھا۔۔۔۔ نے یہ دلیل دینی شروع کی کہ مادہ انتہائی غیر معمولی طور پر چھوٹے چھوٹے اجزاء پر مشتمل ہوتا ہے۔ لیوکریسش سے متاثر ہو کر جاسینڈی، مادے کے جوہری نظریئے کا اتنا زبردست پرچارک بن گیا کہ جلد ہی اس کے نظریات رود بار انگلستان پار کر کے ایک ایسے نوجوان سائنس دان رابرٹ بوائل تک جا پہنچے، جو گیس کمپریس کرنے کے امکانات پر کام کر رہا تھا۔ بوائل نے جوہر کے تصور کو نظریاتی مباحث سے نکال کر لیبارٹری میں پہنچا دیا اور اس نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ خود ہوا بھی چھوٹے چھوٹے ذروں پر مشتمل ہے۔ جاسینڈی کی وفات کے چھ سال بعد، بوائل نے اپنے ایک طبع شدہ مضمون میں یہ استدلال دیا کہ ایسا مادہ۔۔۔۔ مثال کے طور پر زمین۔۔۔۔ جسے عام اور سادہ مادی حصوں میں توڑا جا سکتا ہو۔۔۔۔ نہ تو عنصر ہے اور نہ عنصر ہو سکتا ہے۔

اسی دوران رینا ڈ سکالرٹس مذہبی علم سے بہرہ ور ریاضی دان نے۔۔۔۔ جاسینڈی نے اس پر خاصی تنقید کی ہے۔۔۔۔ دعویٰ کیا کہ حقیقت کو چھوٹے چھوٹے اجزاء میں توڑ

MashalBooks.org

لینے کے بعد ہی سمجھا جا سکتا ہے اس کے اپنے الفاظ میں، یہ ضروری تھا کہ ''جانچ پڑتال کی جانے والی مشکلات کے ہر حصے کو زیادہ سے زیادہ امکانی حصوں میں تقسیم کر لیا جائے۔ سو اس طرح دوسری لہر کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ طبیعاتی جوہر کے ہمراہ فلسفیانہ جوہر بھی ارتقاء پذیر ہوا۔

یہاں یکتائی یا وحدت کے تصور پر جارحانہ حملے شروع ہو گئے۔ اس حملے میں فوراً ہی سائنس دانوں، ریاضی دانوں اور فلسفہ دانوں نے گروہ در گروہ شامل ہو کر کائنات کو اور بھی چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کرنے کے نظریئے کی طرف قدم بڑھائے اور بڑے شاندار نتائج حاصل کیئے۔ ڈسکارٹس کا رسالہ ''طریق کار مفصل بحث'' آنے کی دیر تھی۔۔۔۔ ایک مائیکرو بیالوجسٹ رینا ڈوبس لکھتا ہے ''میڈیسن پر اس کے اطلاق کے نتیجے میں لا تعداد دریافتیں فوری طور پر منظر عام پر آ گئیں۔'' کیمیا اور دوسرے شعبوں میں بھی جوہری نظریئے اور ڈسکارٹس کے جوہری طریق کار کے اشتراک سے حیرت انگیز پیش رفت ممکن ہوئی۔ سترہویں صدی کے وسط تک یہ تصور کہ کائنات آزاد، جداگانہ حصوں اور ان کے مزید چھوٹے حصوں پر مشتمل ہے، خود بھی روایتی دانش کا۔۔۔۔ صنعتی راج کی ابھرتی ہوئی حقیقت کا ایک جزو۔۔۔۔ ایک حصہ بن چکا تھا۔

ہر نئی تہذیب، نظریات ماضی سے مستعار لیتی ہے اور انہیں دوبارہ اس طرح ترتیب دیتی ہے کہ وہ دنیا کے ساتھ اس کے باہمی تعلق کو سمجھنے میں مدد دے سکیں۔ ابتدائی صنعتی معاشرے کے لئے۔۔۔۔ ایک ایسا معاشرہ جو واضح اجزاء پر مشتمل مشین کے ذریعے جوڑی جانے والی اشیاء کی وسیع پیمانے کی پیدوار کی جانب بڑھنے کا آغاز کر رہا ہو۔۔۔۔ ایک ایسی جڑی ہوئی کائنات کا تصور، جس کی تشکیل میں واضح اجزاء موجود ہوں، غالباً انتہائی ناگزیر تھا۔

حقیقت کے جوہری ماڈل کی مقبولیت کی سیاسی اور سماجی وجوہات بھی تھیں۔ جونہی دوسری لہر نے پہلی لہر کے پرانے موجود اداروں کی توڑ پھوڑ کا آغاز کیا، اسے لوگوں کو وسیع و عریض خاندان، جابر و قاہر چرچ اور شخصی حکمرانی کے شکنجے سے رہائی دلانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ صنعتی سرمایہ داریت کو انفرادیت کے لئے استدلالی توجیہ کی احتیاج ہوئی۔ صنعتی

MashalBooks.org

راج کے طلوع سے ایک دوصدی پہلے، جب قدیم زرعی تہذیب روبہ زوال تھی، تجارت میں اضافہ ہو رہا تھا شہروں میں بے تحاشا توسیع ہو رہی تھی، ابھرتے ہوئے تاجر طبقوں کے تجارت کرنے اور قرضہ دینے اور ان کی منڈیوں کے پھیلاؤ کے مطالبات نے فرد کے متعلق ایک نئے تصور۔۔۔شخص کی جوہری حیثیت۔۔۔کو جنم دیا، ایک شخص اب محض قبیلے ذات یا برادری کے تابع مہمل رہنے کے بجائے، ایک آزاد وخود مختار فرد تھا ہر فرد کو اپنی جائیداد کی ملکیت، اشیاء کے حصول، گھومنے پھرنے اور سوداکاری، خوشحال ہونے یا سب کچھ تباہ کر دینے (اپنی استعداد کار یا محنت کے مطابق) کا حق ہونے کے ساتھ یکساں طور پر مذہب کے چناؤ اور ذاتی خوشیوں کے حصول کا اختیار بھی تھا۔مختصراً صنعتی راج کی حقیقت نے فرد کے متعلق ایک ایسا نظریہ پیش کیا جس میں فرد ایک جوہر کی طرح۔۔۔ نا قابل تحویل لافانی، معاشرے کا بنیادی جزو تھا۔

جوہری نظریہ، جیسے کہ ہمارا مشاہدہ ہے، سیاست میں بھی ظاہر ہوا، جہاں ووٹ حتمی جزو قرار پایا۔ یہ بین الاقوامی معاملات سے متعلق ہمارے تصورات میں بھی داخل ہوا، جہاں خود مختار، نا قابل دخول اور آزاد اکائیاں نظر آئیں، جنہیں اقوام کا نام دیا جاتا ہے۔ صرف طبیعاتی مادے کو ہی نہیں بلکہ سماجی اور سیاسی مادے کے لئے بھی اینٹوں (خود مختار اکائیاں یا جوہر) کی اصطلاح قابل فہم سمجھی گئی، غرض جوہری نظریہ زندگی کے ہر رخ پر حاوی ہو گیا۔

منظم اور قابل علیحدگی اجزاء پر مجتمع حقیقت کا یہ نظریہ، زبان اور مکان کے نئے تصورات کے ساتھ مکمل طور پر فٹ ہو گیا کیونکہ زمان اور مکان خود بھی چھوٹی سے چھوٹی قابل تعریف اکائیوں میں تقسیم کیئے جا سکتے تھے۔ دوسری لہر کی تہذیب جیسے جیسے پھلی پھولی اور ابتدائی معاشروں اور پہلی لہر کی تہذیب پر غالب اور مستحکم صنعتی نظریئے کا پراپیگنڈا کرتی رہی۔ ایک حتمی چیز البتہ اس استدلالی نظام کو مکمل کرنے کے لئے ابھی غیر موجود تھی۔

حتمی ''کیوں''

چیزیں کیوں وقوع پذیر ہوتی ہیں۔۔۔ جب تک کسی تہذیب کے پاس اس کی کوئی وضاحت موجود نہ ہو۔۔۔ چاہے اس وضاحت کے نو حصے محض خیالی اور صرف ایک

حصہ تجزیاتی کیوں نہ ہو۔۔۔۔ وہ زندگیوں کو مستعدی سے محترک نہیں کرسکتی۔ لوگ اپنی ثقافت کی طرف سے عاید فرائض کی انجام دہی کے دوران یہ یقین دہانی چاہتے ہیں کہ ان کے رویے نتیجہ خیز ہونگے اور یہ اس دائمی ''کیوں'' کے جواب کی جانب کسی حد تک درست اشارہ ہے۔ دوسری لہر کی تہذیب اپنے جلو میں ایک اتنا طاقتور نظریہ لائی جو ہر چیز کی توضیح و تشریح کے لئے کافی محسوس ہوتا تھا۔ ایک پتھر پانی کی سطح سے ٹکراتا ہے۔ پانی کی لہریں مرتعش ہوتی ہیں۔ کیوں؟ اس واقعہ کی کیا وجہ ہے؟ امکانات ہیں کہ صنعتی راج کے بچے کہیں گے ''کیوں کہ کسی نے یہ پتھر پھینکا تھا۔''

بارہویں یا تیرہویں صدی کے ایک معزز تعلیم یافتہ یورپی فرد کے پاس اس سوال کا جواب دینے کے لئے ہمارے موجودہ تصورات کی نسبت خاصی حد تک مختلف نظریات رہے ہونگے۔ اس نے غالباً ارسطو پر تکیہ کیا ہوتا اور اس کی مادی توجیہہ، عمومی توجیہہ، زوداثر توجیہہ اور حتمی توجیہہ تلاش کرتا۔ جن میں سے کوئی بھی بذات خود کسی بھی چیز کی وضاحت کے لئے کافی نہ ہوتی۔ ازمنہ وسطی کا کوئی چینی مفکرین اور ریانگ کے متعلق کچھ کہتا اور اثر انگیزیوں کے اس طاقت ور میدان کارزار کا ذکر کرتا جہاں پر مظہر فطرت کو یقینی طور پر وقوع پذیر ہونا تھا۔

دوسری لہر کی تہذیب نے نیوٹن کے کائناتی قانون ثقل کی حیرت انگیز دریافت میں سیست کے مخفی رازوں کا جواب تلاش کرلیا۔ نیوٹن کے لئے اسباب وعلل وہ قوتیں ہیں جو حرکت پیدا کرنے کے لئے اجسام پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ نیوٹن کے سبب اور نتیجے کی روایتی مثال بلیئرڈ کی وہ گینڈیں ہیں، جو ایک دوسرے سے ٹکراتی ہیں اور جواباً ایک دوسرے کو حرکت دیتی ہیں۔ تبدیلی کی یہ تصور جس نے بلا شرکت غیرے قابل پیمائش اور فوری طور پر قابل شناخت خارجی قوتوں کو فوکس کیا بے انتہا طاقتور تھا، کیونکہ اس نے مکمل طور پر صنعتی راج کی نئی حقیقت۔۔۔۔ زمان اور مکان کے تناظری تصورات۔۔۔۔ سے مطابقت پیدا کرلی۔ درحقیقت نیوٹن کی یا میکانکی سبیت۔۔۔۔ جو یورپ میں صنعتی انقلاب کے پھیلنے کے ساتھ پوری طرح اپنا لی گی تھی۔۔۔۔ نے صنعتی راج کی حقیقت کو اکٹھا کر کے کیمیائی طور پر ایک سیل بند ڈبے میں کھینچ لیا۔

MashalBooks.org

اگر دنیا علیحدہ علیحدہ اجزاء۔۔۔ چھوٹی چھوٹی بلیئرڈ گیندوں کی طرح۔۔۔ پر مشتمل ہوئی تو تمام اسباب ان گینڈوں کے باہمی عمل سے پیدا ہوتے۔ جزو یا جوہر دوسرے سے ٹکراتا۔ پہلا جزو دوسرے کی حرکت کا سبب ہوتا۔ یہ حرکت پہلے جزو کی حرکت کا نتیجہ ہوتی۔ خلاء میں بغیر کسی حرکت کے کوئی عمل ممکن نہیں اور کوئی بھی جزو یا جوہ بیک وقت ایک سے زیادہ جگھوں پر موجود نہیں ہوسکتا۔ کائنات جو، پیچیدہ، ہنگامہ خیز، نا قابل پیش گوئی، بھری بھری، سربستہ راز اور باہم غلط ملط لگتی تھی، اچانک ہی صاف ستھری اور معقول لگنی شروع ہو گئی۔ ہر مظہر فطرت انسانی خلیے کے اندر موجود جوہر سے لے کر دور تاریک آسمان پر موجود سرد ترین ستارے تک، بآسانی سمجھ آنے لگا کیونکہ حرکت پذیر مادے کا ہر جزو دوسرے جزو کو متحرک کر رہا تھا اور اسے قید حیات کے لامتناہی رقص میں شامل ہونے پر مجبور کر رہا تھا۔ دہریوں کے لئے اس نظریئے نے زندگی کی ایسی وضاحت پیش کر دی۔۔۔ بقول لاپلیس۔۔۔ جس نے خدا کا مفروضہ غیر ضروری تھا۔ مذہب پرستوں کے لئے بہر حال اس میں اب بھی خدا کے لئے جگہ تھی، اسے عظیم حرکت دینے والا سمجھا جا سکتا تھا، جس نے بلیئرڈ کی گیندوں کو حرکت میں رکھنے کے لئے اشاراتی چھڑی استعمال کی، پھر غالباً وہ کھیل سے کنارہ کش ہو گیا۔

حقیقت کی یہ تلمیح کسی دانش ورانہ تخلیقاتی ہیجان خیز گولی کی طرح ابھرتے ہوئے صنعتی دور کی حقیقی ثقافت میں پیوست ہو گئی۔ ایک انقلابی فلاسفر' جس نے انقلاب فرانس کی راہ ہموار کرنے میں بہت کام کیا تھا' بیرن ڈی ہولباخ یہ کہتے ہوئے خوشی میں آپے سے باہر ہو گیا۔ ''ہر موجود شے کا یہ وسیع انبوہ کائنات۔۔۔ صرف مادے اور حرکت کا اظہار ہے۔ یہ سب اشیاء بصورت کل' ہمارے غور و فکر کے لئے اسباب و نتائج کے بے حد عظیم اور بلا رکاوٹ تسلسل کے سوا اور کچھ پیش نہیں کرتیں۔

ایک چھوٹے سے فاتحانہ بیان میں اس کا سارا مفہوم آ جاتا ہے۔ کائنات ایک مجتمع حقیقت ہے جو ایسے ممیّز اجزاء سے بنی ہے، جنہیں ایک ہجوم کی صورت مجتمع کر دیا گیا ہے۔ مادے کو صرف حرکت کی اصطلاح میں سمجھا جا سکتا ہے۔۔۔ جیسے واقعات ایک تناظری تسلسل میں وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ واقعات کی ایک قطار خط وقت کے ساتھ حرکت

پذیر ہوتی ہے۔ انسانی جذبات مثلاً نفرت، خود غرضی محبت۔۔۔۔ ڈی ہولباح کہتا گیا، کا موازنہ شکست خوردگی، جمود یا کشمکش جیسی طبعی قوتوں کے ساتھ کیا جا سکتا ہے اور ایک عقلمند سیاسی ریاست انہیں عوامی بھلائی کے لئے اسی طرح استعمال کر سکتی ہے۔ جیسے سائنس عمومی بھلائی کے لئے طبعی یا مادی دنیا کو اپنے استعمال میں لاتی ہے۔

حقیقت یہی ہے کہ ہمارے ذاتی، سماجی اور سیاسی رویوں میں طاقتور انداز صنعتی راج کی حقیقت کے اس کائناتی تصور سے اور اس کے اندر پوشیدہ مفروضات سے ہی برآمد ہوئے ہیں۔ ان ہی میں یہ اشارہ بھی پوشیدہ تھا کہ نہ صرف نظام کائنات اور فطرت بلکہ معاشرہ اور افراد بھی بعض مقررہ اور قابل پیش گوئی قوانین کے مطابق عمل پیرا ہوتے ہیں۔ درحقیقت دوسری لہر کے عظیم مفکر وہی لوگ تھے جنہوں نے انتہائی استدلالی اور بھر پور طریقے سے کائنات کی قانون پسندی پر بحث کو آگے بڑھایا۔

نیوٹن قریب قریب کائنات کو پروگرام کرنے والے قوانین دریافت کر ہی چکا تھا۔ ڈارون نے سماجی ارتقاء کو منضبط کرنے والے قوانین کو شناخت کر لیا تھا اور فرائڈ نفسیات کے متعلقہ قوانین کو انتہائی وضاحت سے پیش کر چکا تھا۔ دوسرے سائنس دانوں، انجینئروں، سماجی سائنس دانوں، ماہرین نفسیات نے پھر بھی مزید یا مختلف قوانی کی تلاش جاری رکھی۔

دوسری لہر کی تہذیب اب سیست کے ایک ایسے نظریئے سے مسلح ہو چکی تھی، جو اپنی قوت اور اپنے وسیع اطلاق کی وجہ سے انتہائی محیرالعقل محسوس ہوتا تھا۔ اب تک جو چیزیں پیچیدہ لگتی تھیں، انہیں سادہ وضاحتی فارمولوں میں بیان کیا جا سکتا تھا۔ ان قوانین یا ضوابط کو محض اس لئے تسلیم نہیں کر لیا گیا کہ انہیں نیوٹن، مارکس یا کسی دوسرے نے پیش کیا تھا بلکہ وہ طویل تجربات اور مشاہدات کے مرہون منت تھے۔ ان کی توثیق کی جا سکتی تھی۔ انہیں استعمال میں لا کر ہم پل تعمیر کر سکتے تھے۔ ریڈیائی لہریں خلا میں بھیج سکتے تھے، ماضی یا مستقبل کی حیاتیاتی تبدیلی کا اندازہ کر سکتے تھے، معیشت کے اتار چڑھاؤ کو قابو میں کر سکتے تھے، سیاسی تحریکوں یا مشینوں کو منظّم کر سکتے تھے اور یہاں تک کہ۔۔۔۔ ان کا دعوی تھا۔۔۔۔ وہ حتمی فرد کے رویئے کو پہلے سے سمجھ سکتے تھے اور اسے (مناسب) شکل بھی دے سکتے تھے۔ ضرورت تھی صرف اس لازمی متغیر کی تلاش کی جو کسی فطری مظہر کی وضاحت کر سکتا

MashalBooks.org

ہو۔ ہم کوئی بھی کام سرانجام دے سکتے ہیں اگر ہم مناسب ''بلیرڈ کی گینڈیں'' ڈھونڈ سکیں اور انہیں بہترین زاویئے کی طرف سے مار کرسکیں۔

اس نئی سیست نے زمان، مکان اور مادے کے نئے تصورات کے ساتھ مل کر، انسانی نسل کے ایک بڑے حصے کو قدیم نا قابل فہم پر اسراریت کے عذاب سے نجات دلائی۔ اس نے سائنس اور ٹیکنالوجی میں عظیم الشان کامیابیوں اور حیرت انگیز توراتی اور عملی کمالات کو ممکن بنایا۔ اس نے جبر و استبدادیت کو چیلنج کیا اور ذہن کو ہزاروں سال کی قید سے آزادی دلائی۔

لیکن صنعتی راج کی حقیقت نے خود اپنا بھی ایک قید خانہ تخلیق کر لیا۔۔۔۔ ایک ایسی صنعتی ذہنیت، جو اپنے فہم سے بالا چیز کو اہمیت ہی نہیں دیتی تھی یا نظر انداز کر دیتی۔ سخت محنت و مشقت کی عموماً معترف ہوتی اور تصورات کی قابل فہمائش گردانتی، جس نے لوگوں کو حد سے زیادہ سادہ انداز میں مادہ حیات کی اکائیوں میں بدل کر رکھ دیا اور جس نے بالآخر کسی بھی مسئلے کا حل اعداد و شمار یا ریاضیاتی انداز میں نکالنا چاہا۔

صنعتی راج کی حقیقت اخلاقی طور پر اتنی غیر جانب دار تھی نہیں، جتنا خود کو ظاہر کرتی تھی۔ ہمارے مشاہدے کے مطابق یہ دوسری لہر کی تہذیب کی خاصی متشدد ''عظیم آئیڈیالوجی'' تھی، اپنا جواز خود مہیا کرنے والی آئیڈیالوجی، جس سے صنعتی دور کے مخصوص دائیں اور بائیں بازو کے نظریات نے جنم لیا۔ کسی بھی دوسری ثقافت کی طرح دوسری لہر کی تہذیب نے بھی اپنے تعصّبات اور تنگ نظر فلٹرز تیار کیے، جن کے ذریعے لوگ خود اپنے آپ کو اور کائنات کو دیکھنے پر مجبور تھے۔ نظریات، تصورات اور مفروضات کے اس ارتکاز نے اور ان سے پیدا شدہ تمثیلات نے، تاریخ کے طاقتور ترین ثقافتی نظام کی تشکیل کی۔

بالآخر صنعتی راج کی حقیقت۔۔۔۔ صنعتی نظام کا ثقافتی چہرہ۔۔۔۔ اس معاشرے کا یک لازمہ ہو گئی، جس کی تعمیر میں وہ معاون رہی تھی۔ اس نے بڑے بڑے اداروں، وسیع شہروں، مرکزی افسر شاہی اور مکمل سرایت پذیر منڈیوں۔۔۔۔ چاہے وہ سرمایہ دارانہ ہوں یا اشتراکی۔۔۔۔ کا معاشرہ تخلیق کرنے میں بھرپور معاونت کی، اس نے خود کو توانائی کے جدید سسٹم، خاندانی نظام، ٹیکنالوجیکل سسٹم، معاشی، سیاسی اور قدری نظاموں میں اس

MashalBooks.org

طرح جاری و ساری کیا کہ ان سب نے باہم مل کر دوسری لہر کی تہذیب کی تشکیل کر ڈالی۔

یہ ساری کی ساری تہذیب ،اپنے تمام اداروں، ٹیکنالوجیوں اور اپنی ثقافت سمیت، تبدیلی کے ایک زبردست برفانی تودے سے ٹکرا کر پاش پاش ہو رہی ہے کیونکہ تیسری لہر، اپنی باری لینے کے لئے پورے کرہ ارض پر متلاطم ہے۔ ہم صنعتی نظام کے آخری اور نا قابل تلافی کرائسس میں سانس لے رہے ہیں اور جونہی صنعتی دور تاریخ کی زینت بنتا ہے، ایک نیا دور پیدا ہونے کو ہے۔

MashalBooks.org

باب9

چمکدار سیلاب

ایک سربستہ راز ابھی باقی ہے۔ صنعتی نظام، تاریخ۔۔۔۔ وقت کی گہرائی میں گم تین مختصر صدیوں۔۔۔۔ کا ایک چمک دار سیلاب تھا۔ صنعتی انقلاب کا سبب کیا تھا؟ کس وجہ سے پورے سیارے کے گرد، دوسری لہر کی تلاطم خیزی بپا ہوئی؟

تبدیلی کی بہت سی چھوٹی چھوٹی ندیاں، ایک عظیم سنگم وجود میں لانے کے لئے باہم مل کر بہنے لگیں۔ نئی دنیا کی دریافت نے صنعتی انقلاب بپا ہوتے وقت، توانائی کا ایک نیا جذبہ اور جوش وخروش یورپی ثقافت اور معیشت میں لا داخل کیا۔ آبادی میں اضافے نے شہروں کی جانب رخ کرنے کی حوصلہ افزائی کی۔ برطانیہ میں جنگلات کے قریب الختم ذخیرے نے کوئلے کے استعمال کی جانب توجہ مبذول کرائی۔ چنانچہ کانوں کی اتنی گہرائی تک کھدائی پر مجبور ہونا پڑا کہ گھوڑوں کے ذریعے چلنے والے پرانے پمپ، ان کا پانی نکالنے میں ناکام ہو گئے۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے بھاپ کا انجن مکمل کیا گیا، جس سے نئے ٹیکنالوجیکل مواقع کے حیرت انگیز تسلسل کی جانب پیش رفت ہوئی۔ صنعتی راج کی حقیقت کے آہستہ رو، نفرذ کرتے نظریات نے چرچ اور سیاسی حاکمیت کو چیلنج کر دیا۔ تعلیم کا پھیلاؤ، سڑکوں اور ذرائع نقل وحمل میں بہتری۔۔۔۔ یہ سب کے سب ایک ہی وقت میں مجتمع ہو کر، تبدیلی کے سیلاب کے دروازے کھولنے کے لئے زور لگانے لگے۔

صنعتی انقلاب کے سبب کی کوئی تلاش بیکار محض ہی رہی کیونکہ اس کا کوئی تنہا یا غالب سبب تھا ہی نہیں۔ ٹیکنالوجی بذات خود تاریخ کو متحرک کرنے والی قوت نہیں ہو سکتی اور نہ ہی نظریات اور قدریں یہ کام انجام دے سکتی ہیں۔ طبقاتی جدوجہد بھی تاریخ پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ تاریخ زمانے کی ماحولیاتی تبدیلیوں (آبادیوں کے

MashalBooks.org

رجحان یا ابلاغی ایجادات) کا محض ایک ریکارڈ ہے۔

معاشیات، تن تنہا، اس یا کسی بھی دوسرے واقعے کی توضیح نہیں کر سکتی۔ کوئی ایسا آزاد متغیر نہیں ہے جس پر دوسرے تمام متغیرات کا انحصار ہو۔ ہاں، لامحدود پیچیدگیوں کے ساتھ باہم متعلق متغیرات ضرور ہیں۔ سبی اثرات کے اس تحیر کے مقابل، ان کے تمام باہمی عمل کا سراغ تک لگانے میں ناکامی کے بعد، ہم زیادہ سے زیادہ ان عوامل پر۔۔۔۔ جو ہمارے مقاصد کو زیادہ واضح منکشف کرتے ہیں۔۔۔۔ فوکس کر سکتے ہیں اور اس چناؤ میں مضمر ہیسی شکست وریخت کو پہچان سکتے ہیں۔ اس اندازِ فکر سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ دوسری لہر کی تہذیب کی بنا میں کارفرما بہت ساری قوتوں میں سے شاید ہی کچھ قوتوں کے نتائج، بہ نسبت صانع اور صارف کے مابین بڑھتی ہوئی خلیج کے اور اس حیرت انگیز تبادلاتی نیٹ ورک کی افزائش کے۔۔۔۔ جسے اب ہم مارکیٹ کا نام دیتے ہیں، خواہ وہ شکلاً سرمایہ دارانہ ہو یا سوشلسٹ۔۔۔۔ نمایاں رہے ہوں۔

صانع اور صارف کے مابین زمان و مکان کے اعتبار سے سماجی اور نفسیاتی بعد کی وجہ سے دوری جتنی زیادہ بڑھی، اتنی ہی تیزی سے مارکیٹ اپنی تمام حیرت انگیز پیچیدگیوں، اپنی تمام قدروں، اپنی ساری تلمیحات اور پوشیدہ مفروضات کے ساتھ سماجی حقیقت پر غلبہ پانے آ گئی۔

اسی غیر محسوس کٹاؤ نے، جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں۔۔۔۔ یہ سارا جدید نظام زر بمعہ اسکے مرکزی بنکاری کے اداروں، سٹاک ایکسچینج، عالمی تجارت، اس کی منصوبہ ساز افسر شاہی، اس کا مقداری اور ریاضیاتی جوش و جذبہ، اس کے معاہداتی اخلاق، اس کا مادہ پرستانہ تعصب، کامیابی کے تنگ پیمانے، اس کا کرخت نظام اجرت اور اس کے حساب کتاب کا طاقتور آپریٹس۔۔۔۔ جس کی ثقافتی اہمیت ہم عموماً صحیح طرح سمجھ نہیں پاتے۔۔۔۔ پیدا کیا۔ صانع اور صارف کے درمیان اسی خلیج سے معیار، تخصیص، وقت سے ہم آہنگی اور مرکزیت پر کئی دباؤ آن پڑے۔ اسی کی بدولت جنسی کردار اور مزاج یا طبیعتوں میں اختلافات نے جنم لیا۔ بہر حال ہم جن دوسری بہت سی طاقتوں کا تجزیہ کر رہے ہیں (جنہوں نے دوسری لہر کو متلاطم کیا) ان میں سے پیداوار اور صرف کے قدیم جوہر کی یہ ٹوٹ پھوٹ

یقیناً اونچے مقام ہوگی۔ اس جوہری تقسیم کی دھماکہ خیز لہریں آج بھی محسوس ہوتی ہیں۔

دوسری لہر کی تہذیب نے محض ٹیکنالوجی، فطرت اور ثقافت کو ہی تبدیل نہیں کیا بلکہ ایک نیا سماجی کردار پیدا کرنے کی معاونت میں اس نے شخصیت کو بھی بدل ڈالا۔ بلاشبہ عورتوں اور بچوں نے دوسری لہر کی تہذیب کو شکل دی اور اس سے خود بھی تشکیل ہوئے۔ لیکن چونکہ مرد براہ راست مارکیٹ کے سانچے اور کام کے نئے طور طریقوں میں زیادہ ملوث ہو گئے تھے، اس لئے عورتوں کی نسبت ان میں زیادہ واضح صنعتی خصوصیات پیدا ہوگئیں۔ صنف نازک سے معذرت کے ساتھ، ان نئی خصوصیات کو یکجا کرنے کے لئے صنعتی مرد کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔

صنعتی مرد، اپنے تروؤں سے مختلف تھا۔ وہ ان توانائی کے غلاموں کا آقا تھا جنہوں نے اس کی حقیر سی طاقت کو بے پناہ بڑھا دیا۔ اس نے اپنی زندگی کا زیادہ تر وقت فیکٹری سٹائل ماحول میں، ان مشینوں اور اداروں سے متعلق رہ کر گزارا جنہوں نے فرد کو بہت چھوٹا (بونا) بنا دیا۔ اس نے اپنے بچپن میں ہی یہ جان لیا تھا کہ بقا کے لئے آج پیسہ جتنا ضروری ہے، اتنا کبھی نہیں تھا۔ وہ عموماً ایک جوہری کنبے میں پلا بڑھا اور ایک فیکٹری سٹائل سکول میں چلا گیا۔ اس نے دنیا کے بارے میں اپنا بنیادی تصور ماس میڈیا سے لیا۔ اس نے کسی عظیم کارپوریشن یا پبلک ایجنسی کے لئے کام کیا۔ یونینوں، چرچ اور ایسے ہی دوسرے اداروں کو۔۔۔۔ اپنی منقسم ذات کا ایک ایک حصہ ہدیہ کرتے ہوء۔۔۔۔ ان سے اپنا تعلق استوار کیا۔ گاؤں یا شہر سے اپنی شناخت کو بھلا کر قوم کا حصہ بنا۔ اس نے خود کو فطرت کے خلاف کھڑے پایا۔۔۔۔ اپنے روزمرہ کام میں وہ اس کا استحصال کر رہا ہوتا، پھر بھی مضحکہ خیزی کی انتہا دیکھئے کہ ہر ایک ویک اینڈ پر اسی کو سیر و تفریح کے لئے نکل کھڑا ہوتا (درحقیقت، وہ فطرت کو جتنا بدشکل اور برہنہ کر رہا تھا اتنا ہی اسے رومان پرور سمجھ رہا تھا اور کم از کم، زبان کی حد تک اس کا احترام بھی کر رہا تھا) اس نے خود کو ایسے وسیع وعریض باہم انحصار پذیر معاشی، سیاسی اور سماجی نظاموں کے ایک چھوٹے سے جزو کے طور پر دیکھنا سیکھا، جن کی حدود اس کے فہم و ادراک سے بالا کہیں پیچیدگیوں میں تحلیل ہو جاتی تھیں۔

اس حقیقت سے ٹکرا کر اس نے ناکام بغاوت بھی کی۔ زندگی گزارنے کے لئے

اسے جدوجہد کرنا پڑی۔ معاشرے کے مطلوبہ کھیلوں میں حصہ لینا سیکھا، خود کو تفویض شدہ کرداروں میں، بسا اوقات ان سے نفرت کے باوجود، ڈھالا۔ خود کو اس نظام کا، جسنے اس کا معیار زندگی بہتر بنایا، بے بس و لاچار شکار بھی محسوس کیا۔ اس نے خط مستقیم کی شکل میں کوقت کو مستقبل کی جانب، اسے ہمراہ لئے بڑھتے دیکھا، جہاں سا کی قبر، اس کی منتظر تھی۔ اور جیسے ہی اس کی کلائی کی گھڑی حرکت کرنا بند کر دیتی، وہ یہ جانتے ہوئے کہ زمین اور اس پر موجود اس سمیت ہر فرد، ایک وسیع وعریض، بے رحم اور مسلسل حرکت پذیر، کائناتی مشین کا محض ایک حصہ ہے۔۔۔۔ موت کے منہ پہنچ جاتا۔ صنعتی آدمی کو ایک ایسا ماحول ملا جس کے بہت سے رخ، اس کے اجداد کے لئے یقیناً نا قابل شناخت ہوتے۔ جہاں تک کہ انتہائی ابتدائی حسی اشارے بھی قطعی مختلف تھے۔

دوسری لہر نے ساؤنڈ سکیپ ہی بدل ڈالا۔ پالتو مرغ کی ککڑوں کوں کی جگہ فیکٹری کی وہسل نے لے لی۔ جھینگروں کے شور کی جگہ، ٹائروں کی چیخ نے لے لی۔ اس نے بیداری کے اوقات کو بڑھا کر، رات کو روشن کر دیا۔ گ اس نے ایسے بصری تصورات دیئے جو کسی آنکھ نے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔۔۔۔ آسمان سے زمین کی لی گئی تصویر یا مقامی سینما میں لاشعور کی عکاسی کے لئے تصاویر کا فنی استعمال یا اعلی قوت کے مائیکروسکوپس کے ذریعے پہلی دفعہ حیاتیاتی شکلوں کا انکشاف۔ رات کی خوشبودار فضا میں گیسولین کی بو اور پودوں کی سڑاند چھا گئی۔ گوشت اور سبزی کے ذائقے تبدیل ہو گئے۔ سارے کا سارا تصوراتی لینڈ اسکیپ ہی بدل کر رہ گیا۔

یہی کچھ انسانی جسم کے ساتھ ہوا۔ پہلی دفعہ اس کی اپنے عمومی پورے قد و قامت میں نشو ونما ہوئی اور بعد میں آنے والی نسلیں اپنے والدین کی نسبت زیادہ طویل قامت ہوئیں۔ جسم کے متعلق رویئے بھی بدلے۔ نوربرٹ ایلیاس، ''تہذیبی عمل'' میں ہمیں بتاتا ہے کہ سولہویں صدی تک جرمین اور دوسرے یورپی ممالک میں ''مکمل برہنگی کے مناظر روز مرہ کا معمول تھے'' دوسری لہر کے پھیلاؤ کے ساتھ ہی برہنگی کو قابل شرم سمجھا جانے لگا۔ بیڈ روم کے رویئے تک تبدیل ہوئے، وہاں بھی شب خوابی کے خصوصی لباس استعمال ہونے لگے۔ کھانے کی میز پر کانٹوں، چمچوں اور مختلف اقسام کی چیزوں کی شمولیت نے خود کھانے کو بھی

خاصا ٹیکنالوجائز کر ڈالا۔ ایک ایسی ثقافت سے، جہاں میز پر مردہ جانور کی موجودگی مسرت و انبساط کا سامان ہوتی تھی، ایک ایسی ثقافت کی جانب سفر ہوا، جہاں میز پر موجود گوشت کی ڈش دیکھ کر یہ احساس، ممکنہ حد تک نہ ہو کہ کسی حیوان کی زندگی بھی ہمارے کھانے کی نذر ہو گئی۔

شادی صرف معاشی سہولت کا نام ہی نہیں رہا۔ جنگ کو بھی بے تحاشا بڑھایا گیا اور اسے بھی Assembly Line پر ڈال دیا گیا۔ والدین اور بچوں کے تعلق میں، بالائی طبقے کی جانب حرکت پذیری کے مواقع میں، غرض انسانی رشتوں کے ہر انداز میں یہ تبدیلیاں، لاکھوں افراد کے لئے ایک انتہائی تبدیل شدہ عرفان ذات ساتھ لائیں۔ اتنی ساری تفسیاتی، معاشی، سیاسی اور سماجی معیاروں سے اس تہذیب کے متعلق کوئی رائے قائم کی جاء؟ کیا اس امعیار زندگی کے ذریعے جو اس نے اپنے معاشروں میں موجود لوگوں کو دیا؟ یا ان اثرات کے ذریعے جو اس نے اپنی حدود سے باہر رہنے والوں پر ڈالے؟ کیا حیاتیاتی دائرے پر اس کی گرفت کے ذریعے؟ اس کے فنون کے انتہائے کمال کی وجہ سے؟ اس کے باشندوں کے طویل عرصہ زندگی کی وجہ سے؟ اس کی سائنسی کامیابیوں کی وجہ سے یا فرد کی آزادی کی وجہ سے؟

وسیع پیمانے کی معاشی کساد بازاری اور انسانی جانوں کے ہیبت ناک اتلاف کے باوجود دوسری لہر کی تہذیب نے ایک عام آدمی کا مادی معیار زندگی نمایاں طور پر بہتر کیا۔ صنعتی راج کے نقاد، اٹھارویں اور انیسویں صدی کے برطانیہ میں مزدور طبقے کی زبردست بد حالی کا ذکر کرتے ہوئے، اکثر اوقات پہلی لہر کے دور کو بہت رومانی سمجھتے ہیں۔ وہ دیہاتی ماضی کی تصویر کشی کرتے ہوئے اسے حرارت بخش، مجتمع، مضبوط، منظّم اور خالص مادی اقدار کے بجائے روحانی اقدار پر مبنی قرار دیتے ہیں لیکن تاریخ انکشاف کرتی ہے کہ یہ نام ونہاد پیاری دیہاتی بستیاں درحقیقت نا کافی غذائیت، امراض، غربت، بے گھری اور ظلم و جبر کے گندے تالاب تھے، جہاں لوگ بھوک، سردی اور جاگیردار آقاؤں کے آگے بالکل بے یارو مددگار تھے۔

بڑے شہروں کے گرد ابھر آنے والی کچی آبادیوں، ان کی مضرت رساں غذا، ان

کی ناصاف پانی کی سپلائی، ان کی جھونپڑیوں اور ان کی ہنگامہ آرائیوں کے متعلق بہت کچھ کار روائیاں ہوتی ہیں۔ ان کے حالات واقعی بے حد ناگفتہ بہ تھے۔ پھر بھی یہ حالات اس ماحوالیات صورتحال سے بد جہا بہتر تھے جسے یہ لوگ پیچھے دیہاتوں میں چھوڑ آئے تھے۔ برطانوی مصنف جان ویزی نے لکھا ہے: گلہ بانی اور معمولی کھیتی باڑی پر انحصار کرنے والے برطانیہ کی تصویر کشی میں مبالغہ آرائی اور رنگ آمیزی کچھ زیادہ ہی ہوگئی۔ ان میں سے اکثر لوگوں کی شہری مضافات کی طرف حرکت پذیری نے انہیں ''حقیقت معیار زندگی میں حیران کن بہتری، طویل عرصہ حیات، گھر گھر ہستی کا بہتر مادی معیار اور ان کے کھانے پینے کی مقدار اور اقسام میں کئی درجہ بہتری'' مہیا کی۔

صحت کے متعلق گائے ولیمز کی ''دکھوں کا زمانہ'' یا ایل اے کلارکسن کی کتاب ''صنعتی دور سے قبل کے برطانیہ میں موت، مرض اور قحط'' کا پڑھ لینا ہی ان لوگوں کی حقیقت کھول دیتا ہے جو دوسری لہر کی بجائے، پہلی لہر کی تہذیب کے ڈنکے بجاتے ہیں۔ ان کتابوں پر تبصرہ کرتے ہوئے کرسٹینا لارنر کی رائے ہے۔

''سماجی مورخوں اور آبادی کی چھان بین کرنے والوں نے کھلے دیہاتوں اور ضرر رساں شہروں، دونوں ہی میں، بیماری، درد اور موت کے خوفناک لہراتے سایوں پر خاصی روشنی ڈالی ہے۔ زندگی کا دورانیہ کافی کم تھا۔ سولہویں صدی میں تقریباً چالیس سال، جو سترہویں صدی کے تیسرے عشرے کے درمیان، وبائی اراض کی وجہ سے اور بھی کم ہوگیا اور اٹھارویں صدی کے پہلے نصف میں اس میں اضافہ ہوا۔۔۔ بہت کم شادی شدہ لوگ طویل عرصہ اکٹھے گزار پاتے تھے۔۔۔ تمام بچے الٹے سیدھے انداز میں پرورش پاتے تھے۔ چاہے ہم اپنے موجودہ کرائسس کے شکار، بے ہنگم نظام صحت پر تنقید کرنے میں کتنے ہی حق بجانب کیوں نہ ہوں، ہمیں ذہن میں یہ بات بھی رکھنی چاہئے کہ انقلاب سے پہلے، سرکاری علاج، بری طرح بدن نکالنے اور بغیر انستھیز نا کے سرجری پر زور دیتا تھا۔

موت کی زیادہ تر وجوہات تھیں: طاعون، سرخ بخار، انفلوئنزاء، پیچش، چیچک اور تپ دق۔ ''عقل مندوں نے عموماً یہ مشاہدہ کیا'' لارنر نے بڑے کرخت انداز میں لکھا ہے۔ ''ہم نے پرانوں کی جگہ مارنے والوں کا ایک مختلف سیٹ بنا لیا ہے۔ ہاں یہ بات ہے، یہ

ہمیں ذرا زیادہ جینے دیتے ہیں۔ صنعتی دور سے پہلے کی وبائی بیماری تو بلاامتیاز بوڑھوں اور جوانوں کو اکٹھا ہی موت کے گھاٹ اتار دیتی تھی۔''

صحت اور معاشیات سے، آیئے فن اور نظریئے کی طرف۔۔۔۔ کیا صنعتی راج، اپنی تمام تر مادہ پرستانہ تنگ نظری کے باوجود اپنے سے قبل موجود جاگیردارانہ معاشروں سے زیادہ مضحکہ خیز تھا؟ کیا میکانکی ذہنیت یا صنعتی راج کی حقیقت زمانہ وسطی کے چرچ یا ماضی کے حکمرانوں کے مقابلے میں، نئے نظریات اور تصورات، چاہیئے وہ مذہب مخالف ہی کیوں نہ ہوں۔۔۔۔ کے لئے کم کشادہ (وسعت نظری میں کم) اور تنگ نظر تھی۔ اپنی کیم شخم نوکر شاہی سے اپنے تمام تنفر کے باوجود، یہ جانچیئے کہ آیا یہ صدیوں پرانی چینی نوکر شاہی یا قدیم مصرف حاکم طبقات سے زیادہ کرخت اور متشدد ہے؟ اور جہاں تک آرٹ کا تعلق ہے۔ کیا مغرب میں پچھلے تین سو سالوں کی ناول، نظمیں اور تصویریں کسی بھی طرح ابتدائی زمانوں یا مختلف مقامات کے فن پاروں کی نسبت زندگی میں، گہرائی میں، انکشافات میں یا پیچیدگی میں کم محسوس ہوتی ہیں؟

اس کا تاریک پہلو بھی بہر حال حاضر ہے۔ دوسری لہر کی تہذیب نے جہاں ہمارے اجداد کی حالت میں بے پناہ بہتری پیدا کی، وہاں اس نے جارحانہ خارجی نتائج وعواقب۔۔۔۔ غیر متوقع ضمنی اثرات۔۔۔۔ بھی پیدا کئے۔ ان میں سب سے زیادہ شدید اور غالباً نا قابل تلافی نقصان، زمین کے نازک حیاتیاتی دائرے کو پہنچا۔ فطرت کے خلاف اس کے صنعتی حقیقت پر مبنی تعصب کی وجہ سے، اس کی وسعت پذیر آبادی کی وجہ سے، اس کی ظالمانہ ٹیکنالوجی اور پھیلاؤ کے لئے مسلسل احتیاج کی وجہ سے، گذشتہ کسی بھی زمانے کی بہ نسبت اس نے بے پناہ ماحولیاتی تباہی و بربادی پھیلائی۔ میں نے صنعتی زمانے سے قبل کے شہروں کی سڑکوں پر گھوڑے کی لید کے متعلق پڑھا ہے (یہ حوالہ عموماً اس یقین دہانی اور ثبوت کے طور پر آتا ہے کہ آلودگی کوئی نئی چیز نہیں) مجھے یہ بھی علم ہے کہ قدیم شہروں کی گلیاں گندگی سے بھری رہتی تھیں۔ بہر حال صنعتی معاشرے نے ماحولیاتی آلودگی کے مسائل کو اور وسائل کے استعمال کو ایک انتہائی انقلابی سطح پر لاکر ماضی اور حال میں کوئی توازن یا تناسب باقی ہی نہیں رہنے دیا۔

MashalBooks.org

پہلے کبھی کسی تہذیب نے ایسے ذرائع پیدا نہیں کئے تھے، جن سے واقعتاً ایک شہر ہی نہیں بلکہ پورے سیارے کی تباہی ہو رہی ہو۔ پہلے کبھی تمام سمندروں میں ایسی زہر آلودگی نہیں ہوئی ہو گی کہ انسانی حرص یا لاپرواہی کی بدولت، راتوں رات تمام جاندار، زمین سے ختم ہو جائیں، کبھی بالوں پر اسپرے کرنے والی گیس اوزون کی سطح کے لئے اس طرح نقصان دہ یا گیسوں کی آلودگی زمینی آب و ہوا کے لئے خطرہ نہیں بنی ہو گی۔

اس سے ملتا جلتا مگر زیادہ پیچیدہ سوال سامراج کا ہے۔ جنوبی افریقہ میں کانیں کھودنے کے لئے انڈینز کی غلامی، افریقہ اور ایشیا کے بڑے علاقوں میں پلانٹیشن، فارمنگ کا اجزاء، صنعتی اقوام کی ضروریات پور کرنے کے لئے نو آبادیاتی معیشتوں کا جان بوجھ کے بیڑا غرق کرنا، ان سب نے اپنے پیچھے دکھ، بیماری، بھوک اور ثقافتی تباہی کے سوا اور کیا چھوڑا۔ دوسری لہر کی تہذیب نے نسلوں کے سر پر سوار ہو کر، پیمانے کی خود کفیل معیشتوں کو زبردستی عالمی تجارت کے نظام میں منضبط کر دیا۔ یہ سارے زخم ابھی تک مندمل ہونا شروع نہیں ہوئے۔

بہر حال ابتدائی خود کفالتی معیشتوں کو بہت بڑھا چڑھا کر بیان کرنا یقیناً ایک غلطی ہو گی۔ یہ سوال ہو سکتا ہے کہ آیا دنیا کے غیر صنعتی علاقوں کی آبادی، تین سو سال پہلے کی نسبت آج زیادہ بدتر حالت میں ہے۔ زندگی کے دورانئے، غذائی خوراک، شیر خواروں کی شرح اموات، تعلیم اور انسانی عزت وقار کے معاملے۔۔۔۔ ساحل سے وسطی امریکہ تک۔۔۔۔ آج بھی لاکھوں کروڑوں انسان ناقابل بیان مصائب کا شکار ہیں لیکن اس کے باوجود حال کو سمجھنے کی جلد بازی میں ایک غیر حقیقی اور رومان انگیز ماضی ایجاد کر لینا، ان کی کوئی خدمت نہیں ہو گی۔ مستقبل کی سمت بڑھنے والا راستہ، ایک زیادہ تکلیف دہ ماضی کی طرف رجوع کرنے میں بہر حال نہیں ہے۔

جس طرح دوسری لہر کی تہذیب کی پیدائش کا کوئی ایک سبب نہیں ہے، اسی طرح صرف ایک ہی ارتقاء بھی ممکن نہیں۔ میں نے دوسری لہر کی تہذیب کی، اس کی خامیوں سمیت، تصویر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر میں ایک جگہ اس کو مسترد کرتا نظر آؤں اور دوسری جگہ اس کی حمایت، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ سادہ اندازے عموماً گمراہ کن ہوتے ہیں۔

جس انداز میں صنعتی راج نے پہلی لہر اور ابتدائی قدیم اقوام کو کچلا، میں اس انداز سے نفرت کرتا ہوں۔ میں بھلا نہیں سکتا کہ کس طرح جنگ کو پھیلایا گیا اور ایٹم کو ہیروشیما کو جلا کر بھسم کر دینے کے لئے استعمال کیا گیا۔ باقی دنیا کے خلاف اس کی تباہ کن کاروائیوں اور اس کی ثقافتی تکبر پر میں شرمندگی محسوس کرتا ہوں۔ میں انسانی توانائی، تصور اور جذبے کے اپنے معبدوں میں ضائع ہونے پر بیزار ہوتا ہوں۔

لیکن اپنے ہی زمانے اور لوگوں سے بلاوجہ کی نفرت یقیناً مستقبل کو جنم دینے کی کوئی بہتر بنیاد نہیں بن سکتی۔ کیا صنعتی راج ایک ایئر کنڈیشنڈ ڈراؤنا خواب تھا۔ ایک بیکار اور ناکارہ زمین تھی، سر پر منڈلاتا ایک مسلسل عذاب تھا؟ سائنس اور ٹیکنالوجی کے دشمنوں کے دعوؤں کے مطابق کیا یہ ایک تخیلاتی دنیا تھی؟ بلاشبہ لیکن یہ اس سے کہیں زیادہ آگے کی چیز تھی۔ یہ زندگی ہی کی طرح دائمی بقا میں ایک کھٹا میٹھا واقعہ تھا۔

بہر حال ایک دھندلے حال کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ سمجھ لینا نہایت اہم ہے کہ صنعتی کھیل ختم ہو چکا ہے، اس کی توانائیاں صرف ہو چکیں۔ دوسری لہر کی قوت ہر جگہ زوال پذیر ہے کیونکہ تبدیلی کی نئی لہر شروع ہو چکی ہے۔ دو تبدیلیاں، جن کا وجود صنعتی تہذیب کے نارمل تسلسل کی بنیاد بنا رہا، اب مزید ممکن نہیں رہیں۔

اول یہ کہ فطرت کے خلاف جنگ میں ہم ایک موڑ پر آن کھڑے ہیں۔ دائرہ حیات اب مزید صنعتی خباشتوں کو برداشت نہیں کر سکتا۔ دوسرے یہ کہ ہم مزید لا محدود عرصے تک نا قابل تجدید توانائی۔۔۔۔ جو اب تک صنعتی ترقی کی ایک بنیادی سب سڈی رہی ہے۔۔۔۔ پر بھروسہ نہیں کر سکتے۔

ان حقائق کا قطعاً یہ مطلب نہیں کہ ٹیکنالوجیکل معاشرے یا توانائی کا اختتام ہو رہا ہے۔ لیکن ان کا یہ مفہوم ضرور ہے کہ مستقبل کی ٹیکنالوجیکل پیش رفت، نئے ماحولیاتی (جبری) اثرات کے تحت شکل پذیر ہو گی۔ ان کا یہ مطلب بھی ہے کہ جب تک نئے وسائل کا استعمال نہیں لایا جاتا، صنعتی اقوام کو مسلسل، انخلا کے ممکنہ مضر اثرات کو برداشت کرنا ہو گا کیونکہ توانائی کی نئی شکلوں کے متبادل استعمال کی جدوجہد خود سماجی اور سیاسی تبدیلیوں کے عمل کو تیز تر کر دے گی۔

MashalBooks.org

ایک چیز واضح ہے:ہم سستی توانائی کی آخری حد۔۔۔کم سے کم اگلے کچھ عشروں کے لئے۔۔۔۔ پر ہیں۔ دوسری لہر کی تہذیب، اپنی سب سے اہم دو بنیادی سب سڈیز میں سے ایک سے ہاتھ دھوبیٹھی ہے۔ بالکل اسی طرح دوسری پوشیدہ سب سڈی ارزاں خام مال، ان سے چھن رہا ہے۔نو آبادیاتی اور نو سامراجی راج کے خاتمے کو سامنے پا کر، اعلی ٹیکنالوجی کی حامل اقوام یا تو نئے اندرونی وسائل یا متبادل کی جانب متوجہ ہو گی اور باہمی لین دین کے ذریعے غیر صنعتی ریاستوں سے معاشی تعلقات کوکم کریں گی یا پھراپنی غیر صنعتی مما لک سے بالکل ہی نئ تجارتی شرائط پرخریداری کرتی رہیں گی۔ دونوں ہی صورتوں میں اخراجات خاصی حد تک بڑھ جائیں گے اور وسائل کی بے ساکھیوں پر کھڑی تمام کی تمام تہذیب، اپنی توانائی کی بنیاد سمیت، کی کایا پلٹ ہو جائے گی۔

صنعتی معاشرے پر یہ خارجی اثرات نظام کے اندر موجود(اجزاء کا) تار پود بکھیرنے والے اثرات سے ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ چاہے ہم امریکہ میں خاندانی نظام پر فوکس کریں یا فرانس کے ٹیلی فون سسٹم پر (جو آج کل، کیلا پیدا کرنے والے بعض مما لک سے بھی مقابلتاً بدتر ہے) یا ٹوکیو کے متبادل ریل سسٹم کو دیکھ لیں (اس کی حالت اتنی ناگفتہ بہ ہے کہ اس کے مسافروں نے سٹیشنوں پرحملہ آور ہو کر احتجاجاً ریلوے کے افسروں کو یرغمالی بنا لیا) ہر جگہ کہانی ایک جیسی ہے:لوگ اور سسٹم دونوں ہی حتمی نقطہ انقطاع پر شدید تناؤ کا شکار ہو گئے۔

دوسری لہر کے تمام نظام بحران کا شکار ہیں۔فلاح و بہبود کے نظاموں میں بحران ہے، ڈاک کے نظام میں بحران ہے،تعلیمی نظام کی زد میں ہیں،شہری نظام کی کوئی کل سیدھی نہیں، بین الاقوامی مالیاتی نظام بحرانی حالت میں ہے۔قومی ریاست میں کرائسس ہے۔ غرض دوسری لہر کی اقدار کا پورا سلسلہ ہی بحران کا شکار ہے۔

یہاں تک کہ رویوں کا نظام بھی۔۔۔۔جس نے صنعتی تہذیب کومجتمع رکھا۔۔۔۔ بحرانی کیفیت میں ہے۔اس کا سب سے ڈرامائی انداز،جنسی رویوں کی نئ تعریف کے لئے جدوجہد میں نظر آتا ہے، عورتوں کی تحریک میں ہم جنس پرستی کو قانونی قرار دینے کے مطالبات میں، یک جنسی فیشن کے پھیلاؤ میں، ہم اصناف کے لئے روایتی توقعات کومسلسل

MashalBooks.org

دھندلاتا ہوا دیکھ رہے ہیں۔ پیشہ ورانہ رویوں کے خطوط بھی دھندلاہٹ کا شکار ہیں۔ نرسیں اور مریض، دونوں ہی اپنے رویوں کی نئی وضاحت کر رہے ہیں اور اسی طرح ڈاکٹر بھی۔ پولیس اور اساتذہ اپنے تفویض شدہ کرداروں سے ہٹ کر غیر قانونی ہڑتالی عمل کی باتیں کر رہے ہیں۔ قانون جاننے والے اٹارنی کے کردار کی دوبارہ تعریف کر رہے ہیں۔ کارکن روایتی انتظامی کرداروں کا تیاپانچہ کر کے زیادہ سے زیادہ شراکت کے طلب گار ہیں اور یہ شکستہ حال معاشرتی کرداروں کا ڈھانچہ۔۔۔۔ جس پر صنعتی نظام کا اعتبار قائم تھا۔۔۔۔ اپنی معنویت میں اتنا بھر پور اور توانا نہیں کہ موجودہ سیاسی احتجاجوں اور جلوسوں کے خلاف مزاحم ہو سکے۔ انہی کے ذریعے (اخبارات کی) سرخیاں بنانے والے تبدیلی کو پہچانتے ہیں۔ بالآخر اثرات کا یہ اکٹھ۔۔۔۔ سب سے بنیادی اور نازک ڈھانچے ''شخصیت'' کے بحران پر منتج ہوا۔ غرض دوسری لہر کی تہذیب کی شکست وریخت نے شخصیت کے بحران کی وبا کو جنم دیا۔ آج ہمیں لاکھوں لوگ بری طرح اپنے ہی سائے کی تلاش میں فلموں، ڈراموں، ناولوں اور اپنی مدد آپ کی نوع کی کتابوں۔۔۔۔ جو انہیں ان کی گم شدہ شناخت کے دوبارہ حصول میں ان کی معاونت کا وعدہ کرتی ہیں۔۔۔۔ کی جانب چاہئے وہ کتنی جاہلانہ کیوں نہ ہوں، سرپٹ دوڑتے نظر آتے ہیں۔ امریکہ میں جیسا کہ ہم دیکھیں گے، شخصیتی بحران کے حوالے سے انتہائی اوٹ پٹانگ انکشافات ہو رہے ہیں۔

اس کے شکار خود کو بے پرواہی سے گروہی علاج، تصوف یا جنسی تلذذ کے کھیل میں جھونک دیتے ہیں۔ وہ تبدیلی کے شدید خواہاں ہونے کے باوجود اس سے ڈرتے ہیں۔ وہ اپنی موجودہ قید حیات سے فوری رہائی چاہتے ہیں، وہ بہرصورت ایک نئی زندگی کی جانب۔۔۔۔ شاید وہ بننے کے لئے جو وہ اب نہیں ہیں۔۔۔۔ چھلانگ لگانا چاہتے ہیں۔ وہ اپنے روزگار، بیویوں، کرداروں اور ذمہ داریوں میں تبدیلی چاہتے ہیں۔

بظاہر سمجھدار اور مطمئن امریکی تاجر بھی حال کی اس بے چین کیفیت سے ماروا نہیں ہیں۔ امریکن مینجمنٹ ایسوسی ایشن کے ایک سروے سے پتہ چلتا ہے کہ درمیانی سطح کے 40% مینجرز اپنے کام کی نوعیت سے ناخوش ہیں اور ان میں سے ایک تہائی سے زیادہ متبادل کیریئر کا خواب دیکھ رہے ہیں، جہاں وہ اپنے خیال کے مطابق زیادہ خوش رہ سکیں گے۔ بعض اپنی بے اطمینانی کی وجہ سے اٹھتے ہیں، نوکری چھوڑ کر کسان بن جاتے ہیں یا

آوارہ گردی اختیار کر لیتے ہیں، زندگی کے نئے طور طریقوں کی تلاش کرتے ہیں، سکول کی طرف لوٹ جاتے ہیں یا سیدھے سبھاؤ ایک چمکتے ہوئے دائرے کے گرد انتہائی برق رفتاری سے خود اپنا ہی تعاقب کرتے ہیں اور بالآخر دباؤ کی زیادتی کے نتیجے میں ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں۔

اپنے دکھوں کے اسباب جاننے کے لئے، اپنے آپ میں ان کی جڑیں تلاش کرتے ہوئے، وہ غیر ضروری پچتاؤوں کے کرب سے گزرتے ہیں۔ انہیں اس کا بالکل احساس نہیں کہ جو کچھ وہ اپنے اندر محسوس کر رہے ہیں، وہ ایک کہیں بڑے معروضی بحران کا موضوع انعکاس ہے۔ وہ ایک ڈرامے کے اندر ایک (اور) نادانستہ ڈرامہ کر رہے ہیں۔

کوئی ان مختلف بحرانوں کو علیحدہ علیحدہ واقعے کے طور پر دیکھنے کے لئے بھی اصرار کر سکتا ہے۔ ہم توانائی کے بحران اور شخصیتی بحران کا باہمی تعلق، نئی ٹیکنالوجیز اور نئے جنسی رویوں اور ایسے ہی پوشیدہ باہمی تعلقات کو نظر انداز کر سکتے ہیں لیکن یہ اپنے خوف کو چھپانے کی بات ہی ہوگی کیونکہ جو کچھ ہونے جا رہا ہے، وہ ان سب سے کہیں بڑا واقعہ ہے۔ ایک دفعہ ہم باہم منسلک تبدیلی کی مسلسل لہروں کا اور ان لہروں کے تصادم کا مفہوم سمجھنے لگیں، تب ہماری نسل کا ضروری سچ ہمارے قابو آتا ہے اور وہ سچ یہ ہے کہ صنعتی راج اپنی موت مر رہا ہے اور اب ہم تبدیلی کے نشانات کے درمیان یہ تلاش شروع کر سکتے ہیں کہ نیا واقعتاً ہے کیا، جو اپنی ہیئت میں صنعتی قطعاً نہیں۔ اس طرح ہم تیسری لہر کو پہچان سکتے ہیں۔

''یہی وہ تبدیلی کی تیسری لہر ہے، جو ہماری باقی ماندہ زندگیوں کو ترتیب دے گی۔ اگر ہم قدیم مرتی ہوئی تہذیب اور نئی تشکیل پذیر تہذیب کے درمیانی عبوری وقفے کو پر سکون رکھنا چاہتے ہیں اور اگر ہمیں اپنے تشخص اور آگے آنے والے شدید ترین بحران میں سے اپنی زندگیاں بچا لینے کی اہلیت کو قائم رکھنا ہے تو ہمیں تیسری لہر کی ایجادات کو پہچاننے اور انہیں تخلیق کرنے کا اہل ہونا چاہئے۔''

اگر ہم اپنے ارد گرد نظر دوڑائیں تو ہمیں ناکامی اور شکستگی کے انکشافات کے ساتھ ساتھ، نشوونما کے ابتدائی نشانات اور نئے طاقتور امکانات بھی ملتے ہیں۔ اگر ہم غور سے سنیں تو تیسری لہر کی گرجدار آواز کی گونج قریبی ساحلوں سے آتی محسوس ہو رہی ہے۔

MashalBooks.org

MashalBooks.org

تیسری لہر

MashalBooks.org

MashalBooks.org

باب 10

نئی نظریاتی ترتیب

جنوری 1950ء میں انیسویں صدی کے دوسرے نصف کی ابتداء ہی ہوئی تھی، بائیس سالہ نوجوان تروتازہ یونیورسٹی ڈپلوما ہاتھ میں لئے رات کے دوران ایک طویل سفر کے لئے بذریعہ بس اس منزل کی طرف گامزن ہوا، جسے وہ اپنے عہد کی مرکزی حقیقت سمجھتا تھا۔ اس کی گرل فرینڈ اس کے ہمراہ تھی اور کتابوں سے بھرا ہوا سوٹ کیس اس نشست کے نیچے پڑا تھا اور وہ خود نیلگوں سرمئی صبح کے آثار کے ساتھ امریکی مغرب۔۔۔۔ وسطی کی فیکٹریوں کا لامتناہی سلسلہ بارش سے دھندلائی کھڑکی میں سے برق رفتاری سے گزرتے دیکھ رہا تھا۔

امریکہ دنیا کی مرکزی ریاست کی حیثیت رکھتا تھا اور عظیم جھیلوں سے جھلملاتا علاقہ امریکہ کا صنعتی دل تھا اور فیکٹری دلوں کے اس دل کی اندرونی دھڑکن تھی۔ سٹیل ملز، ایلومونیم فاؤنڈریز، آلات اور ڈائی کی دکانیں، آئل رفالنریز، آٹو پلانٹس، وسیع وعریض رقبوں میں پھیلی سیاہ عمارت، جہاں دھاتوں کی ہیئت گری، سوراخ کرنے، پنچ کرنے۔ موڑنے، ویلڈ کرنے، انہیں گلانے اور ڈھالنے کے لئے بڑی بڑی مشینیں متحرک تھیں۔ فیکٹری صنعتی عہد کی ایک علامت تھا اور ایک ایسے نوجوان کے لئے، جو نچلے درمیانے طبقے کے مناسب ناز ونعم میں پلا بڑھا ہو، چار سال تک افلاطون اور ٹی ایس ایلیٹ، تاریخ، آرٹ اور خیالی معاشرتی نظریئے میں گم رہا ہو۔۔۔۔ یہ سب کچھ اتنا ہی استعجاب انگیز تھا جتنا کسی اجنبی کے لئے تاشقند یا تیرہ ڈل فیوگو۔

میں نے ان فیکٹریوں میں پانچ سال گزارے، ایک کلرک یا پرسنل اسسٹنٹ کی حیثیت میں نہیں، بلکہ چیزیں جوڑنے والے کارکن کی طرح، مل کاریگر کی طرح، ویلڈز بنکر، ہاتھ ریڑھی چلا کر، پنچ پریس آپریٹر بنکر۔۔۔۔ پنکھے جوڑکر، فاؤنڈری میں مشینوں کو فکس کر

کے، افریقی کانوں کے لئے گرد کنٹرول کرنے والی بڑی مشینیں بنا کر اور اسمبلی لائن کے پاس سے تیزی سے گزرتے ٹرکوں پر دھاتوں کولڈ کر کے، میں نے یہ وقت کاٹا۔ پہلی دفعہ یہ علم ہوا کہ صنعتی دور میں فیکٹری مزدور کس طرح روزی کمانے کے لئے جدوجہد سے گزرتے ہیں۔

میں نے فاؤنڈری کی گرد، پسینہ اور دھواں خوب اچھی طرح نگلا۔ بھاپ کی پھنکار، زنجیروں کی جھنجھناہٹ اور ڈبے جمع کرنے والے انجن کی غراہٹ نے میرے کانوں کے پردے پھاڑ ڈالے۔ میں نے حدت کو اس طرح محسوس کیا، جیسے سفید گرما گرم سٹیل انڈیلا جا رہا ہے۔ ایسیٹی لین سے اٹھنے والے شعلے میری ٹانگوں پر نشانات چھوڑ گئے۔ میں نے مینجرز کو۔۔۔۔ ہرلحہ، ہر مزدور کو اس کی اپنی جگہ پر کام پر توجہ دلاتے دیکھا۔ یہ سفید پوش لوگ بھی اپنے افسران بالا کی عقابی نظروں کا ہمہ وقت شکار رہتے تھے۔ میں نے ایک دفعہ ایک پینسٹھ سالہ بوڑھی عورت کو خون آلود مشین سے نکالنے میں مدد کی، جس کے ہاتھ کی صرف چار انگلیاں ضائع ہوئی تھیں۔ آج بھی میرے کانوں میں اس کی چیخیں سنائی دیتی ہیں۔''اف میرے خدا! میں کبھی دوبارہ کام کرنے کے قابل نہیں ہوسکوں گی!''

فیکٹری زندہ باد فیکٹری! آج بھی نئی فیکٹریاں بن رہی ہیں لیکن انہیں عبادت گاہ کا درجہ دینے والی تہذیب دم توڑ رہی ہے اور دور کہیں عین اسی وقت بہت سے نوجوان مرد اورعورتیں ابھرتی ہوئی تیسری لہر کی تہذیب کے مرکز کی جانب راتوں رات محوسفر ہیں۔ ہمارا کام اب یہ ہے کہ ہم ان کے ساتھ جا ملیں کیونکہ وہ آنے والے کل کے متلاشی ہیں۔

اگر ہم ان کی منزلوں تک ان کا تعاقب کریں تو ہم کہاں جا پہنچیں گے؟ کیا ان لانچنگ سٹیشنوں پر، جہاں سے شعلوں میں بھڑکتی گاڑیوں اور انسانی شعور کے اجزاء کوخلاء کی جانب بھیجا جاتا ہے؟ کیا سمندری تحقیقات پر مامور لیبارٹریوں میں؟ کیا قبائلی گھرانوں میں؟ کیا مصنوعی ذہانت کے ساتھ سرگرم ٹیموں میں؟ جذباتی مذہبی فرقوں میں؟ کیا وہ رضا کارانہ سادگی میں زندگی گزار رہے ہیں؟ کیا وہ ایک مربوط زینے پر چڑھ رہے ہیں؟ کیا وہ دہشت گردوں گ پرحملہ آور ہیں؟ مستقبل کی تربیت وتشکیل کہاں ہو رہی ہے؟

اگر ہم مستقبل کی سیاحت کا اسی سے مماثل پروگرام بنا رہے ہوتے تو ہم اپنے

نقشے کس طرح تیار کرتے؟ یہ کہنا بہت آسان ہے کہ مستقبل حال ہی میں سے شروع ہوتا ہے۔لیکن کونسا حال؟ ہمارا حال تو متضاد اور متصادم نظریات کے ہاتھوں تباہی کے کنارے پر ہے۔

ہمارے بچے منشیات،جنس اور خلائی نشانہ بازی کے متعلق بڑا پر تکلف انداز رکھتے ہیں۔بعض بچے کمپیوٹرز کے بارے میں، اپنے والدین سے زیادہ جانتے ہیں۔ پھر بھی تعلیمی امتحانات میں انکے نمبر کوئی خاص نہیں ہوتے۔ طلاق کی شرح بڑھتی جا رہی ہے۔لیکن دوبارہ شادی کا رواج بھی بڑھ رہا ہے۔خواتین مخالف تحریک عین اس وقت نمودار ہوتی ہے جب عورتیں اپنی، حقوق کی جنگ جیتتی ہیں اور ان حقوق کو خواتین مخالف تحریک بھی تسلیم کرتی ہے۔ ہم جنسیت زدہ مرد اپنے حقوق طلب کرتے ہیں اور اپنے خلوت کدوں سے اس طرح برآمد ہوتے ہیں جیسے صرف انیتا برائنٹ کو تلاش کرنا ہے، جو ان کی راہ میں آنکھیں بچھائے، ان کی منتظر ہے۔

دوسری لہر کی تمام قومیں بے لگام افراط زر کے شکنجے میں ہیں اور پھر بھی بے روز گاری۔۔۔ ہمارے سارے کلاسیکی نظریات کے باکل برعکس۔۔۔ بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ اسی دوران، رسد اور طلب کے اصول سے قطعی الٹ، لاکھوں لوگ محض نوکریاں ہی نہیں چاہ رہے، بلکہ ایسا کام ان کی ضرورت ہے جو تخلیقی، نفسیاتی طور سے کار آمد اور سماجی طور پر ذمہ دارانہ ہو۔ معاشی تضادات حد سے بڑھتے جا رہے ہیں۔

سیاست میں جماعتیں اپنے ارکان کی ہمدردی سے اس نازک موقع پر محروم ہو رہی ہیں جبکہ بنیادی مسائل۔۔۔ ٹیکنالوجی، مثال کے طور پر۔۔۔ ہمیشہ سے کہیں زیادہ سیاسی رنگ میں نظر آ رہے ہیں۔ اسی دوران زمین کے طور وعرض میں، قومی تحریکیں مضبوط ہو رہی ہیں۔۔۔ حالانکہ عین اسی عرصے میں گلوبلزم کے نام پر یا ارضی شعور کی وجہ سے، قومی ریاستیں شدید حملوں کی زد میں ہیں۔ اتنے سارے تضادات سامنے پا کر ہم رجحانات اور مزاحم رجحانات کے پیچھے کیا تلاش کر سکتے ہیں؟ صد افسوس، اس سوال کا جواب کسی کے پاس بھی نہیں۔ مستقبل میں جھانکنے کی ہماری تمام تر کوششیں یا آج ہی کی توضیح اور عنویت کی تلاش۔۔۔ تمام تر کمپیوٹر پرنٹ آوٹس، ڈایا گرامز کے جھرمٹ، ریاضیات ماڈلز اور سانچے

(Martices)اور جو کچھ بھی مستقبل کا تجزیہ کرنے والے استعمال کرتے ہیں، کے باوجود۔۔۔۔سائنسی سے کہیں زیادہ فنی مشق لگتی ہے۔

منضبط ریسرچ، ہمیں بہت کچھ سکھا سکتی ہے۔لیکن آخر میں ہمیں پیچیدگی، تضاد، انچ پیچ، تخیل اور جرات سے معمور نئی اجزائی ترتیب کومسترد کرنے کی بجائے آزمائشی طور پر ہی سہی انہیں تسلیم کر لینا چاہیئے۔

مستقبل کے متعلق جاننے کے لئے ہمیں اسی لئے آئندہ صفحات میں، اہم رجحانات کی پہچان سے زیادہ کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔کام ذرا مشکل تو ہے مگر ہمیں خطوط مستقیم کے بہکاوے کے خلاف بھر پور مزاحمت کرنا ہے۔ بہت سے لوگ۔۔۔۔بشمول مستقبل پر کام کرنے والوں کے۔۔۔۔آنے والے کل کو، آج ہی کی محض ایک توسیع سمجھتے ہیں۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ رجحانات، چاہے بظاہر کتنے ہی طاقتور کیوں نہ ہوں، صرف تناظری انداز میں ہی جاری وساری نہیں رہتے۔ وہ حتمی نکات تک پہنچتے ہیں، جہاں وہ پھٹ کر نئے مظاہر کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ وہ اپنا رخ بدل لیتے ہیں۔ وہ رک جاتے ہیں اور شروع ہو جاتے ہیں۔ چونکہ کوئی چیز اب وقع پذیر ہو رہی ہے یا تین سو سال سے وقوع پذیر ہے، اس کے باوجود اس کی کوئی گارنٹی نہیں کہ وہ مسلسل رواں رہے گی۔ ہم اگلے صفحات میں مختصراً انہی تضادات، مزاحمتوں، موڑوں اور انقطاعی نکتوں پر توجہ دیں گے، جو مستقبل کو مسلسل حیران کن بناتے ہیں۔

اس سے زیادہ اہم، ہم واقعات کے مخفی باہمی ربط تلاش کریں گے جو بظاہر غیر متعلقہ ہیں۔سیمی کنڈکٹرز یا توانائی کے مستقبل کے بارے میں یا خاندان (چاہے وہ اپنا ہی خاندان کیوں نہ ہو) کے مستقبل کے متعلق پیش گوئی کرنے کا کیا فائدہ،اگر پیش گوئی اس تمہید سے شروع ہو: بشرطیکہ باقی تمام چیزیں بدستور (غیر متبدل) رہیں۔ کیونکہ کوئی چیز بھی تبدیل ہوئے بغیر نہیں رہے گی۔ مستقبل منجمد نہیں، سیال ہے۔ یہ ہمارے ادھر ادھر ہونے اور روز مرہ تبدیل ہوتے فیصلوں سے تعمیر ہوتا ہے اور ہر واقعہ دوسروں پر اثر انداز ہوتا ہے۔

دوسری لہر کی تہذیب نے، مسائل کے مختلف اجزاء کو الگ الگ کرنے میں ہماری اہلیت پر انتہائی زور دیا، حالانکہ ان اجزاء کو دوبارہ باہم جوڑنے میں، ہماری اہلیت کا عموماً

خاصا کم معاوضہ دیا گیا۔ اکثر لوگ ثقافتی طور پر بہتر تجزیہ نگار تو ہو سکتے ہیں مگر اجزاء کو نئی ترتیب نہیں دے سکتے۔ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے مستقبل کے خاکے (اور اس مستقبل میں خود ہمارا اپنا آپ) اتنے شکستہ، الٹے سیدھے اور۔۔۔۔ غلط ہوتے ہیں۔ ہمارا کام یہاں یہ ہوگا کہ ہم تخصیص کار بننے کی بجائے عمومیت پسندوں کی طرح سوچیں۔

آج مجھے یقین ہے کہ ہم اجزائی ترتیب کے ایک نئے دور کے کنارے پر کھڑے ہیں۔عقل و آگہی کے تمام میدانوں میں طبعی سائنسی میدانوں سے لے کر، عمرانیات، نفسیات، اور معاشیات تک۔۔۔۔ معاشیات میں خصوصاً ہمیں، جلد ہی وسیع پیمانے کی سوچ، عمومی نظریئے اور اجزاء کو دوبارہ یکجا کرنے کی جانب مراجعت نظر آئے گی۔ کیونکہ ہم پر اب یہ واضح ہونا شروع ہوا ہے کہ سیاق وسباق کے بغیر مقداری تفصیلات پر اور بتدریج چھوٹے سے چھوٹے مسائل کی لطیف سے لطیف پیمائش پر، ہمارے حد سے زیادہ ارتکاز نے ہمیں کم سے کم کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کا موقع دیا۔

آئندہ کیا ہونے والا ہے اس کے متعلق ہمارا طریق کار یہ ہوگا کہ تبدیلی کی ان ندیوں کو جو ہماری زندگیوں کو بری طرح لرزہ براندام کر رہی ہیں، تلاش کریں۔ ان کے باہم مخفی رابطوں کو منکشف کریں، صرف اس لئے نہیں کہ ان میں سے ہر ایک بذات خود اہم ہے، بلکہ اس لئے کہ تبدیلی کی یہ ندیاں، زیادہ بڑے، زیادہ گہرے اور زیادہ تیز تبدیلی کے دریاؤں کی شکل اختیار کرنے کے لئے اکٹھی بہ رہی ہیں اور بعد ازاں اس سے بھی بڑی کسی شکل۔۔۔۔تیسری لہر۔۔۔۔ میں رواں دواں ہونگی۔

اس نوجوان آدمی کی طرح جو صدی کے وسط میں حال کا دل تلاش کرنے کے لئے سفر پر روانہ ہوا تھا، اب ہم مستقبل کے لئے اپنی تلاش کا آغاز کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ تلاش ہماری زندگی میں انتہائی اہمیت کی حامل ہو۔

MashalBooks.org

باب 11

عظیم الشان رفعتیں

8اگست 1960ء کو، مغربی ورجینیا میں جنم لینے والے۔ ایک کیمیکل انجینئر مونرورتھبون نے مین ہٹن کے بلند و بالا راک فیلر پلازہ میں اپنے آفس میں بیٹھے ہوئے ایک ایسا فیصلہ کیا جسے ممکن ہے مستقبل کے مورخین دوسری لہر کے خاتمے کے سمبل کے طور منتخب کرنا پسند کریں۔ جس دن ایکسون کارپوریشن کے چیف ایگزیکٹورتھ بون نے، تیل پیدا کرنے والے ممالک کو دیئے جانے والے، ٹیکس کی شرح میں کٹوتی کے اقدامات اٹھائے۔ کسی نے بھی اس پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ مغربی پریس نے اس کے فیصلے کو ضرور نظر انداز کیا مگر ان ملکوں کی حکومتوں میں اس کی وجہ سے زبردست لرزہ طاری ہو گیا کیونکہ ان کے ذرائع آمدنی کا انحصار ہی ان آئل کمپنیز کی ادائیگیوں پر تھا۔

چند ہی دنوں میں تیل کی دوسری بڑی کمپنیوں نے بھی ایکسون کی پیروی کر ڈالی۔ ایک ماہ بعد، نوستمبر کو بغداد کے قدیم شہر میں، شدید متاثرہ ممالک کے نمائندوں کی ایمرجنسی کونسل کا ایک اجلاس ہوا، جس میں انہوں نے تیل پیدا کرنے والے ممالک کی کمیٹی تشکیل دی۔ تقریباً اگلے تیرہ سال تک اس کمیٹی کی سرگرمیوں، حتیٰ کہ اس کے نام تک پر، معدودے چند تیل کی صنعت سے متعلق جریدوں کے سوا، کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ 1973ء میں جب یام کپر جنگ شروع ہوئی تو اوپیک (OPEC) اچانک دھندلکوں سے باہر نکل آئی۔ کروڈ آئل کی عالمی سپلائی بند کر کے اس نے دوسری لہر کی ساری معیشت کو لرزہ براندام کر دیا۔

اوپیک نے اپنی تیل کی آمدنی کو چار گنا بڑھانے کے علاوہ، ایک ایسے انقلاب کو مہمیز دے دی جو پہلے ہی دوسری لہر کے تکنیکی دائرے میں جڑیں پکڑ رہا تھا۔

MashalBooks.org

سورج اور اس کے مابعد

توانائی کے بحران پر کان پھاڑ دینے والے شور شرابے کے دوران اتنے زیادہ منصوبوں، تجاویز، استدلال اور جوابی استدلال کا ڈھیر ہمارے پاس لگ گیا کہ ان میں سے معقول انتخاب ہی مشکل ہے۔ حکومتیں خود بھی الجھنوں کا اتنا ہی شکار ہیں، جتنا سڑک پر چلتا ہوا ایک عام آدمی، اس دھندلاہٹ کو صاف کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ انفرادی ٹیکنالوجیز اور حکمت عملی کے اندر موجود اصولوں سے بھی آگے نظر ڈالنے کی کوشش کی جائے۔ ایک بار کی اس کوشش سے پتہ یہ چلتا ہے کہ بعض پالیسیاں، توانائی پر مبنی دوسری لہر کی توسیع کو قائم رکھنے کے لئے تشکیل دی جاتی ہیں، جبکہ بعض نئے اصولوں پر تکیہ کرتی ہیں۔ نتیجتاً توانائی کے تمام مسئلے کی انقلابی وضاحت سامنے آ جاتی ہے۔ دوسری لہر کی توانائی کی بنیاد ہی اس مفروضے پر تھی کہ وہ نا قابل احیا ہے۔ اسے بے پناہ مرتکز مگر ختم ہونے والے ذخیروں سے نکالا گیا۔ اس کا انحصار مہنگی اور بری طرح مرکوز ٹیکنالوجیز پر تھا۔ یہ غیر متبدل تھی اور اس کا نسبتاً کم وسائل اور طریقوں پر تکیہ تھا۔ صنعتی عہد کے دوران، دوسری لہر کی تمام قوموں میں توانائی کی بنیاد کی یہی بنیادی خصوصیات تھیں۔

ان چیزوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے، تیل کے بحران کے نتیجے میں پیدا شدہ منصوبوں اور تجاویز کا جائزہ لیا جائے تو ہم فوراً یہ جان سکتے ہیں کہ کون سے منصوبے پرانے نظام کی محض توسیع ہیں اور کون سے بنیادی طور پر کسی نئی چیز کے پیش رو ہیں۔ یہاں بنیادی سوال یہ نہیں رہتا کہ تیل کو چالیس ڈالر فی بیرل بکنا چاہئے یا سی بروک یا گرونڈی میں نیوکلیئر ری ایکٹر تعمیر ہونا چاہئے۔ زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ آیا صنعتی معاشروں کے لئے ڈیزائن کردہ اور دوسری لہر کے اصولوں پر مرتب شدہ توانائی کی بنیاد اپنا وجود برقرار رکھ سکتی ہے۔ اس صورت میں سوال پوچھا جائے تو اس کا جواب ناگزیر ہو جاتا ہے۔ گذشتہ نصف صدی کے دوران پوری دنیا توانائی کی دو تہائی حصہ آئل اور گیس سے آیا ہے۔ آج کے اکثر اہل نظر، جنونی قدامت پسندوں سے لے کر معزول شاہ ایران تک، شمسی عجوبوں اور سعودی شیخوں سے مختلف حکومتوں کے سوٹڈ بوٹڈ، بریف کیس اٹھائے ہوئے ماہرین تک، سب ہی متفق ہیں کہ زیر زمین ایندھن پر زیادہ عرصہ انحصار نہیں کیا جا سکتا، چاہے کتنے ہی نئے آئل فیلڈ کیوں

MashalBooks.org

نہ دریافت کر لئے جائیں۔

اعداد وشمار بدلتے رہتے ہیں۔ جھگڑے بھی چلتے رہتے ہیں کہ دنیا کتنا عرصہ اور یہ وسائل چلا لے گی۔ پیش گوئی کی اپنی لا تعداد پیچیدگیاں ہیں اور بہت گذشتہ پیش گوئیاں اب بالکل احمقانہ لگتی ہیں۔ بہر حال ایک چیز واضح ہے۔ کوئی بھی تیل اور گیس کو دوبارہ زمین میں نہیں بھر رہا تا کہ وہاں اس کی وافر رسد موجود رہے۔

ان وسائل کا خاتمہ، کسی ماحولیاتی غرغر کی صورت میں ہو یا غالباً پریشان کن نا ہموار قلتوں کے تسلسل، عارضی افراط سے یا زبردست پیداواری قلت سے، تیل کا زمانہ بہر حال ختم ہو رہا ہے۔ ایرانیوں کو، نائیجریا والوں، وینزویلا والوں اور سعودیوں، سب کو یہ پتہ ہے۔۔۔۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تیل کی آمدنی کے بجائے، اپنی معیشت کسی اور بنیاد پر استوار کرنے کے لئے بھاگ دوڑ کر رہے ہیں۔ پٹرولیم کمپنیوں کو بھی اس کا علم ہے، اسی وجہ سے وہ تیل کی صنعت سے باہر نکلنے کے لئے پر تول رہے ہیں۔ (ٹوکیو میں کچھ ہی عرصہ پہلے ایک آئل کمپنی کے صدر نے عشائیے کے دوران مجھے بتایا کہ اس کی رائے میں تیل کے موجود دیو، ریلوے نظام کی طرح، جلد ہی صنعتی ڈائنوسارس بن جائیں گے۔ اس کے نظام الاوقات میں۔۔۔۔ عشرے نہیں، کچھ سال کا۔۔۔۔ صرف سانس لینے کا وقفہ موجود تھا۔

بہر حال قدرتی وسائل کے اخراج پر بحث وتمحیص اب مرکزی نقطہ نہیں رہی۔ کیونکہ آج کی دنیا میں مادی رسد کی بجائے، قیمت وہ چیز ہے جس کا فوری اور واضح اثر ہوتا ہے اور یہاں بھی حقائق زیادہ شدت سے اسی نتیجے کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔

ممکن ہے اگلے کچھ عشروں میں توانائی کی افراط ہو جائے اور وہ سستی بھی ہو۔ وجہ اس کی چاہے کوئی حیرت انگیز ٹیکنالوجیکل پیش رفت ہو یا معاشی اتار چڑھاؤ۔ چاہے کچھ بھی ہو تیل کی قیمتیں اسی طرح چڑھتی رہیں گی۔ وجوہ ظاہر ہیں زمین کے اندر زیادہ سے زیادہ گہرائی تا جانا، زیادہ دور دراز کے علاقوں میں اس کی تلاش اور نسبتاً زیادہ خریداروں کا باہمی مقابلہ۔ اوپیک کو ایک طرف رکھتے ہوئے، پچھلے پانچ سال میں ایک اور تاریخی تبدیلی آئی ہے۔ میکسیکو میں نئے وسیع ذخائر کی دریافت اور بے تحاشا بڑھتی ہوئی قیمتوں کے باوجود، کروڈ آئل کے مصدقہ تجارتی طور پر حاصل ہونے والے ذخائر کی حقیقی مقدار بجائے بڑھنے

MashalBooks.org

کے اور گھٹ گئی ہے۔۔۔کئی عشرے تک جاری رہنے والا رجحان الٹی سمت رواں ہو گیا ہے۔مزید ثبوت، اگر ضروری ہو تو، کہ تیل کا زمانہ اب گیا کہ گیا۔

اسی دوران کوئلہ۔۔۔جو دنیاوی توانائی کا ایک تہائی کے قریب رسد دیتا رہا ہے، بے پناہ مقدار میں موجود ہے، یہ اور بات کہ بالآخر اسے بھی ختم ہو جاتا ہے۔کوئلے کے استعمال میں وسیع پیمانے کا اضافہ، ہوا کہ خراب کر کے، دنیاوی ماحول کو ممکنہ نقصانات پہنچا سکتا ہے بلکہ (فضا میں کاربن ڈائی آکسائیڈ میں اضافہ کے ذریعے) دنیا ہی کو تباہ و برباد کر سکتا ہے اور بالفرض محال اگلے کچھ عشروں کے لئے، انہیں ضروری خطرات سمجھ کر قبول بھی کر لیا جائے تو بھی کوئلہ کسی گاڑی کے ٹینک میں فٹ نہیں ہوسکتا اور نہ ہی اور بہت سی جگہوں پر جہاں آج کل تیل اور گیس کا کام کر رہے ہیں، اس کا استعمال ممکن ہے۔کوئلے کو گیس یا سیال کی شکل دینے والے پلانٹس کے لئے سرمایہ اور پانی (اس کا زیادہ حصہ زراعت کے لئے چاہئے) کی ریل پیل چاہئے، پھر بھی ان کی غیر مستعد کارکردگی اور مہنگے پن کی وجہ سے، انہیں انتہائی گراں تفریح طبع کے لئے، ایک وقتی مہم جوئی سے زیادہ اہمیت نہیں دی جا سکتی۔

جوہری توانائی کو اس کی ترقی کے موجودہ مراحل میں، اور وہ بھی زیادہ خوفناک مسائل در پیش ہیں۔روایتی ری ایکٹرز یورینیم پر انحصار کرتے ہیں۔یورینیم خود بھی ختم ہو جانے والا ایندھن ہے اور اس کے تحفظ میں بے پناہ رسک شامل ہیں، جن پر قابو پانا۔۔۔اگر حقیقت میں ان پر قابو پایا جا سکے۔۔۔خود بھی بے پناہ مہنگ سودا ہے۔کوئی بھی جوہری فضلے کی ڈسپوزل کا شافی حل تلاش نہیں کر سکا اور جوہری اخراجات اتنے زیادہ ہیں کہ حکومتیں لازمی سب سڈی دے دے کر دوسرے وسائل کے مقابلے میں جوہری توانائی کو کسی حد تک ہی متوازن کر سکتی ہیں۔

تیز پیداواری ری ایکٹرز خود تو بہترین ہیں لیکن جب کبھی انہیں بے خبر عوام کے سامنے مسلسل متحرک مشینوں کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔۔۔کیونکہ ان کا استعمال شدہ پلوٹونیم بھی ایندھن کے طور پر استعمال ہوسکتا ہے۔۔۔تو پتہ چلتا ہے کہ یہ بھی بالآخر معمولی سی ناقابل احیا یورینیم کی زمینی رسد کی محتاج ہیں۔یہ نہ صرف بہت زیادہ مرتکز، ناقابل یقین

MashalBooks.org

حدتک گراں، کافورطبع اوخطرناک ہیں بلکہ جوہری جنگ اور جوہری سازوسامان کے دہشت گردوں کے ہتھے چڑھ جانے کے خطرات کو بھی بڑھا دیتی ہیں۔

ان سب باتوں کا یہ مفہوم قطعاً نہیں کہ ہم دوبارہ زمانہ وسطی میں پھینکے جانے والے ہیں یا مزید معاشی پیش رفت ناممکن ہوگئی ہے۔لیکن اس کا یہ مطلب بہرحال ہے کہ ہم ایک خط ارتقاء کے اختتام پر آ گئے ہیں اور اب ہمیں دوسرے خط ارتقاء کا آغاز کرنا چاہیئے۔مقصد یہ ہے کہ دوسری لہر کی توانائی کی بنیاد نا قابل استعمال ہوتی جا رہی ہے۔

درحقیقت اس کی ایک اور بنیادی وجہ بھی ہے کہ دنیا کو کیوں ایک انقلابی اور نئی توانائی کی بنیاد لازماً درکار ہے اور یہ اس کی طرف شفٹ ہو گی کیونکہ کسی بھی توانائی کی بنیاد کے لئے، چاہیئے وہ ایک گاؤں کے لئے ہو یا صنعتی معیشت کے لئے ضروری ہے، کہ وہ معاشرے کی ٹیکنالوجی کی سطح، پیداوار کی نوعیت، منڈیوں کی تقسیم کار، آبادی اور بہت سے دوسرے عوامل سے لازمی مطابقت رکھتی ہو۔

دوسری لہر کی توانائی کی بنیاد کی اٹھان، ایک نئی ٹیکنالوجیکل ارتقائی مرحلے کی جانب معاشرے کی پیش رفت کے ساتھ منسلک تھی اور جب زیر زمین ایندھن نے ٹیکنالوجی کی نشوونما کو تیز رفتار کیا تھا تو اس کا معکوس عمل بھی بالکل سچ ہوگا۔توانائی کی پیاسی، ہوس پرست ٹیکنالوجی کی ایجاد نے صنعتی عہد کے دوران زیر زمین ایندھن کے تیز اور بے مہابا استعمال کو مہمیز لگا دی۔ گاڑیوں کی صنعت کی ترقی نے، مثال کے طور پر آئل کے کاروبار میں، اتنی انقلابی وسعت پیدا کر دی کہ ایک زمانے میں وہ صرف ڈیٹرائٹ کامحتاج ہوکر رہ گیا تھا۔ایک تیل کمپنی کے سابقہ ڈائریکٹر ڈونلڈ ای کار کے الفاظ میں۔۔۔ جو توانائی اور زمینی مشین کے مصنف بھی ہیں: پٹرولیم کی صنعت ''اندرونی مشتعل انجن کی ایک شکل کی غلام'' بن کر رہ گئی۔

آج ہم ایک بار پھر ایک تاریخی ٹیکنالوجیکل جست کے کنارے پر ہیں۔ اس ابھرتے ہوئے نئے پیداواری نظام کو توانائی کے تمام معاملات میں انقلابی تعمیر نو درکار ہوگی، بے شک اوپیک کو اپنے خیمے لپیٹ کر کہیں روپوش ہونا پڑے۔ ایک اور بہت بڑی حقیقت نظر انداز ہو رہی ہے کہ توانائی کا مسئلہ صرف مقداری نوعیت کا نہیں بلکہ اس کی ساخت کا

MashalBooks.org

بھی ہے۔ ہمیں نہ صرف توانائی کی ایک خاص مقدار چاہئے بلکہ زیادہ مختلف (تبدیل شدہ)صورتوں میں، مختلف اور بدلتے ہوئے مقامات پر، دن رات اور سال کے مختلف اوقات میں اور نامعلومام نا خوابیدہ مقاصد کے لئے درکار ہے۔ یہ ہیں وہ وجوہات۔۔۔۔ صرف اوپیک کا قیمتیں بڑھانے کا فیصلہ ہی نہیں ۔۔۔۔ جو توانائی کے پرانے نظم کے بجائے، نئے متبادل کی تلاش کی وضاحت کرتی ہیں۔ تلاش کی رفتار خاصی تیز ہے اور اب مسئلے کے حل کے لئے نئے اور وسیع مالی اور تصوراتی وسائل بروئے کار لا رہے ہیں۔ نتیجے کے طور پر مختلف حیرت انگیز امکانات کا بغور جائزہ لیا جا رہا ہے۔ توانائی کی بنیاد کو، دوسری بنیاد کی جانب شفٹ کرتے ہوئے، معاشی اور دوسری عظیم تبدیلیوں کی وجہ سے اندھیرا تو لاحمالہ ہوگا لیکن اس کا ایک اور کہیں زیادہ مثبت پہلو بھی ہے۔ تاریخ میں ایسا کبھی نہیں کہ اتنے سارے لوگ بڑے جوش و جذبے سے توانائی کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے ہوں۔۔۔۔ اور نہ ہی اس سے پہلے کبھی اتنے شاندار اور ہیجان انگیز کارآمد امکانات ہمارے سامنے تھے اس مرحلے پر یہ معلوم کرنا قطعی ناممکن ہے کہ ٹیکنالوجیز کا کونسا میل، کن مقاصد کے لئے زیادہ مفید ثابت ہوگا۔ لیکن ہمارے پاس دستیاب آلات اور ایندھنوں کی ایک لمبی مضطرب قطار، زیادہ سے زیادہ تحیر خیز امکانات اپنے دامن میں سمیٹے یقیناً موجود ہوگی جو تیل کی قیمتیں اوپر جانے کے ساتھ ساتھ، تجارتی طور پر قابل قبول ہو جائے گی۔ ان امکانات کی حدود عکسی برقی بیٹری (Photovoltaic Cells) سے، جو شمسی روشنی کو بجلی میں تبدیل کر دیتے ہیں۔۔۔۔ (ایک توانائی جس پر ٹیکساس انسٹرومنٹس شمسی توانائی کی اختراعی کمپنی اور کئی دوسری کمپنیاں تحقیق کر رہی ہیں)۔۔۔۔سوویت بادبانی مل کے منصوبے تک ہیں، جو اسے کرہ ہوائی میں رکھ کر غباروں سے مربوط کر کے بجلی کی روشنی کو بذریعہ کیبلز زمین تک پہنچائے گی۔ نیویارک شہر نے گاربیج (کوڑا کرکٹ کو ایندھن کے طور پر جلانے کا ٹھیکہ ایک نجی کمپنی کو دیا ہے اور فلپائنی جزیرے ناریل کے بے کار حصوں سے بجلی پیدا کرنے کے پلانٹس تعمیر کر رہے ہیں۔ اٹلی، آئس لینڈ اور نیوزی لینڈ پہلے ہی زمینی حرارت کے وسائل۔۔۔۔ زمین کی اپنی حرارت کا اخراج۔۔۔۔ سے بجلی پیدا کر رہے ہیں، جبکہ جاپان میں ہوشو جزیرے کے قریب تیرتا ہوا پانچ سوٹن وزنی پلیٹ فارم لہری طاقت سے بجلی بنا رہا

ہے۔ دنیا بھر میں ہر جگہ چھتوں پر شمسی حرارت پیدا کرنے والے یونٹ پھیلتے جا رہے ہیں اور جنوبی کیلے فورنیا ایڈیسن کمپنی ایک ''مینار قوت'' تعمیر کر رہی ہے جو کمپیوٹر سے منضبط آئینوں کے ذریعے، شمسی توانائی کو قابو کر کے، ایک مینار پر جس میں سٹیم بوائلر موجود ہو گا، فوکس کرے گی اور اس طرح اپنے مستقل گاہکوں کے لئے بجلی پیدا کرے گی۔ سٹوٹ گرٹ، جرمنی میں ڈیملر بینز کی تیار کردہ بس، ہائیڈروجن کی قوت سے شہر کی سڑکوں پر بھاگتی دوڑتی نظر آ رہی ہے۔ جبکہ لاک ہیڈ، کیلے فورنیا میں انجینئرز ہائیڈروجن کی قوت سے چلنے والا ہوائی جہاز بنانے میں لگے ہوئے ہیں۔ تلاش اتنی کثیر الجہت ہے کہ تھوڑی سی جگہ میں ان کا مناسب تذکرہ ناممکن ہے۔

جب ہم توانائی پیدا کرنے کی نئی ٹیکنالوجیز کو، توانائی کو سٹور کرنے اور ترسیل کے نئے طریقوں کے ساتھ ملاتے ہیں تو امکانات اور بھی روشن تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ جنرل موٹرز نے برقی کاروں میں استعمال کے لئے ایک نئی زیادہ کارگر آٹوموبیل بیٹری بنائی ہے۔ ناسا کے محققین نے ''ریڈاکس'' کے نام سے ایک سٹوریج سسٹم بنایا ہے جو ان کے یقین کے مطابق روایتی لیڈ ایسڈ بیٹریز سے صرف ایک تہائی اخراجات پر بن سکتا ہے۔ طویل وقتی تناظر میں ہم عظیم حری میلانیت(Super Conductivity)اور یہاں تک کہ۔۔۔۔''قابل احترام'' سائنس کی حدود سے بھی آگے۔۔۔۔ ٹیسلا لہروں کو کم سے کم نقصان کے ساتھ، شعاعی توانائی کی رہ گزر بنانے پر تحقیق اور جستجو میں لگے ہوئے ہیں۔

ان میں سے زیادہ تر ٹیکنالوجیز ابھی ارتقاء کے ابتدائی مرحلوں میں ہیں اور ان میں سے بہت سی بلاشبہ ناقابل عمل ثابت ہونگی۔ تاہم کئی ایک واضح طور پر تجارتی استعمال کے لئے تیار ہیں یا ایک دوعشروں میں عام مستعمل ہونگی۔ یہ نظر انداز حقیقت بہت اہم ہے کہ بہت بڑی پیش رفت کسی تن تنہا ٹیکنالوجی کے ذریعے نہیں ہوتی بلکہ بہت سی ٹیکنالوجیز کی خیال انگیز یکجائیت یا آمیزش کی مرہون منت ہوتی ہے۔ ممکن ہے ہم یہ مشاہدہ کریں کہ عکسی برق بیٹری بجلی پیدا کرنے میں استعمال ہو جو جواباً پانی سے ہائیڈروجن حاصل کرنے میں استعمال کی جائے تاکہ اس ہائیڈروجن کو کاروں میں استعمال کیا جا سکے۔ آج ہم ابھی تک اڑان شروع کرنے کی سطح سے پیچھے ہیں۔ ایک دفعہ ہم ان بہت سی نئی ٹیکنالوجیز کو باہم ملانا

شروع کر دیں تو زیادہ واضح مواقع، اپنی تمامتر تصریح کے ساتھ، سامنے آئیں گے اور ہم انتہائی ڈرامائی انداز میں تیسری لہر کی توانائی کی بنیاد کی تعمیر اور تیز کر دیں گے۔

اس نئی بنیاد کی خصوصیات دوسری لہر کے زمانے کی توانائی کی بنیاد سے واضح طور پر بہت مختلف ہونگی کیونکہ اس کی زیادہ تر رسد ختم ہو جانے والے وسائل کے بجائے قابل احیا وسائل سے حاصل ہو گی۔ بہت زیادہ مرتکز ایندھنوں پر انحصار کرنے کے بجائے یہ وسیع منتشر وسائل کی کئی اقسام سے توانائی حاصل کرے گی۔ شدید مرتکز ٹیکنالوجیز پر بہت زیادہ انحصار کرنے کی بجائے یہ توانائی کی مرتکز اور غیر مرتکز دونوں پیداواروں کو آپس میں ملا دے گی۔ اور مٹھی بھر طریقوں یا وسائل پر خطرناک حد تک اعتبار کرنے کے بجائے یہ شکلاً انقلابی حد تک مختلف نوعیت کی ہو گی یہی بوقلمونی۔۔۔ بڑھتی ہوئی مختلف ضروریات کے ساتھ پیدا شدہ توانائی کی اقسام اور کوالٹی کے موازنے کی ہمیں اجازت دے کر۔۔۔ تقصانات کو بہت حد تک کم کر دے گی۔

مختصراً اب ہم پہلی بار توانائی کی ایک ایسی بنیاد کا خاکہ دیکھ سکتے ہیں جو حالیہ گزرے ہوئے تین سو سال کے اصولوں کے بالکل برعکس، قریب قریب قطری شکل کے اصولوں پر گامزن ہوتی ہے۔ واضح رہے کہ تیسری لہر کی توانائی کی یہ بنیاد ایک تلخ معرکے کے بغیر وجود میں نہیں آ سکتی۔

خیالات اور پیسے کی اس جنگ میں جو پہلے ہی اعلیٰ ٹیکنالوجی کی حامل تمام اقوام میں بھڑکی ہوئی ہے، دو کے بجائے تین حریفوں کی پہچان ممکن ہے۔ ابتداء دوسری لہر کی توانائی کی پرانی بنیاد میں، جن لوگوں کا مفاد پوشیدہ ہے، وہ توانائی کے روایتی وسائل اور ٹیکنالوجیز۔۔۔ کوئلہ، تیل، گیس، جوہری طاقت اور ان کے مختلف ادل بدل۔۔۔ کی بات کرتے ہیں۔ یہ لوگ درحقیقت دوسری لہر کے موجودہ نظام کی توسیع کے لئے لڑتے جھگڑتے ہیں اور چونکہ یہ لوگ آئل کمپنیوں، نفع بخش خدمات، جوہری اداروں، کان کنی کی کارپوریشنوں اور ان سے متعلقہ ٹریڈ یونینوں ٹھاٹھ سے بیٹھے ہیں، اس لئے دوسری لہر کی قوتیں بظاہر مستحکم اور منضبط نظر آتی ہیں۔

اس کے برعکس، تیسری لہر کی توانائی کی بنیاد کی طرف پیش قدمی کے حامی۔۔۔

صارفین، ماحولیاتی محافظوں، سائنس دانوں اور انتہائی ترقی یافتہ صنعتوں کے ناظموں کا امتزاج بعہ اپنے مختلف اتحادیوں کے۔۔۔۔منتشر مالی پریشانیوں کے شکار اور عموماً سیاسی طور پر بے اثر نظر آتے ہیں۔ دوسری لہر کے پراپیگنڈسٹ باقاعدگی سے انہیں سادہ لوح، ڈالر کے حقائق سے لاتعلق اور آسمانی ٹیکنالوجی سے بے پناہ مرعوب افراد کے طور پر پیش کرتے رہتے ہیں۔

اور بھی زیادہ بری بات یہ ہوتی ہے کہ تیسری لہر کے سرگرم حامی، ایسے گروہوں کے غوغا آرائی سے خاصے گڑ بڑا ہو جاتے ہیں، جنہیں غالباً پہلی لہر کی قوتوں کا نام دینا ہی سب سے موزوں رہے گا۔۔۔۔ وہ لوگ جو ایک نئے زیادہ دالنش ورانہ قابل برداشت اور سائنسی بنیادوں پر استوار نظام توانائی کی طرف پیش رفت کی بات کرنے کے بجائے صنعتی دور سے پہلے کے ماضی میں واپس لوٹ جانا چاہتے ہیں، اپنی انتہائی صورت میں ان کی پالیسیاں ٹیکنالوجی کے زیادہ تر حصے کو نیست و نابود کر دیں گی، نقل وحرکت محدود کر دیں گی، شہروں کو فنا کر دیں گی اور تحفظ کے نام پر راہبانہ ثقافت کو مسلط کر دیں گی۔

ان دونوں گروہوں کو یک جا کر کے دوسری لہر کے پر جوش لابیسٹ، ماہرین تعلقات عامہ اور سیاست دان عوامی پریشانی کو مزید گہرا کر کے تیسری لہر کی قوتوں کو مدافعانہ انداز اختیار کرنے پر مجبور کیے رکھتے ہیں۔ بہرحال فتح نہ پہلی لہر کے حامیوں کی ممکن ہے اور نہ ہی دوسری لہر کے ہم رکابوں کی کیونکہ پہلی قسم کے لوگ دقیانوسی خیالات سے چمٹے ہوئے ہیں اور دوسرا گروہ توانائی کی ایک ایسی بنیاد کو مستحکم رکھنا چاہتا ہے۔ جس کے مسائل نا قابل فہم بلکہ حقیقتاً عقدہ لاینحل ہیں۔

دوسری لہر کے ایندھن کے تیزی سے بڑھتے ہوئے اخراجات، انتہائی شدومد سے دوسری لہر کے مفادات کے خلاف کام کر رہے ہیں۔ دوسری لہر کی توانائی کی ٹیکنالوجیز پر، سرمایہ کاری کے لئے، آسمان کی بلندیوں کو چھوتے ہوئے اخراجات بھی اس کے مفاد میں نہیں۔ دوسری لہر کے طریق کار میں جدید حقیقی توانائی میں معمولی سے اضافے کے لئے عموماً توانائی کی بھاری مقدار درکار ہوتی ہے، یہ حقیقت بھی دوسری لہر کے مفاد کے خلاف ہے۔ آلودگی کے روز افزوں مسائل بھی ان کے خلاف کام کر رہے ہیں۔ ایٹمی خدشات ان کی

مخالفت میں ہیں۔ ایٹمی ری ایکٹرز، کانوں یا دیوہیکل پیداواری پلانٹس کو روکنے کی کوشش، میں بہت سے ملکوں کے ہزاروں افراد کی پولیس سے ٹکرا جانے کی خواہش بھی، ان کے مفادات کے خلاف کام کر رہی ہے۔ غیر صنعتی دنیا کی اپنی توانائی کے حصول کے لئے اور اپنے وسائل کے لئے بلند قیمتوں کی زبردست خواہش بھی ان کے مفادات کے خلاف ہے۔

مختصراً ایٹمی ری ایکٹرز یا کوئلے سے گیس کا حصول یا سیال ساز پلانٹس اور اسی طرح کی دوسری ٹیکنالوجیز بظاہر کتنی ہی اعلیٰ اور ترقی یافتہ نظر آئیں، درحقیقت وہ دوسری لہر کے تضادات سے بھر پور ماضی کی ہی کاریگری ہیں۔ ان میں سے بعض عارضی تدبیر کے طور پر، ضروری بھی ہوسکتی ہیں لیکن فی النفس یہ گزرے کل کی بازگشت ہیں۔ اسی طرح دوسری لہر کی قوتیں بظاہر طاقت ور اور تیسری لہر سے منسلک ان کے نقاد کمزور لگ سکتے ہیں لیکن ماضی پر بہت زیادہ تکیہ کرنا انتہائی بے وقوفی ہوگی۔ حقیقتاً مسئلہ یہ ہے ہی نہیں کہ کیا دوسری لہر کی توانائی کا خاتمہ ہو جائے گا یا کوئی نئی توانائی اس پر غالب آ جائے گی بلکہ مسئلہ یہ ہے کہ ایسا کتنی جلدی ہوگا کیونکہ توانائی کے معاملے پر جنگ میں، ایک اور مساوی اہمیت کی تبدیلی، مداخلت کار بن کر، درمیان میں آ گئی ہے اور وہ ہے، دوسری لہر کی ٹیکنالوجی کا خاتمہ۔

آلات مستقبل

کوئلہ، ریل، ٹیکسٹائل، فولاد، کاریں، ربڑ، مشینی آلات سے بننے والی اشیاء۔۔۔ یہ تھیں دوسری لہر کی کلاسیکل صنعتیں۔ سادہ برقی میکانکی اصولوں پر مبنی یہ صنعتیں بہت زیادہ توانائی استعمال کریں، مختلف طرح کے فضلے اور آلودگیاں خارج کرتیں۔ طویل پیداواری دورانیے، کام کی معمولی سوجھ بوجھ، مسلسل ایک ہی طرح کا کام، معیاری اشیاء اور زبردست مرکزی کنٹرول ان کی نمایاں خصوصیات تھیں۔ 1950ء کے عشرے کے وسط میں صنعتی قوموں میں ان صنعتوں کی پس ماندگی اور انحطاط پذیری واضح ہو چکی تھی۔ مثلاً امریکہ میں 1965ء سے 1974ء کے درمیان جب لیبر فورس میں 21% اضافہ ہوا تو ٹیکسٹائل میں ملازمت کے مواقع صرف 6% بڑھے جبکہ لوہے اور فولاد کی صنعتوں میں روزگار کے یہ مواقع 10% کم ہو گئے۔ سویڈن، چیکوسلواکیہ، جاپان اور دوسری لہر کی کئی اقوام میں بھی یہی صورت حال پیدا ہوئی۔ جیسے جیسے پرانی وضع کی یہ صنعتیں ان نام ونہاد ''ترقی پذیر'' ملکوں

میں منتقل ہونا شروع ہوئیں، جہاں ارزاں محنت دستیاب تھیں اور ٹیکنالوجی بھی کم ترقی یافتہ تھی۔۔۔۔ ان کا سماجی اثر ونفوذ بھی ختم ہونے لگا اور ان کی جگہ لینے کے لئے نئی اور متحرک صنعتوں کا ایک اور سیٹ ابھر کر سامنے آنے لگا۔

یہ نئی صنعتیں، اپنی پیش روصنعتوں سے، کئی لحاظ سے واضح طور پر مختلف تھیں۔ یہ صنعتیں نہ تو بنیادی طور سے برقی میکانکی خصوصیات کی حامل تھیں اور نہ ہی ان کی بنیاد دوسری لہر کے دور کی کلاسیکی سائنس پر تھی بلکہ انہوں نے سائنسی نظم وضبط سے پیدا شدہ ایسی تیز رفتار اور محیرالعقل دریافتوں کے جلو میں جنم لیا جو ابھی پچیس سال پہلے تک ادھوری، نامکمل یا غیر موجود تھیں۔۔۔۔ کوانٹم الیکٹرونکس، نظریہ اطلاعات، سالماتی حیاتیات، سمندری علم، جوہریات، اکالوجی، اور خلائی سائنسز۔۔۔۔ انہی کے ذریعے زمان ومکان کی ان واضح خصوصیات سے بھی آگے ہماری رسائی ممکن ہوئی، جن سے دوسری لہر کی صنعت نے اپنی مطلب براری کے لئے چولی دامن کا ساتھ بنا رکھا تھا۔ اس پیش رفت کا ذکر روسی ماہر طبعیات بی جی کزنٹیسوف نے یوں کیا ''بہت چھوٹے مکانی خطے جن کے جوہری مرکزے کا رداس تقریباً13-10 10 سینٹی میٹرز ہوتا ہے اور 28-10 سیکنڈ کے درجے کے لمحاتی وقفے۔''

ان نئے علوم اور ان کے استعمال میں ہماری حیرت انگیز صلاحیتوں نے کمپیوٹر اور ڈیٹا پراسسنگ، خلا بازی کی ٹیکنالوجی معیاری پٹروکیمیکلز، سیمی کنڈکٹرز، ترقی یافتہ ابلاغیات اور ان گنت دوسری نئی صنعتوں کو جنم دیا۔

امریکہ میں، جہاں دوسری لہر سے تیسری لہر کی ٹیکنالوجیز کی جانب، تبدیلی کا عمل سب سے پہلے شروع ہوا۔۔۔۔ غالباً1950ء کے عشرے کے وسط میں۔۔۔۔ نیو انگلینڈ میں میری میک ویلی جیسے پرانے علاقے پسماندہ اور انحطاط پذیر سمجھے جانے لگے۔ جبکہ بوسٹن کے مضافات میں روٹ 128 یا کیلی فورنیا میں ''سلیکون ویلی'' جیسے مقامات انتہائی برقی رفتاری سے اہمیت اختیار کر گئے۔ ان کی مضافاتی آبادیاں سالڈ سٹیٹ فزکس، سسٹم انجینئرنگ، منصوعی ذہانت یا پولیمر کیمسٹری کے ماہرین سے گویا بھر گئیں۔

مزید برآں ٹیکنالوجی کی منتقلی کی طرف پیش قدمی کے دوران ہی بہتر روزگار اور

پرتعیش حالات کا مشاہدہ کیا جا سکتا تھا، چنانچہ بھاری بھرکم دفاعی معاہدوں پر پلنے والی نام و نہاد ''سمشی پٹی پر واقع'' ریاستوں نے ایک ترقی یافتہ ٹیکنالوجیکل بنیاد تعمیر کر ڈالی، جبکہ شمال مشرق میں اور عظیم نہروں کے گرد واقع پرانے صنعتی علاقے انحطاط پذیر ہو کر قلاش ہونے لگے۔ نیویارک سٹی کا طویل عرصہ تک جاری مالیاتی بحران، اسی ٹیکنالوجیکل انقلاب کی ایک واضح جھلک تھا۔ فرانس میں فولاد سازی کے مرکز لادین پر طاری جمود بھی اسی وجہ سے تھا اور ایک اور سطح پر یہی انقلاب برطانوی سوشلزم کی ناکامی کا باعث بنا۔ چنانچہ دوسری جنگ عظیم کے خاتمے پر لیبر حکومت نے دیوہیکل صنعتوں کو اپنی تحویل میں لینے کا اعلان کیا اور اس پر عمل بھی کر ڈالا۔ ماضی کی یہ دیوہیکل صنعتیں، جنہیں حکومت نے قومیایا، کوئلہ، ریل اور فولاد کی تھیں۔ تیسری لہر کی صنعتوں پر استوار معیشت کے علاقے یا شعبے تیز رفتاری سے ترقی کرنے لگے اور دوسری لہر کی صنعتوں والے علاقے انحطاط پذیر ہونے لگے۔ لیکن تبدیلی کا یہ عمل بمشکل شروع ہی ہوا ہے۔ آج بہت سے حکومتیں عبوری دور کی مشکلات اور پریشانیوں کو کم کرنے کے لئے شعوری طور پر اس تحتی تبدیلی کو تیز تر کرنے کے راستے ڈھونڈ رہی ہیں۔

جاپانی وزارت بین الاقوامی صنعت و تجارت میں موجود منصوبہ ساز مستقبل کی خدمتی (Service) صنعتوں کو سہارا دینے کے لئے نئی ٹیکنالوجیز کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ مغربی جرمنی کے چانسلر ہیلمنٹ شمٹ اور ان کے مشیر نئے سیاسی ڈھانچے کی بات کر رہے ہیں اور وسیع پیمانے کی روایتی پیداواری صنعتوں کے جال سے باہر نکلنے کے لئے ان کی نظریں یورپی سرمایہ کاری بنک کی سہولتوں پر جمی ہوئی ہیں۔ آج متعلقہ صنعتوں کے چار گروپ افزائش کے زیادہ تر حصے کو متوازن کئے ہوئے ہیں اور غالباً تیسری لہر کے دور کی بنیادی صنعتیں بھی یہی بنیں گی اور ایک بار پھر اپنے جلو میں معاشی طاقت اور سماجی اور سیاسی ترتیب میں زبردست تبدیلیاں لائیں گی۔

الیکٹرونکس اور کمپیوٹرز، واضح طور پر ایک ایسے ہی باہم منسلک گروپ کی تشکیل کرتے ہیں۔ بین القوامی منظر پر نسبتاً نووارد، الیکٹرونکس کی صنعت سالانہ ایک سو بلین ڈالر مالیت کی اشیاء کی فروخت کر رہی ہے اور 1980ء کے عشرے کے اختتام تک ان اشیاء کی فروخت 325 ملین ڈالر بلکہ 400 بلین ڈالر تک پہنچ جانے کی توقع ہے۔ اس طرح یہ فولاد،

کارسازی اور کیمکلز کے بعد دنیا کی چوتھی سب سے بڑی صنعت بن کر ابھرے گی۔ کمپیوٹرز کا پھیلاؤ جس تیزی سے ممکن ہوا ہے، وہ روز روشن کی طرح سب کے سامنے ہے اور کسی وضاحت کا محتاج نہیں۔ قیمتیں اتنی تیزی سے گری ہیں اور اس کی استعداد اتنی حیرت انگیز شرح سے بڑھی ہے کہ کمپیوٹر میگزین کے مطابق، ''کمپیوٹر کی صنعت میں پچھلے تیس سال میں جو کارگزاری ہوئی ہے، اگر کارسازی کی صنعت میں بھی اسی برق رفتاری سے یہ سب کچھ ہوا ہوتا، تو رولس رائس ڈھائی ڈالر کی ہوتی اور ایک گیلن پٹرول میں دوملین میل کا سفر ممکن ہوتا۔''

آج سستے منی کمپیوٹرز امریکی گھروں پر دھاوا بولنے ہی والے ہیں جون1979ء تک تقریباً ایک سو کمپنیاں گھریلو کمپیوٹرز تیار کر رہی تھیں۔ ٹیکساس انسٹرومنٹس جیسی دیوہیکل کمپنی میدان میں موجود تھی اور میسرز اور منٹگمری وارڈ جیسے عظیم الشان سلسلے اپنی گھریلو مصنوعات میں کمپیوٹرز کا اضافہ کرنے ہی والے تھے۔ ''جلد ہی کسی روز'' ڈلاس میں مائیکرو کمپیوٹر کے ایک خوردہ فروش نے بڑے جوش سے کہا ''ہر گھر میں کمپیوٹر ہو گا۔ ٹوائیلٹ کی طرح یہ بھی ایک لازمی ضرورت ہو گا۔''

بنکوں، سٹوروں، حکومتی دفتروں، پڑوس کے گھروں اور کام کرنے کی جگہ سے منسلک یہ کمپیوٹرز، پیداوار سے پرچون فروشی تک، کاروبار کو ہی نئی شکل نہیں دیں گے، بلکہ کام کی نوعیت اور درحقیقت گھریلو ڈھانچہ تک بدل کر رکھ دیں گے۔

الیکٹرونکس کی صنعت بھی، جس کا کمپیوٹر کی صنعت سے گویا ننھیالی رشتہ ہے بے، تحاشہ پھل پھول رہی ہے، جیبی اور دستی کیلکولیٹرز اور ڈائی اوڈ گھڑیوں اور ٹی وی سکرین کے کھیلوں کی زبردست یلغار صارفین پر جاری ہے۔ یہ اشیاء ذخیرے میں موجود چیزوں کی جانب ایک معمولی سا اشارہ ہیں۔ زراعت میں مستعمل، آب وہوا اور سطح سے متعلقہ چھوٹے چھوٹے اور سستے حساس آلات، دل کی دھڑکن اور ذہنی سطح کو جانچنے کے لئے عمومی لباس میں منسلک مختصر میڈیکل اختراعات یہ اور اسی طرح کی بہت سی الیکٹرانک ایجادات، موجودہ دور سے ذرا ہی آگے گھات لگائے بیٹھی ہیں۔ توانائی کا بحران، تیسری لہر کی صنعتوں کی جانب پیش قدمی کے عمل کو مزید تیز تر کر دے گا، کیونکہ ان میں سے اکثر صنعتیں ہمیں ایسے

MashalBooks.org

مراحل اور اشیاء کی جانب لے جا رہی ہیں، جن کی توانائی کی ضروریات بہت ہی محدود ہیں۔ مثلاً دوسری لہر کی ٹیلی فون سسٹم کے لئے شہر کی سڑکوں کے نیچے تانبے کا جال درکار ہوتا تھا۔۔۔ میلوں تک ختم نہ ہونے والے سانپوں کی طرح لہراتے کیبل، نالیاں (Conduit) آواز نشر کرنے والے آلات اور سوئچ اب ہم اسے فائبر آپٹک سسٹم میں تبدیل کر رہے ہیں، جن میں پیغام رسانی کے لئے بال جیسے باریک روشنی بردار فائبر استعمال ہوتے ہیں۔ اس تبدیلی میں توانائی کے اہم مضمرات بری طرح دھچکا لگا ہے۔ تانبے کی تار کی مساوی طوالت کے لئے کھدائی اس کے پگھلانے اور پراسس کرنے میں جتنی توانائی صرف ہوتی تھی آپٹک فائبر تیار کرنے میں اس انرجی کا ایک ہزار واں حصہ لگتا ہے۔ 90 میل لمبی تانبے کی تار کے لئے جتنے ٹن کوئلہ درکار ہوتا تھا، اتنے کوئلے سے 80ہزار میل طویل فائر بنایا جا سکتا ہے۔

الیکٹرونکس میں سولڈ سٹیٹ فزکس کی جانب منتقلی بھی اسی سمت میں رواں دواں ہے۔ ہر اگلی پیش رفت ایسے اجزاء کو جنم دے رہی ہے، جنہیں کم سے کم توانائی درکار ہے۔ آئی بی ایم میں ہونے والے وسیع پیمانے کی حالیہ تشکیلات میں سے ایسے اجزاء شامل ہیں جنہیں متحرک کرنے کے لئے 50 مائیکرو واٹ جتنی معمولی توانائی کافی ہے۔ الیکٹرانک انقلاب کی یہ خصوصیت توانای کے بحران کی شکار اعلیٰ ٹیکنالوجی کی معیشتوں کے لئے یہ واضح اشارہ ہے کہ دوسری لہر کی توانائی ضائع کرنے والی صنعتوں کے بجائے تیسری لہر کی دھیمی توانائی کی صنعتوں کی جانب، تیز رفتار انتقال پذیری ہی، ان کے لئے مضبوط ترین ممکنہ حکمت عملی ہوسکتی ہے۔

سائنس جرنل کی یہ عمومی رائے بہت حد تک حقیقت کے قریب ہے کہ الیکٹرانکس کے دھاکے کے ذریعے ''ملکی معاشی سرگرمیوں میں اچھی خاصی تبدیلیاں رونما ہونا ممکن ہیں۔ یہ امکان بھی ہے کہ الیکٹرونکس کی نت نئی اور غیر متوقع ایجادات و اختراعات اور ان کے استعمال سے متعلق قصے کہانیاں جلد ہی حقیقت کا روپ دھار لیں گی۔ الیکٹرانکس کا دھاکہ بہر حال تکنیکی دائرے کی سمت صرف ایک قدم ہے۔

زمینی مدار میں مشینیں

بیرونی خلا اور سمندروں میں کی جانے والی مہمات کے بارے میں بھی کم و بیش یہی بات کہی جا سکتی ہے، جہاں دوسری لہر کی ٹیکنالوجیز کی حدود سے کہیں آگے تک، ہماری رسائی اور بھی زیادہ حیرت انگیز نظر آتی ہے۔

خلائی صنعت، ابھرتے ہوئے تکنیکی دائرے میں ایک دوسرے مجموعے کی تشکیل کرتی ہے۔ تاخیر اور تعطل کا شکار ہونے کے بعد، جلد ہی بیرونی خلا اور زمین کے درمیان ہفتہ وار مال بردار اور مسافر خلائی شٹلز کی آمدورفت کا آغاز ہو سکتا ہے۔ اس کے اثرات کی اہمیت عوامی سطح پر ابھی زیادہ واضح نہیں لیکن امریکہ اور یورپ کی بہت سی کمپنیاں ان ''بلند حدود'' کو اعلیٰ ٹیکنالوجی میں آنے والے انقلاب کا انتہائی اہم ذریعہ قرار دیتی ہیں اور ان خطوط پر باقاعدہ کام کر رہی ہیں۔

گرومان اور بوئنگ توانائی پیدا کرنے کے لئے، سیٹلائٹس اور خلائی پیٹ فارمز پر، کام کر رہے ہیں۔ ہفتہ روزہ بزنس کے مطابق صنعتوں کا ایک اور گروپ صرف یہ سمجھنے کی کوشش میں ہے کہ زمینی مدار ان کے کس طرح استعمال میں آ سکتا ہے۔۔۔۔ یہ گروپ اشیاء تیار کرنے اور پراسیس کرنے والی ان صنعتوں پر مشتمل ہے، جو سیمی کنڈکٹرز سے لے کر ادویات تک کا احاطہ کرتی ہیں۔۔۔۔ اعلیٰ ٹیکنالوجی کے حامل بہت سے مادوں کو انتہائی نفیس اور منضبط انداز میں استعمال کیا جاتا ہے اور کشش ثقل کی قوت ان کے لئے نقصان دہ ہو سکتی ہے۔۔۔۔ خلا میں پریشان کن کشش ثقل نہیں پائی جاتی۔ وہاں (مال بردار) کنٹینرز کی بھی ضرورت نہیں۔ زہر اور دوسرے انتہائی مضرت رساں عناصر کی ہینڈلنگ بھی کوئی مسئلہ نہیں اور وہاں خلا کی لامحدود رسد کے ساتھ انتہائی تیز درجہ حرارت اور انتہائی کم درجہ حرارت بھی موجود ہے۔''

چنانچہ ''خلائی مصنوعات کی تیاری'' سائنس دانوں، انجینئروں اور اعلیٰ ٹیکنالوجی کے کار پردازوں کے درمیان ایک گرما گرم موضوع بن گیا ہے۔ میک ڈونل ڈگلس، ادویات تیار کرنے والی کمپنیوں کو، ایک ایسی خلائی شٹل کی ایجاد کی پیش کش کر رہا ہے جو انسانی خلیوں سے کم یاب انزائمز کو علیحدہ کرے گی۔ شیشے کی مصنوعات بنانے والے، خلا میں لیزر اور

فائبر آپٹکس کی اشیاء بنانے کے راستوں کی کھوج میں ہیں۔ خلا میں بنائے گئے سنگل کرسٹل سیمی کنڈکٹرز کے سامنے، زمین پر تیار کردہ یہی ماڈل خاصے دقیانوسی لگتے ہیں۔ خون کے بعض امراض میں مبتلا افراد کے لئے یوروکینیز (Urokinase)۔۔۔۔ جو جمے ہوئے خون(Blood Clot) کو تحلیل کر دیتا ہے۔۔۔۔ کا ایک ڈوز ڈھائی ہزار پونڈ کا آتا ہے۔ جس کو وان پٹ کیمر، ناسا کے خلائی صنعتی تحقیقات کے سربراہ کے مطابق، خلا میں اس کی تیاری پر موجودہ خرچ کے پانچویں (1/5) حصے سے بھی کم خرچ آئے گا۔ زیادہ اہم وہ نئی اشیاء ہیں، جو زمین پر کسی بھی قیمت پر بنائی ہی نہیں جا سکتیں۔ ٹی آرڈ بلیو نامی خلائی اور الیکٹرونکس اشیاء تیار کرنے والی کمپنی نے ایسے چار سو مختلف دھاتی مرکبات کی نشان دہی کی ہے جو کشش ثقل کی وجہ سے زمین پر تیار ہی نہیں کئے جا سکتے۔ جنرل الیکٹرانکس آج کل خلائی بھٹی کے ڈیزائن کی تیاری میں مصروف ہے۔ مغربی جرمنی میں ڈیملر بینز اور ایم اے این خلا میں بال بیرنگس تیار کرنا چاہتی ہیں۔ یورپی خلائی ایجنسی اور برطانوی ہوا بازی کی کارپوریشن جیسی کئی کمپنیاں ایسے آلات اور مصنوعات کی ڈیزائننگ میں مصروف ہیں جن کے ذریعے خلاء کو بہتر تجارتی مقاصد کے لئے استعمال کیا جا سکے۔ ہفت روزہ بزنس کا کہنا ہے کہ ''یہ امکانات محض سائنسی قصے کہانیاں نہیں ہیں بلکہ ان کو حقیقی شکل دینے کے لئے سنجیدگی سے کام کرنے والی کمپنیوں کی تعداد بڑھتی ہی جا رہی ہے۔''

ڈاکٹر جیرارڈ اونائل کے خلائی شہر بسانے کے منصوبے کے حمایتی، انتہائی سنجیدگی اور غالباً کہیں زیادہ جوش و خروش کے حامل نظر آتے ہیں۔ پرنسٹن کے ماہر طبیعیات اونائل انتہائی مستقل مزاجی سے عوام کو خلا میں وسیع پیمانے کی آبادیں قائم کرنے کے امکانات کے متعلق آگہی دے رہے ہیں۔ ایسے پلیٹ فارم یا جزیرے، جہاں پر ہزاروں افراد کی آبادی ہو گی۔۔۔۔ ناسا کی طرف سے بھی اس سلسلے میں انہیں زبردست حمایت مل رہی ہے۔ کیلی فورنیا کے گورنر۔۔۔۔(جہاں کی ریاستی معیشت کا بہت حد تک انحصار ہی خلا سے متعلقہ صنعتوں پر ہے) اور مقام حیرت ہے کہ پوری دنیا کی کٹیلاگ کے خالق سٹیوارٹ برنڈ کی زیر قیادت، سابقہ ہپیوں کا ایک موسیقار گروہ بھی اس امکان کا پرزور حامی ہے۔

اونائل کا نظریہ یہ ہے کہ چاند سے یا خلا میں کسی اور جگہ سے یہ ضروری اشیاء

حاصل کر کے، آہستہ آہستہ خلائی شہر کی تعمیر کی جائے۔ ان کے ایک ساتھ ڈاکٹر برائن اولیری اپالو اور امر نامی چھوٹے سیاروں کے معدنی ذخائر کے استعمال کے امکانات پر تحقیق کرتے رہے ہیں۔ ناسا، جنرل الیکٹرونک، توانائی کی ایجنسیوں اور ان امور میں دلچسپی رکھنے والی دوسری پارٹیوں کے ماہرین پرنسٹن میں منعقد ہونے والی کانفرنسوں میں باقاعدگی سے شریک ہوتے ہیں اور چاند اور دوسری غیر ارضی معدنیات کی کیمیائی پراسسنگ اور خلائی آبادیوں کے ڈیزائن اور تعمیر بند ماحولیاتی نظم پر اکٹھی کی گئی تکنیکی معلومات پر مبنی دستاویزات کا باہم تبادلہ کرتے ہیں۔

غیر ارضی پیداواری امکانات کی جانب، متحرک ترقی یافتہ الیکٹرانکس اور خلائی پروگرام کا حسین امتزاج تکنیکی دائرے کو ایک ایسی نئی سطح پر لے جا رہا ہے جو دوسری لہر کی سوچ کے برعکس لامحدود ہو گی۔

سمندری گہرائیوں میں

سمندر کی گہرائیوں تک رسائی کی ہماری جدوجہد، ایک طرح سے بیرونی خلا کی جانب، ہماری پرواز کے تصور کا حقیقی انعکاس ہے اور یہی صنعتوں کے اس تیسرے بڑے گچھے کی بنیاد بنتی ہے جو غالباً نئے تکنیکی دائرے کے ایک بہت بڑے حصے کی تشکیل کرے گا۔ دنیا میں سماجی تبدیلی کی پہلی تاریخی لہر اس وقت آئی تھی، جب ہمارے اجداد نے شکار اور گلہ بانی کو ترک کر کے پالتوں جانروں اور کاشتکاری کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ سمندروں سے اپنے تعلق کے بارے میں مختصراً اب ہم لگ بھگ اسی سطح پر ہیں۔

بھوک کی ماری دنیا میں خوراک کا مسئلہ حل کرنے میں سمندر بے پناہ مدد کر سکتے ہیں۔ اگر سمندری جانروں کی منسب پرورش اور دیکھ بھال کی جائے تو انتہائی مطلوبہ لحمیات کی لامحدود رسد میسر آ سکتی ہے۔ آج کل کی تجارتی ماہی گیری جو ایک اعلیٰ پیمانے کی صنعت بن چکی ہے۔۔۔ جاپانی اور سوویت بحری کارخانے سمندروں کو خالی کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔۔۔ بے رحمی سے حیوانی استحصال کر رہی ہے اور خطرہ یہ ہے کہ سمندری زندگی کی بہت سی شکلیں بالکل ہی نابود ہو جائیں گی۔ اس کے برعکس عقلمندانہ ''آبی پرداخت اور کاشت مچھلیوں کی پرورش اور نگہداشت اور آبی پودوں کی کاشت کاری۔۔۔ اس نازک

اندام حیاتی دائرے کو، جس پر ہماری زندگیوں کا انحصار ہے، نقصان پہنچائے بغیر خوراک کے عالمی بحران کو بہت حد تک حل کر سکتی ہے۔ سمندروں سے تیل نکالنے کی اندھا دھند تقلید کے سبب، فی الحال سمندری ''تیل میں اضافے'' کے امکانات خاصے مخدوش ہو گئے ہیں۔ بیٹیل میموریل انسٹی ٹیوٹ میں ڈاکٹر لارنس ریمنڈ نے عملی تجربے کے ذریعے یہ ثابت کیا ہے کہ High Oil Content کے ساتھ آبی نباتات کی پیداوار ممکن ہے۔ تاہم اس عمل کو ارزاں طور پر موثر بنانے کے لئے کوششیں کی جا رہی ہیں۔

سمندروں میں معدنیات کا بے شمار خزانہ مدفون ہے۔ جس میں تانبا، زنگ، ٹن، چاندی، سونا، پلاٹینم شامل ہیں۔ ایک اور اہم ذخیرہ فاسفیٹ کا ہے، جس سے سطح زمین پر کاشت کاری کے لئے کھاد تیار کی جا سکتی ہے۔ معدنی کانوں پر کام کرنے والی کمپنیوں، کی نظر بحر احمر کے گرم پانیوں پر جمی ہوئی ہے جہاں اندازاً 3.4 بلین امریکی ڈالر کی مالیت کے زنک، سلور، تانبا، سیسہ اور سونے کے ذخائر موجود ہیں۔ تقریباً سو کمپنیاں جن میں دنیا کی بہت بڑی کمپنیاں بھی شامل ہیں، سمندر کی تہہ میں سے آلو کی شکل کی مینگنیز نوڈلز نکالنے کی تیاریاں کر رہی ہیں۔ (یہ نوڈلز قابل احیاء وسائل ہیں، جنہیں ہوائی کے جنوب میں واقع جانی پہچانی اکیلی پٹی میں، چھ سے دس ملین ٹن سالانہ کی شرح سے، حاصل کیا جا سکتا ہے)

آج کل چار بین الاقوامی کنسورشیم، اربوں ڈالر کی لاگت کے ساتھ 1980ء کے عشرے کے وسط تک سمندری کان کنی کا آغاز کرنے کی تگ ودو میں لگے ہوئے ہیں۔ ایسے ہی ایک کنسورشیم میں تیئیس جاپانی کمپنیاں، ایک اے ایم آر نامی مغربی جرمن گروپ اور کینیڈا کے بین الاقوامی نکل کی ایک امریکی ذیلی کمپنی شامل ہیں۔ ایک اور کنسورشیم کا تعلق بلجین کمپنی یونین مائینیر اور امریکی فولاد اور شمسی کمپنی سے ہے۔ تیسرا اہم جو گروپ، کینیڈا کے نورنیڈا انڈسٹریز، مٹسوبشی آف جاپان اور ریوٹنٹو زنک (Rio Tinto Zink) اور برطانیہ کی کنسالیڈیٹڈ گولڈ فیلڈز کی شکل میں اکٹھا ہوا ہے۔ آخری کنسورشیم میں لاک ہیڈ اور رائل ڈچ/شیل گروپ مجتمع ہیں۔ لندن کا فائنانشل ٹائمز لکھتا ہے کہ ''منتخب معدنیات کے میدان میں یہ کوششیں دنیا بھر کی کان کنی کی سرگرمیوں میں انقلاب بپا کر دیں گی۔'' مزید برآں ادویات تیار کرنے والی کمپنی ہوف مان لارش anti fingal agents درد ختم کرنے والی

یا تشخیص میں مدد اور خون کو روکنے والی نت نئی ادویات کی تیاری کے لئے، خاموشی سے سمندروں کی چھان بین میں مصروف کار ہے۔ان ٹیکنالوجیز کے مناسب ارتقاء کے بعد،ممکن ہے، ہم سمندر میں تیرتی ہوئی فیکٹریاں اور سمندری سطح پر تعمیر شدہ گاؤں یا اندرون سطح پر مکمل ''بحری گاؤں'' بنتے مشاہدہ کر سکیں۔تقریباً مفت جگہ (کم از کم فی الحال) اور موقع پر ہی سمندری ذرائع (طوفان، حرارت خیز آبی لہریں یا طغیانی تموج) سے پیدا شدہ ارزاں توانائی کے باہم بلاپ سے، اس قسم کی تعمیرات سطح زمین کے مقابلے میں، خاصی کم خرچ ہو سکتی ہیں۔ میرین پالیسی نامی تکنیکی جریدے نے یہ قطعی نتیجہ نکالا ہے کہ ''سمندر میں بہتے ہوئے پلیٹ فارمز کی ٹیکنالوجی اتنی زیادہ ارزاں اور سادہ نظر آتی ہے کہ ان تک رسائی دنیا کی بیشتر قوموں کے علاوہ لا تعداد کمپنیوں اور نجی گروپوں کی آسان دسترس میں ہوگی۔ فی الحال ایسا نظر آتا ہے کہ پر ہجوم صنعتی معاشرے سمندر میں رہائشی مقاصد کے لئے ابتدائی بہتے شہروں کی تعمیر کریں گے۔۔۔ کثیر قومی کارپوریشنیں،انہیں اپنی تجارتی سرگرمیوں کے لئے یا فیکٹری جہازوں کے لئے متحرک ٹرمینل کے طور پر بھی دیکھ سکتی ہیں۔۔۔خوراک تیار کرنے والی کمپنیاں، شادی بیاہ کی ثقافتی سرگرمیاں سرانجام دینے کے لئے تیرتے شہر کھڑے کر سکتی ہیں۔ٹیکس سے بچنے کی خواہش مند کمپنیاں اور زندگی کے نت نئے انداز کے متلاشی مہم جو بھی تیرتے شہر نہ صرف بنا سکتے ہیں بلکہ انہیں نئی آزاد ریاستیں بھی قرار دے سکتے ہیں، ان تیرتے شہروں کو سیاسی طور پر تسلیم بھی کیا جا سکتا ہے۔۔۔ یہ مذہبی یا قومی اقلیتوں کے لئے آزادی کے حصول کا ایک متحرک ذریعہ بھی بن سکتے ہیں۔

کئی سمندری آئل رگز (Rigs) سمندر کی تہہ تک پہنچی ہوئی ہیں لیکن بہت سی رگز غیر وزنی کیفیت کنکریٹ کے متوازن سہاروں اور سمندری تموج کے ذریعے متحرک حالت میں بنائی گئی ہیں۔ ان آئل رگز کی تعمیر سے منسلک ٹیکنالوجیکل ترقی کی رفتار بہت تیز ہے اور اس طرح تیرتے شہروں اور بہت سی نئی معاون دیوہیکل صنعتوں کی بنیاد استوار ہو رہی ہے۔

مجموعی طور پر، سمندر کا رخ کرنے کی تجارتی وجوہات اتنی تیزی سے بڑھتی جا رہی ہیں کہ ماہر معاشیات ڈی ایم لپ رگز کے مطابق آج کئی بہت بڑی کارپوریشنیں ''قدیم

MashalBooks.org

مغرب میں رہائشی منصوبہ سازوں کی طرح، انتہائی بے چینی سے، سمندر کی سطح پر ابھرنے والے بڑے بڑے قطعات کے منتظر ہیں۔'' اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ غیر صنعتی ممالک کیوں اتنی شدومد سے اس ضمانت کے حصول کے لئے لڑ رہے ہیں کہ سمندری وسائل پر امیر اقوام کے بجائے تمام انسانوں کا مساوی حق تسلیم کیا جائے۔

ان مختلف ارتقائی سلسلوں کو، اگر ہم علیحدہ علیحدہ دیکھنے کے بجائے باہم مربوط اور خودکار عوامل ۔۔۔۔ جن میں ہر ٹیکنالوجیکل یا سائنسی پیش رفت دوسروں کو مہمیز دے رہی ہے۔۔۔۔ کے طور پر دیکھیں تو یہ بات واضح تر ہو جاتی ہے کہ اس سطح کی ٹیکنالوجی اب غیر متعلق ہوتی جا رہی ہے جس پر دوسری لہر کی بنیادیں استوار ہوتی تھیں۔ ہم ایک بالکل ہی نئے نظام توانائی اور ٹیکنالوجیکل سسٹم کے راستے پر گامزن ہیں۔

لیکن یہ مثالیں بھی سالماتی حیاتیات کی تجربہ گاہوں میں ہونے والے تکنیکی زلزلوں کے مقابلے میں بہت ہی چھوٹی اور غیر اہم ہیں۔ حیاتیاتی صنعت، صنعتوں کے چوتھے گچھے کی تشکیل کرنے جا رہی ہے، اور غالباً یہی مستقبل کی معیشت کا موثر ترین شعبہ ہوگا۔

صنعت تخلیق

ہر دو سال میں دگنی ہوئی ہے حیاتیاتی معلومات اور تیز رفتار میکانکی تخلیق کے ساتھ، جدید سائنسی جریدے کی رپورٹ کے مطابق، ''حیاتیاتی انجینئرنگ آئندہ استعمال ہونے والے ضروری آلات کی تیاری کے دور سے گزری ہے۔ اب یہ تجارتی مقاصد کے لئے بالکل تیار ہے۔ ممتاز سائنسی مبصر لارڈ رچی کالڈر اس کی وضاحت یوں کرتا ہے کہ ''جس طرح ہم پہلے پلاسٹک اور دھاتوں کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتے رہے ہیں، اسی طرح اب ہم جاندار ساز وسامان تیار کر رہے ہیں۔

اکثر کمپنیاں نئی حیاتیات کے تجارتی استعمال کے لئے پہلے ہی انتہائی سرگرمی دکھا رہی ہیں۔ وہ گاڑیوں میں ایسے این زائمز (enzyms) لگانے کا خواب دیکھ رہے ہیں جو آلودگی کے اخراج کو نہ صرف مانیٹر کریں گے بلکہ اس کا ڈیٹا انجن درست کرنے والے مائیکرو پراسسر تک بھی بھیجیں گے۔ وہ ایک ایسی تخلیق کی بات کرتے ہیں جسے نیویارک ٹائمز نے ''دھات کے بھوکے جرثومے کا نام دیا ہے۔ انہیں سمندری پانی میں قیمتی دھاتوں کی کان

کنی میں بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔'' نئی حیاتیاتی شکلوں کے جملہ حقوق، اپنے نام محفوظ رکھنے کا مطالبہ، وہ منوا بھی چکے ہیں۔ ایلی للّی، ہاف مین۔ لارش۔ جی ڈی سرلے، اب جان، مرک اور جنرل الیکٹرانک کا تو خیر ذکر ہی کیا، سب کے سب اس دوڑ میں بھرپور طرح سے شریک ہیں۔

اعصابی مبصرین، بشمول بہت سے سائنس دانوں کے، بلاوجہ پریشان نہیں کیونکہ یہ دوڑ حد سے زیادہ بڑھتی جا رہی ہے وہ تیل کے بہاؤ کے بجائے ایسے ''جوثوموں کے بہاؤ کے حیرت انگیز تصورات پیش کر رہے ہیں، جو بیماری پھیلا کر تمام آبادیوں کو نیست و نابود کر سکتے ہیں۔ وبائی جوثوموں کی تخلیق اور ان کی حادثاتی رہائی، بہر حال، خطرے کی گھنٹی بجنے کی صرف ایک وجہ ہے۔ انتہائی باوقار اور قابل احترام سائنس دان تخیلات کو لرزا دینے والے امکانات کا ذکر کر رہے ہیں۔ کیا ہمیں گاؤشکم لوگوں کی افزائش کرنا چاہئے تاکہ وہ گھس پھوس کھا کر بھی گزارہ کر سکیں۔۔۔۔ گویا خود کو اس طرح تبدیل کرائیں کہ خوراک کی اقسام کی ادنیٰ ترین چیزیں غذا کے طور پر استعمال کریں، اور یوں خوراک کا مسئلہ حل کر لیں۔ کیا ہم کارکن افراد میں ایسی حیاتیاتی تبدیلیاں لائیں جو ان کی پیشہ ورانہ ضروریات کا تقاضا ہیں۔۔۔۔ مثلاً ایسے پائلٹوں کی تخلیق جو قوت کے مطابق تیز رفتار ردعمل کا مظاہرہ کر سکیں یا ایسے پرزے جوڑنے والے کارکن ڈیزائن کریں جو ذہنی طور پر ہمارے لئے یکساں نوعیت کا کام کر سکتے ہوں۔ کیا ہمیں ''ادنیٰ'' لوگوں کو ختم کر کے ''اعلیٰ نسل'' کے افراد کی افزائش کرنی چاہئے؟ (ہٹلر نے بھی یہ کوشش کی تھی مگر ان حیاتیاتی ہتھیاروں کے بغیر کی جو جلد ہی لیبارٹریوں سے برآمد ہونے والے ہیں) کیا ہمیں جنگیں لڑنے کے لئے فوجیوں کی میکانکی تخلیق (Cloning) کرنا چاہیے؟ کیا ہمیں ''غیر موزوں بچوں'' کو پیدائش سے پہلے ہی ضائع کر دینے کے لئے حیاتیاتی پیش گوئی کا سہارا لینا چاہئے؟ کیا ہمیں اپنے لئے محفوظ اعضاء پیدا کرنا چاہئیں۔۔۔۔ اور یوں ہم میں سے ہر ایک فرد کے پاس فالتو گردے، جگر اور پھیپھڑوں سے بھرا ہوا ایک بچت بنک موجود ہو؟

یہ قیاسات کتنے ہی وحشیانہ کیوں نہ ہوں، سائنسی برادری میں اور ان کے حیرت ناک تجارتی استعمال میں ان کے لئے حمایت بھی موجو ہے اور مخالفت بھی۔ حیاتیاتی

MashalBooks.org

انجینئر نگ کے دو مبصروں جرمی رفکن اور ٹیڈ ہاورڈ نے اپنی کتاب۔۔۔ خالق کا کھیل کسے کھیلنا چاہئے؟ میں اس طرح لکھا ہے ''وسیع پیانے کی حیاتیاتی انجینئر نگ، غالباً سب سے پہلے امریکہ ہی میں متعارف کرائی جائے گی، بعینہ جیسے وہاں اسمبلی لائنز، موٹر گاڑیاں، امراض کے ٹیکے کمپیوٹرز اور تمام دوسری ٹیکنالوجیز کا آغاز ہوا تھا۔ چونکہ ہر نئی حیاتیاتی پیش رفت بالآخر تجارتی استعمال میں آ جاتی ہے اس لئے نئے صارفین پیدا کئے جائیں گے اور اس طرح نئی ٹیکنالوجی کے لئے پوری مارکیٹ تشکیل پا جائے گی۔'' غرض امکانی اطلاعات کا کوئی حد و حساب ہی نہیں۔ مثلاً نئی حیاتیات توانائی کا مسئلہ بہتر طور سے حل کرنے میں خاصی مدد کر سکتی ہے۔ سائنس دان اس نظریئے کا بغور مطالعہ کر رہے ہیں کہ سورج کی روشنی کو الیکٹر وکیمیکل توانائی میں تبدیل کر کے، جراثیم (Bacterias) میں اہلیت پیدا کر کے انہیں استعمال میں لایا جائے۔ وہ ''حیاتیاتی شمسی سیلز'' کا سوچ رہے ہیں۔ کیا ہم جوہری طاقت کے پلانٹس کی جگہ لینے کے لئے ایسی حیاتیاتی تشکیل کی نشوونما کر سکتے ہیں؟ اگر ایسا ہو گیا تو ممکن ہے ہمیں ریڈیو ایکٹو شعاعوں کے اخراج کے بجائے بائیو ایکٹو شعاعوں کے اخراج کے خطرے کا سامنا کرنا پڑے؟

صحت کے شعبے میں بہت سے امراض۔۔۔ جو ابھی نا قابل علاج ہیں۔۔۔ کا علاج ممکن ہو جائے گا یا ان سے محفوظ رہا جا سکے گا۔ اور یہ امکان بھی ہے کہ زیادہ خطرناک اور موذی امراض، بے توجہی یا خباثت کی وجہ سے متعارف ہو جائیں۔ (ذرا سوچئے اگر کوئی دولت کی بھوکی کمپنی کوئی ایسا مرض دریافت کر لے اور اسے خفیہ طور سے لوگوں میں پھیلا بھی دے، جس کا علاج صرف اسی کے پاس ہو) نزلے زکام جیسی معمولی بیماری بھی۔۔۔ موزوں اور اجارہ دارانہ علاج کے لئے۔۔۔ ایک زبردست مارکیٹ پیدا کر سکتی ہے۔

کیلیفورنیا کی ایک کمپنی، کیلس جس کے ساتھ دنیا کے بہت سے مشہور معروف حیاتیاتی سائنس دان تجارتی طور پر منسلک ہیں۔۔۔ کے سربراہ کے مطابق، اگلے تیس سال میں ''حیاتیات اہمیت کے اعتبار سے کیمسٹری کی جگہ لے لے گی۔

ادھر ماسکو میں ایک سرکاری پالیسی بیان ''قومی معیشت میں آرگن ازم کے وسیع تر استعمال'' پر انتہائی زور دیا گیا ہے۔۔۔''

پلاسٹک، کھاد، کپڑے، رنگ، زرعی ادویات اور ہزاروں دوسری اشیاء کی پیداوار میں حیاتیات، تیل کی ضرورت کم کر دے گی یا بالکل ہی ختم کر دے گی۔ یہ لکڑی، اون اور ایسی ہی دوسری قدرتی اشیاء کی پیداوار میں خاصی تبدیلیاں لے آئے گی۔ یونائیٹڈ سٹیٹ سٹیل، فیسٹ، ہٹاچی، آسیایا آئی بی ایم جیسی کمپنیوں نے یقیناً اپنے حیاتیاتی ڈویژن قائم کر لئے ہونگے کیونکہ ہم وقت کے ساتھ، صنعتی پیداوار کے بجائے ''حیاتیاتی پیداوار'' کے ذریعے اشیاء کی ایک ایسی رینج بنانے جا رہے ہیں، جنکا تصور بھی ابھی نہیں کیا جا سکتا۔ مستقبل کے گروپ کے سربراہ تھیوڈور جے گورڈن کا کہنا ہے ''حیاتیات میں ایک دفعہ ہمارا آغاز ہو گیا تو ہمیں ایسی ایسی چیزوں کے بارے میں سوچنا پڑے گا۔۔۔کیا آپ انسانی ریشے سے ہمیں ایسی ایسی چیزوں کے بارے میں سوچنا پڑے گا۔۔۔کیا آپ انسانی ریشے سے مطابقت رکھتی قمیض یا انسانی چھاتی جیسی ملتی جلتی شے سے، گداز چھاتی جیسا گدا (mattress) تخلیق کر سکتے ہیں۔''

لیکن اس سے کہیں پہلے، زراعت میں، حیاتیاتی انجینئرنگ کا خوراک کی بین الاقوامی رسد میں اضافے کے لئے استعمال شروع ہو چکا ہو گا۔ 1960ء کے عشرے میں سبز انقلاب کا بڑا غلبہ رہا، لیکن وہ بے چارے کسانوں کے لئے، ایک زبردست جال ثابت ہوا کیونکہ زراعت میں پٹرولیم سے بنی کھاد کی بے تحاشا مقدار استعمال ہوتی تھی اور پہلی لہر کے ممالک کو یہ برآمد کرنا پڑتی تھی۔ مستقبل کے حیاتیاتی زراعتی انقلاب کا مقصد یہ ہے کہ مصنوعی کھاد پر انحصار کم سے کم کر دیا جائے۔ تخلیقی انجینئرنگ کے ذریعے زیادہ سے زیادہ زراعتی شرح پیداوار، صحرائی اور شور زدہ زمین میں فصلوں کی کاشت کے علاوہ، ایسی فصلوں کا حصول مقصود ہے جو زرعی کپڑے مکوڑوں سے خود کو محفوظ بھی رکھ سکتی ہوں۔ یہ خوراک کو ذخیرہ کرنے اور اس کے پراسیسنگ کے لئے سادہ، ارزاں اور توانائی کی بچت کے طریقے دریافت کرنے کے ساتھ ساتھ بالکل ہی نئی غذائی اقسام اور حیوانی ریشوں کی تخلیق کے لئے بھی سرگرم عمل ہے۔ بعض انتہائی خطرناک پہلوؤں کی حامل، حیاتیاتی انجینئرنگ ایک دفعہ پھر وسیع پیمانے کی قحط زدگی کے خاتمے کے روشن امکانات کے ذریعے، خود کو متوازن ثابت کر رہی ہے۔

MashalBooks.org

ان روشن امکانات کی وجہ سے انسان کو امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہئے۔ اگر تخلیقی کاشت کاری کے پیرو 50% بھی صحیح ہیں تو اس کے زراعت پر حیرت انگیز اثرات ہونگے اور دوسری چیزوں کے علاوہ امیر اور غریب ممالک کے باہمی تعلقات میں زبردست مثبت تبدیلیاں آئیں گی۔ سبز انقلاب نے غریب اقوام کو امیر قوموں کا اور زیادہ محتاج بنا دیا تھا۔ حیاتیاتی زرعی انقلاب صورت حال کو الٹ کرسکتا ہے۔

ابھی یقین سے کچھ کہنا قبل از وقت ہوگا کہ حیاتیاتی ٹیکنالوجی کی نشوونما کس طرح کی ہوگی۔ لیکن اب رجعت قہقری کا وقت بھی نہیں رہا۔ ہم آہنگی کے سفر میں جتنا آگے بڑھ چکے ہیں، اسے ناپید نہیں کیا جا سکتا۔ ہم اس کے استعمال اور اطلاق کو منضبط کرنے کی صرف جدوجہد کر سکتے ہیں، تاکہ عاقبت نا اندیشانہ صورت حال پیدا نہ ہو، بین الاقوامی اشتراک ممکن ہو اور ۔۔۔۔ وقت کی ڈور ہاتھ سے نکل جانے سے پہلے ۔۔۔۔ ادارتی، قومی اور بین السائنسی عداوتوں کو اس سارے شعبے میں، کم سے کم کیا جا سکے۔

ایک چیز البتہ، بلاکسی شک وشبہ کے، ہم دوسری لہر کی روایتی ٹیکنالوجی کے تین سو سالہ قدیم الیکٹرومکینکل دائرے میں مقید نہیں رہے اور اس تاریخی حقیقت کی تمام تر اہمیت پر طائرانہ نظر ڈالنا شروع کر سکتے ہیں۔

جس طرح دوسری لہر نے کوئلے، فولاد، بجلی اور ریل ٹرانسپورٹ کو مجتمع کر کے، گاڑیاں اور زندگی میں تبدیلی لانے والی ہزاروں دوسری اشیاء پیدا کر ڈالی تھیں، اسی طرح نئی تبدیلیوں کے حقیقی اثرات اس وقت تک ظاہر نہیں ہو سکیں گے۔ جب تک ہم نئی ٹیکنالوجیز ۔۔۔۔ کمپیوٹرز، الیکٹرانکس، بیرونی خلا اور سمندروں سے حاصل کردہ نئے مادوں کا حیاتی افزائش سے باہمی تعلق اور بعدازاں، ان سب کا توانائی کی نئی بنیاد کے ساتھ ارتباط ۔۔۔۔ کو مجتمع کرنے کے مرحلے تک رسائی حاصل نہیں کر لیتے۔ ان سب عناصر کے یکجا ہونے کی صورت میں ایجادات کا ایسا طوفان آئے گا، جس کا انسانی تاریخ میں کبھی سوچا بھی نہیں گیا ہوگا۔ ہم تیسری لہر کی تہذیب کے لئے ڈرامائی انداز کا ایک نیا تکنیکی دائرہ تعمیر کر رہے ہیں۔

MashalBooks.org

مکنیکی باغی(Techno-rebels)

اتنی عظیم الشان پیش رفت ۔۔۔۔ اور ارتقاء کے مستقبل کے لئے اس کی بے پناہ اہمیت کے پیش نظر بہت ہی ضروری ہو گیا ہے کہ ہم ابھی سے اس کی رہنمائی کی ابتداء کر دیں۔ اس کام سے آنکھیں چرانا یا لاتعلقی اختیار کر لینا، ہمارے اور ہماری آئندہ نسلوں کے لئے تباہ کن ثابت ہوسکتا ہے۔ چونکہ تاریخ میں تبدیلیوں کی ایسی قوت، سکیل اور رفتاری کی کوئی نظیر نہیں ملتی اور تین میل نامی جزیرے، کی ہلاکت خیزی، ڈی سی 10 کا افسوس ناک تصادم، میکسیکو کے ساحل پر تیل کے ضیاع کو روکنے کی ناکامکوششوں اور سینکڑوں دوسرے ٹیکنالوجیکل خطرات کی خبریں ہمارے ذہنوں میں ابھی تازہ ہیں۔ ان تمام تباہ کن خطرات کے مدنظر، کیا ہم مستقبل کی کہیں زیادہ طاقت ٹیکنالوجیز کی نشوونما اور ان کی یکجائیت ۔۔۔۔ دوسری لہر کے دوران روائتگ نظر اور خود غرضانہ معیاروں کے مطابق ہی ۔۔۔۔ کنٹرول کرنے کی اجازت دے سکتے ہیں؟ گذشتہ تین صدیوں کے دوران سرمایہ دارانہ یا سوشلسٹ اقوام، دونوں ہی میں نئی ٹیکنالوجیز کے متعلق اٹھائے گئے بنیادی سوالات بالکل سیدھے سادے رہے ہیں۔ کیا یہ ٹیکنالوجیز کسی معاشی مفاد یا فوجی اہمیت کی حامل ہیں؟ اب صرف یہ معیار ناکافی ہو گئے ہیں۔ نئی ٹیکنالوجیز کو کہیں زیادہ کٹھن امتحانات ۔۔۔۔ ماحولیاتی، سماجی، معاشی اور بنیادی حکمت عملیوں سے متعلقہ ۔۔۔۔ سے گزرنا ہوگا۔

امریکی قومی سائنس فاؤنڈیشن کی تیار کردہ ''ٹیکنالوجی اور حوادث'' نامی رپورٹ ۔۔۔۔ حالیہ سالوں میں ٹیکنالوجی کی بنا پر بپاشدہ تباہ کاریوں کا ایک کیٹلاگ ۔۔۔۔ کا بغور مطالعہ کرنے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ان میں سے اکثر تباہ کاریوں کا تعلق، تیسری لہر کی ٹیکنالوجیز کی بجائے، دوسری لہر کی ٹیکنالوجیز سے تھا۔ وجہ صاف ظاہر ہے۔ تیسری لہر کی ٹیکنالوجی کا ابھی Mوسیع پیمانے پر استعمال شروع ہی نہیں ہوا۔ ان میں سے کئی ایک تو ابھی شیر خوار حالت میں ہیں۔ بہر حال ہم ابھی سے الیکٹرانک دھند، اطلاعاتی آلودگی، بیرونی خلا میں تصادم، تخلیقی اخراج، آب و ہوا میں مداخلت اور ماحولیاتی جنگ و جدل ۔۔۔۔ مثلاً کہیں دور دراز مقام سے لہریں مرتعش کر کے زلزلے پیدا کرنے کی دیدہ دانستہ کوشش ۔۔۔۔ کے خطرات کی جھلک محسوس کر سکتے ہیں۔ نئی ٹیکنالوجیکل پیش رفت کے ساتھ ساتھ، اس سے بھی

کہیں آگے، اور بہت سے خطرات کا ایک زبردست جمگھٹا موجود ہے۔

ان حالات کے پیش نظر نئی ٹیکنالوجی کے خلاف، حالیہ برسوں میں ہونے والی وسیع وعریض تقریباً بلاامتیاز، عوامی مزاحمت پر قطعی حیرت نہیں ہونی چاہئے۔ دوسری لہر کے ابتدائی دور میں بھی، نئی ٹیکنالوجی کا راستہ روکنے کے لئے، ایسی نئی مکینیکل کٹنگ مشینوں کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا، کیونکہ اس سے ان کے بے روزگار ہونے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔1676ء میں ربن کے کارکنوں نے یہی حشر اپنی مشینوں کے ساتھ کیا۔1710ء میں نئے متعارف سٹاکنگ فریموں کے خلاف احتجاجی ہڑتالیں ہوئیں۔ بعدازاں، ٹیکسٹائل ملوں میں استعمال ہونے والی فلائنگ شٹل کے موجد جان نے ایک مشتعل ہجوم کو اپنے گھر پر دھاوا بولتے دیکھا اور بالآخر وہ برطانیہ ہی چھوڑ کر چلا گیا۔معروف ترین مثال 1811ء کی ہے، جب لوڈائٹس نامی مشین مخالف گروہ نے ناٹنگھم میں اپنی ٹیکسٹائل مشینری کو مکمل طور پر تباہ کر ڈالا تھا۔

تاہم مشینوں کے خلاف یہ ابتدائی غم وغصہ اور نفرت کے واقعات اکا دکا تھے اور بلا سوچے سمجھے ہو جاتے تھے۔ ایک مورخ کا کہنا ہے کہ اکثر واقعات میں ''مشینوں سے نفرت کی بجائے، کارخانہ دار کی قابل اعتراض حرکات اور طریق کار، جھگڑے اور فساد کی وجہ نظر آئے۔'' ناخواندہ مرد اور خواتین کارکنوں، غریب، بھوکے اور مایوس مزدوروں کو مشینوں کی صورت میں اپنے انفرادی وجود کے لئے زبردست خطرہ دکھائی دیا۔ تیز رفتار ٹیکنالوجی کے خلاف، آج کا باغی پچھلے باغیوں سے مختلف ہے۔اس میں بے تحاشا لوگ فوج در فوج شامل ہوتے جا رہے ہیں۔۔۔۔ غریب اور جاہل کا کوئی سول ہی نہیں۔۔۔۔ یہ لوگ ٹیکنالوجی یا معاشی نشوونما کے قطعی مخالف نہیں، لیکن انہیں موجودہ ٹیکنالوجی کے غیر منضبط تسلط کی وجہ سے، اپنے وجود اور اپنی دنیا کے وجود کو شدید خطرات نظر آ رہے ہیں۔

ان میں سے کئی جنونیوں کو اگر موقع مل جائے تو شاید وہ بھی لوڈائٹ کی طرح تخریب کاری کا راستہ اختیار کر لیں۔کسی کمپیوٹر تنصیب یا حیاتیاتی لیبارٹری یا جوہری ری ایکٹر کی نامکمل عمارت کو بم سے اڑا دینے کا تصور کون سا ایسا مشکل کام ہے۔ جو بھی شخص بڑی آسانی سے کسی تباہ کن ٹیکنالوجی کا سہارا لیکر ایسا ہتھیار بنا سکتا ہے جس کے ذریعے نئی ٹیکنالوجی کے ذمہ دار سفید پوش سائنس دانوں کا شکار کیا جا سکے۔مستقبل کا کوئی بھی سیاست

دان سستی شہرت کے حصول کے لئے ''کیمبرج ٹین'' یا ''ادک رج سیون'' کے خلاف تحقیقات کرا سکتا ہے۔

بہر حال آج کل کے تکنیکی باغیوں میں سے نہ کوئی بم پھینکنے والا ہے اور ہی لوڈائٹس جیسا گروہ۔ ان میں سے کروڑوں عام شہریوں کے ساتھ ساتھ سائنسی ٹریننگ لئے ہوئے افراد۔۔۔ جوہری انجینئرز، بائیو کیمسٹ، ماہرین طبیعات، محکمہ عوامی صحت کے افسران اور ماہرین حیاتیات، ہزاروں کی تعداد میں شامل ہیں۔

یاد رہے کہ لوڈائٹس کے برعکس، یہ لوگ بہت منظّم اور باشعور لوگ ہیں۔ یہ اپنے ملکنیکی رسائل چھاپتے ہیں اور پراپیگنڈا مہم بھی چلاتے ہیں۔ یہ نہ صرف جلسے جلوس اور احتجاج منظّم کرتے ہیں بلکہ قانونی مقدمات لڑنے کے ساتھ ساتھ قانون سازی میں بھی معاونت کرتے ہیں۔

یہ تحریک، جیسے عموماً رجعت پسندی کا طعنہ دیا جاتا ہے، درحقیقیت ابھرتی ہوئی تیسری لہر کا ایک اہم حصہ ہے کیونکہ اس کے اراکین سہ طرفہ سیاسی اور معاشی جنگ اور ٹیکنالوجی کے میدان میں متوازی جدوجہد۔۔۔ توانائی کے سلسلے میں، جس کا ذکر ہم ابتداء میں کر چکے ہیں۔۔۔ میں مستقبل کا رہنما دستہ ہوں گے۔

یہاں بھی ہمیں دوسری لہر کی قوتیں ایک طرف اکٹھی نظر آتی ہیں اور پہلی لہر کی احیاء کے حامی دوسری طرف، جبکہ تیسری لہر کی قوتیں، ان دونوں کے خلاف نبرد آزما نظر آتی ہیں۔ یہاں دوسری لہر کی قوتیں وہ ہیں جو ٹیکنالوجی کے لئے قدیم اور بے سوچی سمجھی اپروچ کی حمایت کرتی ہیں۔ ''اگر یہ کام کے قابل ہے تو اسے تیار کرو، اگر یہ فروخت ہوتی ہے تو اسے بناؤ۔ اگر یہ ہمیں مضبوط کرتی ہے تو اسے تعمیر کرو'' دقیانوسی رنگ میں رنگے، صنعتی دور کی حقیقت کے ان نشانات ترقی، جن میں سے بہت سے گزری ہوئی دوسری لہر کے مرہون منت ہیں، ٹیکنالوجی کے غیر ذمہ دارانہ اطلاق میں، ان کا اپنا مخصوص مفاد پوشیدہ ہے۔ یہ خطرات کو نظر انداز کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور دوسری جانب، ایک دفعہ پھر ہمیں، پہلی لہر کی ابتدائی ٹیکنالوجیز کے شیدائی، رومانی انتہا پسندوں کا شور وغوغا سنائی دیتا ہے۔ درمیانے طبقے کے لوگ اپنی سابقہ خوشحالی کو ذہن میں رکھے، ازمنہ وسطی کی دستکاریوں اور گھریلو

صنعتوں کے دور کی واپسی کا خواب دیکھتے ہیں اور ٹیکنالوجیکل پیش رفت کی بلا امتیاز مزاحمت میں اسی طرح اندھا دھند طریقے سے پیش پیش رہتے ہیں، جیسے دوسری لہر کے لوگ ٹیکنالوجی کی اندھی حمایت کرتے ہیں۔ وہ ایک ایسی دنیا میں واپسی کے خواہاں ہیں، جہاں ہماری بات تو چھوڑیئے، وہ خود بھی انتہائی کراہیت محسوس کریں گے۔

ان دونوں انتہاؤں کے خلاف مجتمع ہونے والے لوگوں کی تعداد بھی ہر ملک میں بڑھتی جا رہی ہے، یہی لوگ مکنیکی باغیوں کا لشکر تشکیل دے رہے ہیں۔ وہ لاشعوری طور پر تیسری لہر کے ایجنٹ ہیں اور ٹیکنالوجی کے بجائے ایسے سخت سوالات کرتے ہیں کہ ہم کس قسم کا۔۔۔۔مستقبل کا۔۔۔۔معاشرہ چاہتے ہیں۔ انہیں بخوبی علم ہے کہ ہمارے پاس اتنے زیادہ ٹیکنالوجیکل مواقع ہیں کہ ان سب پر مزید پیسہ خرچ کرنا، اس ترقی دینا اور ان کا مناسب استعمال کرنا ہمارے بس میں ہی نہیں۔ اسی لئے وہ ان امکانات کے ازحد محتاط چناؤ کی ضرورت پر زور دیتے ہیں اور وسیع تر سماجی اور ماحولیاتی مقاصد کی تکمیل کرنے والی ٹیکنالوجیز کے انتخاب حمایت کرتے ہیں۔ بجائے اس کے کہ ٹیکنالوجی ہمارے مقاصد کا تعین کرے، ان کی خواہش ہے کہ ٹیکنالوجی کی طاقت کی مختلف جہتوں پر سماجی کنٹرول کو موثر بنایا جائے۔

تکنیکی باغیوں نے ابھی تک کوئی واضح اور لمبا چوڑا پروگرام تشکیل نہیں دیا، لیکن اگر ہم ان کے مختلف منشوروں، قانونی مقدمات، بیانات اور ان کی مطالعاتی سرگرمیوں کی چھان بین کریں تو ٹیکنالوجی کے مشاہدے کے ایک نئے راستے کی جانب رواں دواں، سوچ کی بہت سی لہروں کو، صاف طور پر پہچانا جا سکتا ہے۔ تیسری لہر کے مستقبل کی جانب عبوری دور کے معاملات کے لئے یہ خاصی مثبت حکمت عملی ہے۔

تکنیکی باغی، بات کی ابتداء اس دلیل سے کرتے ہیں کہ زمین کا حیاتیاتی دائرہ بہت ہی نازک اور حساس ہے اور ٹیکنالوجیز جتنی زیادہ طاقت ور ہونگی، کرہ ارض کے لئے ناقابل تلافی نقصانات کے خطرات اتنے ہی زیادہ ہوتے جائیں گے۔ ان کا مطالبہ یہ ہے کہ نئی ٹیکنالوجی کے متوقع نقصانات اور منفی اثرات کا پوری طرح ادراک کیا جائے، ان خطرناک ٹیکنالوجیز متوقع اثرات سے بچاؤ کے لئے دوبارہ ڈیزائن کیا جائے یا انہیں ختم کر

دیا جائے۔۔۔ قصہ مختصر دوسری لہر کے دور کی خراب صورت حال کے بجائے مستقبل کی ٹیکنالوجیز کو زیادہ سختی سے ارضی اور ماحولیاتی حالات سے مطابقت پیدا کرنے کا پابند بنایا جائے۔

تکنیکی باغیوں کا دعویٰ ہے کہ یا تو ہم ٹیکنالوجی کو کنٹرول کرتے ہیں یا وہ ''ہم'' پر مسلط ہو جاتی ہے۔۔۔ اور اس ''ہم'' میں سے اب صرف سائنس دانوں، انجینئروں، سیاست دانوں اور کاروباری اشرافیہ کا ایک چھوٹا سا حلقہ ہی، مراد نہیں بلکہ مغربی جرمنی، فرانس، سویڈن، جاپان اور امریکہ میں (ابھرتی ہوئی ایٹم مخالف تحریک کی وجوہات کچھ بھی رہی ہوں) کنکارڈ جہازوں کے خلاف جنگ یا تخلیقی ریسرچ کو باقاعدہ اور منضبط کرنے کے مطالبات، وسیع پیمانے پر اسی جذباتی مطالبے کا انعکاس ہیں کہ ٹیکنالوجی سے متعلقہ فیصلے کرنے کے نظام کو زیادہ سے زیادہ جمہوری بنایا جائے۔

تکنیکی باغیوں کا خیال ہے کہ ٹیکنالوجی کو شاندار اور پر شکوہ بنانے کے چکر میں، اس کا حجم بڑھانے، گراں کرنے یا پیچیدہ بنانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ دوسری لہر کی بھاری بھرکم ٹیکنالوجیز بظاہر جتنی مستعد اور کارآمد نظر آتی تھیں، حقیقت میں ان کی کارکردگی اتنی تھی نہیں کیونکہ کارپوریشنوں اور اشتراکی اداروں نے آلودگی کو ختم کرنے کے مختلف اخراجات، بے روزگاروں کے تحفظ یا کام کاج سے بے زاری کے مسائل کا سارا بوجھ اپنے سر سے ہٹا کر معاشرے کے کندھوں پر ڈال دیا، ان سب کو بھی اگر پیداواری اخراجات کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو بظاہر اعلیٰ کارکردگی کی حامل ان مشینوں کی استعداد منفی ہو کر رہ جاتی ہے۔

اسی لئے تکنیکی باغی ''مناسب ٹیکنالوجیز'' کی ایک ایسی مکمل رینج کی تشکیل کے حامی ہیں، جن کا مقصد انسانی روزگار کی فراہمی، آلودگی سے بچاؤ، ماحول کی حفاظت اور صرف قومی اور بین الاقوامی مارکیٹ کے لئے پیداوار کے بجائے ذاتی اور مقامی استعمال کی اشیاء تیار کرنا ہو۔ تکنیکی باغیوں نے چھوٹے پیمانے کی ٹیکنالوجیز کی مدد سے، دنیا بھر میں ماہی گیری اور غذائی تیاری سے لے کر توانائی کی پیداوار، بیکار اور ضائع شدہ مواد کا دوبارہ استعمال، سستی تعمیرات اور سادہ ٹرانسپورٹ کے شعبوں میں لاتعداد تجربات کر ڈالے ہیں۔

ان میں سے کئی تجربات بہت سیدھے سادے اور افسانوی ماضی کی یاد دلاتے

ہیں جبکہ بہت سے اچھے خاصے عملی ہیں۔ بعض میں جدید ترین مواد اور سائنسی آلات کے استعمال سے، پرانی تکنیکوں کو نئے انداز میں یکجا کر دیا گیا ہے۔ مثلاً وسطی دور کی ٹیکنالوجی کے مورخ جین گمپل نے سادہ اوزاروں کے ایسے شاندار ماڈل تیار کئے ہیں، جو غیر صنعتی ممالک میں بہت مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ ان میں سے بعض میں پرانے طریق کار کو جدید مواد کے ساتھ یکجا گیا ہے۔ ہوا بازی میں دلچسپی کی تیز تر لہر (بائی پاس ٹیکنالوجی کے استعمال کی) ایک اور مثال مہیا کرتی ہے۔۔۔۔ جس کے ذریعے بے پناہ وزن اٹھانے کی صلاحیت کی حامل، انتہائی ترقی یافتہ مادے یا اشیاء سے تیار کردہ ایجاد، اب حقیقت کا روپ دھار رہی ہے۔ فضائی جہاز (airships) فضائی اعتبار سے بہت محفوظ ہیں اور انہیں برازیل اور غالباً نائیجریا جیسے علاقوں میں، جہاں سڑکیں ناپید ہیں، انہیں آہستہ رو مگر ارزاں اور محفوظ ٹرانسپورٹ کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ مناسب یا متبادل ٹیکنالوجیز کے ساتھ کئے گئے تجربات، خصوصاً توانائی کے شعبے میں یہ ظاہر کرتے ہیں کہ بعض چھوٹے پیمانے کی ٹیکنالوجیز بھی وسیع پیمانے کی ٹیکنالوجیز کی طرح ''دلکش'' اور پیچیدہ ہو سکتی ہیں، بشرطیکہ ان کے مضر اثرات کو اچھی طرح چھان پھٹک لیا جائے اور مشین اپنا کام موزوں طریقے سے سرانجام دے سکتی ہو۔

چہرہ ارض پر، سائنس اور ٹیکنالوجی کے ہاتھوں پیدا شدہ، حد سے زیادہ عدم توازن بھی تکنیکی باغیوں کے لئے زبردست وجہ اضطراب ہے۔ اس تشویش میں دنیا بھر کے تین فیصد سائنس دان۔۔۔۔ جن کا تعلق ان ممالک سے ہے جہاں دنیا کی 75% آبادی رہتی ہے۔۔۔۔ بھی شامل ہیں۔ وہ غربت زدہ دنیا کی ضرورت اور خلائی اور سمندری وسائل کی زیادہ منصفانہ شراکت کی جانب زیادہ ٹیکنالوجیکل توجہ دینے کی حمایت کرتے ہیں۔ جہاں وہ سمندروں اور آسمانوں کو نسل انسانی کی مشترکہ میراث تصور کرتے ہیں، وہاں وہ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ہندوستانیوں، عربوں اور قدیم چینیوں سمیت بہت سی اقوام کی تاریخی شراکت کے بغیر، موجودہ ترقی یافتہ ٹیکنالوجی عالم وجود میں ہی نہیں آ سکتی تھی۔

آخری بات، جس پر وہ زور دیتے ہیں، یہ ہے کہ تیسری لہر میں داخل ہوتے ہوئے، دوسری لہر کے وسائل کے ضیاع اور آلودگی آمیز پیداواری نظاموں سے ایک ایسے

MashalBooks.org

زیادہ ''ہاضم'' نظام کی جانب قدم بہ قدم پیش رفت کی جانی چاہئے، جو ہر صنعت کی پیداوار اور ضمنی پیداوار کا دوبارہ استعمال یقینی بنا کر فضلے اور آلودگی کا خاتمہ کر سکے، غرض ایک ایسا نظام مقصود ہے، جس میں ایسی ہر پیداوار سے احتراز کیا جائے جو کسی دوسرے پیداواری عمل میں استعمال نہ ہو سکتی ہو۔ خالص پیداواری مفہوم میں نہ صرف یہ نظام بہت اعلیٰ کارکردگی کا حامل ہوگا بلکہ حیاتیاتی دائرے کو لاحق خطرات بھی تقریباً ختم کر دے گا۔

تکنیکی باغیوں کا یہ پروگرام، مجموعی طور پر ٹیکنالوجیکل تسلط کو انسانی دوست بنانے کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ تکنیکی باغی، اس حقیقت کو مانیں، یا نہ مانیں مگر وہ واقعتاً تیسری لہر کے ایجنٹ ہیں۔ آنے والے سالوں میں ان کی تعداد تیزی سے بڑھے گی کیونکہ تہذیب کے نئے مرحلے میں پیش رفت کا یہ بھی اتنا ہی اہم حصہ ہیں جتنا کہ وینس کی جانب ہماری مہمات یا ہمارے حیرت انگیز کمپیوٹرز، ہماری حیاتیاتی دریافتیں یا سمندر کی تہوں میں ہماری تحقیق و تلاش۔

پہلی لہر کے مثالیت پرستوں اور دوسری لہر کے ٹیکنالوجی کے ہمنواؤں سے پیدا شدہ تضادات کے نتیجے میں ایسی عاقلانہ ٹیکنالوجیز جنم لیں گی جو ہمارے مطلوبہ نئے اور قابل برداشت نظام توانائی سے ہم آہنگ ہوں گی۔ نئی ٹیکنالوجیز کے اس نئی بنیاد توانائی سے منسلک ہوتے ہی، ہماری ساری تہذیب کی ایک بالکل ہی نئی سطح اجاگر ہوگی۔

اس دوران ہمیں موثر ماحولیاتی اور سماجی کنٹرول کی حامل بڑی بڑی عالیشان، سائنسی بنیادوں پر استوار صنعتوں کے شانہ بشانہ، اتنی ہی پیچیدہ مگر کم پھیلاؤں والی، چھوٹی اور زیادہ انسان دوست صنعتیں فعال نظر آئیں گی۔ لیکن ان دونوں کے ہی بنیادی اصول دوسری لہر کے تکنیکی دائرے سے بالکل مختلف ہونگے صنعت کی یہ دونوں سطحیں یکجا ہو کر مستقبل کی عظیم کارکردگی کی تشکیل کریں گی۔

لیکن یہ ایک بہت وسیع وعریض منظر نامے کی صرف تفصیل ہی ہے کیونکہ تکنیکی دائرے کی سی تبدیلی کے دوران ہم اطلاعاتی دائرے میں بھی انقلابی تبدیلیاں لاتے جا رہے ہیں۔

باب12

ذرائع ابلاغ کا عدم پھیلاؤ

جاسوس ایجنٹ ہمارے زمانے کا ایک بہت طاقتور استعارہ ہے۔ یہ استعارہ پوری کامیابی کے ساتھ اپنے سارے ہم عصر تصورات پر چھایا رہا ہے۔ سینکڑوں فلموں نے 007اور اس کے ساتھ کرداروں کو گویا زندہ جاوید بنا کر رکھ دیا۔ ٹی وی اور کتابوں کے سستے ایڈیشنوں نے جاسوس کا ایک ایسا لا متناہی تصور پیش کیا، جس میں جرات و بہادری، رومانویت کا شاہکار، یہ فرد اخلاقی قیود سے بیگانہ اور منظر حیات پہ چھایا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ حکومتیں، اسی دوران، جاسوسی پر اربوں روپے خرچ کرتی رہی ہیں۔ کے جی بی، سی آئی اے اور دوسری بہت سی جاسوسی ایجنسیاں۔۔۔ برلن سے بیروت اور مکاؤ سے میکسیکو سٹی تک۔۔۔ ایک دوسرے سے گتھم گتھا نظر آتی ہیں۔ ماسکو میں مغربی اخبار نویسوں پر جاسوسی کا چانسلرز حکومت سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ واشنگٹن میں کانگریس کی تحقیقاتی کمیٹی، بیک وقت امریکی اور ریائی خفیہ ایجنٹوں کی کارستانیوں سے پردہ اٹھاتی ہے، جبکہ خود آسمان ایسے جاسوس سیٹلائٹس سے بھرا پڑا ہے جو بظاہر زمین کے ایک ایک انچ کی تصاویر اتارنے میں مصروف ہیں۔

جاسوس کا کردار، تاریخ میں کوئی نئی چیز نہیں، چنانچہ یہ سوال بے جا نہیں کہ خاص اسی دور میں جاسوس کا نظریہ عوامی تخیل پر اس بری طرح کیوں چھا گیا کہ نجی آنکھیں، پولیس اور کاؤ بوائز جیسے کردار پس منظر میں چلے گئے۔ یہ سوال ذہن میں آتے ہی جاسوس اور ان ثقافتی ہیروز کے درمیان ایک اہم فرق محسوس ہونے لگتا ہے۔ افسانوی پولیس والے اور کاؤ بوئے عموماً جسمانی طاقت یا زیادہ سے زیادہ پستولوں پر انحصار کرتے ہیں، جب کہ افسانوی جاسوس جدید ترین اور آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی ٹیکنالوجی۔۔۔ الیکٹرانک جاسوسی

MashalBooks.org

آلات، لاتعداد کمپیوٹرز، انفراریڈ کیمروں، اڑنے والے یا تیرتی کاروں، ہیلی کاپٹرز، یک نشست آبدوزوں، موت کی شعاعوں اور اسی طرح کی دوسری ایجادات سے مسلح ہوتا ہے۔

بہر حال جاسوسیت کے پھیلاؤ کا ایک گہرا سبب اور بھی ہے۔ کاؤبوائز، پولیس اور نجی آنکھیں، مہم جو اور محقق لوگ۔۔۔۔ کتابوں اور فلم کے روایتی ہیروز۔۔۔۔ٹھوس حقیقتوں کے متلاشی ہوتے ہیں۔ وہ جانوروں کے لئے زمین چاہتے ہیں، انہیں پیسہ چاہئے یا وہ کسی بدمعاش کو پکڑنا چاہتے ہیں یا کسی لڑکی کا حصول ان کا مقصد ہوتا ہے۔ جاسوسی کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔

کیونکہ جاسوس کا بنیادی کام معلومات کا حصول ہے اور معلومات کا شعبہ شاید دنیا کا انتہائی تیزی سے ابھرتا ہوا اور اہم ترین کاروبار بن گیا اور جاسوس اس انقلاب کا جیتا جاگتا نشان بن گیا ہے جو اب معلوماتی دائرے کو اپنی گرفت میں لے رہا ہے۔

تصورات کا کارخانہ

ہمارے عین درمیان معلومات بم کا دھماکہ ہو رہا ہے، تصورات کے آتشیں گولے ہم پر برس رہے ہیں اور نجی دنیا سے متعلق ہمارے فکر وعمل میں تبدیلیاں پیدا کر رہے ہیں۔ دوسری لہر سے تیسری لہر کے معلوماتی دائرے کی جانب بڑھتے ہوئے، ہم اپنی نفسیات کو بھی بدل رہے ہیں۔

ہم میں سے ہر شخص، اپنے دماغ میں، حقیقت کا ذہنی ماڈل۔۔۔۔ تصورات کا کارخانہ۔۔۔۔ تخلیق دے لیتا ہے۔ ان میں سے بعض تصورات بصری اور سمعی، بلکہ لمس کے ذریعے محسوس بھی ہو سکتے ہیں۔ بعض صرف (تخیلاتی) ہوتے ہیں، مثلاً، آنکھ کے کونے سے نظر آتی نیلے آسمان کی جھلک، جیسے ہمارے ماحول سے متعلق معلوماتی نشانات۔ بعض ''رابطے'' ہوتے ہیں جو رشتوں اور تعلقات کی تعریف کرتے ہیں، جیسے ''ماں'' اور ''بچے'' کا درمیانی تعلق بتانے والے دو الفاظ بعض سادہ ہوتے ہیں اور بعض پیچیدہ اور کسی نظریئے کی طرح تخیلاتی ہوتے ہیں۔ مثلاً ''افراد زر'' بڑھتی ہوئی اجرتوں کی وجہ سے پیدا ہوتے ہے۔'' اس قسم کے تصورات ہمارے دنیاوی منظر نامے میں اضافہ کرتے رہتے ہیں۔۔۔۔ ہمیں زمان و مکان اور ہمارے اردگرد کے ذاتی تعلقات کے دائرہ کار میں ہماری ذات کی شناخت

میں مدد دیتے ہیں۔

یہ تصورات کہیں اور سے نہیں آتے بلکہ ہمارے اردگرد کے ماحول سے ملنے والی معلومات یا اشارات و کنایات سے اس طرح تشکیل ہوتے ہیں کہ ہم سمجھ نہیں پاتے۔ جوں جوں ہمارا ماحول تبدیلایوں۔۔۔۔ ہمارے کاموں، گھروں، عبادت گاہوں، سکولوں اور سیاسی معاملات پر تیسری لہر کا اثر۔۔۔۔ کی زد میں آتا ہے، ہمارے اردگرد موجود معلومات کا سمندر بھی تبدیل ہونے لگتا ہے۔

اس میڈیا کے معرض وجود میں آنے سے پہلے، آہستہ رو تبدیلی کے دیہاتی ماحول میں پروان چڑھتا بچہ، ایک چھوٹے اور محدود سے ذرائع۔۔۔۔ استاد، مولوی، قبیلے کا بڑا یا سربراہ اور سب سے بڑھ کر خاندان۔۔۔۔ سے حاصل کردہ تصورات سے اپنی حقیقت کا ماڈل تعمیر کیا کرتا تھا۔ ماہر مستقبلیات اور نفسیات دان ہربرٹ جرجوائے نے لکھا ہے ''گھر میں ٹی وی یا ریڈیو قسم کی کوئی چیز نہیں ہوتی تھی، جو بچے کو، زندگی کے مختلف شعبوں سے، مختلف طرح ک اجنبیوں، بلکہ مختلف ممالک کے باشندوں سے ملنے کا موقع فراہم کرتی۔۔۔۔ بہت کم لوگ پردیس کا کوئی شہر دیکھ پائے ہونگے۔۔۔۔ چنانچہ نقالی کرنے یا انہیں اپنا ماڈل بنانے کے لئے، مختلف طرح کے لوگوں کی بہت کم تعداد میسر ہوتی تھی۔

''ان کی پسند ناپسند بھی، اسی وجہ سے بہت ہی محدود تھی کہ جن لوگوں کو وہ اپنے لئے مثال یا نمونہ بنانا چاہتے، ان کے اپنے تجربات و مشاہدات بھی دوسرے لوگوں کی طرح انتہائی محدود نوعیت کے ہوتے تھے۔'' اسی لئے دیہاتی بچے کے تخلیق کردہ، دنیا سے متعلقہ تصورات واجبی اور سطحی ہوتے تھے۔

عموماً دو طرح کے پیغامات کی اسپر بھرمار ہوتی تھی۔ یہ پیغامات یا تو کسی کی لمبی چوڑی گفتگو سے ملتے، جن میں وقفوں اور بار بار دھرائی گئی باتوں کا سلسلہ ہوتا یا مختلف معلومات دینے والوں کے ذریعے نظریات مربوط کڑیوں کی شکل میں اس پر ٹھونسے جاتے۔ ''یہ نہ کرو، وہ نہیں کرنا'' جیسے مسلسل احکامات اسے چرچ اور سکول سے موصول ہوتے رہتے۔ خاندان اور ریاست کی تمام ہدایات انہی دونوں اداروں، سکول اور چرچ کے ذریعے اس کے ذہن میں ٹھونسی جاتیں۔ برادری کی اجتماعی رائے اور اسے تسلیم کرنے کی مجبوری

جیسے عوامل بچے کی قوت متخیلہ اور اس کے رویئے کو محدود تر کر دیتے تھے۔

دوسری لہر نے ایسے ذرائع کی تعداد خاصی بڑھا دی، جن سے فرد، حقیقت کے بارے میں اپنی تصویر خود بنا سکتا تھا۔ اب بچے کے لئے مظاہر فطرت اور لوگ ہی تصورات کا ذریعہ نہیں رہے بلکہ اخبارات، رسالے، ریڈیو اور بعد میں ٹیلی ویژن بھی، اس کے تصورات کا ماخذ بن گئے۔ بہر حال عبادت گاہیں، ریاست، گھر اور سکول بیک وقت اپنی قدروں کی حفاظت کے لئے، ایک دوسرے کی تقویت دیتے رہے، لیکن اب ماس میڈیا خود بھی انتہائی طاقتور آہنگ کا مالک ہو چکا تھا اور اس کی طاقت، معاشرے کی ذہنی رو سے بہتے تصورات کو معیاری بنانے کے لئے، علاقائی، مذہبی، قبائلی اور لسانی سرحدوں کے بھی پار استعمال ہو رہی تھی۔ بعض بصری تصورات کو اتنے وسیع پیمانے پر پھیلایا گیا اور کروڑوں ذہنوں میں اس طرح راسخ کیا گیا کہ وہ تصورات بتوں اور مجسموں کی شکل اختیار کر گئے۔ لینن کا تصور، سرخ لہراتے جھنڈے تلے اس کا فاتحانہ چہرہ، مصلوب حضرت عیسیٰ کے تصور کی طرح، کروڑوں انسانوں کے ذہنوں میں گویا تجسیم ہو گیا۔ ڈربی اور لاٹھی کے ساتھ چارلی چپلن کا تصور یا نورن برگ میں ہٹلر کا آگ بگولہ چہرہ، بوچن والڈ میں لکڑی کے تختوں کی طرح ڈھیر لاشوں کا تصور، فتح کا نشان ''V'' بناتے ہوئے چرچل کا یا سیاہ قبا پہنے ہوئے روز ویلٹ کا تصور، مارلن منرو کا تیز ہوا میں اڑتا سکرٹ، میڈیا کے سینکڑوں درخشندہ ستاروں اور ہزار ہا، مختلف قسم کی ساری دنیا میں جانی پہچانی تجارتی اشیاء۔۔۔ امریکہ میں ایوری سوپ کی ٹکیا، جاپان میں موری ناگا چاکلیٹ، فرانس میں پیریر کی بوتل۔۔۔ یہ سارے عالم گیر تصوراتی فائل کا ایک معیاری حصہ بن چکے ہیں۔

ماس میڈیا کے ذریعے عوامی ذہنوں میں ٹھونسے گئے، مرکزی طور پر تیار کردہ تصورات نے صنعتی پیداواری نظام کو مطلوب معیاری رویئے پیدا کرنے میں بے حد مدد کی۔

آج تیسری لہر اس سارے سلسلے کو بری طرح بدل رہی ہے۔ معاشرے میں رونما ہوتی ہوئی کوئی بھی تبدیلی متوازی طور پر ہمارے اندر بھی ایسا ہی اسراع پیدا کرتی ہے۔ نئی معلومات ہم تک پہنچتی ہیں تو ہم اپنی تصوراتی فائل کو زیادہ سے زیادہ تیز رفتار سے اور مسلسل تبدیل کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ گزری ہوئی حقیقت پر مبنی پرانے تصورات بدلنے ہی

چاہئیں کیونکہ انہیں وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ کئے بغیر، ہمارے افعال حقیقت سے دور ہوتے جاتے ہیں اور آہستہ آہستہ ہماری اہلیت کمزور پڑتی جاتی ہے۔ حقیقت کا سامنا کرنا، ہمارے لئے ناممکن ہوتا جاتا ہے۔

ہمارے اندر تصوراتی عمل کی اس تیز رفتاری کا مطلب یہ ہے کہ تصورات کی افزائش زیادہ سے زیادہ عارضی نوعیت کی ہوتی ہے۔ وقتی آرٹ، لمحاتی مزاحیہ کیفیت' پولا رائیڈ تصاویر، زیراکس فوٹو کاپیاں اور وقتی استعمال کی تصاویر، یہ سب لمحاتی تصورات ہیں، جو آتے ہیں اور غائب ہو جاتے ہیں۔ نظریات، عقیدے اور رویئے تیز رفتاری سے شعور میں آتے ہیں، چیلنج ہوتے ہیں، مات کھاتے ہیں اور اچانک ہی شعور سے نہ جانے کہاں غائب ہو جاتے ہیں۔ سائنسی اور نفسیاتی نظریات روزانہ ہی تغیر و تبدیل اور شکست و ریخت کا شکار ہوتے ہیں۔ عقیدے ٹوٹتے پھوٹتے ہیں۔ مشہور و معروف موسیقار و رقاص، عارضی طور پر ہماری شعوری سطح پر اپنی جگہ بناتے ہیں۔ متضاد سیاسی اور اخلاقی نعرے ہم پر حملہ آور ہوتے رہتے ہیں۔

تصوراتی اشیاء کی تبدیلی کے اس گردابی نظارے سے، تصور کی پیدائش کے عمل میں تبدیلی کے متعلق صحیح آگہی کا ادراک خاصا مشکل ہے، کیونکہ تیسری لہر صرف ہمارے اطلاعاتی بہاؤ کو ہی تیز تر نہیں کرتی بلکہ اس گہرے اطلاعاتی ڈھانچے کو بھی تبدیل کر ڈالتی ہے، جس پر ہمارے روزمرہ کے افعال کا دارومدار ہوتا ہے۔

ذرائع ابلاغ کا سکڑاؤ

دوسری لہر کے دوران ماس میڈیا زیادہ سے زیادہ طاقتور ہوتا گیا۔ اب ایک حیرت انگیز تبدیلی نے جنم لیا ہے۔ جوں جوں تیسری لہر کی طرفانی آمد کا غلغلہ ہو رہا ہے، ماس میڈیا، اپنے حلقہ اثر کو بڑھانے کے بجائے، اچانک، اس میں اشتراک پر مجبور ہونے لگا ہے۔ مختلف محاذوں پر ہونے والی اس یک لخت شکست و ریخت کو میں ''ذرائع ابلاغ کے سکڑاؤ'' کا نام دیتا ہوں۔ اخبارات، اس کی پہلی مثال ہیں۔ دوسری لہر کا قدیم ترین ذریعہ ابلاغ، اخبارات، اپنے قارئین سے محروم ہوتے جا رہے ہیں۔ 1973ء تک امریکی اخبارات کی مجموعی اشاعت 63 ملین روزانہ تھی۔ اس اشاعت میں اضافہ کی بجائے، ہوا یہ

کہ ان کی موجود اشاعت بھی کم ہونے لگی۔ 1978ء میں یہ تعداد گھٹ کر 62 ملین رہ گئی۔ روزانہ اخبار پڑھنے والے امریکیوں کی شرح بھی، جو 1972ء میں 69% تھی کم ہو کر 1977ء میں 62% رہ گئی۔ اس دوران بہت سے اہم قومی اخبارات بری طرح متاثر ہوئے۔ نیویارک میں 1970ء اور 1976ء کے دوران تین بڑے اخبارات کے مجموعی قارئین کی تعداد پانچ لاکھ پچاس ہزار تھی۔ لاس انجیلز ٹائمز جو 1973ء میں اپنے عروج پر تھا، 1976ء تک اپنے اسی ہزار قارئین کھو چکا تھا۔ فلاڈیلفیا کے دو بڑے اخبارات اپنے ڈیڑھ لاکھ، کلیولینڈ کے دو بڑے اخبار نوے ہزار اور سان فرانسکو کے دو اخبارات اسی ہزار سے زائد قارئین سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اسی دوران ملک کے مختلف حصوں میں چھوٹے چھوٹے اخبارات نمودار ہونے لگے۔ کلیولینڈ نیوز، ہارٹ فورڈ ٹائمز، ڈیٹرائٹ ٹائمز، شکاگو ٹوڈے یا لانگ آئی لینڈ پریسے جیسے بڑے بڑے امریکی روزنامے تباہی کے کنارے پر جا پہنچے۔ برطانیہ میں بھی کچھ اسی طرح کی صورت حال تھی۔ 1965ء سے 1975ء کے درمیانی عشرے میں وہاں قومی روزناموں کی اشاعت میں 8% کم ہوگئی۔

ان نقصانات کو ٹی وی کی مقبولیت سے قطعاً منسلک نہیں کیا جا سکتا۔ آج ہر کثیر الاشاعت روزنامے کو تیزی سے ابھرتے ہوئے مختصر الاشاعت ہفت روزہ سہ روزہ اور نام و نہاد ''تجارتی'' رسالوں کے ساتھ زبردست مقابلے کا سامنا ہے کیونکہ یہ چھوٹے چھوٹے جریدے، نہ صرف قارئین کو وسیع و عریض ملکی مارکیٹ کے حالات سے آگاہ رکھتے ہیں بلکہ مقامی اشتہارات اور خبروں کے ذریعے ارد گرد کے خصوصی اور علاقائی معاملات سے بھی باخبر رکھتے ہیں۔ حتیٰ الامکان انتہا پر پہنچنے کے بعد، بڑے شہروں کے یہ کثیر الاشاعت روزنامے شدید ترین مشکلات کا شکار ہو گئے ہیں۔ مختصر الاشاعت میڈیا ان کی جڑوں میں بیٹھ گیا ہے۔

کثیر الاشاعت رسالے اور جریدے، اسی حوالے سے ایک اور مثال ہیں۔ 1950ء کے درمیانی عشرے سے اب تک بمشکل کوئی برس ایسا گزرا ہو گا جس میں مریکہ کے کسی نہ کسی بڑے رسالے کی موت واقع نہ ہوئی ہو۔ لائف، لک، سیچر ڈے ایوننگ پوسٹ۔۔۔ ان سب کی تدفین ہوئی، بعد ازاں احیاء کی کوششوں کا نتیجہ ہوا کہ اپنی گذشتہ

تجسیم کے بھوتوں کی طرح یہ مختصر سی اشاعت کے ساتھ منظر عام پر رہ گئے۔

1970ء اور 1977ء کے دوران، امریکی آبادی میں 14 ملین کا اضافہ ہونے کے باوجود، باقی ماندہ بڑے بڑے رسالوں کی مجموعی اشاعت 4 ملین کم ہوگئی۔

اسی دوران امریکہ میں چھوٹے چھوٹے رسالوں کی تعداد میں دھماکہ خیز اضافہ ہوا۔ چھوٹے چھوٹے مقاصد، خصوصی مفادات، علاقائی بلکہ مقامی مارکیٹوں سے منسلک، ہزاروں نت نئے، میگزین پیدا ہو گئے۔ پائلٹ اور ہوا بازی سے متعلقہ افراد، آج واقعتاً لاتعداد رسالوں میں سے انتخاب کر سکتے ہیں، جو صرف انہی کے لئے شائع ہوتے ہیں، نوجوانوں، زیر آب غوطہ خوروں، ریٹائرڈ لوگوں، خواتین کھلاڑیوں، پرانے کیمروں کے شائقین، ٹینس کے کھلاڑیوں، اس کی انگ اور سکیٹنگ میں دلچسپی رکھنے والوں کے اپنے اپنے رسائل ہیں۔ نیویارک، نیو ویسٹ، ڈی ان ڈلاس یا پٹس برگھر جیسے علاقائی رسائل خوب پھل پھول رہے ہیں۔ بعض رسائل مثلاً کن ٹکی بزنس لیجر یا ویسٹرن فارمر تو علاقائی اور خصوصی مفادات دونوں کا سلیقے سے استعمال کر کے، مارکیٹ کے بڑے حصے پر قابض ہو گئے ہیں۔

جدید، تیز، ارزاں اور مختصر دورانئے کی طباعت نے ہر تنظیم، برداری، سیاسی یا مذہبی جماعت یا گروہ کے لئے اپنی مطبوعات کا شائع کرنا خاصا آسان بنا دیا ہے۔ یہاں تک کہ بہت ہی چھوٹے چھوٹے گروپ، ہر امریکی دفتر میں موجود کاپی مشین کے ذریعے، ہمارے جریدوں کی خاص خاص چیزیں نقل کر ڈالتے ہیں۔ مقبول عام رسالے، قومی زندگی میں اپنا حقیقی حلقہ اثر، تقریباً کھو بیٹھے ہیں۔ ان کی جگہ محدود اشاعت کے حامل چھوٹے چھوٹے میگزین تیزی سے اپنی جگہ بنا رہے ہیں۔

لیکن ابلاغیات میں تیسری لہر کا اثر صرف پرنٹ میڈیا تک ہی محدود نہیں رہا۔ 1950ء سے 1970ء کے دوران، امریکہ میں ریڈیو اسٹیشنوں کی تعداد 2336 سے بڑھ کر 5359 ہوگئی تھی۔ اس عرصے میں آبادی میں صرف 35% اضافہ ہوا تھا، جبکہ ریڈیو اسٹیشنوں میں اضافے کی شرح 129% تھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر 65 ہزار امریکیوں کے لئے ایک ریڈیو اسٹیشن کے بجائے، اب ہر 35 ہزار امریکیوں کے لئے ایک ریڈیو اسٹیشن موجود ہے اور اس کا یہ مفہوم بھی ہے کہ سامعین زیادہ پروگراموں میں سے اپنی پسند کا

انتخاب کر سکتے ہیں۔ سامعین کی وسیع تعداد، اب زیادہ سٹیشنوں میں تقسیم ہو گئی ہے۔ پہلے سامعین کے لئے بلاامتیاز، ایک جیسے پروگرام ہوتے تھے مگر اسٹیشنوں میں اضافے کے سبب، سامعین کے مخصوص حلقوں کے لئے ان کی دلچسپی کے مطابق مختلف ریڈیو مختلف پروگرام پیش کرنے لگے ہیں۔ خبریں نشر کرنے والے ریڈیو درمیانے طبقے کے نوجوان تعلیم یافتہ لوگوں کی توجہ مبذول کرتے ہیں، ہارڈ راک، سافٹ راک، مجرے، دیہاتی راک اور لوک راک سٹیشن، نوجوان سامعین کے مختلف گروہوں کو متوجہ کرتے ہیں۔ روحانی موسیقی کے سٹیشن سیاہ فام امریکیوں کے لئے باعث کشش ہیں۔ کلاسیکل موسیقی نشر کرنے والے ریڈیو اسٹیشن، مختلف نسلی گروہوں مثلاً نیو انگلینڈ میں پرتگالیوں، اطالویوں، ہسپانویوں، جاپانیوں اور یہودیوں۔۔۔۔ کے مرکز نگاہ بنتے ہیں۔ سیاسی کالم نگار رچرڈ ریویز لکھتا ہے۔''میں نے نیو بورٹ، آر آئی میں اے ایم ریڈیو ڈائل چیک کر کے 18 اسٹیشن تلاش کئے۔ ان میں سے تین مذہبی، دو سیاہ فاموں کے اور ایک اسٹیشن پرتگالیوں کے پروگرام پیش کر رہے تھے۔'' غرض سمعی ابلاغ کی نت نئی شکلیں باقی ماندہ سامعین کے خاصے وسیع حلقے کو اڑیں۔1960ء کے عشرے کے دوران چھوٹے اور سستے ٹیپ ریکارڈ کیسٹ پلیرز، خود رو آگ کی طرح نوجوانوں میں مقبول ہونے لگے۔ اس کے برعکس، مقبول عام غلط تصور کے باوجود، آج کل کے نوجوان بچے ریڈیو میں اتنی دلچسپی بھی نہیں لیتے، جتنی 1960ء کے دہائی میں تھی۔ 1967ء میں ریڈیو کی سماعت کی اوسط 48 گھنٹے روزانہ تھی، جو 1977ء میں گھٹ کر 2.8 گھنٹے روزانہ رہ گئی۔

پھر سٹیزن بینڈ ریڈیو آ گیا۔ نشریاتی ریڈیو کے برعکس، جو یک طرفہ نشریات کر سکتا ہے، (سامع پروگرام پیش کرنے والے سے بات نہیں کر سکتا) کاروں میں سی بی ریڈیو نے کار چلانے والوں کے لئے یہ ممکن بنا دیا کہ وہ پانچ سے پندرہ میل کے دائرے میں ایک دوسرے سے گفتگو کر سکیں۔

1959ء اور 1974ء کے درمیان، امریکہ میں ایک ملین سی بی استعمال ہو رہے تھے۔ پھر فیڈرل ابلاغیات کمیشن کے ایک حیرت زدہ ترجمان کے الفاظ میں ''صرف آٹھ ماہ میں یہ تعداد دو ملین ہو گئی اور بعدازاں صرف تین ماہ میں، اس نے تین ملین کے عدد کو چھو لیا،

MashalBooks.org

سی بی کا دھما کہ واقعتاً انتہائی حیرت انگیز تھا۔1977ء تک کوئی 25ملین سیٹ استعمال میں آ گئے تھے اور فضاؤں میں رنگ برنگ الفاظ بکھر رہے تھے۔۔۔۔کہیں یہ وارننگ کہ پولیس تیز رفتاری چیک کر رہی ہے، کہیں خدا کی حمد وثناء اور کہیں طوائفوں کے باہمی مسائل، سی بی کا خبط تو خیر اپنے انجام کو پہنچا مگر اس کے اثرات ابھی باقی ہیں۔

اپنی اشتہاری آمدنی کی فکر میں غلطاں، ریڈیو ناشرین بڑی ڈھٹائی سے اس حقیقت سے انکاری ہیں کہ سی بی سیٹ نے ان سے سامعین کی خاصی تعداد چھین لی ہے لیکن اشتہاری ایجنسیوں کو ان کی بات کی قطعی یقین نہیں۔ اس میں سے ایک ایجنسی مارشل ٹیلر انکار پورٹیڈ نے نیو یارک میں ایک سروے کے ذریعے یہ پتا چلایا کہ 45% سی بی سیٹ استعمال کرنے والوں نے کار ریڈیو کی سماعت میں 10% سے 15% تک کمی کر دی ہے۔ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ سروے کے مطابق آدھے سے زیادہ سی بی استعمال کرنے والے، کار ریڈیو اور سی بی دونوں کو بیک وقت سنتے ہیں۔

بہر حال پرنٹ میڈیا کی طرح، ریڈیو کے معاملات میں بھی کوئی مثبت تبدیلی نہیں آئی۔ اشاعتی شعبے کی طرح نشریاتی شعبے میں بھی، دلچسپی کے چھوٹے چھوٹے حلقے وجود میں آ گئے۔

بہر حال، دوسری لہر کے ذرائع ابلاغ کو 1977ء میں انتہائی اہم اور خوفناک شکست سے دو چار ہونا پڑا۔ گذشتہ ایک نسل سے ٹیلی ویژن، انتہائی طاقتور اور مقبول عام میڈیا سمجھا جاتا تھا۔ 1977ء میں پکچر ٹیوب جھلملانے لگی۔ ٹائمز میگزین نے لکھا، ''زبردست دھچکا تھا۔ براڈ کاسٹر پریشانی کے عالم میں اعداد وشمار پر چڑھ دوڑے۔۔۔۔ انہیں اپنی ہی آنکھوں دیکھے پر یقین نہیں آ رہا تھا۔۔۔۔ تاریخ میں پہلی دفعہ ٹی وی ناظرین کی تعداد کم ہو گئی تھی۔''

اشتہارات سے منسلک، ایک حیرت زدہ فرد منہ ہی منہ میں بڑ بڑایا۔''کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ٹی وی کے ناظرین میں کمی آ جائے گی۔''

ابھی تک وضاحتیں جاری ہیں۔ بتایا جا رہا ہے کہ شوز کی حالت، ماضی سے بھی زیادہ پتلی ہو گئی ہے۔ فلاں چیز بہت زیادہ ہو گئی ہے اور فلاں چیز کا تو پتہ ہی نہیں چل

رہا۔انتظامیہ کے سربراہ اپنا بوریا بستر سمیٹے بیٹھے ہیں۔ ہم سے اس طرح کا یا اس نئی قسم کے شو کا وعدہ کیا گیا تھا۔ لیکن حقیقی صداقت مواصلاتی بادلوں میں سے نمودار ہونا، ابھی صرف شروع ہوئی ہے۔ بے پناہ طاقتور، مرکزی نیٹ ورک، جو تصورات کی پیدائش کو کنٹرول کرتا ہے، کا دور ختم ہونے کو ہے۔ قومی نشریاتی کارپوریشن (NBC) کے ایک سابقہ صدر نے تین بڑے امریکی ٹیلی ویژن نیٹ ورکس پر ''احمقانہ حکمت عملی'' کا الزام لگاتے ہوئے یہ پیش گوئی کی ہے کہ 1980ء کے عشرے میں پرائم ٹائم کے ناظرین کی تعداد %50 تک کم ہو جائے گی کیونکہ تیسری لہر کے ذرائع ابلاغ، دوسری لہر کے دیوہیکل میڈیا کے تسلط کو ہر کھلے محاذ پر، پیچھے دھکیل رہے ہیں۔

کیبل ٹیلی ویژن، پہلے ہی 14.5 ملین امریکی گھروں میں گھس چکا ہے اور 1980ء کے عشرے میں یہ رفتار اور بھی زیادہ طوفان انگیز ہو سکتی ہے۔ صنعتی ماہرین کی توقع کے مطابق 1981ء کے آخر تک کیبل کنکشن کی تعداد میں 20 ملین سے 26 ملین تک اضافہ ہو سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کیبل سسٹم کی رسائی %50 امریکہ گھروں تک ہو جائے گی۔ ایک دفعہ کاپر کی تار کے بجائے سستے فائبر اوپٹک سسٹم۔۔۔۔ جو روشنی کی لہر کو بال جیسے باریک فائبر کے ذریعے منتقل کرتا ہے۔۔۔۔ کی ابتداء ہو جائے تو چیزیں اور بھی زیادہ تیزی سے حرکت پذیر ہونگی۔ مختصر پرنٹنگ پریسوں اور زیراکس کاپی ساز کی طرح، کیبل بھی، سامعین کی وسعت پذیری کو چھوٹے چھوٹے متعدد عوامی حلقوں میں منقسم کر رہا ہے۔ علاوہ ازیں کیبل سسٹمز کو دوطرفہ ابلاغ کے لئے بھی ڈیزائن کیا جا سکتا ہے تاکہ صارفین پروگرام دیکھنے کے ساتھ ساتھ مستعدی سے، مختلف خدمات سے بھی استفادہ کر سکیں۔

1980ء کے ابتدائی سالوں میں، جاپان کے تمام شہر ''روشنی کی لہر'' کے کیبل سے منسلک ہو جائیں گے۔ اس طرح صارفین ڈائل کر کے نہ صرف پروگراموں بلکہ غیر متحرک تصاویر، ڈیٹا، تھیٹر ریزرویشن، یا اخبارات اور رسائل کے مواد کی نمائش کے لئے بھی درخواست کر سکتے ہیں، نقب زنی اور آگ لگنے کے الارم بھی اسی سسٹم کے ذریعے کام کریں گے۔

اوساکا کے ایک مضافاتی رہائش علاقے اکوما میں، تجرباتی ہائی اوویز سسٹم کے متعلق

ایک ٹی وی شو میں میرا انٹرویو لیا گیا۔ اس سسٹم میں، ہر صارف کے گھر میں ٹیلی ویژن کے اوپر ایک مائیکروفون اور ٹیلی ویژن کیمرا رکھا ہوتا ہے، تاکہ ناظرین پروگرام میں شامل بھی ہوسکیں۔ پروگرام کے میزبان میرا انٹرویو کر رہے تھے کہ اپنے لاؤنج میں بیٹھی ہوئی ایک مسز ساکا موٹونے، پروگرام دیکھتے دیکھتے سوئچ آن کیا اور ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں ہم سے گپ شپ کرنے لگیں۔ میں نے دوسرے ناظرین سمیت انہیں اور ان کے کمرے میں بھاگتے دوڑتے ان کے بچے کو بھی دیکھا، جبکہ وہ اکوما میں میری آمد خیر مقدمی کلمات کہہ رہی تھیں۔

ہائی اویز سسٹم میں، موسیقی سے لے کر کھانے پکانے سے متعلق اور تعلیمی ویڈیو کیسٹس تک کا پورا ایک بینک ہوتا ہے۔ ناظرین ایک کوڈ نمبر پنچ کر کے کمپیوٹر سے کسی بھی خاص پروگرام کی کیسٹ، کسی بھی وقت اپنے ٹی وی اسکرین پر دکھانے کی فرمائش کر سکتے ہیں۔

فی الحال یہ پروگرام تقریباً 160 گھروں تک ہی منسلک ہوسکتا ہے، پھر بھی اس ہائی اویز تجربے کو جاپانی حکومت اور فیوجٹ سو، سوی ٹوموالیکٹرک، میٹسوشیتا اور کن ٹیٹسو جیسی کارپوریشنوں کی زبردست پشت پناہی حاصل ہے۔ یہ انتہائی ترقی یافتہ ایجاد ہے اور اس کی بنیاد ہی اوپٹک ٹیکنالوجی پر ہے۔

ایک ہی ہفتے پہلے، اوہایو میں کولمبس کے مقام پر میں وارنر کیبل کارپوریشن کی قیوب سسٹم بھی دیکھ چکا تھا۔ اس سسٹم سے ناظرین کی تیس ٹی وی چینلز (اور ساتھ چار باقاعدہ نشریاتی سٹیشن بھی) سے استفادے کا موقع ملتا ہے اور اس کے خصوصی شو، سکول کے چھوٹے بچوں سے لے کر ڈاکٹروں، وکیلوں یا ''صرف بالغ'' سامعین غرض ہر کسی کے لئے پیش کئے جاتے ہیں۔ قیوب اس وقت دنیا میں اعلیٰ ترقی یافتہ، تجارتی طور پر موثر دوطرفہ کیبل سسٹم ہے۔ ہر صارف کو بظاہر کیلکولیٹر کی شکل کا ایک دستی آلہ فراہم کر دیا جاتا ہے، جس کے ذریعے کوئی بھی ناظر قیوب سٹوڈیو یا کمپیوٹر سے بات چیت کر سکتا ہے۔ ٹائم نے اس سسٹم کی تعریف میں یہ بتاتے ہوئے مثبت مبالغہ آرائی سے کام لیا کہ صارف نہ صرف اس طرح مقامی سیاسی مباحثوں میں اپنی رائے دے سکتا ہے، گیراج سیل لگا سکتا ہے بلکہ خیراتی شو میں رکھی گئی نادر اشیاء کی بولی بھی دے سکتا ہے۔۔۔۔ ایک بٹن دبا کر جو یا جین

کولمبس کسی سیاست دان سے اچانک کوئی سوال کر سکتا ہے یا الیکٹرانک انگوٹھے کو اوپر یا نیچے کر کے مقامی ذہین بچوں کا پروگرام دیکھ سکتا ہے' صارفین مقامی سپر مارکیٹ میں خریداری کا تقابلی جائزہ لے سکتے ہیں یا کسی مشرقی ریستوران میں اپنی ٹیبل محفوظ کرا سکتے ہیں۔

ٹی وی نیٹ ورکس کے لئے کیبل کا مسئلہ ہی پریشان کن نہیں۔ سٹورز میں وڈیو گیمز، فروخت کے ریکارڈ قائم کر رہی ہیں۔ کروڑوں امریکی اس چھوٹے آلے کے زبردست شیدائی نظر آتے ہیں، جو ٹی وی سکرین کو لمحے بھر میں پنگ پانگ ٹیبل، ہائی کا میدان یا ٹینس کورٹ بنا دیتا ہے۔ ممکن ہے یہ سماجی نشو ونماء دقیانوسی اور سماجی تجزیہ نگاروں کو خاصی غیر متعلقہ اور فضول لگے، لیکن یہی کل کے الیکٹرانک ماحول کی زندگی سے ہم آہنگی کی لاشعوری تربیت اور معاشرتی آگہی کی لہر کو ظاہر کرتی ہے۔ وڈیو گیمز نہ صرف سامعین کی تعداد کو مزید منقسم کر رہی ہے اور کسی مخصوص وقت نشریاتی پروگرام دیکھنے والوں کی دلچسپی گھٹا رہی ہیں بلکہ بظاہر ان معصومانہ کھلونوں کے ذریعے کروڑوں لوگ ٹی وی سیٹ سے کھیلنا، بات چیت کرنا اور باہمی ردعمل کا اظہار کرنا بھی سیکھ رہے ہیں۔ اس عمل کے ذریعے وہ محض کاہل سامع کے بجائے پیغام رساں بھی بنتے جا رہے ہیں۔ وہ ٹی وی کے ہاتھوں کھلونا بننے کے بجائے ٹی وی سیٹ کو کھلونا بنا رہے ہیں۔

ٹی وی کے ذریعے مہیا کی جانے والی معلوماتی خدمات اب برطانیہ میں بھی مہیا ہو رہی ہیں، جہاں ناظر ایک اڈاپٹر کے ذریعے بٹن دبا کر درجن کے لگ بھگ مختلف ڈیٹا/شماریاتی خدمات۔۔۔۔ خبریں، موسم، مالیاتی، کھیل اور اسی قسم کے بہت سے اعداد و شمار۔۔۔۔ اپنی پسند کے مطابق منتخب کر سکتا ہے، یہ ڈیٹا بعدازاں ناظر کی ٹیپ میں محفوظ ہو جاتا ہے۔ جلد ہی صارفین کے لئے کسی ہارڈ کاپیئر کو ٹی وی سکرین سے منسلک کر کے، کسی بھی طرح کی تصاویر یا خاکے جو بھی وہ محفوظ کرنا چاہیں، کی کاپی بنا ڈالنا بھی ممکن ہو جائے گا۔ غرض جہاں پہلے کچھ بھی سوچا نہیں جا سکتا تھا، اب وہاں چناؤ کے وسیع امکانات نظر آتے ہیں۔

وڈیو کیسٹ پلیئرز اور ریکارڈرز بھی تیزی سے مقبول ہو رہے ہیں۔ کاروباری حلقوں کی توقع کے مطابق، 1981ء تک امریکہ میں دس لاکھ ریکارڈر استعمال میں ہونگے۔

اس طرح ناظرین سوموار کا فٹ بال میچ ٹیپ کر کے فرض کیجئے اگلے اتوار کو دوبارہ دیکھ سکیں گے (اس طرح نیٹ ورکس کا وقت اور تصورات کی ہم آہنگی کا مقصد تو فوت ہی ہو گیا) یہی نہیں بلکہ فلموں اور کھیل سے متعلقہ پروگراموں کا ریکارڈ ٹیپوں کی فروخت کی بنیاد بھی پڑ رہی ہے۔ (عرب بھی اس وقت خواب خرگوش کے مزے نہیں لے رہے) حضرت محمد ﷺ کی زندگی سے متعلق فلم ''پیغمبر'' سنہرے عربی الفاظ سے مرصع ڈبوں میں پیک، ہر جگہ موجود ہے۔) ویڈیو ریکارڈرز اور پلیئرز نے ایسے خصوصی کارٹریجز کاروبار بھی ممکن بنا دیا ہے، جن میں مثال کے طور پر ہسپتال کے کارکنوں کے لئے طبی ہدایات کا مواد موجود ہو یا صارف کو فرنیچر کے مختلف حصوں کو جوڑنا یا ٹوسٹر کی دوبارہ وائرنگ کرنا سکھایا جائے۔ زیادہ بنیادی بات یہ ہے کہ ویڈیو ریکارڈر کا کوئی بھی صارف، ممکنہ طور پر، اپنے کسی تصور کو حقیقی شکل بھی دے سکتا ہے۔ ناظرین ایک بار پھر مزید منقسم ہو گئے۔

اور آخر میں گھریلو سیٹلائٹس نے انفرادی ٹی وی سٹیشنوں کے لئے خصوصی پروگراموں کے عارضی اور چھوٹے چھوٹے نیٹ ورکس کا قیام، طویل تر فاصلوں کے لئے، انتہائی کم اخراجات کے ساتھ ممکن بنا دیا ہے، چنانچہ موجودہ نیٹ ورکس کو اپنا انجام نظر آ رہا ہے۔ 1980ء کے آخر تک کیبل ٹی وی چلانے والوں کے پاس سیٹلائٹ سگنلز وصول کرنے کے لئے، ایک ہزار زمینی سٹیشن ہونگے ''اس موقع پر'' ٹیلی ویژن ریڈیو ایج کا کہنا ہے۔ ''پروگرام کے ڈسٹری بیوٹر کو صرف سیٹلائٹ پر وقت خریدنے کی ضرورت ہوتی ہے اور پورا قومی کیبل ٹی وی نیٹ ورک، اس کے پاس موجود۔۔۔ وہ سسٹمز کا جو گروپ بھی چاہئے، اپنی مرضی سے نیٹ ورک سے فیڈ کر سکتا ہے۔'' ینگ اینڈ روبی کیم ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں الیکٹرانک میڈیا کے وائس پریذیڈنٹ ولیم جے ڈونلی کے مطابق ''اس کا مطلب ہے تھوڑے سامعین اور قومی سطح پر تقسیم شدہ پروگراموں میں زیادہ سے زیادہ تنوع''

ان ارتقائی واقعات میں ایک چیز مشترکہ نظر آتی ہے: انہوں نے ٹی وی کے وسیع حلقہء ناظرین کو ٹکڑوں میں بانٹ دیا ہے اور ہر حلقہ ثقافتی رنگارنگی میں نہ صرف اضافہ کر رہا ہے بلکہ ان نیٹ ورکس کی طاقت بھی ختم کر رہا ہے، جو اب تک ہمارے تصورات پر مکمل طور پر قابض رہے ہیں۔ نیویارک ٹائمز کے شعوری نقاد جان او کانر نے اس کا تجزیہ یوں کیا ہے:

''ایک چیز یقینی ہے کہ کمرشل ٹی وی اس بارے میں اب مزید اپنی مرضی نہیں ٹھونس سکے گا کہ کیا پروگرام دیکھنا ہے اور کب دیکھنا ہے۔''

بظاہر یہ سب غیر متعلقہ واقعات، انتہائی مربوط تبدیلیوں کی لہر کی شکل اختیار کر چکے ہیں، جو اخبارات، ریڈیو سے لے کر رسالوں، جریدوں اور ٹی وی تک سارے ذرائع ابلاغ کے افق کو اپنی لپیٹ میں لے رہی ہے۔ ماس میڈیا زبردست حملوں کی زد میں ہے۔ اب منقسم میڈیا خوب پھل پھول رہا ہے اور دوسری لہر کے انتہائی مستحکم میڈیا کو نہ صرف چیلنج کر رہا ہے بلکہ اس کی جگہ بھی لیتا ہے۔۔۔۔ چھوٹے چھوٹے حلقوں میں منقسم میڈیا کا دور۔ نئے تکنیکی دائرے کے ساتھ ساتھ نیا اطلاعاتی دائرہ بھی ابھر رہا ہے اور ہمارے دماغوں میں موجود سب سے اہم دائرے پر اس کے دور رس اثرات مرتب ہونگے۔ ان تبدیلیوں کا باہم ارتباط دنیا کے بارے میں تصورات اور انکا صحیح مفہوم سمجھنے کی اہلیت میں انقلابی تبدیلیاں پیدا کر رہا ہے۔

بلپ ثقافت

دیو ہیکل میڈیا کا عدم پھیلاؤ (سکڑاؤ) ذہنوں کی بھی تخصیص کا باعث بن رہا ہے۔ دوسری لہر کے دوران ،میڈیا کی جانب سے مسلسل ٹھونسے جانے والے معیاری تصورات کے ذریعے جو کچھ وجود میں آیا نقادوں ن اسے وسیع نظری کا نام دیا۔ لیکن آج عوام کی اکثریت ایک جیسے پیغامات وصول کرنے کے بجائے چھوٹے چھوٹے مخصوص گروپوں میں منقسم ہو کر اپنے بنائے ہوئے لاتعداد تصورات ایک دوسرے کو بھیج رہے ہیں۔ چونکہ تمام معاشرہ تیسری لہر کی رنگارنگ جہتوں کی جانب گامزن ہے اسی لئے نیا میڈیا بھی اسے نہ صرف منعکس کر رہا ہے بلکہ اس سارے عمل کو تیز تر بھی کر رہا ہے۔

اس سے جزوی طور پر یہ وضاحت بھی ہو جاتی ہے کہ پاپ موسیقی سے سیاست تک ہر چیز میں یکسانیت کا احساس کم ہو رہا ہے۔ عمومی اتفاق رائے بکھر رہا ہے۔ ذاتی سطح پر ہم سب ایسے متضاد یا غیر متعلق تصورات کی شدید گرفت میں آ گئے ہیں، جنہوں نے ہمارے پرانے نظریات کو بری طرح ہلا کر رکھ دیا ہے۔ یہ تصورات ہم پر شکستہ یا غیر مجسم BLIPS کی شکل میں برس رہے ہیں۔ ہم درحقیقت (BLIPCULTURE) میں

سانس لے رہے ہیں۔

''فکشن کا موضوع آہستہ آہستہ محدود اور علاقائی ہوتا جا رہا ہے۔''جیفری ولف نامی نقاد شکوہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ہر ناول نگار''بڑے موضوع کو گرفت میں لینے کی کوشش ہی نہیں کرتا۔'' غیر افسانوی یا حقیقت نگاری میں دانیال لاسکن ''عوامی جنتری'' اور ''کتاب فہرست جیسے نظریاتی مقبول عام حوالوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے''جامعہ تصویر کشی کا تصور اب قرین قیاس ہی نہیں رہا۔ اس کا متبادل یہی ہے کہ دنیا کے کسی بھی رخ کو خصوصاً اس کے خوش کن اور دلفریب رنگوں کو چننے کی کوشش کی جائے۔'' لیکنBLIPS کی شکل میں بکھرے ہوئے ہمارے تصورات کتابوں کی حد میں بمشکل ہی اکٹھے ہو سکتے ہیں۔صحافت اور الیکٹرانک میڈیا میں اس کی نمایاں توضیح ممکن ہے۔

اس نئی طرح کی ثقافت میں بمعہ اس کے مجروح اور عارضی تصورات کے دوسری اور تیسری لہر کے میڈیا کے ضارفین کے درمیان، بڑھتے ہوئے فاصلے کا فرق سمجھنا شروع کیا جا سکتا ہے۔ ماضی کے بنے بنائے اخلاقی اورنظریاتی حقائق کے گرویدہ' دوسری لہر کے لوگ تباہ کن معلومات کی وجہ سے ،خاصے غضبناک ہونے کے ساتھ ساتھ بے سمتی کا شکار بھی ہو رہے ہیں۔1930ء کے ریڈیو پروگرام یا1940ء کے زمانے کی فلمیں آج بھی ان کے تصور میں بسے ہوئے ہیں۔ نئے ابلاغیاتی ماحول میں وہ خود کو تنہا تنہا سمجھتے ہیں۔ اس کی وجہ صرف یہی نہیں کہ ان کی سماعت سے ٹکرانے والا ہر موضوع خوفناک یا گڑ بڑا دینے والا ہے بلکہ یہ بھی کہ خبروں یا معلومات کا انداز ہی انہیں اجنبی سا لگتا ہے۔

پہلے سے مرتب کردہ نظریات کے طویل اور مربوط سلسلوں کے بجائے اگرچہ آہستہ آہستہ معلومات کے مخصوص اور مختصر B L I P Sہمارے سامنے آتے جا رہے ہیں۔۔۔۔اشتہارات، احکامات،نظریات،خبروں کے ٹکڑے، قطرہ قطرہ، پرزہ پرزہ، ایک نئی تراش خراش کے ساتھ ہمارے ذہنوں کی پہلے سے موجود فائلوں (خانوں) میں اپنی جگہ بنانے میں دشواری محسوس کر رہے ہیں۔ نئے تصورات کی درجہ بندی یا ترتیب بھی ایک مسئلہ ہے۔ کچھ تو اس لئے کہ ہمارے ذہنوں میں رچی بسی پرانی درجہ بندی سے ان کا کوئی جوڑ ہی نہیں بنتا اور دوسرا اس لئے کہ وہ بے ترتیب، لمحاتی اور عجیب وغریب شکل میں سامنے آتے

ہیں۔BLIPS ثقافت کے شور شرابے کی شدید لپیٹ میں آئے ہوئے، دوسری لہر کے لوگ، میڈیا کے خلاف ایک دبادبا ساغم وغصہ محسوس کرتے ہیں۔

تیسری لہر کے لوگ اس کے بالکل برعکس BLIPS کی اس بمباری میں۔۔۔۔ نوے سیکنڈ کی کسی خبر کی شہ سرخی، فوراً بعد تیس سیکنڈ کا کمرشل پھر کسی گانے یا گیت کا کوئی ٹکڑا، پھر کوئی شہ سرخی، کارٹون، پرزہ پرزہ جڑتی کوئی تصویر، پھر نیوز لیٹر، کمپیوٹر کا کوئی پرنٹ وغیرہ دیکھتے ہوئے۔۔۔۔ بڑا سکون اور اطمینان محسوس کرتے ہیں۔ ارزاں کتابوں اور خصوصی رسالوں کے شائق قارئین ان چھوٹے چھوٹے لمحاتی مناظر سے بے پناہ معلومات حاصل کرتے ہیں۔لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ تصورات اور محاورات پر بھی اپنی نظر رکھتے ہیں جو BLIPS کو مجتمع یا منظم کر کے ایک بڑی شکل دیتے ہیں۔ جدید انداز کے ڈیٹا کو دوسری لہر کے معیاری طور طریقوں سے جانچنے کے بجائے وہ نئے میڈیا کی جانب سے برسائے گئے لمحاتی مواد کو اپنے طور پر سمجھنے اور اپنے لئے اسے مرتب کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اپنے ذہنی رجحان سے مطابقت رکھتی کو محض وصول کرنے کے بجائے، اب ہم اسے نہ صرف ایجاد کرنے پر، بلکہ مسلسل۔۔۔۔ ایجاد در ایجاد۔۔۔۔ کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ اس کی وجہ سے ہمارے ذہن پر بے تحاشہ بوجھ پڑ رہا ہے لیکن اسی عمل کی بدولت زیادہ انفرادیت، شخصیت اور ثقافت کی تخصیص کے راستے کھل رہے ہیں۔ ہم میں سے کئی اس نئے دباؤ سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتے ہیں یا نا امیدی اور غم و غصے کی حالت میں لاتعلق ہو جاتے ہیں اور بہت سے لوگ، ممکنہ حد تک زیادہ بہتر سطح پر کام کی اہلیت لئے زیادہ مجتمع ارتقاء کی طرف گامزن باصلاحیت افراد بن کر ابھرتے ہیں۔ (ذہنی دباؤ بہت زیادہ ہو یا کم دونوں ہی صورتوں میں نتیجہ مختلف نہیں ہو گا اور دوسری لہر کے سماجی ماہرین اور سائنس فکشن لکھاریوں کی یکسانیت، معیار، قدیم بنیادوں کے تحفظ سے متعلق شور وغوغا صدا بہ صحرا ہی ثابت ہو گا) علاوہ ازیں تہذیب کی غیر عمومی رنگارنگی، میڈیا، جس کا انعکاس کرنے کے ساتھ ساتھ اسے مضبوط بھی بنا رہا ہے۔۔۔۔ ہمارے درمیان اطالاعاتی تبادلے کے حجم میں حیرت انگیز وسعت بھی لا رہی ہے۔۔۔۔ ہمارے درمیان اطلاعاتی تبادلے کے حجم میں حیرت انگیز وسعت بھی لا رہی ہے اور یہی وسعت و اضافہ ہمارے اطلاعتی معاشرہ بننے کی وجوہات کی

وضاحت بھی کرتا ہے۔

تہذیب جتنی متنوع اور رنگا رنگ ہو گی۔۔۔اس کی ٹیکنالوجی، توانائی کی شکلیں اور لوگ جتنے مختلف اور ممتاز ہونگے۔۔۔اسے بحیثیت کل قائم رکھنے کے لئے، اس کے مختلف حصوں کے درمیان، خصوصاً زبردست تبدیلی کے دباؤ کے اتنی ہی زیادہ انفارمیشن کے بہاؤ کی ضرورت ہو گی۔ مثلاً اگر کوئی ادارہ کسی نئے منصوبے کا قیام عمل میں لانا چاہتا ہے تو اسے دوسرے اداروں کے بارے میں (تھوڑا یا بہت) علم ہونا چاہئے تاکہ وہ اپنی مطلوبہ تبدیلی کے متعلق ان کے ردعمل کے بارے میں پہلے سے آگاہ ہو سکے۔ افراد کے بارے میں ایسا ہی ہونا چاہئے۔ ہم میں جتنی زیادہ یکسانیت ہو گی، ایک دوسرے کے رویوں سے متعلق پیش گوئی کے لئے، ایک دوسرے کو جاننے کی، اتنی ہی کم ضرورت ہو گی۔ چونکہ ہمارے اردگرد کے لوگ زیادہ منفرد اور متنوع یا غیر عمومیت پسند ہوتے جا رہے ہیں، اسی لئے ہمیں اپنے ساتھ ان کے پیش آمدہ رویوں کا عمومی اندازہ لگانے کے لئے بھی۔۔۔زیادہ معلومات، سگنلز اور اشارات کی ضرورت پڑتی ہے اور اس قسم کے درست اندازے لگائے بغیر اکٹھے کام کرنا تو درکنار، اکٹھے رہنا بھی محال ہے۔ چنانچہ لوگ اور ادارے زیادہ سے زیادہ معلومات اکٹھا کرنے کے مسلسل کوشش کرتے رہتے ہیں اور سارے کا سارا نظام ڈیٹا (معلومات) کے زیادہ سے زیادہ بہاؤ کے ساتھ مرتعش ہوتا جاتا ہے۔ سماجی نظام کو مربوط بنانے کے لئے، معلومات کا مطلوبہ حجم اور اس کے باہم تبادلے کی ضروری رفتار کو لازم و ملزوم بنا کر، تیسری لہر، دقیانوسی اور حد سے زیادہ بوجھل دوسری لہر کے اطلاعاتی دائرے کے دائرہ کار کو بکھیر رہی ہے اور اس کی جگہ لینے کے لئے نئے اطلاعاتی دائرے کی تعمیر کر رہی ہے۔

MashalBooks.org

باب13

ذی شعور ماحول

دنیا کی بہت سی قوموں کا ایمان تھا کہ چیزوں کی ظاہری طبعی حقیقت کے پیچھے روحیں ہوتیں ہیں۔ آج بھی بہت سے لوگوں کو اس کا یقین ہے کہ بظاہر بہت سی مردہ چیزیں، چٹانیں یا زمین اپنے اندر قوت حیت رکھتی ہیں۔ سایوکس انڈین اسے ''وکان'' کا نام دیتے تھے۔ ایلگوکین اسے ''مینی ٹو'' کہتے تھے۔ ایراکوئیز ''اورینڈا'' سے موسوم کرتے تھے۔ اس قسم کے لوگوں کیلیئے تمام ماحول زندہ ہے۔

آج ہم، تیسری لہر کی تہذیب کے، نئے اطلاعاتی دائرے کی تشکیل کرتے ہوئے، اپنے اردگرد کے ''مردہ'' ماحول کو زندگی تو نہیں بخش سکتے، البتہ ذہانت ضرور دے رہے ہیں۔

اس انقلابی پیش رفت کی کنجی بلاشبہ کمپیوٹر ہے۔ محفوظ ڈیٹا کو پراسیس کرنے کے لئے ہدایاتی پروگرام اور الیکٹرانک یادداشت کا مجموعہ۔۔۔ یہ کمپیوٹرز 1950ء کے عشرے کے آغاز میں ابھی صرف سائنسی عجوبہ لگتے تھے۔ 1955ء اور 1965ء کے دوران، جبکہ تیسری لہر نے امریکہ میں ابھرنا شروع ہی کیا تھا، ان کمپیوٹرز نے کاروباری دنیا میں آہستہ آہستہ قدم جمانا شروع کر دیئے تھے۔ شروع میں درمیانی صلاحیت کے یہ انفرادی یونٹس زیادہ تر مالیاتی مقاصد کے لئے استعمال ہو رہے تھے لیکن جلد ہی زیادہ صلاحیت کے حامل کمپیوٹرز نے کارپوریٹ ہیڈکوارٹرز کا رخ کر لیا اور متنوع اقسام کے کاموں میں مستعمل ہونے لگے۔ 1965ء سے 1977ء تک بوز ایلن اینڈ ہملٹن نامی انتظامی مشیروں کی کمپنی کے سینئر وائس پریذیڈنٹ، ہاروے پوپیل کا کہنا ہے۔ ''بڑے مرکزی کمپیوٹر کا دور مشینی دور کی سوچ کے انتہائی ارتقاء کی محض ایک ابتدائی تجلی ہے۔ یہ ایک عظیم الشان کامیابی ہے۔۔۔

ایک بہت بڑا سپر کمپیوٹر، زمین کے اندر کہیں سینکڑوں فٹ نیچے بموں سے محفوظ۔۔۔۔ جراثیم سے پاک ماحول میں۔۔۔۔عظیم تکنیکی ماہرین کے ایک گروہ کی زیرِنگرانی''۔

یہ مرکزی دیو ہیکل مشینیں اتنی متاثر کن تھیں کہ جلد ہی یہ معاشرتی افسانویت کا ایک معیاری حصہ بن گئیں۔فلم سازوں، کارٹونسٹوں اور سائنسی کہانیاں لکھنے والوں نے انہیں مستقبل کا نشان بنا کر استعمال کرتے ہوئے، عموماً کمپیوٹر کو مکمل طاقتور ذہن۔۔۔۔عظیم انسانی ذہانت کا وسیع ترین ارتکاز۔۔۔۔ کے طور پر پیش کیا۔

1970ء کے عشرے کے دوران ، دقیانوسی تصورات کو کہیں پیچھے چھوڑتے ہوئے، حقیقت نے افسانے کو مات دے دی۔ جوں جوں اختصار پسندی اس کے مختلف النوع افعال کی قیمتیں واضح ہوگئیں، ویسے ہی چھوٹے، ارزاں، طاقت ور منی کمپیوٹرز ہر جگہ پھیلنا شروع ہو گئے۔ ہر فیکٹری کی شاخ، لیبارٹری، سیلز آفس یا انجینئرنگ ڈیپارٹمنٹ اپنے لئے علیحدہ علیحدہ کمپیوٹر کے متمنی نظر آئے۔ ہر جگہ اتنے کمپیوٹر نظر آنے لگے کہ بعض اوقات کمپنیوں کو یہ اندازہ تک نہ رہا کہ ان کے پاس کتنے کمپیوٹر ہیں۔کمپیوٹر کی ''ذہنی طاقت'' کسی ایک مقام تک ہی مرتکز نہیں رہ سکی، یہ تقسیم ہونے لگی۔

کمپیوٹر ذہانت کا یہ پھیلاؤ اب اور بھی تیزی سے حرکت پذیر ہے۔1977ء میں اخراجات ،جنہیں اب ''تقسیم شدہ ڈیٹا پراسیسنگ'' یا ڈی ڈی پی کہا جاتا ہے، صرف ایک امریکہ میں 300 ملین ڈالر تک پہنچ گئے تھے۔ بین لاقوامی ڈیٹا پراسیسنگ کارپوریشن نامی ایک معروف تحقیقی کمپنی کے مطابق یہ اعداد 1982ء تک 3 بلین ڈالر کی یقینی حد کو چھولیں گے۔ چھوٹے اور سستے کمپیوٹر جن کے لئے کسی خصوصی کمپیوٹر ٹریننگ کی کوئی ضرورت نہیں۔۔۔۔ جلد ہی عام ٹائپ رائٹر کی طرح ہر جگہ موجود ہونگے۔ہم اپنے کام کے ماحول کو مستعد اور تیز طرار بنا رہے ہیں۔

مزید برآں، صنعت اور حکومت کی حدود سے باہر ایک متوازی منصوبہ روبہ عمل ہے، جو جلد ہی گھریلو کمپیوٹر کی صورت میں ہر جگہ ہر وقت نظر آ رہا ہوگا۔ پانچ سال پہلے تک گھریلو یا ذاتی کمپیوٹرز کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔لیکن آج ایک اندازے کے مطابق تین لاکھ کمپیوٹرز، امریکہ کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک نشست گاہوں، باورچی

MashalBooks.org

خانوں اور گھریلو اجتماعات میں ہلکے سروں میں مشغول کار ہیں اور ہاں، آئی بی ایم اور ٹیکساس انسٹرومنٹس جیسے اہم اداروں نے تو ابھی فروخت کاری کی اپنی مہم شروع ہی نہیں کی۔ گھریلو کمپیوٹر جلد ہی کم وبیش ٹی وی سیٹ کی قیمت میں بکنا شروع ہو جائیں گے۔

یہ ہوشیار اور مستعد مشینیں پہلے ہی مختلف اقسام کے کاموں۔۔۔۔ گھریلو ٹیکسوں، گھروں میں توانائی کے استعمال کی نگرانی متفرق گیموں کے کھیلنے، وصولیوں کی فائل بنانے، مالکوں کو پیش آمدہ ملاقاتوں کی یاد دہانی اور ''چاک و چوبند ٹائپ رائٹر'' کی خدمات۔۔۔۔ میں استعمال ہو رہی ہیں۔ یہ سارے کام بلاشبہ ان کی مکمل استعداد کی ایک معمولی سی جھلک ہیں۔

امریکہ کی ٹیلی کمپیوٹنگ کارپوریشن سورس نامی ایک خدمت پیش کرتی ہے۔ جس کے ذریعے کمپیوٹر استعمال کرنے والے کی، معمولی سے اخراجات پر امریکی پریس انٹرنیشنل کی خبررساں لائن سے ہمہ وقتی رسائی ممکن ہوگئی ہے۔ اس طرح سٹاک اور اشیاء کی مارکیٹ کا لا محدود ڈیٹا اس کی پہنچ میں ہوتا ہے۔ بچوں کو پڑھانے کے لئے ریاضی، املا، فرنچ، جرمن یا اطالوی زبان کے تعلیمی پروگرام، خریداری کے کسی کمپیوٹرائزڈ، ڈس کاؤنٹ کلب کی رکنیت، ٹھہرنے یا سفر کے لئے نشست محفوظ کرانے کی فوری سہولت اور ایسی ہی بہت سی سہولتیں، ایک انگلی کی جنبش کے ساتھ ہی اس کے سامنے موجود ہوتی ہیں۔

''سورس'' کے ذریعے، کوئی بھی شخص سستے کمپیوٹر ٹرمینل کے ذریعے بھی، اس نظام سے منسلک کسی بھی فرد سے رابطہ کر سکتا ہے۔ برج، شطرنج یا بیک گیمن کے کھلاڑی، اگر چاہیں تو ہزاروں میل کے فاصلے پر موجود، کسی شخص سے کھیل سکتے ہیں۔ اس کے صارف باہمی نجی پیغامات یا ایسے ہی پیغامات، بہت سارے لوگوں کو بیک وقت نہ صرف بھیج سکتے ہیں بلکہ تمام خط و کتابت کو الیکٹرانک یادداشت میں محفوظ بھی کر سکتے ہیں۔ ''سورس'' یکساں اور مشترکہ مفادات یا دلچسپی رکھنے والے افراد کے گروہ کو مجتمع ہونے میں بھی مدد دے گا، ایسے گروپ کو شاید ''الیکٹرانک برادری'' کا نام دیا جا سکے۔ درجن بھر مختلف شہروں میں لئے گئے درجن ایک تصویری مناظر، الیکٹرانک ذریعے سے مجتمع کر کے ممکن ہے، ''سورس'' ناظرین کے دلوں میں کیمرون، سامان فوٹوگرافی، ڈارک روم کی تکنیکوں، روشنیوں یا رنگین

فلم کی خوش کن یادیں تازہ کر دے اور وہ مہینوں بعد ''سورس'' کی الیکٹرانک یادداشت میں موضوع، تاریخ یا کسی اور حوالے کے تحت۔۔۔محفوظ، اپنے تبصروں سے ایک بار پھر محفوظ ہونا چاہیں۔

گھروں میں کمپیوٹروں کا پھیلاؤ۔۔۔ ان کے شاخ درشاخ نیٹ ورک میں باہم رابطوں سے صرف نظر کرتے ہوئے بھی، ایک باشعور ماحول کی تعمیر میں ایک بڑی پیش رفت ظاہر کرتا ہے اور بات یہیں پر بس نہیں ہو جاتی، مائیکرو پراسسرز اور مائیکرو کمپیوٹرز کی آمد نے مشینی ذہانت کو ایک اور جہت دی ہے۔ یہ ننھے ننھے چپس۔۔۔ ذہانت کے محفوظ ذخیرے۔۔۔لگتا ہے جلد ہی ہماری سبھی مصنوعات اور استعمال کی اشیاء کا ایک جزو بننے والے ہیں، صنعتی عمل اور کاروبار میں ان کے عمومی استعمال کے علاوہ یہ چپس ائیر کنڈیشنرز اور گاڑیوں سے لے کر سلائی مشینوں اور آلات پیمائش تک میں پہلے ہی سے زیر استعمال ہیں۔ اب یہ گھروں میں توانائی کے ضیاع کو کم کرنے میں بھی مدد دیں گے۔ یہ واشنگ مشین میں دھلائی کے کام کے مطابق پانی کے ٹمپریچر اور صابن کی مقدار کا تعین کریں گے۔ کار کے فیول سسٹم کو صحیح رکھیں گے۔ کسی چیز کی مرمت کی ضرورت پڑنے پر ہمیں فوراً اطلاع دیں گے۔ یہ پراسسز کلاک ریڈیو، ٹوسٹر، کافی میکر اور باتھ روم کے شاور پر چمکتے نظر آئیں گے۔ گیراج کو گرم رکھیں گے، دروازے بن کریں گے اور اسی طرح کے بہت سے معمولی اور غیر معمولی کام، ہمارے لئے انجام دیں گے۔

اگلے چند عشروں میں کیا کیا تبدیلیاں رونما ہونے والی ہیں، ان کا تذکرہ مائیکرو کمپیوٹر کے ایک ممتاز ڈسٹری بیوٹر ایلن۔ پی۔ ہالڈ کے مطابق ''گھریلو کمپیوٹر پہلے ہی گفتگو کر سکتے ہیں، بات کا مفہوم سمجھ سکتے ہیں اور مختلف آلات کو کنٹرول کر سکتے ہیں۔ ان میں کچھ سنسرز، مناسب ذخیرہ الفاظ اور بیل ٹیلیفون سسٹم بھی شامل کردیں اور آپ کا گھریلو کمپیوٹر۔۔۔ دنیا میں کسی سے بھی یا کچھ بھی۔۔۔ کہہ سن سکے گا۔'' سامنے اب بھی کئی رکاوٹیں ہیں لیکن تبدیلی کا راستہ بالکل صاف ہے۔

''تصور کیجئے'' ہالڈ لکھتا ہے۔ ''آپ کام میں مصروف ہیں، ٹیلی فون بجتا ہے۔ یہ فرڈ ہے آپ کا گھریلو کمپیوٹر حالیہ ڈاکوں کی کہانیوں سے لبریز، صبح کی نیوز رپورٹ دیتے

دیتے، فریڈ موسم کا حال بتاتا ہے، جس میں زبردست بارش کی اطلاع موجود ہے۔ یہ اطلاع فریڈ کی یادداشت کو ٹٹولتی ہے اور وہ گھر کی چھت کی مرمت اور اس کی دیکھ بھال کے متعلق بتانے لگتا ہے۔ چھت میں اچھی خاصی لیک موجود تھی، آپ کو فوج کرنے سے پہلے فرڈ نے سلم سے فون پر ہی مشورہ مانگا۔ سلم بلاک میں ہی ایک مویشی باڑے کی طرز کا گھر ہے۔۔۔۔فریڈ اور سلم دونوں عموماً شماریاتی ذخیرے میں حصہ لیتے تھے اور دونوں کو ہی یہ معلوم تھا کہ وہ گھریلو خدمات کی شناخت کے لئے موثر تحقیقی ٹیکنیکوں کے ساتھ پروگرام کیے گئے ہیں۔۔۔آپ نے فرڈ کے صلاحیتوں پر اعتماد کرنا سیکھ لیا ہے، اس لئے آپ چھت کی مرمت کی منظوری دے دیتے ہیں۔ باقی کا کام سیدھا سادہ ہے، فریڈ چھت ٹھیک کرنے والے کو بلا لیتا ہے۔۔۔''

خاصا لطف انگیز تخیل ہے۔ پھر بھی ایک ذی شعور ماحول میں کسی آسیب کی طرح زندگی کے محسوسات کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ ایسے ماحول میں رہنا بہت سے چبھتے ہوئے فلسفیانہ سوالات کو جنم دیتا ہے۔ کیا مشینیں ہر چیز پر قابض ہو جائیں گی؟ کیا ذی شعور مشینیں، خصوصاً باہم مربوط نیٹ ورکس سے منسلک، انہیں سمجھنے اور کنٹرول کرنے کی ہماری صلاحیت کا خاتمہ کر دیں گی؟ کیا بڑا بھائی کسی دن اتنی اہلیت کا مالک ہو جائے گا کہ ٹیلی فون کو بند کرنے کے علاوہ ہمارے ٹوسٹرز اور ٹیلی ویژن کو بھی ہماری حرکت اور موڈ کے مطابق متحرک کر سکے؟ کس حد تک ہمیں کمپیوٹر اور چپ پر انحصار کرنے کی عادت ہونی چاہئے؟ ہم جس قدر زیادہ ذہانت اپنے مادی ماحول میں ذخیرہ کرتے جائیں گے، کیا ہمارے ذہن اتنے ہی بے کار اور کمزور نہیں ہوتے جائیں گے؟ اور اگر کسی بھی وجہ سے کمپیوٹر کا مربوط سلسلہ اپنے اختتام کو پہنچ جاتا ہے تو نتائج کیا ہونگے؟ کیا پھر بھی اپنے وجود کی بقا کے لئے مطلوبہ بنیادی قابلیت، ہمارے پاس ہو گی؟

ان میں سے ہر سوال مزید نئے سوالات کو جنم دیتا ہے۔ کیا بڑا بھائی واقعتاً ہر ٹوسٹر، ٹی وی سیٹ، ہر کار کے انجن اور کچن میں مستعمل آلات کے بٹن چالو رکھ سکتا ہے۔ جب ذہانت پورے ماحول میں اچھی طرح پھیل جاتی ہے۔ اس کے صارفین اسے ہزار ہا جگہوں پر بیک وقت استعمال میں لا سکتے ہوں اور جب وہ لوگ مرکزی کمپیوٹر سسٹم میں

جائے بغیر ایک دوسرے سے رابطہ کر سکتے ہوں (بہت سے تقسیم شدہ نیٹ ورکس میں یہ آج بھی ممکن ہے) کیا بڑا بھائی پھر بھی چیزوں یا معاملات کو کنٹرول کر سکتا ہے؟

ذہانت کا عدم ارتکاز، اجتماعی ریاست کی طاقت کو بڑھانے کے بجائے درحقیقت اسے کمزور بناتا ہے۔ ذہانت کے پھیلاؤ کی وجہ سے کیا ہم حکومت کی چال بازیوں کو آسانی سے مات نہیں دے دیں گے؟ جان برونر کے معرکتہ الآرا اور متنوع ناول ''لرزہ خیز لہر کا مسافر'' میں مرکزی کردار حکومت کی جانب سے کمپیوٹر نیٹ ورک کے ذریعے خیالات کو کنٹرول کرنے کی کوششوں کو کامیابی سے ناکام بناتا ہے۔ کیا ذہن والقعی ناکارہ ہو جائیں گے؟ تھوڑی ہی دیر میں ہم دیکھیں گے کہ ذی شعور ماحول کی پیدائش کا عمل اس کے برعکس اثرات مرتب کرے گا۔ اپنے معاملات کو چلانے کے لئے، مشینوں کو ڈیزائن کرتے ہوئے کیا ہم آئزک عاصموف کی کلاسیکل کہانی کے کردار ''روبی'' کی طرح پروگرام نہیں کر سکتے، جس کا کہنا ہے ''میں روبوٹ کبھی کسی انسان کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔'' ابھی تک یہ فیصلہ کن مرحلہ نہیں آیا، جب ایسے مسائل کو نظر انداز کرنا غیر ذمہ داری کے زمرے میں آئے گا۔ فی الحال یہ فرض کرنا کہ حالات انسان کے قابو سے باہر ہو جائیں گے۔ ایک احمقانہ تصور سے زیادہ کچھ نہیں۔ ہم ایسی ذہانت اور قوت متخیلہ کے حامل ہیں، جس کا استعمال بھی ابھی ہم نے شروع نہیں کیا۔

البتہ ایک چیز بالکل واضح ہے، ہمارا یقین چاہے کچھ بھی ہو کہ ہم اپنے معلوماتی دائرے کو اس کی بنیاد سے ہی تبدیل کر رہے ہیں۔ ہم صرف دوسری لہر کے میڈیا کو ہی منقسم نہیں کر رہے بلکہ سماجی نظام میں، ایک بالکل ہی نئی قسم کا ابلاغی ڈھانچہ ترتیب دے رہے ہیں۔ دوسری لہر کا دور۔۔۔ جس میں ماس میڈیا، پوسٹ آفس اور ٹیلی فون کا دور دورہ تھا۔۔۔ تیسری لہر کے ابھرتے ہوئے معلوماتی دائرے کے سامنے انتہائی دقیانوسی اور پھسپھسا نظر آتا ہے۔

ذہن کی توسیع

اطلاعاتی دائرے میں اتنی زبردست تبدیلی لاتے ہوئے ہمیں اپنے ذہنوں کو بھی مکمل تبدیلی کے لئے تیار کرنا ہو گا۔۔۔ اپنے مسائل کے بارے میں سوچنے کا انداز

معلومات کی ترتیب وتشکیل کا طریق کار، اپنی کارکردگی کے نتائج سے نمٹنے کا طور طریقہ وغیرہ، غرض ہمیں اپنی زندگیوں میں تعلیم کے کردار میں تبدیلی لانا ہوگی۔ ممکن ہے ہمیں اپنے ذہن میں کیمیاوی تبدیلیاں بھی کرنا پڑیں۔

کمپیوٹر اور چپس کی ہم سے گفتگو کی اہلیت کے متعلق ہالڈ کی رائے بظاہر دوراز کار لگتی ہے مگر ایسا نہیں۔ آواز سے متعلقہ ''ڈیٹا انٹری ٹرمینل'' آج بھی موجود ہیں اور ان میں شناخت کرنے اور ایک ہزار الفاظ تک کے ذخیرے سے جواب دینے کی اہلیت پہلے ہی موجود ہے۔ آئی بی ایم یا نپان الیکٹرک جیسی دیوہیکل کمپنیوں سے لے کر ہیور سٹکس انکار پور۔لمٹڈ یا سینٹی گرام کارپوریشن جیسی چھوٹی کمپنیاں، اس ذخیرے میں اضافہ کرنے، ٹیکنالوجی کو آسان بنانے اور قیمتوں میں انقلابی کمی لانے کی زبردست ڈوڑ میں لگی ہوئی ہیں۔ پانچ سال کی عمر سے بیس سال کی عمر تک کی قدرتی زبان سے ہم آہنگی میں کمپیوٹر کو کتنا عرصہ لگے گا اور اس ارتقا کے معیشت اور ثقافت پر کیا ممکنہ اثرات ہونگے۔ ان کے جواب کے حصول میں مثبت اور شاندار پیش رفت جاری ہے۔

آج کروڑوں افراد کو ان کی عملی جہالت کی وجہ سے ملازمت کا اہل ہی نہیں سمجھا جاتا، عام سے کاموں میں بھی فارم پڑھنے، بٹن کھولنے بند کرنے، ملازمت کے چیکس، ملازمت سے متعلقہ ہدایات اور ایسے ہی کئی افعال جاننے کی اہلیت لازمی ہوتی ہے۔ دوسری لہر کے دور میں ملازم رکھنے والے آفس کے نزدیک اہم ترین مطلوبہ اہلیت، پڑھنے کی صلاحیت تھی۔

جہالت عقل سے پیدل ہونے کے مترادف بہر حال نہیں۔ دنیا بھر میں بے پناہ ان پڑھ لوگ ہیں، جنہوں نے زراعت، تعمیرات، شکار اور موسیقی جیسے مختلف النوع اعلی معیاری شعبوں میں اپنی کارکردگی کا لوہا منوایا ہے۔ بہت سے ان پڑھ لوگوں کی یادداشت کمال کی ہے، جو بہت سی زبانیں انتہائی روانی سے بول سکتے ہیں۔۔۔۔۔ یہ وہ کام ہے جو سو فیصد تعلیم یافتہ امریکیوں کے بس سے باہر ہے۔ دوسری لہر کے معاشروں میں ان پڑھ لوگ معاشی طور پر بالکل تباہ ہو گئے۔

تعلیم یقیناً کسی ایک کام میں مہارت سے زیادہ وسیع چیز ہے۔ تعلیم ہی تصورات

MashalBooks.org

اور خوشیوں کی حیرت انگیز کائنات کے دروازے کھولتی ہے۔ تاہم ایک ذی شعور ماحول میں، جہاں مشینیں، آلات اور یہاں تک کہ دیواریں تک بات چیت کرنے کی اہلیت رکھتی ہوں، تعلیم کا پیسے کمانے کے عمل سے اتنا گہرا تعلق باقی نہیں رہتا۔ جتنا کہ گذشتہ تین سو سالوں میں مشاہدے میں آیا۔ ائیر لائن کے ریزرویشن کلرک، گودام کا عملہ، مشینوں کے چلانے والے اور ان کی مرمت کرنے والے اپنے معمول کے کام، پڑھنے کے بجائے سن کر نہایت اچھی طرح سرانجام دے سکتے ہیں۔ مشینیں انہیں مرحلہ در مرحلہ اپنی آواز کے ذریعے بتاتی جاتی ہیں کہ اب کیا کرنا ہے یا ٹوٹے ہوئے پارٹ کو کیسے بدلنا ہے۔

کمپیوٹر انسان سے ماورا نہیں ہیں۔ وہ بریک ڈاؤن ہوتے ہیں۔ ان سے غلطیاں۔۔۔ بعض اوقات بہت ہی خطرناک۔۔۔ ہوتی ہیں۔ ان میں کوئی جادوئی شے نہیں اور وہ یقیناً کوئی بھوت پریت یا ایسی روحیں نہیں ہیں، جو ہمارے ماحول میں خود آدھمکی ہوں۔ کمپیوٹر ہماری ذہنی قوت میں اسی طرح اضافہ کر رہا ہے جس طرح دوسری لہر کی ٹیکنالوجی نے ہماری جسمانی طاقت کو بڑھایا تھا۔ ہمیں ابھی تک پتہ نہیں کہ ہمارے اپنے ذہن بالآخر ہمیں کہاں لے جائیں گے۔

جیسے جیسے ہم اپنے ذی شعور ماحول سے آشنا ہوتے جائیں گے اور اپنی پیدائش کے ساتھ ہی ان سے جان پہچان ہونے لگے گی، توں توں ہم ان کا استعمال جس مشاقی مہارت اور فطری انداز میں کرنے لگیں گے، آج اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اور یہ کمپیوٹر۔۔۔ صرف چند سپر تکنیک سازوں کی ہی نہیں۔۔۔ بلکہ ہم سب کی دنیا کے اور خود اپنے بارے میں گہری سوچ بچار کے سلسلے میں مکمل معاونت کر رہے ہونگے۔

آج جونہی کوئی مسئلہ پیدا ہوتا ہے، ہم فوراً اس کی وجوہات تلاش کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اب تک ہوا یہ ہے کہ اکثر مفکرین، چند ایک عارضی قوتوں کی اضافی معنویت کے ذریعے، عموماً چیزوں کی تشریح و توضیح کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں، کیونکہ دنیا کے بہترین انسانی دماغ بھی کسی بھی مسئلے کے بہت سے محرکات کو، بیک وقت کنٹرول کرنا تو دور کی بات ہے انہیں، سمجھنے میں بھی دشواری محسوس کرتا ہے۔ چنانچہ جب بھی کسی پیچیدہ مسئلے سے پالا پڑ جائے، مثلاً بچہ قصور وار کیوں ہے یا افراط زر معیشت کو کیسے تہ و بالا کرتا ہے یا

شہروں میں بڑھتی ہوئی آبادکاری قریبی دریا کی اکالوجی کوکس طرح متاثر کرتی ہے۔۔۔۔تو ہم دو یا تین عوامل پر پوری توجہ مرکوز کر دیتے ہیں اور بہت سے دوسرے عوامل کو۔۔۔۔جن میں سے کوئی ایک یا اجتماعی طور پر وہ سب زیادہ اہم بھی ہو سکتے ہیں۔۔۔۔ یا بالکل ہی نظر انداز کر دیتے ہیں۔

ستم بالائے ستم، ماہرین کا ہر گروہ دوسروں کی رائے کو اہمیت دیئے بغیر صرف ''اپنی'' وجوہات کو بنیادی اہمیت دینے پر اصرار بھی کرتا ہے، مثلاً شہری ماحول میں خرابی کے مسائل سے دو چار گھریلو تعمیرات کے ماہرین، گھٹن اور رہائشی عمارات کی خستہ حالی کو بنیادی وجہ قرار دیتے ہیں۔ ٹرانسپورٹ کے ماہرین راستوں اور سڑکوں کی کمی کا رونا روتے ہیں، سماجی بہبود کے ماہرین ڈے کیئر سنٹرز اور سماجی بہبود کے کاموں کے لئے فنڈز کی کمی کو اہم وجہ سمجھتے ہیں۔ ماہرین جرم پولیس کی کمی نفری کو ان خرابیوں کا ذمہ دار سمجھتے ہیں۔ ماہرین معاشیات کا کہنا ہے کہ بڑھتے ہوئے ٹیکس کاروباری سرمایہ کاری کی حوصلہ شکنی کر رہے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ یہ بات کوئی نہیں مانتا کہ یہ سارے مسائل کسی نہ کسی طرح باہم منسلک اور مربوط ہیں۔۔۔۔ یہ سب مل کر ایک دوسرے کو تقویت دیتے ہیں۔ لیکن کسی مسئلے کا حل سوچتے ہوئے کوئی بھی اتنی ساری پیچیدگیاں اپنے ذہن میں مجتمع نہیں کر سکتا۔ شہروں کی فرسودگی کا سمئلہ، پیٹررٹر نے اپنی کتاب ''خلائی عہد کا معاشرہ'' میں جسے لاتعداد ''باہم پیوست مسائل'' میں صرف ایک قرار دیتا تھا''۔ اس نے پہلے ہی ایسے بحرانوں کے جنم لینے کی پیش گوئی کر دی تھی۔ اسباب اور نتائج کا تجزیہ جن کے لئے نا کافی ہو گا اور ایسا باہم مربوط تجزیہ درکار ہو گا، جو بہ آسانی علیحدہ ہو جانے والے عناصر پر مشتمل نہ ہو بلکہ درجنوں آزاد اور متضادم ذرائع سے پیدا شدہ سینکڑوں ممد معاون اثرات پر حاوی ہو۔

کمپیوٹر اپنی یادداشت اور بہت سی لمحاتی طاقتوں کو باہم مربوط کرنے کی اہلیت کی وجہ سے، ایسے مسائل کو عمومی سطح سے کہیں زیادہ گہرائی میں جا کر حل کرنے میں ہماری مدد کر سکتا ہے اور وسیع وعریض ڈیٹا کی چھان بین کے بعد انتہائی نازک پیٹرن بھی ترتیب دے سکتا ہے۔ یہ چھوٹے لمحاتی خاکوں (BLIPS) کو جوڑ کر زیادہ بڑے اور زیادہ بامعنی مکمل تصور تشکیل دے سکتا ہے۔ دیئے گئے مفروضات یا ماڈل کی مدد سے متبادل فیصلوں کے

اثرات سامنے لاسکتا ہے اور یہ سب کچھ اتنا منضبط اور مکمل ہوگا کہ ایک نارمل آدمی عام طور پر کر ہی نہیں سکتا۔ لوگوں اور وسائل کے درمیان نئے یا نظر انداز کئے گئے رابطوں کی شناخت کر کے کمپیوٹر سے مسائل کے تصوراتی حل بھی پیش کر سکتا ہے۔

انسانی ذہانت تصورات اور اس کا وجدان آئندہ عشروں میں بھی مشین سے کہیں زیادہ اہمیت کے حامل رہیں گے۔ کمپیوٹر سے البتہ یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ مکمل ثقافتی تناظر کی گہرائی، اشیاء کے باہمی تعلق کی آگاہی میں اضافہ اور ہمارے اردگرد موجود بے ربط ڈیٹا میں سے ہمارے لئے بامعنی ''اکائیاں'' مرتب کرنے میں پوری پوری مدد کرے گا۔ کمپیوٹر واقعی بلپ ثقافت کا ترقاق محسوس ہوتا ہے۔ اسی دوران ذی شعور ماحول، مسائل سے متعلقہ ہمارے تجزیاتی طریقوں اور انفارمیشن اکٹھی کرنے کے انداز میں، تبدیلی لانا شرع کرنے کے ساتھ ساتھ ہمارے دماغوں کی کیمیائی تبدیلی کا موجب بھی بن سکتا ہے۔ ڈیوڈ کریچ، مارین ڈائمنڈ، مارک روزنزگ، ایڈورڈ، بینٹ اور کئی دوسرے ماہرین کے تجربات سے پتہ چلتا ہے کہ بہتر اور خوش گوار ماحول میں رکھے گئے جانور، منضبط گروہ کی شکل میں رکھے گئے جانوروں کی نسبت، بڑے دماغی Cortices، زیادہ Glialcells، بڑے اعصاب (Neurons)، زیادہ مستعد نیورو ٹرانسمیٹر ز اور کہیں زیادہ مقدار میں دماغ کی جانب خون کی رسد کے حامل ہوتے ہیں۔ ممکن ہے جیسے جیسے ہم ماحول کو پیچیدہ تر اور زیادہ باشعور بناتے جائیں ہماری ذہانت میں مزید اضافہ ہوتا جائے۔

نیویارک کے نفسیاتی انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر ریسرچ، ڈاکٹر ڈونلڈ ایف کلائن، جو دنیا کے ممتاز نیورو سائیکارٹسٹوں میں سے ایک ہیں، کی محققانہ رائے ہے۔

''کریچ کی تحقیق کے مطابق کہ ابتدائی ماحول کی رنگارنگی اور اثر پذیری، ذہانت کو متاثر کرنے والے اہم محرکات میں سے ایک ہے۔ جو بچے ایک جاہلانہ، غیر متحرک، غربت زدہ اور غیر موثر۔۔۔۔ ماحول میں پرورش پاتے ہیں، وہ جلد ہی مواقع (سے فائدہ اٹھانے) کی فطری صلاحیت ضائع کر بیٹھتے ہیں۔ اس سلسلے میں غلطی کا امکان نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔ بچہ محتاط (خوف زدہ قدامت پرست، غیر متجس یا بالکل ہی مجہول ہو کر رہ جاتا ہے۔ ظاہر ہے ذہنی ارتقاء کے لئے یہ سبھی محرکات منفی ہیں۔ دوسری جانب، موثر اور مستعد

ہمہ جہتی متحرک ماحول میں پرورش پانے والے بچے اپنے اندر مختلف اقسام کی فنی صلاحیتیں دریافت کر لیتے ہیں۔ اگر بچے اپنے مختلف کاموں کے لئے ماحول کی مدد حاصل کر سکیں تو چھوٹی عمر میں ہی اپنے ماں باپ پر ان کا انحصار خاصا کم ہو جاتا ہے۔ وہ چیزوں تک اپنی دسترس اور اہلیت وقوت کی خود اعتمادی سے آشنا ہو سکتے ہیں اور اسی طرح وہ تجسس، تحقیق و جستجو اور تخیلاتی صلاحیت کے حامل ہو کر زندگی میں مسائل کا سامنا کرنے کا راستہ اپنا سکتے ہیں۔ یہ سب تبدیلیاں خود ذہن میں بھی تبدیلیاں پیدا کرنے کا باعث بن سکتی ہیں۔ فی الحال ہم صرف اندازے ہی لگا سکتے ہیں۔لیکن یہ بات ناممکنات میں سے ہرگز نہیں کہ ایک ذی شعور ماحول ایک نئے خاکے اور کہیں بڑے ذہنی ارتقاء کی جانب ہماری راہنمائی کر سکے۔ ایک بہتر اور مستعد ماحول یقیناً زیادہ بہتر اور مستعد لوگوں کی افزائش کر سکتا ہے۔

بہر حال یہ سب کچھ نئے اطلاعاتی دائرے کے ہمراہ آنے والی تبدیلیوں کی اہمیت کی جانب محض ایک اشارے سے زیادہ کچھ نہیں کیونکہ ذرائع ابلاغ کا عدم پھیلاؤ اور کمپیوٹر کا عروج، دونوں لازم وملزوم ہو کر ہماری سماجی یاد داشت کو بدل رہے ہیں۔

سماجی یادداشت

تمام یاد داشتوں کو دو طرح کی یاد داشتوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک تو خالص ذاتی یا نجی ہوتی ہیں اور دوسری مشترکہ یا معاشرتی نوعیت کی۔نجی یا غیر اشتراک شدہ یادیں، انسان کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی ہیں۔ معاشرتی یادیں باقی رہتی ہیں۔مشترکہ یادشتوں کو مجتمع کرنے اور دوبارہ اپنے کام میں لانے کی حیرت انگیز صلاحیت ہی دراصل ہماری صنف کے ارتقاء کی کامیابی کا راز ہے۔کوئی بھی چیز جب ہماری معاشرتی یاد داشت کی تعمیر، اسے ذخیرہ کرنے اور اس کے استعمال کرنے کے انداز کو تبدیل کرتی ہے تو اس کے اثرات نسلوں تک جاتے ہیں۔

انسان، پہلے بھی اپنی تاریخ میں دو بار اپنی معاشرتی یاد داشت میں انقلابی تبدیلیاں لا چکا ہے آج بھی نئے اطلاعاتی دائرے کی تعمیر کرتے ہوئے ہم ایسی ہی ایک عظیم الشان تبدیلی کے دہانے پر کھڑے ہیں۔ ابتدائی دور میں انسان اپنی مشترکہ سماجی یادداشتیں بھی اسی جگہ محفوظ کرنے پر مجبور تھا جہاں وہ اپنی ذاتی اور نجی یادداشتیں ذخیرہ کرتا تھا۔۔۔

یعنی افراد کے اپنے اپنے ذہن ہیں۔

یہ تمام یادداشتیں قبائلی سرداروں، دانا لوگوں اور بہت سے دوسرے سمجھدار افراد کے ذہن میں تاریخ، دیو مالائی کہانیوں، لوگ گیتوں اور روایات کی شکل میں محفوظ رہتی تھیں اور وقتاً فوقتاً یہ سب کچھ وہ اپنے بچوں تک اپنی گفتگو، گیتوں، قوالیوں اور مثالوں کے ذریعے منتقل کرتے رہتے۔ آگ کیسے جلاتی ہے؟ پرندے کو جال میں پھانسے کا بہترین طریقہ کیا ہے؟ ہل کو کیسے تیز کیا جات ہے؟ یا بیلوں کی دیکھ بھال کس طرح کی جاتی ہے؟۔۔۔ قبیلے کا یہ اجتماعی تجربہ، انسانی Neurons and glia میں، خلاصے یا مختصر خاکے کی صورت میں محفوظ ہو جاتا تھا۔

جب تک حالات و معاملات اس حد تک محدود تھے، معاشرتی یادداشت بھی محدود تھی۔ چاہئے کسی بزرگ کی یادداشت کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو، گیتوں اور واقعات کی خوبصورتی اور دلکشی چاہے کتنی ہی یاد رکھے جانے کے قابل ہو، انسانی ذہن میں ذخیرہ کی اہلیت کم وبیش اتنی ہی رہتی تھی۔

دوسری لہر کی تہذیب نے یادداشت کی ان حدود کو توڑ ڈالا۔ اس کی وجہ سے وسیع پیمانے پر تعلیم پھیلی، ہزاروں لائبریریاں اور عجائب گھر تعمیر کئے گئے۔ فائل کیبنٹ ایجاد ہوئے۔غرض اس نے یادداشت کو دماغی حدود سے باہر نکالا۔

اسے ذخیرہ کرنے کے نئے طریقے تلاش کئے اور اس طرح یادداشت کی پرانی حدود کو بے پناہ وسعت دے ڈالی۔ اجتماعی علم کو ذخیرہ کرنے کی اہلیت بڑھاتے ہی، سماجی تبدیلیاں اور ایجادات کا عمل تیز تر ہو گیا اس طرح دوسری لہر کی تہذیب کو ایسی تیز رفتار تبدیلیوں کو اختیار کرنے اور ثقافتی ارتقاء کی جانب گامزن ہونے کا موقع ملا، جس کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔

آج ہم معاشرتی یادداشت کے ایک نئے مرحلے کی جانب جست لگانے والے ہیں۔ ذرائع ابلاغ کا انقلابی عدم پھیلاؤ نئے میڈیا کی ایجاد، خلائی سیٹلائٹس کے ذریعے دنیا کی نقشہ نویسی، ہسپتالوں میں مریضوں کی الیکٹرانک حساس آلات کے ذریعے نگرانی، اداراتی فائلوں کو کمپیوٹرائز کرنا۔۔۔ اس کا مطلب ہے کہ ہم اپنی تہذیب کی سرگرمیوں کی لمحہ بہ لمحہ

تفصیلات ذخیرہ کرتے جا رہے ہیں۔ اگر ہم نے زمین کو بمعہ اپنی یادداشت کے جلا کر خاکستر نہ کر دیا تو جلد ہی اپنی تہذیب کی تفصیلی یادداشت سے ملتی جلتی شے مرتب کر لیں گے، جسے بوقت ضرورت با آسانی استعمال بھی کیا جا سکے گا۔ تیسری لہر کی تہذیب کے پاس کہیں زیادہ انفارمیشن اور کہیں بہتر مرتب انفارمیشن موجود ہو گی۔ جس کا ابھی ایک چوتھائی صدی پہلے تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

تیسری لہر کی سماجی یادداشت کی جانب تبدیلی کا سفر محض شماریاتی تناظر میں ہی نہیں دیکھنا چاہئے بلکہ درحقیقت ہم اپنی یادداشت کو نئی زندگی بخش رہے ہیں۔ جب سماجی یادداشت ذہنوں میں محفوظ ہوتی تھی، اس میں مسلسل کانٹ چھانٹ، تروتازگی اور حرکت پذیری کا عمل جاری رہتا تھا۔ نت نئے انداز میں اس کی ترتیب وتشکیل ہوتی رہتی تھی۔ یہ مستعد اور متحرک رہتی تھی، بلکہ حقیقی معنوں میں زندگی سے بھرپور ہوتی تھی۔

جونہی صنعتی تہذیب کے ہاتھوں سماجی یادداشت دماغ کی حدود سے باہر نکلی، اس نے معروضی صورت اختیار کر لی، اور فنی حقائق کی صورت میں کتابوں، تنخواہوں کے حساب کتاب، اخبارات، تصاویر اور فلموں میں مرتکز ہو گئی۔ لیکن کسی صفحے پر بنا ہوا خاکہ، فلم میں کسی خاص لمحے کی لی گئی تصویر، ایک بار کا شائع شدہ اخبار، ظاہر ہے مجہول یا غیر متحرک حالت میں موجود ہوتا تھا۔ دوبارہ انسانی ذہن میں پہنچنے کے بعد ہی یہ زندہ اور متحرک ہو سکتے تھے تاکہ انہیں نئے انداز یا نئی ترتیب سے مجتمع یا استعمال کیا جا سکے۔ دوسری لہر کی تہذیب نے جہاں یادداشت کو انقلابی وسعت دی، وہاں اسے منجمد بھی کر دیا۔

تیسری لہر کے اطلاعاتی دائرے کی جانب جست کو اتنا بے مثال تاریخی واقعہ اسی بنا پر سمجھا جا رہا ہے کہ اس کے ذریعے سماجی یادداشت نہ صرف وسعت پذیر بلکہ مستعد بھی ہو رہی ہے۔ ان دونوں خصوصیات کا اجتماع ارتقائی عمل کو تیز تر کر دے گا۔

یہ جدید توسیع شدہ یادداشت روبہ عمل ہو کر تر وتازہ ثقافتی توانائیوں کا راستہ ہموار کرے گی کیونکہ کمپیوٹر نہ صرف خاکوں کو منظّم یا مرتب کر کے حقیقت کے مربوط ماڈل بنانے میں ہماری مدد کرتا ہے بلکہ دوراز کار امکانات تک ہماری رسائی ممکن بناتا ہے۔ کوئی لائبریری یا فائل کیبنٹ سوچ نہیں سکتی، غیر دقیانوسی انداز میں صرف سوچنا ہی کتنا بڑا عمل ہے! کمپیوٹر

سے اس کے برعکس سوچ سے ماورا، اور پہلے کبھی نہ سوچی گئی باتوں کے بارے میں بھی، پوچھا جا سکتا ہے۔ ایسے خیالات ونظریات اور تصورات مثلاً فنی تخیلات، تکنیکی پیش رفت، معاشی اور سیاسی اختراعات وغیرہ۔۔۔ جن کے بارے میں سوچ بچار اور تصور کرنا بھی محال تھا، کمپیوٹر کی وجہ سے ممکن العمل ہو رہے ہیں۔ اس طرح تاریخی تبدیلیوں کا عمل تیز ہو رہا اور تیسری لہر کے رنگا رنگ معاشرے کی طرف پیش رفت بھی ہو رہی ہے۔

گذشتہ تمام معاشروں میں اطلاعاتی دائرہ، انسانوں کے مابین ذرائع ابلاغ مہیا کرتا تھا۔ تیسری لہر نے ان ذرائع میں کئی گنا اضافہ کر دیا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ تاریخ میں پہلی بار۔۔۔ مشین کا مشین سے رابطہ اور اس سے زیادہ حیرت انگیز، انسان اور اردگرد کے ذی شعور ماحول کا باہم ابلاغ۔۔۔ جیسی طاقت ورسہولتیں بھی فراہم کر رہی ہے۔ اگر ہم کچھ لمحے رک کر موجودہ وسیع منظر پر نظر ڈالیں تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اطلاعاتی دائرے میں برپا شدہ انقلاب کسی بھی طرح تکنیکی دائرے کے۔۔۔ نظام توانائی اور معاشرے کی ٹیکنالوجیکل بنیاد میں۔۔۔ انقلاب سے کم ڈرامائی نہیں۔

ایک نئی تہذیب کی تشکیل کا کام انتہائی تیزی سے بیک وقت کئی سطحوں پر انجام پا رہا ہے۔

MashalBooks.org

باب14

وسیع پیمانے کی پیداوار سے ماوراء

کچھ ہی عرصے پہلے، ایک دن میں نے کرائے کی کار میں ''راکی'' کے پہاڑی سلسلے کی برف پوش چوٹیوں سے اپنا سفر شروع کیا اور سانپ کی طرح لہراتی بل کھاتی سڑکوں سے گزر کر مختلف النوع راستوں سے ہوتا نیچے اور نیچے، اس عالیشان پہاڑی سلسلے کے نشیبی دامن کی مشرقی جانب جا پہنچا۔ کولوراڈو سپرنگس میں، نیلے چمکتے آسمان تلے آ کر میں نے ہائی وے کے کنارے کنارے تعمیر شدہ ایک طویل اور کم بلند کمپلیکس کا رخ کیا۔ پیچھے دور کہیں برف پوش چوٹیاں خوبصورت پس منظر کے طور پر موجود تھیں۔

عمارت میں داخل ہوتے ہی مجھے وہ فیکٹریاں یاد آ گئیں، جہاں کبھی میں نے کام کیا تھا، ان کا شور، تھرتھراہٹ، اڑتی خاک، دھواں اور دبا دبا غم و غصہ گویا میری نظروں کے آگے پھر گیا۔ سالوں سے جب سے ہم نے فیکٹری کا جسمانی مشقت کا کام چھوڑا ہے میں نے اور میری بیوی نے فیکٹری سیاحوں کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ دنیا کے گرد اپنے تمام سفر کے دوران، ہم نے کلیساؤں کی زیارت اور سیاحوں کے لئے مختص جگہوں کی سیر تفریح اور ان کی یادیں مجتمع کرنے میں وقت ضائع کرنے کے بجائے، یہ وطیرہ اختیار کیا کہ لوگوں کے کام کاج اور انداز و اطوار کا مشاہدہ کیا جائے۔ کیونکہ ان کے سوا کوئی اور چیز، ان کی ثقافت پر روشنی نہیں ڈال سکتی۔ آج پھر میں کولوراڈو سپرنگس میں ایک فیکٹری کا دورہ کر رہا تھا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ یہ دنیا کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ صنعتی سہولتیں مہیا کرنے والی جگہوں میں سے ایک ہے۔

اس کی وجہ سے میں فوراً ہی واضح ہوگئی کیونکہ ایسے پلانٹس میں ہر کوئی جدید ترین ٹیکنالوجی اور انتہائی ترقی یافتہ اطلاعاتی نظام۔۔۔۔ اور ان کے باہمی اتصال کے عملی اثرات

کی جھلک فورا ہی محسوس کر لیتا ہے۔ اس ہیولیٹ پیکارڈ میں سوملین ڈالر سالانہ مالیت کی الیکٹرانک آلات۔۔۔۔ ٹی وی مانیٹرز اور طبی آلات میں مستعمل کیتھوڈ رے ٹیوبس، اوسیلو سکوپس، ٹسٹ کرنے کے لئے ''لاجک اینا لائزرز'' بلکہ اس سے بھی زیادہ حساس آلات۔۔۔۔ تیار کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ یہاں برسرکار 1700افراد میں سے 40%لوگ انجینئرز، پروگرامرز،ٹیکنیشن، کلرک اور انتظامیہ سے متعلق ہیں۔ وہ سب ایک وسیع وعریض اونچی چھت والی کھلی جگہ پر کام کرتے ہیں۔ ایک پوری دیوار پر پائنک پیک کا عظیم الشان منظر ابھرا ہوا نظر آتا ہے۔ دوسری دیواروں پر چمکدار زرد اور سفید رنگ پینٹ کیا گیا۔ ہلکے ڈینائل رنگ کے چمکتے دمکتے فرش، کسی ہسپتال کی مانند، صاف ستھرے نظر آتے ہیں۔

ہیولیٹ پیکارڈ میں کلرکوں سے کمپیوٹر ماہرین تک، پلانٹ مینجر سے پرزے جوڑنے والوں اور نگرانوں تک، تمام کارکنوں کو علیحدہ علیحدہ رکھنے کے بجائے کھلے کھلے ہالوں میں مل جل کر کام کرنا ہوتا ہے۔ مشینوں کے چلتے شور کے درمیان، چیخ چیخ کر بات کرنے کے بجائے، وہ عمومی انداز گفتگو اختیار کرتے ہیں۔ ہر شخص روز مرہ کا لباس پہنے ہوتا ہے، رینک یا کام کی بنیاد پر ظاہری طور پر کوئی فرق محسوس ہی نہیں ہوتا۔ پیداواری کارکن اپنے اپنے بینچوں یا ڈسکوں پر بیٹھتے ہیں۔ ان میں سے بہت سی جگہیں عشق پیچاں کی بیل پھولوں اور دوسرے سرے سرسبز پودوں سے اس طرح سجی ہوتی ہیں کہ ان پر کسی باغیچے کا گمان ہونے لگتا ہے۔

اتنا شاندار اور سہولیات سے بھرپور ماحول دیکھ کر، میرے ذہن میں یہ خیال رینگنے لگا کہ اگر میں کسی جادو کے زور سے اپنے پرانے مزدور ساتھیوں کو فاؤنڈری کی متحرک اسمبلی لائن کی لمبی قطار، گرد اور مٹی سے بھرپور (سخت جسمانی مشقت) اور مروجہ سخت گیر انتظامی ماحول سے نکال کر یہاں لے آؤں تو انہیں کام کا جدید ماحول کتنا خواب ناک لگے گا۔ وہ اپنے سامنے موجود منظر کو دیکھ کر حیرت سے آنکھیں جھپکانا بھول جائیں گے۔ میں یہ قطعاً نہیں کہتا کہ ہیولیٹ پیکارڈ کارکنوں کی جنت ہے اور مزدور دوست اتنی آسانی سے بے وقوف بنائے بھی نہیں جا سکتے۔ وہ تنخواہوں کے شیڈیول، دیگر فوائد، علاج معالجے کے

MashalBooks.org

طریقوں کے بارے میں ایک ایک کر کے جاننا چاہیں گے۔ پلانٹ میں مستعمل نئی اشیاء اور مواد کے بارے میں بھی یقیناً وہ باخبر ہونا چاہیں گے کہ کیا حفاظتی انتظامات ہیں اور کہیں حفظانِ صحت کے لئے ماحولیاتی ضرر رساں مسائل تو پیدا نہیں ہوتے۔ یہ بھی ان کے ذہن میں ہوگا کہ بظاہر خوشگوار ماحول کے باوجود کچھ لوگ حکم دے رہے ہوں گے اور دوسروں کو ان کی تعمیل کرنا ہوگی۔

بہرحال میرے پرانے دوستوں کی تجربہ کار نگاہیں یہاں بہت کچھ اپنی جانی پہچانی کاسیکل فیکٹریوں کے مقابلے میں جدید اور خاصی حد تک مختلف پائیں گے۔ مثلاً وہ یہ محسوس کریں گے کہ تمام کارکن بیک وقت فیکٹری پہنچ کر وقت پر پنچ کرنے اور اپنے اپنے کام کی جگہوں پر دوڑے جانے کے بجائے ایک مناسب حد میں اپنی مرضی کے اوقات کار کا چناؤ کر سکتے ہیں۔ ایک جگہ کام کرنے پر مجبور ہونے کے بجائے وہ اپنی مرضی سے اردگرد آ جا بھی سکتے ہیں۔ میرے پرانے ساتھ اس پر یقیناً حیران ہونگے کہ تمام ایچ پی کارکن، پھر ایک مناسب حد میں اپنے کام کی رفتار سیٹ کرنے میں مینجر اور انجینئرز کے مرتبے اور دبدبے میں آئے بغیر، ان سے گفتگو کرنے میں اور اپنی مرضی کے کپڑے پہننے میں آزاد ہیں۔

مختصراً بھاری بھرکم جوتوں، گندے اوور آل اور ٹوپیاں پہننے والے یہ افراد، درحقیقت میرا اپنے پرانے ساتھی۔۔۔۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں۔۔۔۔ فیکٹری کے ایسے ماحول کے بارے میں سوچ ہی نہیں سکتا۔ اگر ہم اس فیکٹری وسیع پیداوار کے گھر کے طور پر لیں تو یہ بہت حد تک صحیح ہو گا کیونکہ وسیع پیمانے کی پیداوار میں یہ سہولتیں ممکن نظر نہیں آتیں۔ ہم دراصل وسیع پیداواری عمل سے بھی کہیں آگے گامزن ہو رہے ہیں۔

چوہے کا دودھ اور ٹی شرٹس

یہ بات اب کوئی راز نہیں رہی کہ پچھلے پچیس برسوں کے دوران اکثر ترقی یافتہ ملکوں میں صنعتی کارکنوں کی تعداد کم ہوئی ہے۔ (امریکہ میں آج آبادی کا صرف 9% ملین کارکن کوئی 220 ملین لوگوں کے لئے اشیاء تیار کرتے ہیں۔ باقی 65 ملین کارکن خدمات و سہولیات مہیا کرتے ہیں) جوں جوں صنعتی دنیا میں اشیاء کی پیداوار کا عمل سکڑا ہے۔ توں توں روزمرہ کی اشیاء کی پیدوار کو نام ونہاد ترقی پذیر ممالک، الجیریا سے میکسیکو اور تھائی لینڈ

MashalBooks.org

تک۔۔۔ میں شفٹ کر دیا گیا ہے۔ پرانی استعمال شدہ اور ناکارہ کاروں کی طرح، دوسری لہر کی دقیانوسی ترین صنعتوں کو امیر اقوام سے غریب اقوام کے علاقوں میں، برآمد کر دیا گیا ہے۔

کچھ بنیادی حکمت عملی اور کچھ معاشی وجوہات کی بنا پر، امیر اقوام کے لئے۔ صنعتی پیداواری عمل سے بالکل علیحدہ ہونا یا ''خدماتی معاشروں'' یا ''اطلاعاتی معیشتوں'' کی خالص مثال بن کر رہ جانا ممکن العمل ہی نہیں۔ یہ تصور کرنا کہ امیر اقوام غیر مادی پیداوار پر اکتفا کریں اور باقی ساری دنیا مادی اشیاء کی پیداوار میں جت جائے۔۔۔ اسے انتہائی سادگی یا بھولپن ہی کہا جا سکتا ہے۔ ہونا یہ ہے کہ امیر اقوام بنیادی اشیاء کی پیداوار جاری رکھیں گی۔۔۔ لیکن ان میں برسر کار کارکنوں کی ضرورت نسبتاً کم ہو گی کیونکہ ہم اشیاء کی، پیداوار کے طریقوں میں انقلابی تبدیلیاں لا رہے ہیں۔

دوسری لہر کے پیداواری عمل کی رح لاکھوں کی تعداد میں یکساں مشابہت والی اور معیاری اشیاء کی وسیع پیمانے پر تیاری تھی۔ اس کے برعکس تیسری لہر کا صنعتی عمل جزوی یا مکمل طور پر انفرادی پسندیدگی کی بنیاد پر مختصر پیمانے پر اشیاء کی تیاری سے مختص ہے۔

عوامی سوچ ابھی تک وسیع پیمانے کے پیداواری عمل کے گرد ہی گھومتی ہے اور یہ ہے بھی حقیقت کہ ہم اربوں سگریٹیں، کروڑوں گز کپڑا، روشنی کے بلب، ماچس، اینٹیں یا بجلی کے سپارک پلگ، ستاروں کی سی تعداد میں۔۔۔ آج بھی بناتے جا رہے ہیں اور یہ بھی سچ ہے کہ اس طرح کا عمل کافی عرصے تک جاری رہے گا۔ لیکن مختصراً یہ ساری اشیاء دقیانوسی صفتوں سے متعلق ہیں اور ترقی یافتہ صنعتی عمل سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ تمام صنعتی اشیاء کا بمشکل 5% بنتی ہیں۔

سوویت سٹڈیز کے ایک جریدے کریسٹیک میں ایک تجزیہ نگار لکھتا ہے کہ جب ''نسبتاً'' کم ترقی یافتہ ممالک۔۔۔ جن کی عمومی قومی پیداوار ایک اور دو ہزار امریکی ڈالر فی سالانہ کے درمیان ہے،۔۔۔ وسیع پیداواری عمل پر ارتکاز کرتے ہیں، تو اعلیٰ ترقی یافتہ ممالک۔۔۔ ایسی خاص اور مختصر پیمانے کی ان پیداواری اشیاء کی برآمد پر توجہ مرکوز کرتے ہیں جو انتہائی ماہرانہ کاریگری اور بلند تحقیق اخراجات کی حامل ہوں۔ مثلاً کمپیوٹرز، خصوصی

مشینری، ہوائی جہاز، خود کا پیداواری نظام، اعلی ٹیکنالوجی کے حامل پینٹس، فارماسوٹیکل اشیاء، اعلی ٹیکنالوجی والے پیچیدہ مرکبات اور پلاسٹک۔ جاپان، مغربی جرمنی، امریکہ بلکہ سوویت یونین میں بھی برقی اشیاء، کیمیکلز، ہوابازی، الیکٹرانکس، خصوصی گاڑیوں، مواصلات اور ایسے ہی دوسرے شعبوں میں ہمیں انفرادی جدت کا رجحان خاصا ارتقاء پذیر نظر آتا ہے۔

مثال کے طور پر شمالی ایلی نوائے میں ویسٹرن الیکٹرک کے عظیم ترقی یافتہ پلانٹ میں کارکن چار سو مختلف اقسام کے ''سرکٹ پیکس'' بناتے ہیں، جن میں سے بعض کی پیداوار دو ہزار فی مہینہ کی زیادہ سے زیادہ حد کو چھوتی ہے اور بعض اشیاء کم سے کم صرف دو فی مہینہ بنتی ہیں۔ کولوریڈو سپرنگس میں ہیولیٹ پیکارڈ کی کم سے کم پیداوار پچاس سے ایک سو اکائیوں جتنی کم ہونا عام سی بات ہے۔

امریکہ میں آئی بی ایم، پولا رائیڈ، میک ڈونلڈ ڈگلس، ولیسٹنگ ہاؤس اور جنرل الیکٹرک، برطانیہ میں پلے سی اور آئی ٹی ٹی، جرمنی میں سیمنز یا سویڈن میں ایرک سن۔۔۔ ان سب اداروں میں مختصر پیمانے کی تخصیصی پیداوار کا رجحان بڑھتا ہوا واضح محسوس ہوتا ہے۔ ناروے کا ایکر گروپ، جو کبھی قومی جہاز سازی کی صنعت کے 45% حصے پر قابض تھا، آف شور آئل ایکوپمنٹ کی پیداوار کی جانب چلا گیا ہے۔ نتیجہ جہازوں کی ''مسلسل پیداوار'' سے ''درزی کی تیار کردہ'' آف شور پیداوار کی سمت منتقلی کی صورت میں نکلا۔

کیمکلز میں بھی، بقول ایک اعلی منتظم آر۔ای۔ لی کے، ایکسون ''چھوٹے پیمانے کی اشیاء کی تیاری۔۔۔ کی جانب بڑھ رہی ہے۔ پیرامنز میں ہم زیادہ تر انفرادی کاموں میں مصروف ہیں۔ ''بعض پیداواری عمل اتنے مختصر پیمانے کے ہیں کہ بقول لی ''ہم انہیں چوہے کا دودھ نکالنے کے عمل کا نام دیتے ہیں۔''

دفاعی پیداوار کے متعلق بھی زیادہ تر لوگ ابھی تک یہ سمجھتے ہیں کہ وہ وسیع پیمانے پر ہوتی ہے لیکن حقیقت اس کے برعکس، مختصر پیمانے پر مبنی ہے۔ ہم لاکھوں ایک جیسی وردیوں، ہیلمٹس اور بندوقوں کا تصور ذہن میں لاتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ جدید فوجی انتظامیہ کے زیادہ تر استعمال کی چیزیں وسیع پیمانے کی پیداوار سے قطعی غیر متعلق ہیں۔ جنگی جیٹ طیارے، ایک وقت میں دس سے پچاس جیسی کی تعداد میں بنائے جا سکتے ہیں۔ مقصد

اور محکماتی ضرورت کے مطابق ان میں ہلکی پھلکی تبدیلیاں بھی کی جاتی ہیں۔ ان چھوٹے آرڈرز کی تکمیل کے لئے، ہوائی جہازوں میں استعمال ہونے والے مختلف اجزاء بھی ظاہر ہے، تھوڑی تعداد میں ہی بنائے جاتے ہونگے۔

چنانچہ حتمی اشیاء کی خریداری پر پینٹاگان کے اخراجات سے متعلق ایک تجزیہ انتہائی چونکا دینے والا ہے۔ 9.1 بلین ڈالر کا 78%(7.1 بلین ڈالر) ایسی حتمی اشیاء پر خرچ کیا گیا، جو سوسوا کائیوں سے بھی کم مقدار میں تیار کی گئی تھیں۔

ایسے شعبوں میں، جہاں ابھی تک بڑے پیمانے پر بہت سے اجزاء تیار کئے جاتے ہیں۔۔۔۔بعض انتہائی ترقی یافتہ صنعتوں میں یہی صورت حال ہے۔۔۔۔ان اجزاء کومختلف اقسام کی حتمی اشیاء میں استعمال کیا جاتا ہے، جن میں سے ہر قسم پھر محدود پیمانے پر بنائی جاتی ہے۔

آج ایریزونا کی شاہراہ پر بھاگتی دوڑتی، ناقابل یقین حد تک رنگا رنگ اقسام کی گاڑیوں پر صرف ایک نظر ڈالنے سے پتہ چل جاتا ہے کہ مقابلتاً ایک جیسی گاڑیوں کی مارکیٹ، کس طرح انواع واقسام کی گاڑیوں کی مارکیٹ میں بدل گئی، نہ صرف یہ بلکہ صورت حال نے ٹیکنالوجیکل ڈیوہیکل کارسازوں کو کافی حد تک انفرادی پسند ناپسند کا دھیان رکھنے پر بھی مجبور کر دیا ہے۔ اب کار ساز ادارے، یورپ، جاپان اور امریکہ میں مختلف اجزاء اور انکے متفرق حصوں کی بڑے پیمانے پر پیداوار کر کے، گاڑیوں کو حتمی شکل دینے کے لئے، انفرادی خصوصیات کا خاص خیال رکھتے ہوئے مختلف النوع طریقے اختیار کرتے ہیں۔

ایک اور سطح پر معمولی سی شرٹ کو دیکھئے۔ شرٹس وسیع پیمانے پر بنائی جاتی ہیں لیکن جدید ارزاں تیز حدت کے ذریعے، پرنٹ کے عمل نے مختلف ڈیزائنوں اور نعروں کی چھپائی بہت تھوڑی سی شرٹس پر بھی انتہائی سستی کر دی ہے۔ چنانچہ رنگا رنگ پھولوں والی شرٹس پہننے والے کی ذات یا اس کے رجحان کی پہچان۔۔۔۔مثلاً بیتھون کا دل دادہ، بیئر کا رسیا یا عریاں ستاروں وغیرہ۔۔۔۔ کا پتہ دیتی نظر آتی ہیں۔ کاریں، ٹی شرٹس اور کئی دوسری اشیاء وسیع پیمانے اور انفرادی تشخص کی درمیانی پیداواری سٹیج کی نمائندگی کر رہی ہیں۔

اس کے بعد آنے والا مرحلہ بلاشبہ مکمل انفرادی پسند پر مبنی۔۔۔۔ایک قسم کی ایک

MashalBooks.org

ہی شے کی تیاری کا مرحلہ ہو گا۔ ہم واضح طور پر ہر فرد کی ذاتی ضروریات اور رجحان سے مطابقت رکھنے والی اشیاء کی پیداوار کے عمل کی جانب بڑھ رہے ہیں۔

جدید پیداواری عمل کے ماہر اور رینڈ کارپوریشن کے انفارمیشن سروس ڈیپارٹمنٹ کے سربراہ رابرٹ ایچ اینڈرسن کے مطابق، ''مستقبل قریب میں انفرادی ضروریات کے مطابق اشیاء کی تیاری کوئی زیادہ مشکل کام نہیں ہو گا،۔۔۔۔ یہ ایسے ہی ہو گا جیسے آج کل وسیع پیمانے کی اشیاء بنائی جاتی ہیں۔۔۔۔ہم اس مرحلے سے کہیں آگے جا چکے ہیں، جہاں بہت ساری اشیاء ایک ہی نقشے کے مطابق تیار کر کے، انہیں باہم جوڑ دیا جات تھا۔۔۔۔ اب ہم ترقی کی اس سطح پر ہیں، جہاں کپڑوں کی طرح، انفرادی ضرورت کے مطابق چیزیں تیار کی جاسکتی ہیں۔''

ذاتی ضروریات سے مطابقت پیدا کرنے کے رجحان کے سفر کی بہترین مثال، غالباً ابھی کچھ عرصے پہلے مارکیٹ میں لائی گئی، کمپیوٹر کے ذریعے چلنے والی ملبوسات کی صنعت میں استعمال کے لئے لیزر گن ہوسکتی ہیں۔ دوسری لہر کے جلو میں، وسیع پیمانے کی پیداوار کے نزول سے پہلے، اگر کوئی شخص کوئی لباس بنوانا چاہتا تو وہ عموماً کسی درزی یا درزن کے پاس جاتا تھا یا اس کی بیوی گھر میں ہی سی دیتی تھی۔ بہرصورت یہ کام اس شخص کی ذاتی پیمائش کے مطابق ہاتھ سے انجام دیا جاتا تھا۔سلائی کڑھائی کا یہ سارا کام ذاتی ضروریات یا رجحان کے مطابق ہی مکمل ہوتا تھا۔ دوسری لہر کی آمد کے بعد، ہم نے وسیع پیداواری بنیادوں پر یکساں شکل و شباہت کے لباس تیار کرنا شروع کر دیئے۔اس سسٹم کے تحت کارکن کپڑے کی بہت سی تہیں جما کر ان کے اوپر پیٹرن رکھ دیتا اور تیز دھار برقی چاقو کے ذریعے پیٹرن کے کناروں کے ساتھ ساتھ کٹائی کر کے بہت سے یکساں ٹکڑے بیک وقت حاصل کر لیتا۔بعد میں بھی وہ یکساں عمل سے گزارنے جاتے اور اس طرح یکساں سائز شکل و صورت، رنگ، غرض ہر طرح ایک جیسے کپڑے تیار ہو جاتے۔نئی لیزر مشین، حیرت انگیز حد تک، بالکل ہی مختلف اصول پر کام کرتی ہے۔ یہ بیک وقت دس، پچاس، سو یا پانچ سو شرٹس یا جیکٹس نہیں کاٹتی بلکہ ایک وقت میں صرف ایک ہی کٹائی کرتی ہے۔

پھر بھی آج تک مستعمل، وسیع پیمانے کے طریقوں سے کہیں زیادہ تیز اور سستی

ہے۔ یہ نہ صرف خام مال کے ضیاع کو کم کرتی ہے بلکہ سامان کی لمبی چوڑی فہرستوں کی ضرورت بھی ختم کر دیتی ہے۔ انہی وجوہات کی بدولت، امریکہ میں ملبوسات کی ایک بہت بڑی کمپنی جینیسکو (Genesco) کے صدر کی ٹھوس رائے ہے کہ ''لیزر مشین کے ذریعے ایک لباس کے آرڈر کو بھی با کفایت تیار کیا جا سکتا ہے۔'' اس سے پتہ چلتا ہے کہ معیاری سائز کسی بھی دن اچانک غائب ہو سکتے ہیں اور ممکن ہے کہ ایک شخص اپنی پیمائش ٹیلیفون کے ذریعے بتا کر یا ویڈیو کیمرے کے ذریعے اپنی تصویر اتروا کر براہ راست کمپیوٹر میں پہنچا دے اور وہ مشین کو براہ راست احکامات کے ذریعے ایک لباس تیار کرنے کا کہے۔ جو اس شخص کے ذاتی قد وقامت اور اس کی انفرادی ضروریات کے عین مطابق ہو۔

اعلیٰ ٹیکنالوجی کے حامل انفرادی ضروریات سے ہم آہنگ لباس کی تیاری، درحقیقت ہمارے مدنظر ہے۔ صنعتی انقلاب سے پہلے یہی نظام پیداوار، دنیا میں ہر جگہ موجود تھا جو اب دوبارہ بحال ہو رہا ہے مگر انتہائی ترقی یافتہ اور پیچیدہ ٹیکنالوجی، اب اس کی پشت پناہ ہے۔

میڈیا کی تخصیص کرنے کے ساتھ ساتھ ہم صنعتی پیداواری کی تخصیص کر رہے ہیں۔

تیز رفتار حرکت کا اثر (The Presto effect)

اشیاء بنانے کے طریقوں میں کئی ایک حیرت انگیز ایجادات کی وجہ سے بہت سی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ جہاں بعض صنعتیں وسیع پیمانے کے بجائے کم عددی پیداوار کی جانب متوجہ ہوگئی ہیں، وہاں کئی صنعتوں نے مزید پیش رفت کر کے انفرادی ضروریات سے ہم آہنگی کو ہی مسلسل پیداوار کی مستقل بنیاد بنا لیا ہے، ہر مختصر پیداواری عمل کی ابتداء اور اختتام پر مشینوں کو روک دینے کی بجائے وہ اس مقام پر پہنچ رہے ہیں، جہاں مشینیں خود کو دوبارہ سیٹ کر کے ایک مختصراً ہم بڑی تیزی سے مسلسل اور دن رات کام کرتی مشینوں کے ذریعے انفرادی ضروریات کی تکمیل کی جانب بڑھ رہے ہیں۔

ایک اور اہم تبدیلی جس کا مشاہدہ ہم ابھی کچھ دیر میں کریں گے، کے ذریعے گاہک کا پیداواری عمل سے اتنا قریبی اور براہ راست تعلق ہوگیا ہے، جس کا کبھی سوچا بھی نہ

جا سکتا تھا۔ بعض صنعتوں میں ہم اس مرحلے سے صرف ایک قدم پیچھے ہیں، جہاں کوئی گاہک کمپنی، اپنی مطلوبہ خصوصیات، براہ راست پیداوار کرنے والی کمپنی کے کمپیوٹرز میں پہنچا رہی ہو گی اور وہ جواباً خود ہی پیداواری لائن کو کنٹرول کرنا شروع کر دیں گے۔ اس عمل کے پھیلاؤ کے ساتھ ہی پیداواری عمل کے ساتھ گاہک کا تعلق اتنا گہرا ہو جائے گا کہ ہمیں یہ بتانا مشکل سے مشکل تر ہوتا جائے گا کہ کون صارف ہے اور کون صانع؟ اور آخری بات یہ ہے کہ دوسری لہر کی مصنوعات، ان معنوں میں فرانسیسی فلاسفر اور ریاضی دان کارٹی سین کے اصولوں پر مبنی عمل کیمطابق تھیں کہ پہلے اشیاء کو اجزاء میں تقسیم کیا جائے اور پھر انتہائی مہارت سے انہیں دوبارہ جوڑ دیا جائے۔ تیسری لہر کا صنعتی مصنوعات کے پیداواری عمل میں آنے والی تبدیلی سے اس کی بہتر وضاحت کی جا سکتی ہے۔ ایک زمانے میں گھڑیوں میں سینکڑوں پرزے ہوا کرتے تھے۔ اب ہم نے ایسی سالڈ سٹیٹ گھڑیاں بنا لی ہیں۔۔۔۔ جو کہیں زیادہ صحیح اور قابل اعتماد ہیں۔۔۔۔ مگر ان میں متحرک پرزے، سرے سے موجود ہی نہیں ہیں۔ اسی طرح آج کے پیناسانک ٹی وی سیٹ میں گذشتہ دس سال پرانے ماڈل کے مقابلے۔۔۔۔ پرزوں کی تعداد آدھی رہ گئی ہے۔ جوں جوں چھوٹے مائیکرو پراسیسرز۔۔۔۔ دوبارہ وہی حیرت انگیز چپس۔۔۔۔ زیادہ سے زیادہ اشیاء میں استعمال ہو رہے ہیں، توں توں وہ روایتی پرزوں کی خاصی معقول تعداد کو ختم کرتے جا رہے ہیں۔ ایکسون نے ''کیووائی ایکس'' نامی ٹائپ رائٹر روشناس کرایا ہے، جس میں آئی بی ایم سلیکٹرک کے سینکڑوں پرزوں کے مقابلے میں مٹھی بھر چند پرزے لگائے گئے ہیں۔ اسی طرح کینن اے ای۔ نامی معروف 35 ایم ایم کیمرہ اپنی گذشتہ ماڈل کے مقابلے میں 300 کم پرزوں کے ساتھ بنایا گیا ہے ان میں سے 175 پرزوں کی جگہ صرف ایک ٹیکساس انسٹرومنٹس چپ لگایا گیا ہے۔

کمپیوٹر کی معاونت سے تیار شدہ ڈیزائن اور دوسرے جدید صنعتی آلات کے ذریعے، سالماتی (Molecular) سطح تک رسائی حاصل کر کے، ہم زیادہ سے زیادہ افعال کو کم سے کم اجزاء میں مجتمع کر کے گویا بہت سے مختلف پرزوں کی جگہ ''مکمل'' اجزاء لگائے جا رہے ہیں۔ ارتقاء کی رفتار کا اندازہ، فن مصوری میں، فوٹوگرافی کے کمالات سے کیا جا سکتا

ہے۔ کینوس پر مختلف قسم کے رنگ بکھیر کر تصویر بنانے کے بجائے، مصور صرف ایک بٹن دبا کر، تمام خاکہ صرف ایک لمحے میں بنا ڈالتا ہے۔ اسی تیز رفتار عمل کا مظاہرہ ہم صنعتی پیداواری عمل میں بھی شروع کرنے جا رہے ہیں۔

اس طرح پیٹرن بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ تکنیکی اور اطلاعاتی دائروں میں ہم جہتی تبدیلیاں ہمارے طریق پیداوار میں بھی تبدیلیاں لا رہی ہیں۔ ہم انتہائی تیزی سے وسیع پیمانے کی پیداوار کے روایتی سسٹم سے، وسیع پیمانے اور مختصر پیمانے کے دلکش امتزاج کی جانب بڑھ رہے ہیں۔ اس ساری جدوجہد کا حقیقی مقصد اب واضح ہو رہا ہے۔ مکمل طور پر انفرادی ضروریات سے ہم آہنگ اشیاء، مسلسل جاری پراسیس کے ذریعے "مکمل اجزاء" سے تیار شدہ اور آہستہ آہستہ صارف کا پیداوار پر براہ راست کنٹرول۔

مختصراً معاشرے کی ہر سطح پر تبدیلی کے اثرات پہنچا کر، ہم پیداوار کے عمیق ڈھانچے میں انقلابی تبدیلی لا رہے ہیں لیکن اس مکمل تبدیلی کو، جو طالب علم کو اپنے کیریئر کے چننے میں، سرمایہ کاری کے لئے کاروباری یا قومی ترقیاتی حکمت عملی کے لئے منصوبہ بندی پر اثر انداز ہو گی۔۔۔ محض ایک تبدیلی کے طور پر سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔ اسے ایک اور انقلاب کے براہ راست تعلق کے حوالے سے دیکھا جانا چاہئے۔۔۔ جو دفتر میں بپا ہو رہا ہے۔

سیکرٹری کا انتقال

جوں جوں امیر اقوام میں، طبعی پیداوار میں، افرادی قوت کا استعمال کم ہوتا گیا اسی طرح نظریات، خرید و فروخت کے حق کی تخصیص سائنسی فارمولوں، بلوں، اشیاء کی فہرستوں، تنظیم نو کے منصوبوں، فائلوں، معلومات، مارکیٹ کی تحقیق، اشیائے فروخت کی نمائش، خطوط، گوشوارے، قانونی شذرے، انجینئرنگ جزئیات و خصوصیات، کمپیوٹر پروگراموں اور اسی طرح کے ہزاروں دوسرے شماریاتی اعداد اور غیر حقیقی پیداواری کاموں کے لئے زیادہ سے زیادہ لوگوں کی اتنی تیزی سے بڑھتی گئی۔ سفید کالر، ٹیکنیکل اور انتظامی سرگرمیاں بہت سے ملکوں میں اتنی تیزی سے بڑھی ہیں کہ ان کی وضاحت کے لئے کسی قسم کا شماریاتی ثبوت دینے کی کوئی ضرورت ہی نہیں۔ بعض ماہرین سماجیات بڑھتی ہوئی تخیلاتی

پیداوار کو اس بات کا ثبوت سمجھتے ہیں کہ معاشرہ ''پوسٹ انڈسٹریل'' مرحلے میں داخل ہو گیا ہے۔

حقائق کہیں زیادہ پیچیدہ ہیں کیونکہ سفید پوش کارکنوں میں عددی اضافے کو نئے نظام کی جانب ایک جست کے بجائے صنعتی نظام کی توسیع۔۔۔ دوسری لہر کی مزید ایک آخری لہر۔۔۔ کے طور پر بہتر انداز میں سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ بات اپنی جگہ بجا ہے کہ مادی کام میں کمی اور غیر مادی یا غیر مرئی کام میں زیادہ اضافہ ہوا ہے لیکن جن دفاتر میں یہ کام ہو رہا ہے، وہ اپنی بناوٹ کے اعتبار سے بالکل دوسری لہر کی فیکٹریوں کی طرح ہیں۔ کام کی نوعیت اسی طرح منقسم، یکساں تواتر کا شکار، بے کیف اور غیر انسانی نظر آتی ہے۔ آج بھی دفتری نظم و نسق کم و بیش فیکٹری کے سسٹم سے ملتا جلتا ہی نظر آتا ہے۔ اس ''علامتی فیکٹری'' میں دوسری لہر کی تہذیب نے فیکٹری کی طرح کا ذات پات کا سسٹم بھی رائج کیا۔ فیکٹری کی افرادی قوت کو محنت کشوں اور غیر محنت کش کارکنوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ دفتر میں بھی اسی طرح ''اعلیٰ تخیلاتی'' اور ''ادنیٰ تخیلاتی'' کارکنوں کی تقسیم کی گئی۔ ایک سطح پر ہمیں ''اعلیٰ تخیلاتی'' کارکن تکنیکی اشرافیہ، سائنس دان، انجینئر اور مینجرز نظر آتے ہیں جن کا زیادہ تر وقت ملاقاتوں، کانفرنسوں، کاروباری لنچوں یا احکام دیتے، خطوط لکھواتے، فون پر بات چیت کرتے یا معلومات کے تبادلے میں گزر جاتا ہے۔ ایک حالیہ سروے کے مطابق انتظامی افسروں کا 80% وقت روزانہ 150 سے 300 ''تبادلہء معلومات'' میں خرچ ہو جاتا ہے۔

دوسری جانب ہم ''ادنیٰ تخیلاتی'' کارکنوں۔۔۔ سفید پوش پرولتاریوں کو دیکھتے ہیں، جو ہمیشہ کی طرح دوسری لہر کے فیکٹری مزدور بنے، کبھی ختم نہ ہونے والے روز مرہ کے یکساں اور تھکا دینے والے کاموں میں الجھے نظر آتے ہیں۔ زیادہ تر خواتین پر مشتمل یہ غیر منظّم گروپ، سماجی ماہرین کی ''پوسٹ انڈسٹریلزم'' کے متعلق گفتگو پر، بے ساختہ استہزائی انداز میں ہنس پڑے تو قطعاً بے جا نہ ہوگا۔ یہی تو ہیں دفتر کی صنعتی افرادی قوت۔

دفتری نظام بھی اب دوسری لہر کے شکنجے سے نکل کر، تیسری لہر کی جانب بڑھنے کو ہے اور اس کا صنعتی ذات پات کا نظام چیلنج ہو رہا ہے۔ تمام دفتری ڈھانچے اور نظام مراتب کسی بھی لمحے تبدیلی کی زد میں آ سکتے ہیں۔

MashalBooks.org

بعض متصادم قوتوں کے نتیجے میں، دفتر میں تیسری لہر کا انقلاب آ رہا ہے۔
انفارمیشن کی طلب اتنی بری طرح بڑھی ہے کہ دوسری لہر کے کلرکوں، ٹائپسٹوں اور سیکریٹریوں کی ، چاہے کتنی ہی بڑی اور محنتی فوج ہی کیوں نہ ہو، اس کی ضروریات کا احاطہ کر ہی نہیں سکتی۔ مزید براں کاغذی کام کے اخراجات اس قدر ظالمانہ حد تک بڑھ چکے ہیں کہ اسے کنٹرول کرنے میں مزید حماقتیں اور بدحواسیاں ہو رہی ہیں۔ (دفتری اخراجات، بہت سی کمپنیوں میں، کل اخراجات کا 40%یا 50%بن جاتے ہیں۔بعض ماہرین کے خیال میں ایک کاروباری خط پر اٹھنے والے اخراجات، اگر تمام پوشیدہ عوامل کو شامل کر لیا جائے تو۔۔۔ 14 سے 18 ڈالر تک پہنچ سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں، امریکہ میں ایک عام فیکٹری کارکن کے لئے اندازاً 25ہزار ڈالر مالیت کی ٹیکنالوجی بطور معاون موجود ہوتی ہے جبکہ دفتری کارکن کو بقول زیراکس کے ایک سیلز مین کے، پانچ سو یا ایک ہزار ڈالر مالیت کے پرانے ٹائپ رائٹروں اور حسابی مشینوں کے ساتھ کام کرنا ہوتا ہے اور وہ غالباً دنیا میں سب کم پیداواری کارکنوں میں سے ایک ہے۔ پچھلے عشرے میں دفتری پیداواری صلاحیت تقریباً چار فیصد بڑھی ہے۔ دوسرے ممالک میں غالباً صورت حال زیادہ واضح اور بہتر ہے۔

ایک اور اہم بات کہ کمپیوٹر کی قیمتیں۔۔۔ اپنی فعالیت اور صلاحیت میں بہت زیادہ اضافے کے باوجود۔۔۔ غیر معمولی طور پر کم ہوتی جا رہی ہیں۔اندازہ ہے کہ کمپیوٹر کی پیداواری صلاحیت میں، پچھلے پندرہ سال میں، ایک ہزار گنا اضافہ ہوا ہے اور اس کا فی کس فاعلانہ خرچ کم ہو کر آج ایک لاکھ واں حصہ رہ گیا ہے۔ ایک جانب ہوشربا اخراجات اور جامد پیداواری صلاحیت اور دوسری جانب کمپیوٹر کی حیرت انگیز پیش رفت، ایک نا قابل مزاحمت امتزاج کو جنم دے رہے ہیں، نتیجہ کسی بھی طرح ''لفظی زلزلے'' سے کم نہیں ہوگا۔
ورڈ پراسیسرز نامی ایک الیکٹرانک ایجاد، اس زبردست زلزلے کی بنیادی علامت ہے اس وقت اور ایکسون جیسے عظیم الشان اداروں سمیت، ان مصنوعات کے تیار کرنے والے،اس نئے مقابلے کے لئے تیاریاں کر رہے ہیں، جو ایک اندازے کے مطابق دس بلین ڈالر سالانہ کی وسیع مارکیٹ پر محیط ہوگا۔ کبھی اسے مستعد ٹائپ رائٹر ''ٹیکسٹ ایڈیٹر'' کہا جاتا تھا لیکن اب اسی ایجاد نے دفتر میں انفارمیشن کے بہاؤ اور کام کے سارے ڈھانچے کو بدل ک

رکھ دیا ہے۔ بہر حال، نئی ٹیکنالوجیز کے خاندان کی، صرف یہی ایک چیز سفید پوش دنیا کو تہ و بالا کرنے جا رہی ہے۔

جون 1979ء میں انٹرنیشنل ورڈ پراسیسنگ ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام شکاگو میں منعقدہ، ایک کنونشن میں 20ہزار سے زائد پسینے میں شرابور افراد نے نمائش ہال میں، قطار اندر قطار ایسی خواص باختہ کرنے والی مشینوں۔۔۔ آپٹیکل سکینرز، تیز رفتار پرنٹر، مائیکروگرافک آلات، اصل چیز کی نقل کر لینے والی(Facsimile) مشینیں، کمپیوٹر ٹرمینلز وغیرہ وغیرہ۔۔۔ کا بغور معائنہ کیا۔ وہ ایک ایسی شروعات دیکھ رہے تھے جسے بعض لوگ مستقبل کا ''بغیر کاغذ کا دفتر'' کا نام دیتے ہیں۔

واشنگٹن ڈی سی میں مائیکرونیٹ نامی ایک مشاورتی کمپنی نے، سترہ مختلف صنعتی اداروں کے تیار کردہ آلات کو باہم مربوط کر کے، ایک ایسا جامع دفتر بنایا ہے، جہاں کاغذ سرے سے موجود ہی نہیں۔ دفتر میں پہنچنے والی کسی بھی دستاویز کی فوری مائیکروفلم بن جاتی ہے اور وہ مابعد استعمال کے لئے، کمپیوٹر میں سٹور ہو جاتی ہے۔ یہ نمائشی دفتر اور تربیتی سہولت، ڈکٹیشن کے سامان، مائیکروفلم، آپٹیکل سکینرز اور ویڈیو ٹرمینلز کو باہم مربوط کر کے ایک فعال نظام ترتیب دیتا ہے۔ مائیکرونیٹ کے پریذیڈنٹ لاری سٹاکٹ کے بقول، مقصد یہ ہے کہ مستقبل کا ایسا دفتر تشکیل دیا جائے جہاں ''کوئی مس فائلنگ نہ ہو۔ مارکٹنگ، سیلز، اکاؤنٹس اور تحقیق سے متعلق اعداد وشمار، ہر لمحے درست اور مکمل حالت میں موجود ہوں، گھنٹے کے اندر اندر ہزاروں لاکھوں صفحات پر پھیلی ہوئی اطلاعات، نا قابل یقین حد تک معمولی خرچ پر، مطلوبہ جگہ پر تقسیم بھی کر دی جائیں اور۔۔۔ اپنی مرضی کے مطابق، معلومات کو پرنٹ سے ڈیجیٹل اور فوٹوگرافک میڈیا تک۔۔۔ آگے، پیچھے جیسا بھی چاہیں۔۔۔ تبدیل کر سکیں۔

عمومی خط و کتابت، مستقبل کے اس دفتر کی بنیادی کلید ہے، دوسری لہر کے روایتی دفتر میں جب افسر کوئی خط یا میمو بھیجنا چاہتا ہے۔ ایک درمیانی آدمی۔۔۔ سیکرٹری۔۔۔ کو بلا لیتا ہے۔ اس کا کام پہلے نوٹ بک یا ٹائپ شدہ ڈرافٹ کے ذریعے، افسر کے الفاظ کو کاغذ پر منتقل کرنا ہے۔ پھر اس میں موجود غلطیوں کی تصحیح کے لئے غالباً کئی بار ٹائپ کرنا ہے۔

MashalBooks.org

پھر اس کی حتمی ٹائپنگ ہوتی ہے بعدازاں زیراکس کے ذریعے اس کی نقل کو فائل کر دیا جاتا ہے۔ پیغام کی ابتدائی کمپوزنگ کو علیحدہ رکھتے ہوئے بھی مسلسل پانچ واضح مرحلے سامنے آتے ہیں۔ آج کل کی مشینیں، ان پانچوں مراحل کو یکجا کر کے اسی ترتیب سے مگر بیک وقت طے کر ڈالتی ہیں۔

اس عمل کو سیکھنے کے لئے۔۔۔ اور کچھ کام کی رفتار تیز کرنے کے لئے میں نے ایک سادہ کمپیوٹر خریدا، اسے ورڈ پراسیسر کے طور پر استعمال کیا اور اس کتاب کا آخری نصف حصہ اسی کے ذریعے لکھ ڈالا۔ یہ دیکھ کر میری خوشی کی انتہا نہ رہی کہ میں نے ایک چھوٹے سے سیشن میں ہی کمپیوٹر کو کنٹرول کرنا سیکھ لیا اور چند گھنٹوں میں، میں اسے بڑی آسانی سے استعمال کر رہا تھا۔ اس پر کام کرتے ہوئے مجھے ایک سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا ہے اور میں اب بھی اس کی رفتار اور وقت پر حیرت زدہ ہوں۔

آج میں کاغذ پر کتاب اکا ایک باب ڈرافٹ کرنے کے بجائے کی بورڈ پر ٹائپ کرتا ہوں جو فلاپی ڈسک نامی ایک الیکٹرانک حصے میں محفوظ ہو جاتا ہے۔ میں ٹی وی جیسی سکرین پر اپنا ٹائپ شدہ مواد دیکھتا ہوں۔ چند کیز (Keys) دبا کر میں ان الفاظ میں تبدیلی لا سکتا ہوں، دوبارہ ترتیب دے سکتا ہوں، پیراگراف اوپر نیچے کرنا، حذف کرنا، تبدیلی و اضافہ کرنا، انڈر لائن کرنا، یہاں تک کہ میں اپنے اطمینان کے مطابق اسے مرتب کر ڈالتا ہوں۔ اس کے ذریعے الفاظ مٹانا، غلطی پر سفیدہ لگانا، کانٹ چھانٹ کرنا، جوڑنا، پھاڑنا، زیراکس کاپی کرنا، بار بار ٹائپ کرنا جیسے سارے عمل بالکل ختم ہو جاتے ہیں۔ ایک دفعہ ڈرافٹ کی تصحیح ہو گئی، میں بٹن دباتا ہوں اور میرے ایک جانب موجود پرنٹر، آنکھ جھپکتے میں بالکل صحیح کاپی نکال دیتا ہے۔

لیکن کسی بھی چیز کی کاپیاں نکالنا، اس مشین کا انتہائی فضول استعمال ہے اور اس کی بنیادی روح کے خلاف بھی ہے۔ کسی الیکٹرانک دفتر کی حتمی خوبصورتی صرف اسی میں نہیں کہ سیکرٹری کی ٹائپنگ اور ان کی تصحیح کے مراحل کی بچت ہو جائے۔ خود کار دفتر انہیں الیکٹرانک بٹس (Bits) کی شکل میں ٹیپ یا ڈسک پر خود ہی فائل بھی کر لیتا ہے۔ ایک الیکٹرانک ڈکشنرل کے ذریعے، یہ خود بخود اپنی املاء کی غلطیاں درست کر سکتا ہے۔ ایک اور

مشین یا ٹیلیفون سے منسلک ہو کر یہ فوراً ہی مطلوبہ خط کو مرسل الیہ کے پرنٹر یا سکرین تک پہنچا سکتا ہے۔ چنانچہ یہ ساز و سامان ایک اصل پیغام کو محفوظ کر کے تصحیح کر سکتا ہے، کاپی کر سکتا ہے، اسے منزل مقصود پر بھیج سکتا ہے اور فائل بھی کر سکتا ہے اور یہ سب کچھ ایک ہی عمل کے ذریعے بیک وقت ہوتا ہے۔ کام کی رفتار بڑھتی جاتی ہے اور اخراجات کم ہوتے جاتے ہیں اور پانچ مراحل یک جان ہو کر ایک مرحلے میں سمٹ جاتے ہیں۔

اس ارتکاز عملی کے اثرات، دفتر سے باہر بھی دور دور تک پھیل رہے ہیں۔ کیونکہ دوسری چیزوں کے ساتھ ساتھ اس مشینری کا سیٹلائٹس، مائیکرو ویو اور دوسری مواصلاتی سہولتوں کے ساتھ ارتباط، دوسری لہر کے روایتی ادارے، پوسٹ آفس کی تھکا دینے والی اور الٹی سیدھی ترسیل کے خاتمے کو ممکن بنا رہا ہے۔ دفتری خود کاریت کا پھیلاؤ، ورڈ پراسیسر جس کا محض ایک معمولی سا رخ ہے "الیکٹرانک میل" کی تخلیق سے منسلک ہو کر پوسٹ مین اور اس کے بھاری بھرکم تھیلے سے بھی نجات دلا رہا ہے۔

آج امریکہ میں اندرونی ڈاک کا 35% حصہ رپورٹس کی ترسیل پر مشتمل ہوتا ہے۔ بل، رسیدیں، خریداری کے آرڈر، اشیاء کی فہرست، بنک سٹیٹ منٹس، چیکس اور اسی طرح کی اور چیزیں۔ علاوہ ازیں زیادہ تر خطر و کتابت کا بہاؤ افراد کے بجائے اداروں کے درمیان ہوتا ہے۔ ڈاک کے نظام کا بحران شدید تر ہونے کے ساتھ ساتھ، کمپنیوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد نے دوسری لہر کے ڈاک سسٹم کے بجائے، کسی بہتر متبادل کی تلاش میں تیسری لہر کے اجزاء کی تعمیر کرنا شروع کر دی۔

ٹیلی پرنٹرز، کاپی کرنے والی مشینیں، ورڈ پراسیسرز اور کمپیوٹر ٹرمینلز پر قائم یہ الیکٹرانک پوسٹل سسٹم انتہائی تیزی سے ترقی یافتہ صنعتوں میں پھیلتا جا رہا ہے اور نئے سیٹلائٹ سسٹم معاونت اسے مزید حیرت انگیز نشو و نما سے ہم کنار کرے گی۔

آئی بی ایم ایٹنا (حادثات سے بچاؤ کی کمپنی) اور کاسیٹ (نیم حکومتی مواصلاتی سیٹلائٹ ایجنسی) نے، مشترکہ طور پر سیٹلائٹ بزنس سسٹمز نامی ایک کمپنی تشکیل دی ہے جو دوسری کمپنیوں کو مربوط انفارمیشن کی خدمات مہیا کرے گی۔ ایس بی ایس، جنرل موٹرز، ہولسٹ یا توشیبا جیسے اپنے صارفین کے لئے، خصوصی سیٹلائٹس قائم کرنے کے منصوبے بنا

رہی ہیں۔ ہر کمپنی کی تنصیبات میں موجود، ارزاں زمینی سٹیشنوں کے ساتھ، ایس بی ایس سیٹلائٹ کا رابطہ ہر کمپنی کے لئے اس کے اپنے الیکٹرانک ڈاک سسٹم کی تشکیل ممکن بنا دے گا جو پبلک ڈاک سسٹم کا ہر اعتبار سے بہتر متبادل ہو گا۔

نئے سسٹم میں، کاغذ کی ترسیل کے بجائے، الیکٹرانک اشارے (Pulses) بھیجے جاتے ہیں۔ آرتھر ڈی لٹل ریسرچ آرگنائزیشن کے ونسنٹ گیولیا نو کا خیال ہے کہ آج بھی الیکٹرانکس بہت سے شعبوں میں انتہائی لازیم میڈیم کے طور پر موجود ہے۔ ترسیلات دراصل الیکٹرانک متحرک اشاروں کے ذریعے ہی ہو رہی ہیں بعدازاں بھیجے جانے والے کاغذی بل یا رسیدیں یا گوشوارے تو محض ان کی توثیق کے لئے ہوتے ہیں۔ کاغذ کی ضرورت ابھی کتنا اور عرصہ رہے گی، یہ مسئلہ فی الحال اختلاف رائے کا شکار ہے۔

ابتداء یہ سیکرٹری کے بہت سے کام، عملاً ختم کر دے گا۔ کل کے دفتر میں آواز پہنچانے کی ٹیکنالوجی آنے کے بعد ٹائپنگ ایک فضول اور ناکارہ ہنر بن کر رہ جائے گا۔ شروع میں پیغامات کی وصولی اور ترسیل کے سلسلے میں ٹائپنگ یقیناً لازمی ہو گی لیکن جلد ہی ڈکٹیشن کے آلات کے، صارف کی انفرادی آواز یا لہجہ پہچاننے کے عمل کے ساتھ ہی آوازیں، براہ راست تحریری الفاظ میں تبدیل ہونے لگیں گی اور اس طرح ٹائپنگ کا عمل بالکل ہی غیر ضروری ہو جائے گا۔

پرانی ٹیکنالوجی میں ٹائپسٹ کا استعمال تھا۔ ڈاکٹر گیولیانو کا کہنا ہے۔ ’’کیونکہ یہ کیونکہ یہ Clutzy تھی جس زمانے میں مٹی کی تختیاں ہوتی تھیں تو آپ کو ایسے نقاش کی ضرورت پڑتی تھی جو تختیاں پکانے کے ساتھ ساتھ ان پر نقاشی کا عمل بھی جانتا ہو۔ تحریر عام لوگوں کے لئے تھی ہی نہیں ہمارے موجودہ دور کے نقاش ٹائپسٹ ہیں لیکن جونہی نئی ٹیکنالوجی کے ذریعے پیغامات کی تشکیل کرنا، اس کی تصحیح، اسے سٹور کرنا، دوبارہ تلاش کرنا، اس کی ترسیل اور نقل کا حصول، آسان ہو جاتا ہے۔ ہم یہ سارے علم تحریر وتقریر کی طرح خود ہی کر رہے ہونگے۔ ایک بار ہم Clutz Factor کا خاتمہ کر دیں، ہمیں ٹائپسٹ کی ضرورت نہیں رہتی۔

ورڈ پراسیسنگ کے بہت سے ماہرین دلی طور پر یقیناً یہ چاہتے ہونگے کہ ٹائپنگ

MashalBooks.org

کے عملاً تحلیل ہونے تک سیکرٹری کو بہتر سماجی حیثیت مل جائے یا افسران بھی ٹائپ کی تھوڑی بہت شد بد حاصل کر کے اسے استعمال کرنے لگیں۔ مثال کے طور پر بین الاقوامی ورڈ پراسیسنگ کنونشن میں میری ایک تقریر کے دوران یہ پوچھا گیا کہ کیا میری سیکرٹری میرے لئے کمپیوٹر استعمال کرتی ہے۔ میں نے جب انہیں بتایا کہ میں اپنے مسودے خود ہی ٹائپ کرتا ہوں اور میری سیکرٹری کا میرے کمپیوٹر یا ورڈ پراسیسر کے قریب سے بمشکل ہی گزر ہوتا ہے تو ہال میں تالیوں کے شور سے گونج اٹھا۔ وہ اس دن کا خواب دیکھ رہے ہیں جب اخبارات کے کلاسی فائیڈ سیکشن میں اس طرح کا اشتہار بھی شامل ہوگا:

ضرورت ہے کہ گروپ وائس پریذیڈنٹ کی۔ مالیاتی، مارکیٹنگ اور مختلف شعبوں میں اشیاء کی ڈویلپمنٹ لائن کے مابین رابطہ، اس کی ذمہ داریوں میں شامل ہوگا۔ بھرپور انتظامی کنٹرول کی صلاحیتوں سے بہرہ ور ہونا چاہئے۔ کثیر الجہتی بین الاقوامی کمپنی کے ایگزیکٹو وائس پریذیڈنٹ کو جواب دہ ہوگا ٹائپنگ ضروری ہے۔

منتظمین اس کے برعکس، اپنی انگلیوں کے پوروں کو متحرک کئے جانے پر مزاحمت کریں گے، بالکل اسی طرح جیسے وہ اپنی کافی کا مگ، خود لانے میں، ناگواری محسوس کرتے ہیں۔ یہ جاننے کے بعد کہ کونے میں پڑی لہجہ پہچاننے کی M مشین کی مدد سے، وہ ڈکٹیشن دے کر تمام تر ٹائپنگ خود ہی کرا سکیں گے۔۔۔۔ وہ مشین کو ہنڈل کرنے کے لئے کی بورڈ کے استعمال سیکھنے پر بھی مزاحمت کریں گے۔

وہ ایسا کرتے ہیں یا نہیں، یہ ناگزیر حقیقت اپنی جگہ ہے کہ دفتر میں تیسری لہر کی پیداواری قوت، دوسری لہر کے پرانے نظاموں سے ٹکرا کر، نہ صرف پریشانی اور تصادم کی فضا پیدا کرے گی بلکہ دفتری تنظیم نو اور نئے ڈھانچے کی تشکیل کے ساتھ کچھ نہ کچھ لوگوں کے لئے نئے کردار اور نئے مواقع بھی پیدا کرے گی۔ نئے نظام پرانے افسرانہ طور پر طریقوں، شاہانہ انداز، کرداروں کی جنسی تقسیم اور ماضی کی شعبہ جاتی رکاوٹوں کے خلاف حقیقی چیلنج ثابت ہوں گے۔

اس صورت حال سے خاصا خوف و ہراس پیدا ہوا ہے۔ عمومی رائے دو طرح کی ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ لاکھوں ملازمتیں سرے سے ہی ختم ہو جائیں گی (یا آج کل

کے سیکرٹری میکانکی غلام بن کر رہ جائیں گے) اور دوسرا نقطہ نظر، جو ورڈ پراسیسنگ کی صنعت میں خاصا مقبول ہے۔ بوزایلین اینڈ ہملٹن نامی مشاورتی کمپنی کی ایک پرنسپل رینڈی گولڈ فیلڈ نے پیش کیا ہے۔ مس گولڈ فیلڈ کے مطابق، سیکریٹریز کند ذہنی اور یکساں نوعیت کے کاموں کی تکرار کا سامنا کرنے کی بجائے، ایسےPara-Principals بن جائیں گے اور ایسے پیشہ ورانہ کاموں اور فیصلہ کن مرحلوں میں بھی حصہ لے سکیں گے، جن سے ابھی تک انہیں زیادہ تر لاتعلق رکھا گیا ہے۔ لگتا یوں ہے دو طرح کی تفریق ہمارے سامنے واضح ہو گی۔ سفید پوش کارکنوں کا ایک طبقہ زیادہ ذمہ دارانہ پوزیشن کے ساتھ آگے بڑھتا نظر آئے گا جبکہ انہی کارکنوں میں سے ایک حصہ تنزلی کا شکار ہوتا ہوا۔ بالآخر اپنے انجام کو پہنچے گا۔

پھر، ان لوگوں کا اور معیشت کا عمومی حال کیا ہوا؟ 1950ء کے عشرے کے آخر اور 1960ء کے شروع میں جب خود کاریت (Automation) منظر عام پر آنا شروع ہوئی تھی تو ماہرین معاشیات اور ٹریڈ یونینسٹوں نے بہت سے ملکوں میں وسیع بے روزگاری پیدا ہونے کا خدشہ ظاہر کیا تھا۔ ہوا کیا؟ اعلیٰ ٹیکنالوجی کی حامل اقوام میں روزگار کے مواقع مزید پیدا ہوگئے۔ پیداواری شعبے کے سکڑنے کے ساتھ ساتھ، خدمات کا شعبہ پھیلنا شروع ہو گیا۔ ادھر کے لوگ ادھر جذب ہو گئے۔ لیکن اگر پیداوار شعبہ مسلسل سکڑتا جاتا ہے اور دفتری سرگرمیاں بھی میکانائز ہو جاتی ہیں تو مستقبل میں روزگار کے مواقع کہاں سے پیدا ہونگے؟

اس کا علم کسی کو بھی نہیں۔ مسلسل تحقیق و جستجو اور بلند و بانگ دعووں کے باوجود، تمام تر اندازے اور مشاہدے ایک دوسرے سے لگا نہیں کھاتے۔ میکانائزیشن اور اٹومیشن میں سرمایہ کاری کو صنعتی کارکردگی سے ہم آہنگ کرنے کی کوششیں، بقول فائنانشل ٹائمز آف لندن کے ''قطعی غیر متناسب اور غیر مربوط'' نظر آتی ہیں۔ 1963ء اور 1973ء کے دوران، سات قومی مطالعے کے مطابق، قدر زائد کے فیصد کے طور پر، جاپان کی، نئی ٹیکنالوجی میں سرمایہ کاری کی شرح، کسی بھی دوسرے ملک یک نسبت، سب سے زیادہ تھی۔ وہاں روزگار میں اضافے کی شرح بھی سب سے زیادہ تھی۔ برطانیہ میں سج کی مشینری میں سرمایہ کاری سب سے کم تھی، بے روزگاری کا زبردست طوفان آ گیا تھا امریکی معیشت میں

جاپان کی طرح کا ہی رجحان رہا، ٹیکنالوجی کی پیش رفت کے ساتھ ساتھ، روزگار کے مواقع میں بھی اضافہ ہوتا رہا۔ البتہ سویڈن، مغربی جرمنی، فرانس اور اٹلی میں مختلف طرح کے انفرادی رجحانات دکھائی دیئے۔

یہ بات واضح ہے کہ روزگار کی سطح محض ٹیکنالوجیکل پیش رفت کا انعکاس ہی نہیں ہوتی۔ خودکاری کے عمل میں کامیابی یا ناکامی کی وجہ سے ہی روزگار کی سطح میں اتار چڑھاؤ نہیں ہوتا، بلکہ اس اتار چڑھاؤ میں بہت سی پالیسیوں کا دخل ہوتا ہے۔

آنے والے برسوں میں، روزگار کے مواقع پر دباؤ میں ڈرامائی اضافہ ہوسکتا ہے۔ لیکن صرف کمپیوٹر کو اس کی واحد وجہ قرار دینا یقیناً غلط ہوگا۔ ایک بات بہرحال یقینی ہے کہ دفتر اور فیکٹری دونوں ہی جگہ، مستقبل قریب میں انقلابی تبدیلیاں ناگزیر ہیں۔ سفید پوش کارکنوں اور صنعتی مزدوروں میں جنم لینے والا یہ جڑواں انقلاب، معاشرے کے لئے، ایک مکمل اور نیا پیداواری اسلوب (Mode) لا رہا ہے۔ یہ انسانی نسل کی بہت عظیم پیش رفت ہوگی اور اس کے اپنے نا قابل بیان حد تک، مختلف الجہتی اثرات رونما ہونگے۔ اس سے روزگاری سطح اور صنعتی ڈھانچوں جیسی چیزیں ہی متاثر نہیں ہونگی بلکہ سیاسی اور معاشی قوت کی تقسیم، ہمارے کام کی اکائیوں کا سائز، بین لاقوامی تقسیم محنت، معیشت میں خواتین کا کردار رخ، کام کی نوعیت، صانع اور صارف کے مابین خلیج، اور بظاہر ایک انتہائی سادہ حقیقت یعنی کام ''کہاں'' ہو، تک کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔

MashalBooks.org

باب15

الیکٹرانک گھر(Cottage)

نئے پیداواری نظام کی جانب پیش رفت کے اندر سماجی تبدیلی مخفی جذبہ بھی موجود ہے۔ لیکن اس کے غیر محسوس ہونے کی وجہ سے، ہم میں سے بہت کم لوگوں نے اس کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ صورت یہ ہے کہ ہمارے گھر بھی ان انقلابی تبدیلیوں کی زد میں آ رہے ہیں۔

کام کی چھوٹی چھوٹی اکائیوں کی حوصلہ افزائی یا پیداوار کی عدم مرکزیت اور شہری مقامات سے دوری کا اور کام کی حقیقی نوعیت میں تبدیلی سے قطع نظر، نیا پیداواری نظام دوسری لہر کے ہاتھوں تشکیل شدہ فیکٹریوں اور دفاتر میں مجتمع لاکھوں کاموں کو دوبارہ ان کی اصلی جگہ منتقل کر سکتا ہے۔ اگر واقعتاً ایسا ہوا تو، خاندان سے سکول اور یعنی گھر میں کارپوریشن تک کا، ہمارا ہر جانا پہچانا ادارہ مکمل طور پر تبدیل ہو جائے گا۔

تین سو سال پہلے کھیتوں میں محنت مشقت کرتے کسانوں کو دیکھ کر، کوئی پاگل ہی یہ خواب دیکھ سکتا تھا کہ جلد ہی وہ وقت آنے والا ہے کہ لوگ اپنی روزی کمانے کے لئے شہری فیکٹریوں کا رخ کریں گے اور کھیت ویران ہو جائیں گے اور کوئی پاگل ہی ایسا سوچنے میں حق بجانب بھی ہوتا۔ آج بھی یہ کہنے کے لئے بڑے حوصلے کی ضرورت ہے کہ ہم اپنی ہی زندگی میں، طویل و عریض فیکٹریوں اور بلند و بالا دفتری عمارتوں کو آدھا ہوتے دیکھیں گے، وہاں بھوت پریت بسیرا کریں گے یا ممکن ہے انہیں انسانی رہائشی جگہوں میں بدل دیا جائے۔ بہر حال نیا پیداواری اسلوب نئی، اعلی اور الیکٹرانک بنیادوں کے ساتھ، گھریلو صنعت کی سمت مراجعت اور معاشرے کے مرکز کے طور پر گھر کی اہمیت اجاگر کرنے کے امکانات پیدا کر رہا ہے۔

MashalBooks.org

اس تجویز سے کہ ہم میں سے لاکھوں انسان دفتر یا فیکٹری جانے کے بجائے، ممکن ہے، جلد ہی اپنے گھروں میں وقت گزارنے لگیں، فوری اعتراضات کی نئی بوچھاڑ شروع ہو جائے گی اور اس نکتہ چینی کی بہت سی معقول وجوہات بھی ہیں۔ ''لوگ گھر میں کام کرنا ہی نہیں چاہتے۔ خود ہی دیکھ لیجئے، تمام خواتین گھر سے باہر نکلنے اور کوئی نہ کوئی کام کرنے کے لئے کوشاں، ہیں!'' ''بچے آپ کے سروں پر ناچ رہے ہوں تو کوئی کام کیسے کیا جاسکتا ہے؟'' ''جب تک کوئی افسر سر پر نہ کھڑا ہو، لوگ کام کہاں کرتے ہیں!'' ''مل جل کر کام کرنے کے لئے ضروری اعتبار اور اعتماد پیدا کرنے کے لئے، لوگوں میں قریبی باہمی رابطہ بہت ضروری ہے۔'' متوسط گھروں کی مکانیت اس طرح کے کاموں کے لئے موزوں ہی نہیں ہوتی۔'' ''گھر ہر کام سے، کیا مطلب ہے آپ کا۔۔۔۔ کیا ہر تہہ خانے میں ایک چھوٹا سا آتشیں فرنیس (بھٹی)! علاقائی تحدیدات (Restrictions) اور مالک مکان کے اعتراضات کا کیا ہو گا؟'' ''یونین اس نظریئے کو چلنے ہی کہاں دیں گی؟'' ٹیکس جمع کرنے والے کیا کریں گے؟ ٹیکس دینے والے روز بروز گھریلو پیداواری عمل پر ٹیکس کٹوتی کے سلسلے میں، سخت رویہ اختیار کرتے جا رہے ہیں'' اور سونے پہ سہاگہ یہ حتمی بات: ''کیا، میں تمام دن اپنی بیوی (یا شوہر) کے ساتھ گھر میں ہی گزار دوں؟''

اس بات کو شاید کارل مارکس بھی ناگواری سے سنتا۔ اس کے نظریئے کے مطابق گھر پر کام کرنا پیداواری عمل کی غیر انقلابی دقیانوسی شکل تھی، کیونکہ ''ایک ہی ورکشاپ میں مزدوروں کا اجتماع، معاشرے میں تقسیم محنت کے لئے ایک لازمی شرط تھا۔'' قصہ مختصر اس تمام تصور کو احمقانہ قرار دینے یا سمجھنے کی، ہمیشہ ہی بہت سی وجوہات موجود رہی ہیں۔

گھر میں پیداواری عمل:

دس ہزار سال سے اپنے گھروں اور نزدیکی زمینوں میں کام کرنے کے عادی تھے۔ گھریلو زندگی کا تمام تر ڈھانچہ، بچوں کی پرورش اور شخصیت کی تشکیل کا عمل، جائیداد اور حکمرانی کا تمام نظام، ثقافت، زندگی سے رشتہ برقرار رکھنے کی روز مرہ کی جدوجہد، غرض ان تمام معاملات کا تعلق ہزاروں غائبانہ زنجیروں کے ذریعے زمین سے جڑا ہوا تھا، لیکن نئے پیداواری سسٹم کے نمودار ہوتے ہی یہ زنجیریں، مختصر سے عرصے میں ٹوٹ پھوٹ کر بکھر

گئیں۔ آج بھی کچھ ایسی ہی صورت حال ہے۔ سماجی اور معاشی قوتوں کا ایک مکمل گروہ کام کے مرکز کی تبدیلی کے لئے کوشاں ہے۔

ابتدائی طور پر، دوسری لہر کے صنعتی عمل کی جگہ، جدید اور زیادہ ترقی یافتہ تیسری لہر کے صنعتی عمل نے لے کر، مادی اشیاء کی صورت گری میں مصروف کارکنوں کی تعداد میں خاصی کمی کی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ مینوفیکچرنگ سیکٹر میں کام کا خاصا حصہ کہیں پر بھی، یہاں تک کہ گھر کے اندر بھی سرانجام دیا جا سکتا ہے بشرطیکہ وہاں مواصلاتی رابطہ اور دوسرا ضروری سازوں سامان موجود ہو اسے محض سائنس فکشن کرشمہ نہیں سمجھا جانا چاہئے۔

جب ویسٹرن الیکٹرک نے الیکٹرومکینکل سوئچنگ سازوسامان کے بجائے، فون کمپنی کے لئے، الیکٹرانک سوئچنگ گیئر بنانے شروع کئے تو شمالی ایلی نوائے میں موجود ان کی ترقی یافتہ فیکچرنگ سہولتوں کی بدولت ان کی ورک فورس کی ہیئت ہی بدل گئی۔ اس تبدیلی سے پہلے، پیداواری کارکنوں نے وائٹ کالر اور ٹیکنیکل کارکنوں کا تناسب کم کر کے 3:1 کا کر دیا تھا۔ اب یہ تناسب برابری کا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دو ہزار کارکنوں کا نصف حصہ اشیاء کے بجائے انفارمیشن ہینڈل کرتا ہے اور ان کا زیادہ تر کام گھر پر بھی انجام پا سکتا ہے۔ شمالی ایلی نوائے فیسی لیٹی (Facility) کے ڈائریکٹر انجینئرنگ ڈوم کومو کی بڑی واضح رائے: ''اگر آپ انجینئروں کو شامل کر لیں تو موجودہ ٹیکنالوجی کی مدد سے، یہاں کیا جانے والا، دس سے پچاس فیصد کا، با آسانی گھر پر بھی کیا جا سکتا ہے۔

کومو (Cuomo) کا مینجر انجینئرنگ جیرالڈ مچل، اس سے بھی آگے کی بات کرتا ہے۔ اس کے مطابق ''دو ہزار میں سے چھ سات سو کارکن۔۔۔۔ موجودہ ٹیکنالوجی کے ساتھ ہی۔۔۔۔ اب اپنا کام گھر میں بھی انجام دے سکتے ہیں اور اگلے پانچ سالوں میں، ہم اس سے کہیں آگے جا سکتے ہیں۔''

یہ معلوماتی اندازے انتہائی حد تک، کولوراڈو سپرنگس میں ہیولیٹ پیکارڈ فیکٹری کے مینوفیکچرنگ مینجر ڈار ہوارڈ کے (Guesstimates) سے متماثل ہیں۔ ''ہمارے ایک ہزار کارکن حقیقی مینوفیکچرنگ کرتے ہیں، ان میں سے تقریباً 250 کارکن گھر میں کام کر سکتے ہیں۔ نقل و حرکت کی پیچیدگی کا تو کہا نہیں جا سکتا مگر سازوسامان اور آلات ان کی راہ

میں کوئی رکاوٹ نہیں ہونگے۔ اگر آپ وائٹ کالر ریسرچ اور ڈیولپمنٹ کے سلسلے میں، کمپیوٹر ٹرمینلز میں سرمایہ کاری کے خواہاں ہوں تو آدھے سے تین چوتھائی کارکنوں تک، گھروں میں ہی کام کر سکتے ہیں''۔ ہیولیٹ پیکارڈ فیکٹری میں، اس مقصد کے لئے مزید 350 سے 520 کارکنوں تک کا اضافہ کرنا پڑے گا۔ صاف ظاہر ہے کہ 35% سے 50% موجودہ کارکن، اس ترقی یافتہ مینوفیکچرنگ مرکز میں، ہونے والا کام، اب بھی با آسانی اپنے اپنے گھروں میں سرانجام دے سکتے ہیں۔ بشرطیکہ کوئی پیداوار کو اس انداز میں منظم کرنا پسند کر، مارکس کی سوچ کے برعکس، تیسری لہر کی مینوفیکچرنگ کے لئے 100% ورک فورس کا ورکشاپ میں ارتکاز قطعی ضروری نہیں اور ایسا بھی نہیں کہ الیکٹرانک انڈسٹری ہی میں یا وسیع و عریض کاروباری اداروں میں ہی، اس طرح کے تخمینے لگائے جا سکتے ہوں۔

آرتھو فارماسوٹیکل (کینیڈا) لمیٹڈ کے نائب صدر پیٹر ٹیٹل کے مطابق سوال یہ نہیں کہ ''کتنے لوگوں کو گھر پر کام کرنے کی اجازت ہونی چاہئے؟ بلکہ یہ ہے کہ ''کتنے لوگوں کو دفتر یا فیکٹری میں کام کرنا پڑے گا؟'' اپنے پلانٹ میں کام کرنے والے تین سو ملازمین کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے ٹیٹل کا کہنا ہے: ''لگ بھگ 75% کارکن گھر پر ہی کام کر سکتے ہیں بشرطیکہ ہم انہیں ضروری کمیونیکیشن ٹیکنالوجی فراہم کر دیں''۔ یہ بات واضح ہے کہ الیکٹرانک اور فارماسوٹیکل انڈسٹری میں کارفرما حکمت عملی ہی، دوسری ترقی یافتہ انڈسٹریز میں بھی اسی طرح روبہ عمل ہو گی۔ اگر صنعتی عمل میں شریک لوگوں کی اتنی بڑی تعداد، اب بھی گھروں میں کام کر سکتی ہے تو وائٹ کالر کارکنوں کا ایک بڑا حصہ۔۔۔جنہیں کسی پیداواری ساز و سامان کی ضرورت بھی نہیں ہوتی۔۔۔ ظاہر ہے، باآسانی اپنا کام گھروں میں سرانجام دے سکتا ہے۔

درحقیقت، اب بھی سیلز سے متعلق بہت سے خواتین و حضرات اپنا بے تحاشا کام ٹیلی فون اور ذاتی رابطے کے ذریعے نمٹاتے ہیں اور کبھی کبھار ہی اپنے دفتروں کا رخ کرتے ہیں۔

بہت سے دوسرے پیشوں۔۔۔آرکیٹیکٹس، ڈیزائنرز، صنعتی شعبے کے خصوصی ماہرین، تھراپسٹ اور ماہر نفسیات جیسے انسانی خدمات مہیاں کرنے والے، موسیقی اور

MashalBooks.org

لسانیات کے اساتذہ، فنون لطیفہ (Art) میں مصروف کاروباری لوگ، ماہر سرمایہ کاری کا مشورہ دینے والے، بیمہ ایجنٹس، قانون دان، تعلیم و تحقیق کے ماہر۔۔۔ میں مصروف وائٹ کالر، ٹیکنیکل اور پیشہ ور افراد اپنے معاملات اسی انداز میں نمٹاتے ہیں۔ ان پیشوں کے کام کچھ اس نوعیت کے ہیں کہ موجودہ دور میں ان کی وسعت پذیری میں اضافہ ہوتا ہی جا رہا ہے اور اگر رضروری سازو سامان، جس کے ذریعے کسی بھی گھر میں ایک ارزاں ''دارالعمل '(Station Work) بن سکتا ہو، مہیا کر دیں۔ جدید ٹیکنالوجی کے حامل، ایک خوبصورت سا ٹائپ رائٹر، فوٹو کاپی مشین یا کمپیوٹر اور باہمی رابطے کے آلات بھی وہاں موجود ہوں تو گھر پر کام کرنے کے امکانات حیرت انگیز حد تک وسیع ہو جاتے ہیں۔

اس سازو سامان سے لیس ہو کر، سب سے پہلے کون مرتکز پیداواری ماحول (فیکٹری) سے نکل کر ''الیکٹرانک کاٹیج'' کا رخ کرنے کی کوشش کرے گا؟ بہر حال کاروبار میں براہ راست ذاتی رابطے، ان سے متعلقہ تحت الشعوری اور خاموش حرکات اشارات کی اہمیت کو قطعی نظر انداز کرنا بھی غلطی ہو گی۔ یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے کہ خارجی روابط، بعض معاملات میں ضروری نہیں ہوتے اور بعض اوقات کبھی کبھار کا راطہ بھی کافی ہوتا ہے۔

چنانچہ (Low Obstraction) دفتری کارکن زیادہ تر ڈیٹا محفوظ کرنے، ٹائپ کرنے، مواد کی دراستگی، اعداد کے کالموں کا جمع کرنا، بل تیار کرنا اور اسی طرح کے مختلف کام کرتے ہیں۔ ان میں سے شاید ہی کسی کام کے لئے کسی براہ راست شخصی رابطے کی ضرورت محسوس ہو۔ غالبًا انہیں سب سے با آسانی الیکٹرانک کاٹیج میں شفٹ کیا جا سکتا ہے۔ غیر معمولی ذہنی کام کرنے والوں۔۔۔ تحقیق کرنے والوں مثلاً ماہرین معاشیات، پالیسی بنانے والے، اداراتی تشکیل دینے والے۔۔۔ کو اپنے ساتھیوں اور کام کرنے والے کارکنوں لیس قریبی رابطوں اور ساتھ ہی ساتھ تنہا کام کرنے کے اوقات کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ بعض اوقات کاروباری لوگوں کو بھی، اپنے ضروری سوچ بچار ''Home Work'' کے لئے فارغ وقت درکار ہوتا ہے۔ لہمن برادرز کوہن لوئب سرمایہ کاری بینکنگ ہاؤس کے ایک مشاورتی ڈائریکٹر نتھالیئل سیموئیلز بھی متفق ہیں۔

۔۔۔جو پچاس سے پچھتر دن سالانہ گھر میں کام کرتا ہے، کی رائے میں

''مستقبل کی ٹیکنالوجی گھریلو کام (Home Work) کی مقدار میں اضافہ کر دے گی۔''
درحقیقت بہت سی کمپنیاں پہلے ہی کام کے لازمی دفتروں میں کیئے جانے کی پالیسی کو نرم کر رہی ہیں۔ کچھ ہی عرصہ پہلے، جب ویئر ہاؤزر (Weyerhauser) نامی لکڑی کی مصنوعات بنانے والی کمپنی کو کارکنوں کے رویوں پر ایک نئے کتابچے کی ضرورت محسوس ہوئی تو اس کے نائب صدر آر۔ایل۔ سیگل اور اس کے تین سٹاف ممبرز تقریباً ایک ہفتے تک، اس کے گھر پر ہی کتابچے کے مسودے کی تیاری میں ملتے رہے۔'' ہم نے سوچا کہ پراگندہ خیالی سے بچنے کے لئے، ہمیں (دفتر سے) کہیں دور چلے جانا چاہیئے۔'' سیگل کا کہنا ہے۔''گھر میں کام کرنا، لچکدار اوقات کی جانب ہماری پیش رفت سے ہم آہنگ ہے۔'' وہ مزید کہتا ہے۔''اہم چیز یہ ہے کہ آپ کا کام ہو رہا ہے۔ کہاں کام ہو رہا ہے، اس کی ہمارے نزدیک کوئی اہمیت نہیں۔''

وال سٹریٹ جرنل کے مطابق ویئر ہاؤزر ایسی ایک ہی کمپنی نہیں۔''اور بہت سی کمپنیاں بھی اپنے کارکنوں کو گھر پر کام کرنے دے رہی ہیں۔''اخبار کی رپورٹ کے مطابق ان میں یونائیٹڈ ایرلائنز بھی شامل ہے، جس کا ڈائریکٹر پبلک ریلیشنز اپنے سٹاف کے لوگوں کو تقریباً 20 دن سالانہ گھر میں لکھنے کا کام دیتا ہے۔ میکڈانلڈ بھی، جس کے زیریں سٹاف کی موجودگی ہیم برگر گرلز بنانے کے لئے، ضروری ہوتی ہے، اپنے بعض اعلی انتظامی افسروں کی گھر پر کام کرنے کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔

''کیا آپ واقعی اس قسم کا دفتر چاہتے ہیں؟'' بوز امین اینڈ ہملٹن کا ہاروے پوپل یہ سوال پوچھتا ہے ایک غیر مطبوعہ پیش گوئی میں پوپل نے یہ تجویز کیا کہ''1990ء کی دہائی تک دوطرفہ ابلاغ کی صلاحیت اس حد تک بڑھ جائے گی کہ اس سے گھر پر کام کرنے کے عمل کی وسیع پیمانے پر حوصلہ افزائی ہو گی''۔ اس کے اس نظریئے کی بہت سے دوسرے محققین کی طرح مانٹریال کی بیل کینیڈا کے طویل دورانیے کے پلانر رابرٹ ایف لاتھم نے بھرحمایت کی ہے۔ لاتھم کے مطابق ''جوں جوں اطلاعاتی ملازمتوں میں اضافہ ہوگا اور ابلاغی سہولتیں بہتر ہونگی، توں توں گھر پر یا گھر کے قریبی مراکز کار میں کام کرنے والے لوگوں کی تعداد بھی بڑھتی جائیگی۔

اسی طرح امریکی محکمہ داخلہ کے انتظامی مشیر ہالیس ویل کا پختہ یقین کہ 1980ء کے درمیانی عشرے تک ''مستقبل کے ورڈ پراسیسنگ مراکز'' با آسانی اپنے ہی گھر میں قائم ہو سکتے ہیں۔'' اس نے افگر کمپنی کی ایک کارکن سیکرٹری جین آدمز کی سرگرمیوں کا تفصیلی تناظر میں جائزہ لیا ہے، جو دفتری کام گھر پر ہی کرتی تھی اور صرف کبھی کبھار ''مسائل پر گفتگو کرنے اور، بلاشبہ دفتری پارٹیوں میں شرکت کے لئے ہی دفتر جایا کرتی تھی۔''، مستقبل کے ادارے (for Fulture Institute) کی رائے بھی کچھ اسی قسم کی۔ اس ادارے نے 1971ء کی ابتداء میں نئی اطلاعاتی ٹیکنالوجی سے منسلک، اعلیٰ ترین حیثیت کی حامل کمپنیوں کے 150 ماہرین کا سروے کیا اور مختلف نوعیّتوں کے پانچ ایسے کام تجویز کئے، جنہیں گھر پر آرام سے منتقبل کیا جا سکتا تھا آئی ایف ایف کی تحقیق کے مطابق، ضروری آلات کار کے ساتھ، سیکرٹری کے بہت سے موجودہ فرائض گھر میں بھی با آسانی، دفتر ہی کی طرح، انجام دیئے جا سکتے ہیں۔ اس طرح کا نظام لیبر پول میں خاصا اضافہ کرنے کا باعث ہو گا کیونکہ شادی شدہ خواتین، اپنے بچوں کی دیکھ بھال کے ساتھ دفتری کام بھی جاری رکھ سکیں گی۔۔۔۔ بظاہر کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ سیکرٹری، گھر میں بیٹھی، اسی طرح ڈکٹیشن لے، اور اپنے گھر کے ٹرمینل پر اسے ٹائپ کرے اور اس کی صاف ستھری کاپی مصنف کے گھر یا دفتر سے نکل آئے۔''

مزید برآں، آئی ایف ایف نے یہ رائے بھی ظاہر کی کہ ''انجینئروں، ڈرافٹس مین اور دوسرے وائٹ کالر کارکنوں کے ہاتھوں سر انجام پائے جانے والے بہت سے کام، دفتر یہی کی طرح بلکہ بعض اوقات اس سے بھی کہیں بہتر انداز میں گھر میں کئے جا سکتے ہیں۔ ''مستقبل کا ایک بیج (Seed) پہلے ہی برطانیہ میں موجود ہے۔ مثال کے طور پر ایف۔ انٹرنیشنل لمیٹڈ کے چار سو جز وقتی کارکن کمپیوٹر پروگرامر کے طور پر ہیں، تھوڑی سی تعداد کے علاوہ، وہ سب کے سب اپنے گھر پر ہی کام کرتے ہیں۔

صنعتی پروگرامرز کی ٹیمیں منظم کرنے والی کمپنی ہالینڈ اور سکنڈے نیویا تک پھیل گئی ہے اور اس کے کلائنٹس میں برٹش سٹیل، شیل اور یونی لیور جیسے بڑے ادارے شامل ہیں ''گھریلو کمپیوٹر پروگرامنگ'' اخبار گارڈین لکھتا ہے۔''1980ء کے عشرے کی گھریلو صنعت

ہے۔''

مختصراً جیسے جیسے تیسری لہر معاشرے کو اپنی گرفت میں لیتی جا رہی ہے، ایک محقق کے لفظوں میں، زیادہ سے زیادہ کمپنیاں ''کمپیوٹر کے گرد جمع لوگوں کا ہجوم'' (شہد کے چھتے پر مکھیوں کا ہجوم) کی شکل اختیار کرتی نظر آتی ہیں۔ کمپیوٹر کو لوگوں کے گھروں میں رکھ دیں تو ان کے یہ ساری ہڑبونگ ختم ہو جائے گی۔ تیسری لہر کی مینوفیکچرنگ کی طرح، تیسری لہر کے وائٹ کالر کام کے لئے بھی 100% قوت کار (Work Force) کو ورکشاپ میں مرتکز کرنے کی قطعی ضرورت نہیں ہو گی۔

دوسری لہر کے مقامات۔۔۔۔ فیکٹری اور دفتر سے، تیسری لہر کے مقام یعنی گھر کی سمت کام کی منتقلی کے سلسلے میں درپیش مشکلات کو غیر اہم نہیں سمجھا جانا چاہئے۔ کارپوریٹ اور سماجی تنظیم نو کو متحرک کرنے میں اور ان کے انتظامی مسائل، اس انتقال کار کو، خاصا طویل اور تکلیف دہ بنائیں گے نہ ہی تمام کمیونیکیشن کو کسی اور شخص کے تخیلاتی مشاہدے کی طرح ہینڈل کیا جا سکتا ہے۔ بعض معاملات میں۔۔۔۔ خصوصاً تخلیقی کاروباری معاملات، جہاں ہر فیصلہ غیر معمولی ہوتا ہے۔ بالمشافہ ملاقات کی اہمیت بہر حال رہتی ہے۔

چنانچہ کینیڈا کی سمندر پار سرمایہ کاری کی کمپنی کے صدر مائیکل کارنر کا کہنا ہے: ایک ہزار فٹ اندر اور ہم سب کی موجودگی، سبھی کے لئے ضروری ہے۔''

مواصلاتی تبدیلیاں

بہرصورت طاقتور عناصر الیکٹرانک کاٹیج کو مقبول عام بنانے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ ٹرانسپورٹیشن اور ٹیلی کمیونیکیشن کے مابین معاشی گٹھ جوڑ کے نتیجے میں آنے والی تبدیلیاں اس کا سب سے فوری اظہار ہیں۔ اعلیٰ ٹیکنالوجی کی حامل اقوام ٹرانس پورٹیشن کرائسس کا شکار ہیں، ان کے وسیع وعریض ٹرانزٹ سسٹم انتہائی شکستہ ہو رہے ہیں، سڑکیں اور شاہراہیں ٹریفک کی وجہ سے بلاک ہو رہی ہیں۔ پارکنگ کی جگہ کم پڑ رہی ہے۔ آلودگی حد سے بڑھتی جا رہی ہے۔ ہڑتالیں اور تالہ بندیاں معمول بن گئی ہیں اور ہر شے کی لاگت آسمان سے باتیں کر رہی ہے آمدورفت کے بڑھتے ہوئے اخراجات اگرچہ ہر کارکن خود برداشت کرتا ہے مگر بالواسطہ طور پر، یہ بلند شرح اجرت کی شکل میں آجر کو ادا کرنے پڑتے

MashalBooks.org

ہیں اور بالآخر یہ سارا بوجھ زیادہ قیمت بن کر صاورف کے سر پر آن پڑتا ہے۔ جیک نلس اورنیشنل سائنس فاؤنڈیشن کی تشکیل کردہ ایک ٹیم نے، وائٹ کالر کارکنوں کے شہر میں واقع دفاتر کی جبائے نزدیکی مقامات تک شفٹ کیئے جانے کی صورت میں، ڈالر اور توانائی، دونوں کی بچت کے متعلق تخمینے لگائے ہیں، دفتری کام کو کارکنوں کے گھر منتقل کرنے کے بجائے نلس گروپ نے ''آدھے راستے کی مسافت'(Half Way House) کا نظریہ پیش کیا جس کے مطابق پیداواری کام کو کارکنوں کے گھروں کے نزدیک واقع کام کے مراکز میں پھیلا دیا جائے۔

ان تحقیقات کے نتائج خاصے حیرت انگیز ہیں۔ لاس اینجلز کی ایک انشورنس کمپنی کے2048 کارکنوں کے مشاہدے کے بعد نلس گروپ نے یہ اندازہ لگایا کہ ہر شخص روزانہ ''گھر اور دفتر کے درمیان، اوسطاً21.4 میل کا سفر کرتا ہے۔ (جبکہ امریکہ کے شہری علاقوں میں عموماً اس مسافت کی قومی اوسط18.8 میل ہے) جتنا بڑا انتظامی عہدہ ہے، اتنا ہی طویل آمدورفت ہوگی۔ اعلیٰ عہدیداروں کی اوسط مسافت 33.2 میل بنتی ہے، پتہ یہ چلا کہ یہ کارکن اپنے دفاتر میں جانے کے لئے ہر سال 12.4 ملین میل کی مسافت طے کرتے ہیں۔ اس مسافت کا وقت تقریباً آدھی صدی کے گھنٹوں پر محیط ہوتا ہے۔

1974ء کی قیمتوں کے مطابق اس کے اخراجات بائیس سینٹ فی میل یا مجموعی طور پر کمپنی اور اس کے صارفین کو برداشت کرنے پڑے۔ فلس کی تحقیق کے مطابق، درحقیقت کمپنی اپنے شہری کارکنوں کو، مضافاتی علاقوں میں کام کرنے والوں کی نسبت سالانہ 0 2 5ڈالر زیادہ۔۔۔ آمد ورفت کے اخراجات میں سب سیڈیری کے طور پر''۔۔۔ ادا کر رہی تھی۔ مرکزی مقامات پر مطلوبہ ضروری مگر مہنگی خدمات اور پارکنگ کی جگہیں بھی انہیں مہیا کر رہی تھی۔ فرض کیجئے کہ اگر سیکرٹری، اپنے نزدیکی علاقے میں، دس ہزار ڈالر سالانہ کما رہا ہوتا، تو آمدورفت کے اخراجات کے خاتمے کی وجہ سے کمپنی تقریباً تین سو نئے کارکن بھرتی کرسکتی تھی یا سا کے منافع میں ایک معقول اضافہ نظر آتا۔

بنیادی سوال یہ ہے: ٹیلی کمیونیکیشن کے سازوسامان کی تنصیب اور انہیں آپریٹ کرنے کے اخراجات کب تک آمدورفت کے موجودہ اخراجات کی نسبت مقابلتاً کم ہونگے؟

پٹرول اور دوسرے ٹرانسپورٹ اخراجات (بشمول کار کے متبادل عوامی ذرائع آمدورفت) ناقابل برداشت ہوتے جا رہے ہیں جبکہ ٹیلی کمیونیکیشن کی قیمتیں مسلسل کم ہو رہی ہیں۔ کہیں نہ کہیں تو دونوں قوسی خطوط باہم متقاطع ہوں گے ہی۔ لیکن پیداواری عمل کے جغرافیائی انتشار(Dispersion)(اور بالآخر مستقبل کے الیکٹرانک کاٹیج) کی جانب ہمیں دھکیلنے میں صرف یہی قوتیں کارفرما نہیں۔

نلس ٹیم کی تحقیقات کی روشنی میں امریکہ کا اوسط شہری صارف64.4 کلو واٹ انرجی کے مساوی گیسولین، اپنے کاروبار کے سلسلے میں، گھر سے آنے جانے میں روزانہ استعمال کرتا ہے۔(لاس اینجلز کی انشورنس کمپنی کے کارکنوں نے اسی آمدورفت میں سالانہ 37.4ملین کلو واٹ گیسولین خرچ کر ڈالی) اس کے برعکس صرف انفارمیشن کی ترسیل میں کہیں کم توانائی خرچ ہوتی ہے۔

ایک عام کمپیوٹر ٹرمینل اپنے آپریشن کے دوران،100 سے 125واٹ یا اس سے بھی کم خرچ کرتا ہے اور ٹیلی فون دوران استعمال، ایک واٹ سے بھی کم خرچ کرتا ہے۔ مواصلاتی رابطوں کے لئے کتنا سازو سامان درکار ہوگا اور کتنا عرصہ وہ قابل استعمال رہے گا۔۔۔ان سے متعلق بعض مفروضات قائم کر کے نلس(Nilles) نے حساب کتاب نکالا: ''ذاتی کار کے استعمال کی صورت میں، ٹیلی کمیونیکیشن پر توانائی کے خرچ اور آمدورفت پر صرف کا تناسب کم از کم 29:1 کا ہوتا ہے۔ عوامی ٹرانسپورٹ، (اپنے عمومی استعمال کی صورت) میں ی تناسب 11:1 کا ہوتا ہے اور ماس ٹرانزٹ سسٹم کے 100%استعمال کی حالت میں بھی، یہ تناسب 2:1 کا رہتا ہے۔'' اس حساب کتاب سے پتہ چلتا ہے کہ 1975ء میں شہری ذرائع آمدورفت میں مواصلاتی ترسیلات کا حصہ بمشکل 12% سے 14% تک تھا۔ امریکہ تقریباً 75ملین بیرل گیسولین کا خرچ بچا سکتا تھا اس طرح بیرونی ذرائع سے حاصل کردہ گیسولین کا صرف بالکل ہی ختم ہوسکتا تھا۔ صرف اسی ایک حقیقت کی وجہ سے نہ صرف امریکی توازن تجارت پر خاصا خوشگوار اثر ہوتا بلکہ ممکن ہے مشرقِ وسطیٰ کی سیاست بھی اتنی اہمیت کی حامل نہ ہوتی۔

جوں جوں گیسولین کی قیمتیں اور توانائی کے اخراجات، آنے والے عشروں میں،

MashalBooks.org

بڑھتے جائیں گے، توں توں سمارٹ ''ٹائپ رائٹرز، ٹیلی کاپیئرز، آڈیو اور ویڈیو لنکس (Links)اور گھریلو کمپیوٹر کنسولز کے آپریشن کے اخراجات، ڈالر اور توانائی دونوں صورتوں میں، کم ہوتے چلے جائیں گے۔دوسری لہر کے دور کی عظیم الشان مرکزی ورکشاپوں کی نسبت، پیداواری عمل کو مختلف جگہوں میں پھیلانے کے اضافی فوائد اب بھی محسوس کئے جا سکتے ہیں۔مواصلاتی ترسیل کی سمت یہ بڑھتے ہوئے پریشرز۔۔۔۔گیس کی عمومی کمیابی، روز مرہ کی پریشانی پٹرول پمپوں پر طویل قطاریں اور غالباً توانائی کی راشنگ، نتیجتاً نارمل آمدورفت میں رکاوٹیں اور دیر۔۔۔۔ یہ سب کے سب سماجی اور معاشی معنوں میں، پٹرول کی لاگت میں اضافے کے ساتھ ساتھ۔۔۔۔مزید موثر ہوتے جائیں گے۔

اسی جانب متحرک کئی اور پریشرز بھی اس میں شامل کئے جا سکتے ہیں۔کارپوریٹ اور حکومتی اداروں کے سربراہ جلد ہی یہ محسوس کر لیں گے کہ کام کی گھروں میں۔۔۔۔ یا مقامی قریبی مراکز کار میں منتقلی (تاکہ مسافت کم کی جا سکے)۔۔۔۔فوری طور پر جائیداد کی مد میں صرف ہونے والی رقوم کو خاصا کم کر دے گی۔مرکزی دفاتر اور مینوفیکچرنگ سہولتیں جتنی مختصر ہونگی۔ جائیداد پر ہونے والا خرچ اور ان کی ٹھنڈا یا گرم رکھنے، روشن رکھنے اور حفاظتی انتظام وانصرام پر اٹھنے والا خرچ خود بخود گھٹ جائیگا۔ جوں جوں زمین، تجارتی اور صنعتی جائیداد اور ان سے متعلقہ ٹیکس کا بوجھ (خرچ کی صورت میں) بڑھتا جائے گا، ان سارے اخراجات کو کم کرنے یا ختم کرنے کی خواہش کام کو مختلف اطراف میں پھیلانے میں مد و معاون ثابت ہو گی۔ انتقال کار اور ٹرانسپورٹ میں کمی ماحولیاتی آلودگی میں کمی اور اس کی صفائی کی شروعات کا باعث بھی ہو گی۔ ماحولیات پسند، کمپنیوں کو ان کی اپنی پیدا کردہ آلودگی ختم کرنے کی ادائیگی پر مجبور کرنے میں جتنا کامیاب ہونگے۔کم آلودگی کو جنم دینے والی سرگرمیوں کی جانب شفٹ کرنے اور بعد ازاں بڑے پیمانے کی مرکزی ورکشاپس کی جگہ چھوٹے چھوٹے مراکز کار بنانے بلکہ پیداواری کام کو گھروں میں منتقل کرنے کا رجحان مزید بڑھتا جائے گا۔

بعدازاں، جوں جوں، ماحولیت پسند اور فطرت کے تحفظ کے حامی شہری گروپ گاڑیوں کے تباہ کن اثرات کے خلاف نبرد آزما ہونگے اور سڑکوں اور شاہراہوں کی تعمیر کی

مخالفت کریں گے یا بعض علاقوں میں گاڑیوں کے داخلے کو روکنے میں کامیاب ہونگے، وہ ن جنے میں انتقال کار کی معاونت کر رہے ہونگے ان کی اس جدوجہد کا ماحصل ٹرانسپورٹ کی موجودہ بلند لاگت اور انفرادی تکالیف کے مقابلے میں مواصلاتی ترسیل کی کم لاگت اور انفرادی سہولت کا ادراک ہے۔

جب ماحولیت پسند دونوں متبادل صورتوں کے درمیان قدرتی تفاوت کومحسوس کر لیں گے اور گھروں میں کام کی منتقلی کا تصور حقیقی پسند کا روپ دھارے گا تو ان کی رائے کا وزن خود بخود عدم مرکزیت کی اس اہم تحریک کے پلڑے میں جا گرے گا اور اس طرح وہ تیسری لہر کی تہذیب میں ہمارے داخلے کا موجب بن جائیں گے۔

سماجی عوامل بھی الیکٹرانک کاٹیج کی جانب پیش قدمی میں معاون ہیں۔روزانہ اوقات کار جتنے مختصر ہونگے، مقابلتاً آمد ورفت کے اوقات اتنے ہی طویل ہونگے۔ ایک کارکن، جو آٹھ گھنٹے کام کرنے کی غرض سے،آنے جانے میں ایک گھنٹہ صرف کرتا ہے، وہ کم اوقات کی ملازمت کے لئے اتنی لمبی مسافت طے کرنے سے انکار کرسکتا ہے۔ اوقات آمد و رفت کار کا تناسب جتنا اونچا ہوگا، ادھر سے ادھر پھرکی کی طرح گھومنے کا عمل اتنا ہی غیر عاقلانہ، پریشان کن اور لایعنی ہوگا۔ جیسے جیسے بلاوجہ کی آمد و رفت کے خلاف مزاحمت میں اضافہ ہوگا، آجر مرکزی مقامات پر موجود بڑی بڑی فیکٹریوں اور دفاتر میں کام کرنے والے کارکنوں کو اضافی تنخواہ دینے پر مجبور ہونگے، جبکہ بہت سے لوگ کم سفری اوقات، کم پریشانی اور کم اخراجات کی وجہ سے، قریبی جگہوں پر، کم اجرت پر کام کرنے کے خواہاں ہونگے۔ انتقال کار(Transfer of Work) کے لئے یہ وجہ بھی خاصی اہم محرک ثابت ہوگی نتیجتاً انتہائی موثر تبدیلیاں اسی سمت رواں دواں ہیں۔ نج کاری کی افزائش سے لے کر چھوٹے شہروں اور دیہی زندگی کا نیا تصور اپنی جگہ، ہم ساتھ ساتھ خاندانی اکائی کے متعلق رویئے میں بھی بنیادی تغیر کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔ دوسری لہر کے زمانے کی سماجی طور پر مقبول اور معیاری نیوکلیئر فیملی (جوہری گھرانہ) شدید مشکلات سے دو چار ہے۔ اگلے باب میں، ہم مستقبل کے گھرانے کے بارے میں روشنی ڈالنے کی کوشش کریں گے فی الحال ہمیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ امریکہ اور یورپ میں۔۔۔۔ جہاں جوہری گھرانے سب سے زیادہ تغیر کی زد

MashalBooks.org

میں ہیں۔۔۔۔ خاندانی اکائی کو دوبارہ مجتمع کرنے کی شدید خواہش جنم لے رہی ہے۔ یہ بھی قابل غور بات ہے کہ ہر زمانے میں خاندان کو مضبوطی سے اکٹھے رکھنے والے عوامل میں سے ایک ایک اشتراک کار رہا ہے آج بھی عمومی اندازہ یہی ہے کہ اکٹھے کام کرنے والے جوڑوں میں طلاق کی شرح خاصی کم ہے۔ الیکٹرانک کاٹیج، ایک بار پھر بڑے پیمانے پر، میاں بیوی بلکہ بچوں تک کے، ایک اکائی کی شکل میں کام کرنے کے امکانات میں انتہائی اضافہ کر رہا ہے۔ گھریلو زندگی کے پر جوش حامیوں کو جب گھروں میں انتقال کار میں چھپے امکانات کا پتہ چلے گا تو اس عمل کو تیز کرنے کے حق میں۔ ٹیکس کی ترغیبات اور کارکنوں کے حقوق سے متعلق نئے تصورات جیسے متعدد مطالبات، سیاسی دباؤ بڑھانے کے لئے، ہمارے مشاہدے میں آئیں گے۔

دوسری لہر کے ابتدائی دنوں میں کارکنوں کی تحریک نے ''دس گھنٹے روزانہ'' جس جس کے متعلق پہلی لہر کے زمانے میں سوچنا بھی ناممکن تھا، زبردست جدوجہد کی جلد ہی اس طرح کا مطالبہ تحریک کی صورت میں سامنے آنے والا ہے کہ جو کام گھر میں کرنا ممکن ہے، اسے گھر میں ہی کیا جائے، بہت سے کارکن اسے اپنے حق کے طور پر تسلیم کرانا چاہیں گے۔ چونکہ اس مکانی تبدیلی کے نتیجے میں گھریلو زندگی کے خوشگوار ہونے کے امکانات ہیں، اس لئے اسے مختلف سیاسی، مذہبی اور ثقافتی حوالوں سے، لوگوں کے بے پناہ حمایت بھی حاصل ہوگی۔

الیکٹرانک کاٹیج کی تعمیر دراصل ماضی کی دوسری لہر اور مستقبل کی تیسری لہر کے مابین جاری زبردست جنگ کا ایک حصہ ہے اور اس کے ذریعے نہ صرف نئے تکنیکی امکانات اجاگر کرنے کے خواہاں ماہرین ٹیکنالوجی اور کارپوریشنوں کو اکٹھا کرنے میں بلکہ دوسری قوتوں کے خاصے وسیع سلسلوں کو۔۔۔۔ جن میں ماحولیت پسند، ایک مختلف انداز کے لیبر مصلحین، اور (قدامت پسند کلیساؤں سے لے کر انقلابی نسوانیت پسندوں تک کی) تنظیموں کا ایک وسیع تر اختلاط اور سیاسی گروہوں کا مرکزی دھارا خاندان کے، بخوبی نظر آنے والے ایک نئے زیادہ قابل اطمینان مستقبل کی حمایت میں یکجا کرنے میں مدد ملے گی۔ اس طرح الیکٹرانک کاٹیج مستقبل کی تیسری لہر کی قوتوں کا بنیادی نقطہ ارتکاز بن کر ابھر سکتا ہے۔

گھر پر مرکوز معاشرہ

اگر الیکٹرانک کاٹیج کی ترویج ہونا ہی ہے تو معاشرے میں زبردست اہمیت کے تغیرات کا سلسلہ جنم لے گا۔ ان میں سے بہت سے تغیرات زیادہ تر پر جوش ماحولیت پسندوں یا تکنیک مخالف گروہوں کے لئے خوشگوار ہونے کے ساتھ ساتھ کاروباری منتظمین کے لئے نئی نئی ترغیبات کے دروازے بھی کھول رہے ہونگے۔

برادری کے اثرات

گھر پر پیداواری کام میں، آبادی کے ایک مناسب حصے کی شمولیت کا مطلب، ایک زیادہ مستحکم برادری کی تشکیل ہوگا۔ یہ مقصد بہت سے تیز رفتار متغیر علاقوں میں آج ہماری پہنچ سے بہت دور لگتا ہے۔ اگر ملازمین اپنا سارا کام یا اس کا کچھ حصہ گھر پر سرانجام دے سکیں تو انہیں، اپنی ملازمت کی تبدیلی کی صورت میں، ہر دفعہ بھاگ دوڑ کی مشکل سے نجات مل جائے گی۔ ایسا سوچنا بھی فی الحال عجیب سا لگتا ہے۔ انہیں شاید صرف کسی دوسرے کمپیوٹر سے ہی منسلک ہونا پڑے۔ اس کا نتیجہ کمک جکبر یک رکت پذیری، کم ذاتی پریشانیوں، پائیدار انسانی رشتوں اور کمیونٹی رہن سہن میں کہیں زیادہ شمولیت کی شکل میں ظاہر ہوگا۔ آج جب کوئی گھرانہ اپنی برادری سے ملنے جلنے نکلتا ہے تو وہ دوبارہ ایسی ہی ملاقات کے لئے ایک دو سال سے پہلے سوچ بھی نہیں سکتا۔ گھر کے افراد انتہائی قریبی تنظیموں میں شامل ہونے، گہری دوستی کرنے، مقامی سیاست میں شریک ہونے اور برادری کے عمومی معاملات میں شریک ہونے میں جھجک محسوس کرتے ہیں۔ الیکٹرانک کاٹیج برادری کے باہمی تعلقات کے حقیقی احساس کی بحالی اور رضاکار تنظیموں سرے سے زندگی کی لہر دوڑا دے گا۔ و الیکٹرانکو کاٹیجو گھریلو زندگی کے متعلق سماجی ماہرین کے Gemeinschaft نامی محبوب تصور سے کہیں زیادہ معنویت پیدا کر سکتا ہے۔

ماحولیاتی اثرات

گھر کی جانب، کلی یا جزوی انتقال کار، نہ صرف توانائی کی ضرورت کو کم کرے گا بلکہ توانائی کی عدم مرکزیت کا راستہ بھی کھول دے گا۔ دفاتر کی بلند و بالا عمارات یا وسیع و

عریض فیکٹریوں کے چند علاقوں میں توانائی کے بے پناہ مقدار کا ارتکاز اور چنانچہ توانائی کی مرتکز پیداوار کی ضرورت کے بجائے، الیکٹرانک کاٹیج توانائی کی طلب کو اس طرح پھیلا دے گا کہ اس کے لئے شمسی، ہوائی اور دوسرے متبادل طریقوں کا استعمال آسان ہو جائے گا۔ ہر گھر میں چھوٹے پیمانے پر توانائی کے پیداواری یونٹس، موجودہ مرتکز توانائی کا کم از کم کسی حد تک بدل بن سکتے ہیں۔ اس طرح دو وجوہات کی بنا پر آلودگی میں بھی خاصی کمی واقع ہو گی۔ اول یہ کہ چھوٹے پیمانے پر توانائی کے قابل احیا ذرائع پر انحصار کی جانب پیش رفت، زیادہ آلودگی آمیز ایندھن کی ضرورت ختم کر دے گی اور دوسرے یہ کہ بے پناہ مرکوز آلودگی مخصوص علاقوں میں ماحول کو بوجھل بنانے کے بجائے، وسیع علاقوں میں کا نسبتاً کم خارج ہو گی۔

معاشی اثرات

اس نظام میں بعض کاروبار سمٹ جائیں گے اور بعض تیزی سے پھلے پھولیں گے۔ ظاہر ہے الیکٹرانک، کمپیوٹر اور ابلاغی صنعتیں ترقی کریں گی۔ اس کے برعکس آئل کمپنیاں، موٹر گاڑیوں کی صنعت اور کمرشل جائیداد کا کام کرنے والے نقصان میں رہے گے۔ چھوٹے چھوٹے کمپیوٹر سٹورز اور اطلاعاتی خدمات کا کاروبار زور شور سے بڑھے گا۔ ڈاک کا نظام بھی سمٹ کر رہ جائے گا۔ کاغذ بنانے والے بھی گھاٹے میں جائیں گے۔ خدمات سے متعلقہ زیادہ تر صنعتیں اور سفید پوش کارکنوں کی صنعتیں فائدے میں رہیں گی۔

اور گہری سطح پر اگر افراد نے نقد یا ادھار ادائیگی کی بنیاد پر اپنے الیکٹرانک ٹرمینلز اور متعلقہ ساز و سامان کی ملکیت لینے کی کوشش کی تو درحقیقت ملازمت کی کلاسیکی حیثیت کے بجائے وہ خود مختار آجروں کی شکل اختیار کر لیں گے۔۔۔۔ مطلب یہ کہ ''ذرائع پیداوار'' پر کارکن کی ملکیت میں اضافہ ہو گا۔ ممکن ہے کہ ہم گھر کام کرنے والوں کو چھوٹی چھوٹی کمپنیوں میں منظّم ہوتے اور اپنی خدمات کے سلسلے میں معاہدے کرتے دیکھیں یا وہ ایسی کوآپریٹوز کی شکل مجتمع ہو جائیں، مشینیں جن کی مشترکہ ملکیت ہوں۔ غرض ہر طرح کے نئے تعلقات اور تنظیمی اشکال ممکن ہو سکتی ہیں۔

MashalBooks.org

نفسیاتی اثرات

غیر واضح اور مشکل علامات پر مبنی جہاں کار کی تصویر، انتہائی ذہنی عمل کا ایسا ماحول بنا رہی ہے جو ہمارے لئے قطعی اجنبی اور ایک سطح پر غیر متعلق محسوس ہو گی لیکن ایک مختلف سطح پر کام کرنے کی وجہ سے گھریلو ماحول اور ہمسائے میں باہمی یگانگت اور جذباتی رشتے زیادہ گہرے ہونگے۔ سائنس فکشن کہانیوں میں بیان کردہ۔۔۔ ایک فرد اور باقی تمام انسانیت کے درمیان موجود ایک برقی سکرین۔۔۔ خالصتاً نیابتی انسانی رشتوں پر مبنی دنیا کے بجائے، انسانی تعلقات کے دو رسیٹوں میں منقسم۔۔۔ ایک حقیقی اور دوسری نیابتی دنیا، اپنے اپنے قوانین اور کردار سمیت قابل فہم نظر آتی ہے۔

بلاشبہ ہم بہت سے تغیرات اور ادھورے عوامل کے مشاہدے سے گزریں گے۔ بہت سے لوگ جز وقتی کام گھر پر یا گھر سے باہر بھی کر رہے ہونگے۔ عدم مرتکز مراکز کار میں یقیناً اضافہ ہو گا۔ بعض لوگ مہینوں بلکہ سالوں گھر پر کام کریں گے اور پھر گھر سے باہر کام کرنے لگیں گے اور شاید پھر دوبارہ گھر میں ہی کام کرنے کی طرف لوٹ آئیں۔ رہنمائی اور انتظامی طور طریقے بہر حال بدلنا ہونگے۔ چھوٹی کمپنیاں وائٹ کالر کاموں کے لئے بڑی کمپنیوں سے کنٹریکٹ لینے کے لئے دوڑ دھوپ کریں گی اور گھر پر کام کرنے والے کارکنوں کی تنظیم، تربیت اور ان کے انتظامات کے لئے خصوصی ذمہ داریاں نبھائیں گی۔ ان افراد کے مابین مناسب رابطوں کے لئے یہی کمپنیاں، اپنے کارکنوں کی ٹیم کی تربیت، باہمی میل جول اور بالمشافہ جان پہچان کے لئے۔۔۔ تاکہ تعلق صرف کنسولزیا کی بورڈ تک ہی محدود نہ رہے۔۔۔ پارٹیوں، سماجی مواقع اور دوسری مشترکہ تعطیلات کا بھر پور استعمال کر سکتی ہیں۔

یقیناً ہر شخص نہ تو گھر پر کام کر سکتا ہے اور نہ ہی آئندہ کر سکے گا (یا کرنا نہیں چاہے گا) تنخواہوں کے سکیلوں اور دوسرے اخراجات کے متعلق بھی متنازعہ صورت آتی رہتی ہے۔ اس وقت معاشرے کی کیا صورت حال ہو گی جب دوران کار باہمی تفاعل کی بڑھتی ہوئی مقدار نیابتی ہو، جبکہ گھر میں یہی تفاعل بالمشافہ اور گہرے جذباتی انداز میں بدل رہا ہو؟ شہروں کا کیا ہو گا؟ بے روزگار لوگوں کے ساتھ کیا ہو گا؟ درحقیقت ہم ایسے نظام میں

''روزگار'' اور ''بے روزگاری'' کی اصطلاحوں سے کیا مفہوم اخذ کرتے ہیں؟ ایسے سوالات اور مسائل کو نظر انداز کرنا انتہائی احمقانہ ہوگا۔

تاہم اگر کچھ لاینحل سوالات اور تکلیف دہ مشکلات سامنے ہیں تو نئے امکانات بھی ساتھ ساتھ روشن نظر آتے ہیں۔ حالیہ دور کے سب سے زیادہ پیچیدہ مسائل، نئے نظام کی جانب کامیاب جست کے ساتھ ہی غیر متعلق ہو کر رہ جائیں گے۔ مثلاً جاگیردارانہ مظالم کو جاگیردارانہ زراعتی نظام کے اندر رہتے ہوئے ختم نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کسان بغاوتوں، غریب پرور امراء یا مذہبی تخیل پرستوں کی پرجوش حمایت کے باوجود اس کا کچھ نہیں بگاڑا جا سکا۔ زرعی دور میں مزدور کارکن کی حالت انتہائی تکلیف دہ تھی اور یہ صورت اس وقت تبدیل ہوئی، جب زرعی نظام کی اپنی مختلف خرابیوں نے فیکٹری سسٹم کے استقبال کے لئے راستے وا کر دیئے۔

بعدازاں صنعتی معاشرے کے خصوصی مسائل۔۔۔۔ بے روزگاری، کام کی یکسانیت، حد سے زیادہ مہارت، فرد کے ساتھ بے رحم برتاؤ کم مزدوری۔۔۔۔ ملازمتوں کا دائرہ بڑھانے والوں، مزدور یونینوں، رحم دل آجروں اور انقلابی مزدور پارٹیوں کے بہترین اداروں اور وعدوں کے باوجود، دوسری لہر کے پیداواری نظام میں، عقدہ لاینحل ہی بنے رہے۔ اگر یہ مسائل پچھلے تین سو سال می سرمایہ دارانہ اور سوشلسٹ دونوں نظاموں میں ہی، حل طلب رہے ہیں تو یہ سوچنا بلا جواز نہیں کہ یہ مسائل طریق پیداوار میں فطری طور پر موجود ہوتے ہیں۔

مینوفیکچرنگ اور وائٹ کالر سیکٹر دونوں میں، ایک نئے پیداواری سسٹم کی جانب جست اور الیکٹرانک کاٹیج کی سمت ممکنہ کامیاب پیش قدمی، نہ صرف موجودہ انداز بحث و تمحیص کو تبدیل کر ڈالے گی بلکہ زیادہ تر ایسے متنازعہ مسائل۔۔۔۔ جن پر خواتین و حضرات بحث و مباحثہ کرتے ہیں، جدوجہد کرتے ہیں اور بعض اوقات اپنی جان بھی دے دیتے ہیں۔۔۔۔ اپنی معنویت ہی کھو بیٹھیں گے۔

ہم کل میں نہیں جھانک سکتے۔ ممکن ہے یہ الیکٹرانک کاٹیج مستقبل کا عمومی معمول ہو۔ بہرحال یہ بات قرین قیاس ہے کہ اگر موجودہ ورک فورس کا کم از کم 10% سے

20% حصہ اگلے بیس تیس سال میں یہ تاریخی تبدیلی (گھر میں انتقال کار) سرانجام دے ڈالے تو ہماری ساری معیشت، ہمارے شہر، ہمارا فطری ماحول، ہمارا گھریلو ڈھانچہ، ہماری اقدار، یہاں تک کہ ہماری سیاست بھی نا قابل یقین حد تک بدل جائیں گے۔

یہ ایک امکان ہے۔۔۔۔ دلفریب اور خوش کن امکان، جس کے متعلق شاید ابھی خاصا سوچ بچار ہونا ہے۔ تیسری لہر کی بہت سی تبدیلیوں کو۔۔۔۔ جن کا عموماً فرداً فرداً جائزہ لیا جاتا ہے۔۔۔۔ ایک دوسرے کے ساتھ منسلک کر کے، ان کا باہمی تعلق دیکھنا ممکن ہی نہیں۔ ہمیں اپنا ٹیکنالوجیکل سسٹم اور توانائی کی بنیاد، ایک نئے دائرہ تکنیک میں منتقل ہوتے نظر آتے ہیں۔ بیک وقت یہ صورت حال بھی ہے کہ ہم ماس میڈیا کے عدم پھیلاؤ سے ایک ذہین وفطین ماحول تشکیل دے رہے ہیں اور اس طرح اپنے دائرہ اطلاعات میں بھی انقلاب لا رہے ہیں۔ بعدازاں یہ دوعظیم الشان رویں فیکٹری اور دفتر میں کام کی نوعیت بدلتے ہوئے، ہمارے پیداواری نظام کے ڈھانچے میں گہرائی تک تبدیلیاں لائیں گی اور بالآخر ہمیں گھر کی جانب انتقال کار کی سمت لے جائیں گی۔

یہ تاریخی تبدیلیاں، خود اس بات کی غماز ہیں کہ ہم ایک نئی تہذیب کے دہانے پر کھڑے ہیں لیکن ہم ساتھ ساتھ اپنے گھریلو بندھنوں اور دوستیوں سے لے کر، اپنے سکولوں اور کارپوریشنوں تک۔۔۔۔ اپنی سماجی زندگی کی ازسرنو تشکیل بھی کر رہے ہیں۔ تیسری لہر کے دائرہ تکنیک اور دائرہ اطلاعات کے ساتھ ساتھ ہم تیسری لہر کا سماجی دائرہ بھی تخلیق کرنے ہی والے ہیں۔

MashalBooks.org

باب 16

مستقبل کے گھرانے

امریکہ میں 1930ء کی دہائی میں عظیم سرد بازاری کے دوران لاکھوں اشخاص بے روزگار ہو گئے۔ احساس ندامت اور مایوسی کے ہاتھوں مزدوروں کو انا کو شدید ٹھیس پہنچی۔ بے روزگاری کی وجہ کارکنوں کی کاہلی یا اخلاقی کمزوری نہیں تھی بلکہ اس تکلیف دہ حالت کا سبب وہ مہیب طاقتیں تھیں جو انسان کے بس سے باہر تھیں۔ بے روزگاری پھیلانے میں دولت کے ناہموار تقسیم، فریب نظر سرمایہ کاری، بے حساب سٹہ بازی، احمقانہ تجارتی پالیسیاں اور نا اہل حکومت کا ہاتھ تھا، نہ کہ بے روزگار کئے گئے مزدوروں کی نا اہلی۔ لہٰذا امریکی مزدوروں میں احساس ندامت غیر موزوں ردعمل تھا۔ آج پھر انسانی انا کے پرخچے اڑائے جا رہے ہیں اور اس احساس کی وجہ سے معیشت کے بجائے خاندان ٹوٹ پھوٹ رہے ہیں۔ لاکھوں مرد اور عورتیں شادی بیاہ طلاق کے چکر اور اپنی زندگیوں کی تباہی کے لئے خود کو مجرم ٹھہراتے ہیں۔ لیکن جب طلاق، ازدواجی جدائی اور اسی طرح کے خاندانی جھگڑوں میں، بیک وقت لاکھوں لوگ مختلف ممالک، میں ملوث ہوں تو اس کے اسباب شخصی عمل میں ڈھونڈنا بے سود ہوگا۔

دراصل خاندان کی ٹوٹ پھوٹ آج کے وسیع تر صنعتی بحران کا ایک حصہ ہے۔ دوسری لہر کے دوسرے اداروں کی طرح، خاندان کی شکست وریخت تیسری لہر کی معاشی دنیا کی راہ ہموار کرنے کی جانب حرکت کا تکلیف دہ جزو ہے، جس کی وجہ سے ہماری شخصی زندگیوں میں برپا ہونے والے تغیرات سے خاندانی نظام کی پہچان ہی مشکل ہو گئی ہے۔

یہ مخصوص صورت حال روزی کمانے والے خاوند، گھر سنبھالنے والی بیوی چند چھوٹے بچوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ گو کہ خاندان کی کئی اور شکلیں بھی موجود ہیں۔ دوسری لہر کی

MashalBooks.org

تہذیب نے اس مخصوص جوہری گھرانے کو معاشی طور پر بنا کر اسے دنیا بھر میں رائج کر دیا۔ اس قسم کے جوہری گھرانے کو معاشی طور پر معیاری درجہ دیا گیا کیونکہ یہ تھوک پیداواری نظام کے لئے موزوں ترین تھا۔ جہاں طبقاتیت، بیوروکریسی کا دور دورہ تھا اور گھریلو زندگی اور منڈی کے کاروباری مقامات کے درمیان واضح فرق کیا جاتا تھا۔ آج جب خاندان کے حامی حکمران اس کی حمایت میں نعرے لگاتے ہیں تو ان کے ذہن میں دوسری لہر کے اسی جوہری گھرانے کا تصور ہوتا ہے۔ ان کی سوچ کی تنگی اصل مسئلہ کی نہ صرف غلط تشخیص ہے بلکہ خاندان کے احیاء کے لئے، ان کا پروگرام طفلانہ ذہن کی عکاسی بھی ہے۔ موجودہ حکام اس خاندانی بحرانی کی ذمہ داری فحاشی پھیلانے والے تاجروں اور پاپ موسیقی پر دھرتے ہیں۔ چند ایسے بھی اصحاب رائے ہیں، جن کے نزدیک خاندان کے استحکام کے لئے اسقاط حمل اور جنسی تعلیم کی مخالفت اور خواتین کے حقوق کے تعرے بند کرنا لازمی ہے۔ یا پھر وہ خاندان کی بابت نصابی تعلیم کا نسخہ پیش کرتے ہیں۔ امریکی حکومت کے ماہر شماریات کے مطابق، شادی سے قبل ازدواجی معاملات کی تربیت سے، سائنسی بنیادوں پر رفیق حیات کا انتخاب ممکن ہو سکے گا، جس سے زیادہ کامیاب شادیاں عمل میں لائی جا سکیں گی۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو کہ ازدواجی الجھنوں کے متعلق مشاورتی اداروں کی تعداد بڑھانا چاہتے ہیں یا پھر گھرانے کی اہمیت کو وسیع پیمانے پر اجاگر کرنے کے لئے تعلقات عامہ کی مہم چلانے کا مشورہ دیتے ہیں۔ تاریخ کی لہروں کی تبدیلیوں کے عمل سے ناواقف نادان بہت خوش فہم ہیں لیکن ان کے منصوبے حکمت و دانائی سے عاری ہیں۔

جوہری گھرانے کی تحریک

اگر ہم واقعی جوہری گھرانے کی گزری ہوئی آب و تاب واپس لانا چاہتے ہیں تو ہمیں درج ذیل اقدامات کرنے ہوں گے۔

(1) ٹیکنالوجی کی ترقی کو دوسری لہر کی سطح پر منجمد کر دیا جائے تاکہ فیکٹری کے تھوک پیداواری نظام کے معاشرے کو برقرار رکھا جا سکے۔ اس تحریک کی شروعات کمپیوٹر کو رد کرنے سے ہو گی۔ دوسری لہر کے گھرانے کے لئے، اسقاط حمل کے قوانین اور فحاشی کی تجارت سے کہیں زیادہ، دشمن کمپیوٹر ہے کیونکہ جوہری گھرانے کی ترقی کے لئے تھوک

پیداواری نظام لازمی ہے، جب کہ کمپیوٹر ہمیں اس نظام کی حدوں سے باہر لے جا رہا ہے۔

(2) صنعتی شعبے کی مدد کی جائے اور خدماتی شعبے کو ختم کر دیا جائے۔ سفید کالر والے پیشہ ور لوگ اور تکنیکی کام کرنے والے رواج پسند نہیں ہوتے، وہ اپنی زندگی کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ وہ نیلے کالر والے کارکنوں کے مقابلے میں دفاعی اور نفسیاتی طور پر زیادہ آزاد ہوتے ہیں۔ خدماتی پیشوں میں ترقی کے ساتھ ساتھ طلاق کی شرح میں بھی اضافہ ہوا ہے۔

(3) توانائی کے بحران کو ایٹمی اور دوسری اقسام کے نہایت مرتکز ذرائع سے حل کیا جائے۔ جوہری گھرانے کا تصور ایک مرتکز معاشرے میں تو ممکن ہے لیکن ایک غیر مرتکز سماج میں نہیں۔ معاشرے میں پائی جانے والی ماشی اور سیاسی مرکزیت کے ذرجہ پر وہاں کے مروجہ نظام توانائی کا گہرا اثر ہوتا ہے۔

(4) ذرائع ابلاغ کے بڑھتے ہوئے تنوع پر پابندی لگائی جائے، جس کی شروعات کیبل، ٹیلی ویژن اور کیسٹ پر ممانعت سے ہونا چاہئے۔ جوہری خاندان کے پنپنے کے لئے ایسا ماحول لازمی ہے، جس میں ابلاغ اور اقدار پر قومی اتفاق رائے ہو۔ ابالغی طور پر متنوع معاشرے میں جوہری گھرانے کا کوئی مقام نہیں۔ چند اصحاب رائے تو ذرائع ابلاغ کو خاندانی اقدار کا دشمن قرار دیتے ہیں۔ یہ لوگ بھول جاتے ہیں کہ ذرائع ابلاغ نے ہی جوہری خاندان کی تشہیر کی تھی۔

(5) خواتین کو گھر کی چار دیواری میں قید کر دیا جائے۔ خواتین کارکنوں کے اجرت کم سے کم کر دی جائے۔ مزدور یونین کے قوانین کو مزید سخت بنایا جائے تا کہ خواتین کارکن اپنے جائز حقوق حاصل نہ کر سکیں۔ جس وقت گھر میں کوئی بڑا موجود نہ ہو، جوہری خاندان کا محور ہی ختم ہو جاتا ہے۔ (مردوں کو گھر میں رکھ کر، عورتوں کو کاروبار کی اجازت دینے سے، بھی یہ مقصد حاصل ہوسکتا ہے)۔

(6) جوان کاریگروں کی اجرت میں بھی کمی ہوتا کہ وہ زیادہ دیر تک اپنے گھرانے پر بوجھ بنے رہے اور اس طرح نفسیاتی طور پر ان کے خاندان پر انحصار میں اضافہ ہوگا۔ جوان بچوں کے گھر چھوڑ کر، تلاش معاش میں نکلنے سے جوہری گھرانے کی ہیئت ہی

بدل جاتی ہے۔

(7) ضبط تولید پر پابندی عائد کر کے نسلی افزائش پر تحقیق کی مخالفت کی جائے۔ ان اقدامات سے خواتین کی آزادی، حقوق اور غیر منکوعہ جنسی رشتوں میں اضافہ ہوتا ہے، جن سے جوہری گھرانے کو خطرہ لاحق رہتا ہے۔

(8) سارے معاشرے کا طرز زندگی 1955ء سے پہلے کی سطح پر واپس لے جایا جائے کیونکہ معاشی آسودگی سے معیشتی طور پر مطلقہ لوگ اور ہنر مند خواتین اپنی زندگی اکیلے ہی گزار سکتے ہیں۔ جوہری گھرانے کی بقاء کے لئے ایک درجہ غربت (نہ بہت زیادہ اور نہ بہت کم) لازمی ہے۔

(9) معاشرے میں پھیلی ہوئی پرچونیت کی روک تھام کر کے اس میں رائج نظام سیاست، فنون لطیفہ، تعلیم، کاروبار اور دوسرے میدانوں کو واپس تھوک پیداوار پر تشکیل دیا جائے۔ کیونکہ یہ پرچونیت معاشی تنوع میں، آزادی نقل وحمل، آزادی فکر اور ذاتی حقوق کی ترغیب دیتی ہے، جوہری گھرانہ صرف تھوک پیداواری معاشرے میں پروان چڑھ سکتا ہے۔

غرض اگر ہم گھرانے کی تعریف جوہری تصورات سے ہی کریں تو مندرجہ بالا اقدامات لازمی ہونگے۔ اگر ہم واقعی دوسری لہر کے تصور خاندان عام کرنا چاہتے ہیں تو پھر ہمیں دوسری لہر کی تہذیب کا احیاء کرنا پڑے گا، یعنی نہ صرف ٹیکنالوجی بلکہ تاریخ کو بھی منجمد کرنا ہوگا۔ آج جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں، وہ خاندان کے تصور کا خاتمہ نہیں بلکہ یہ دوسری لہر کے خاندانی نظام کی موت ہے، جس نے جوہری شکل کو خاندان کی دوسری شکلوں پر فوقیت بخش کر نمونے کے طور پر دینا کے سامنے پیش کیا۔ ذرائع ابلاغ اور پیداواری نظام میں تنوع کی جانب رجحان کی طرح ہم تیسری لہر کی تہذیب کی جانب بڑھتے ہوئے، اس عبوری دور میں خاندانی نظام میں بھی پرچونیت کا آغاز کر رہے ہیں۔

غیر جوہری طرز زندگی

تیسری لہر کی آمد کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جوہری گھرانے کا بالکل خاتمہ ہو جائے۔ دوسری لہر کے رائج ہونے سے مشترکہ خاندان نیست و نابود ہوا نہیں تھا۔ اس کا

مطلب صرف اتنا ہے کہ جوہری گھرانے کونمونے کے طور پر پیش نہیں کیا جا سکے گا۔

بہت کم لوگ یہ جانتے ہیں کہ ریاست ہائے متحدہ جہاں تیسری لہر کا اثر سب سے زیادہ ہے، وہاں پر اکثریت ابھی بھی جوہری خاندان کی شکل میں نہیں بستی۔ اگر ہم جوہری گھرانے سے یہ مطلب لیں کہ وہ سرسر روزگار خاوند، خاتون خانہ اور وہ بچوں پر مشتمل ہوتا ہے تو ہمیں یہ جان کر حیرت ہوگی کہ کتنے امریکن لوگ اس شکل کے خاندان میں بس رہے ہیں۔ صرف سات فیصد۔ امریکہ کی ترانوے فیصد آبادی خاندان کی اس تعریف پر پوری نہیں اترتی۔ اگر جوہری گھرانے کی تعریف میں کچھ ترمیم کر کے فرض کریں کہ اس میں خاوند اور بیوی دونوں ہی برسرروزگار ہیں اور ان کے کم و بیش دو بچے ہیں تو بھی امریکیوں کی بھاری اکثریت یعنی دو تہائی سے تین چوتھائی تک کی زندگی جوہری خاندان سے ماورا گزرتی ہے۔ ہمارے پاس موجود شماریاتی شواہد کے مطابق جوہری گھرانوں (ہم اس کی تعریف جیسے ہی کیوں نہ کریں) کی تعداد تیزی سے گھٹ رہی ہے۔ جب کہ خاندان کی متبادل شکلوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ پہلے تو یہ کہ تن تنہا لوگوں کی آبادی میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے، یعنی ایسے جو کسی بھی خاندانی نظام سے منسلک نہیں ہیں۔1970ء اور 1978ء کے درمیان 14 سے 34 سال کی عمروں کے ایسے لوگوں کی تعداد 15 لاکھ سے بڑھ کر 34 لاکھ تک پہنچ گئی ہے آج امریکہ میں ہر پانچ میں سے ایک گھر ایسا ہے جس میں شخص تنہا بستا ہے۔ یہ لوگ بے روزگار یا معاشرے میں دھتکارے ہوئے لوگ نہیں ہیں۔ ان لوگوں نے جان بوجھ کر وقتی طور پر ایسا طرز زندگی اختیار کر رکھا ہے۔ شہری مسائل کی کونسل کی ایک خاتون ممبر کا قول ہے کہ میں شادی اس مرد سے کروں گی جو مجھے پسند آئے گا۔ لیکن میں شادی کی خاطر اپنا کام نہیں چھوڑ سکتی۔ یہ خاتون ان نوجوانوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کا حصہ ہے، جو گھر چھوڑ کر کاروبار میں لگ جاتے ہیں لیکن شادی بعد میں کرتے ہیں۔ امریکہ کے ماہر مردم شماری آرتھر نارٹن کے مطابق ایسے لوگ ''عبوری زندگی کے مرحلے'' میں ہیں جو کہ ہماری زندگی کا قابل قبول حصہ بن چکا ہے۔ بڑی عمر کے لوگوں میں دیکھا گیا ہے کہ ان میں بھی کئی طلاق شدہ دوسری شادی کرنے سے پہلے، اپنی پسند کی زندگی گزار رہے ہیں۔ ان اکیلے لوگوں کی تعداد میں اضافے نے ''تنہائی'' کی ایک پوری تہذیب کو جنم دیا ہے۔ ایسے

میخانے، تفریح گاہیں، اور بہت سی خدمات کی بھر مار ہے جو خصوصی طور پر اکیلوں کے لئے بنائی گئی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی تعمیراتی صنعت نے بھی ایسے لوگوں کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے فلیٹ اور چھوٹے چھوٹے گھر بنانے شروع کر دیئے ہیں۔ اب امریکہ میں ہر پانچ میں سے ایک، مکان خریدنے والا شخص اکیلا ہے۔ ایسے لوگوں کی تعداد میں بھی حیرت انگیز اضافہ ہو رہا ہے جو شادی کے تردد کے بغیر ایک ساتھ رہ رہے ہیں۔ امریکی حکام کے اعداد و شمار کے مطابق پچھلی دہائی میں ایسے لوگوں کی تعداد دگنی سے بھی زیادہ ہوگئی ہے۔ اس طرز زندگی کی عمومی قبولیت کے پیش نظر امریکہ کے شہری افزائش تعمیرات کے محکمے نے بھی اپنے قوانین میں ایسی تبدیلیاں کی ہیں جن سے یہ تنہا لوگ سرکاری گھروں میں قانونی مسائل کے حقدار بن سکیں گے۔ کنکٹ سے لے کر کیلی فورنیا تک عدالتیں ایسے لوگوں کی ''طلاق'' سے پیدا ہونے والے قانونی مسائل سے نپٹ رہی ہیں۔ اخبار نویس اپنے کالموں میں یہ سوال اٹھا رہے ہیں کہ ایسے ازدواجی جوڑے ایک دوسرے کو کس نام سے پکاریں اور شادی کے مشیروں کے ساتھ ساتھ اب جوڑوں کے مشیر بھی میدان میں آ گئے ہیں۔

بے اولاد تمدن

خاندانی شکل میں ایک اور اہم تبدیلی یہ دیکھنے میں آئی ہے کہ اولاد نہ پیدا کرنے والے جوڑوں کی تعداد میں قدرے اضافہ ہوا ہے۔ پالیسی تحقیق کے مرکز کے محقق جیمز رامے کے مطابق ہم اولاد پرست گھرانوں کو صرف بالغوں کے گھرانوں میں تبدیل ہوتا دیکھ رہے ہیں۔ اس صدی کی ابتداء میں معاشرے میں شاید ہی لوگ تنہا زندگی گزارتے تھے۔ ایسے والدین کی تعداد بھی بہت کم تھی جو اپنے سب سے چھوٹے بچے کے گھر چھوڑنے کے بعد زیادہ دیر تک زندہ رہتے۔ یعنی گھریلو زندگی زیادہ تر اولاد کے گرد ہی گھومتی تھی۔ اس کے برعکس 1970ء تین میں سے صرف ایک بالغ ایسے گھر میں رہتا ہے جہاں 18 سال سے کم عمر کے بچے بھی رہتے ہوں۔

آج ہم ایسے ادارے بنتے دیکھ رہے ہیں جو بے اولادی کا پرچار کرتے ہیں۔ اولاد سے یہ بیزاری کئی دوسرے صنعتی ممالک میں بھی دیکھنے میں آتی ہے 1960ء میں تیس

سال سے کم عمر صرف 2% شادی شدہ خواتین تھیں۔ 1975ء تک یہ تعداد بڑھ کر 35% تک پہنچ گئی۔ یعنی صرف پندرہ سال میں ساٹھ فیصد اضافہ قومی اتحاد برائے اختیاری نے زور شور سے بے اولادوں کے حقوق کے دفاع کا بیڑا اٹھا رکھا ہے۔ برطانیہ سے ایسی ہی ایک قومی تنظیم ابھری ہے۔ یورپ بھر میں گئی ازدواجی جوڑے اولاد پیدا کرنے سے اجتناب کرتے ہیں۔ مغربی جرمنی کے دارالخلافہ بون کا ایک جوڑا جوتھیو (ایک میونسپل افسر) اور اگنس رحل (آفس سیکرٹری) دونوں مصر ہے کہ اولاد نہیں پیدا کرے گے۔ تھیو اور اگنس زیادہ متمول نہیں، دونوں ایک گھر کے مالک ہیں۔ کبھی کبھی دونوں کیلی فورنیا یا فرانس چھٹیاں منانے چلے جاتے ہیں اولاد کے آنے سے ان کے طرز زندگی پر گہرا اثر پڑے گا۔ ہم اکیلی زندگی سے خوش ہیں اور یہ کہ ''ہم اپنے آپ کو آزاد ہی رکھنا چاہتے ہیں'' وہ دونوں یک آواز کہتے ہیں کہ اولاد سے تنفر صرف سرمایہ داری نظام کے تعفن کا ہی مظہر نہیں بلکہ سوویت یونین میں بھی کئی روسی جوڑے تھیو اور اگنس کی طرح بے اولاد رہنے کا تہیہ کیے ہوئے ہیں۔ اس رویئے سے سوویت حکام خاصے پریشان ہیں کیونکہ غیر روسی اقلیتوں میں شرح آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ اولاد والوں کا جائزہ لیتے ہوئے، ہمیں حیران کن حقیقت کا سامنا ہے کہ اولاد والے مطلقہ مرد اور عورتوں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ حال میں جوہری گھرانوں میں اتنی طلاقیں اور علیحدگی ہوئی ہے، کہ امریکہ میں ہر سات میں سے ایک بچہ والد یا والدہ کے ہاں پل رہا ہے۔ شہری علاقوں میں یہ شرح بڑھ کر چار میں سے ایک بچہ ہے۔ ایسے گھرانوں کی تعداد میں اضافہ اس بات کی شہادت ہے کہ بے پناہ مسائل کے باوجود چند حالات میں بچوں کا مطلقہ والد یا والدہ کے ساتھ رہنا نفرت کے مارے جوہری گھرانے میں رہنے سے بہتر ہے۔ اکیلے والدین کی حوصلہ افزائی کے لئے مخصوص اخبار اور انجمنیں بھی وجود میں آ گئیں ہیں۔

یہ کچھ صرف امریکہ ہی میں نہیں ہو رہا۔ برطانیہ میں بھی دس میں سے ایک گھر ایسا ہے جس میں بچہ اکیلا والدین کے ساتھ رہ رہا ہے۔ ان میں سے ہر چھ میں سے ایک کا سربراہ مرد ہے۔ نیو سوسائٹی کے مطابق اکیلے والدین کا ایک ایسا گروہ ہے جس کا شمار تیزی سے غیریبوں کے زمرے میں ہو رہا ہے۔ لندن میں والدین کی نیشنل کونسل کے نام سے

ایک ایسی تنظیم بنی ہے جو ان کے حقوق کے دفاع کے سرگرم ہے۔ جرمنی کے شہر کولون میں ایک عمارتی انجمن نے ایسے خاندانوں کے لئے فلیٹ بنائے ہیں۔ جہاں پہلے والدین اپنی اولاد کو با حفاظت چھوڑ کر اپنے روز گار پر جا سکتے ہیں اسی طرح سکنڈ۔ نادی ملکوں میں بھی ایسے گھرانوں کی امداد کے لئے کام ہو رہا ہے۔ مثلاً سویڈن میں بچوں کی نرسریوں میں داخلے کا پہلا حق اکیلے والدین کو دیا جاتا ہے۔ ناروے اور سویڈن میں یہ بھی ممکن ہے کہ اکیلے والدین کا معیار زندگی جوہری والدین سے بھی زیادہ بلند ہو۔ دریں اثناء خاندانی زندگی کی ایک عجیب شکل بھی دیکھنے میں آئی ہے کہ جہاں لوگ طلاق کے بعد پھر ایک شادی کر بیٹھتے ہیں۔ میں نے اپنی کتاب ''فیوچر شاک'' میں ایسے خاندان کو مجموعہ خاندان کہا ہے کہ جہاں اولاد والے دو مطلقہ جوڑے دوبارہ شادی کر لیتے ہیں۔ اور دونوں شادیوں کے نتیجے میں پیدا ہونے والی اپنی اولاد کو ایک ہی چھت تلے لے آتے ہیں۔ یہ توسیع شدہ خاندان بھی ایک شکل لگتی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق امریکی بچوں میں 25% بچے ایسی توسیع شدہ فیملی میں رہتے ہیں یا داخل ہونے والے ہیں۔

ڈیویڈرئن مائی کاس کے مطابق آنے والے وقت میں خاندان کی یہ شکل زیادہ نمایاں ہوسکتی ہے۔ یہ اقتصادی کثرت ازدواج ہے، جس میں والدین بچوں پر اٹھنے والے دوسرے اخراجات کے لئے رقم ایک دوسرے کو ادھر اُدھر بھجواتے ہیں۔ خاندان کی اس شکل کی مقبولیت کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ والدین کا اپنی غیر خونی اولاد کے ساتھ جنسی تعلقات میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔

مکینکی طور پر ترقی یافتہ ممالک میں بیک وقت خاندان کی متعدد شکلیں پائیں جاتیں ہیں۔ ہم جنسی شادیاں، اجتماعی ازدواج میں رہنے والے جوڑے کی بستیاں، بزرگوں کے اخراجات میں کمی کر کے اور کبھی کبھی جنسی تعلقات کے لئے اکٹھے رہنا، اقلیتوں میں قبائلی گروہ بندیاں اور دوسری اقسام کی اتنی بڑی تعداد ان ممالک میں پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ راضی ناموں پر مبنی شادی، سلسلہ وار ازدواج، خاندانی گروہ اور اسی قبیل کے کئی دوسرے انتظامات، ایسا بھی ہوتا ہے کہ روزگار کی وجہ سے ماں اور باپ مختلف شہروں میں رہتے ہیں۔

ان سب شکلوں کے باوجود ایسے کئی خاندانی نظام بھی ہیں جو ابھی پوری طرح

سے ظاہر نہیں ہوئے۔ کیلام، اینی سمگر اور ٹرز تین ماہر نفسیات نے شکاگو شہر میں غریب کالوں کے ایک محلے میں سروے کر کے بتایا کہ وہاں بالغ لوگ 86 مختلف طریقوں سے رہ رہے ہیں مثلاً ''نانی'' والدہ ''خالہ'' والدہ ''سوتیلا باپ'' والدہ ''غیر شخص'' والے خاندان۔ رشتوں کی اس لاتعداد تنظیم نو نے چند قدامت پسند دانشوروں کو بھی مجبور کر دیا ہے۔ کہ وہ اس بات کا اعتراف کریں کہ ہم جوہری گھرانے کے عہد سے گزر کر ایسے معاشرے میں داخل ہو رہے ہیں جہاں خاندان کی متنوع شکلیں ہیں۔ ماہر عمرانیات جیسی برنارڈ کا خیال ہے کہ ''مستقبل کی شادیوں کی اہم صفت یہ ہو گی کہ فریقوں کو ایک دوسرے سے اپنی توقعات اور خواہشات کے مطابق زندگی گزارنے کے مواقع ملیں گے۔''

تیسری لہر کی تہذیب کا اپنا کوئی مخصوص فیملی نظام نہیں ہو گا۔ اس کے برعکس مستقبل میں مختلف خاندانی نظام نظر آئیں گے۔ ایک ہی طرز کے خاندانوں میں زندگی گزارنے کی بجائے ہمیں خاندانی ڈھانچے کی بہت سی مختلف اور متنوع شکلیں ملیں گی، جن کو ہر شخص اپنی اپنی ضروریات اور خواہشات کے مطابق ڈھال سکے گا۔ جیسا کہ ہم نے پہلے کہا تھا کہ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ جوہری خاندان کا مکمل خاتمہ ہو جائے گا۔ بلکہ آئندہ یہ جوہری گھرانہ نمونہ ہونے کی بجائے ازدواجی زندگی کی مقبول شکلوں میں سے ایک شکل ہو گی۔ تیسری لہر کی وسعت کے ساتھ گھریلو نظام میں بھی پیداواری نظام اور ابلاغیات کی طرح پرچونیت رائج ہو جائے گی۔

بھڑکیلے رشتے

گھریلو زندگی کی اس متنوع شکلوں میں سے تیسری لہر کی نمائندہ شکل کون سے ہو گی، اس طرف اشارہ کرنا ابھی ممکن نہیں۔

کیا ہماری اولاد کئی کئی سال تنہائی کی زندگی گزارے گی؟ کیا وہ بے اولاد رہ جائیں گے؟ کیا ہم بوڑھوں کی بستیوں میں دھکیل دیئے جائیں گے؟ خاندان کی عجیب و غریب شکلیں بھی تو ہو سکتی ہیں؟ کئی خاوند اور ایک بیوی والا خاندان۔ جنیاتی انجینئرنگ کی مدد سے ہم اگر اپنی اولاد کی جنس کا انتخاب خود کر سکیں اور زیادہ لوگ لڑکے پیدا کرنا پسند کریں تو یہ بھی ممکن ہے۔ ہم جنس پرست جوڑے بھی تو بچے پال سکتے ہیں۔ ہماری عدالتیں

آج کل اسی مسئلے کا جائزہ لے رہی ہیں۔

جنیاتی ٹیکنالوجی کی وجہ سے اگر انسانی پیدائش کے مماثل ممکن ہوسکی تو اس کا کیا اثر ہوگا؟ اگر ہم اپنے اپنے تجربہ کی بنیاد پر ایک خاندان کا تصور کریں تو اس کے کیا مراحل ہوگے۔ تجرباتی شادی، اس کے بعد برسرروزگار عورت سے بیاہ کئے بغیر اولاد پیدا کرنا۔ پھر ہم جنسی شادیاں جن میں پالنے کے لئے بچے متبنی بنائے جائیں۔ ایسے سینکڑوں امکانات ہو سکتے ہیں۔ ان امکانات کو تنقید کے دباؤ میں آکر رد نہیں کیا جاسکتا۔ جیسی برنارڈ کے مطابق شادی بیاہ کے متعلق کوئی ایسی سوچ نہیں ہے جو کہ سوچی نہ جاسکی ہو اور جس پر عمل نہ ہوا ہو۔ جو لوگ اس پر عمل پذیر ہوئے، ان کو سب کچھ طبعی نظر آتا تھا۔

محض خاندانی اقتدار سے وابستگی یا ان سے دوری کی بناء پر خاندانی نظام اختیار نہیں کیا جاسکتا۔ اس نظام کا اختیار کرنا بھی ایسا ہی فیصلہ ہے جو ہم ٹیکنالوجی اور عمل کے بارے میں کرتے ہیں۔ خاندانی ڈھانچے کی شکل پر بہت سے عوامل اثر انداز ہوتے ہیں۔ مثلاً ابلاغیاتی صداقتیں، اندازوں میں تبدیلیاں، مذہبی تحریکیں، ماحولیاتی تغیرات، لیکن خاندان کی شکل اور روزگار کے مواقع کا گہرا ساتھ ہے۔ جیسا کہ کارخانے کے نظام نے جوہری گھرانے کو جنم دیا، عمل کا کارخانہ اور دفتر سے دور منتقل ہونا بھی گھریلو نظام کو متاثر کرے گا۔

کتاب کے ایک باب میں محبت اور خاندانی نظام میں آنے والی تبدیلیوں کا مکمل احاطہ ممکن نہیں۔ لیکن ایک ایسی بنیادی اور انقلابی تبدیلی، جس کا ہمیں زیادہ ادراک نہیں اور جس پر ہمیں زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے، وہ ہے کام کا دفتر اور فیکٹری سے منتقل ہو کر گھروں میں واپس لوٹنا، فرض کریں آج سے 25 سال بعد محنت کرنے والوں کی تعداد کا 15% کل وقتی یا جز وقتی بنیادوں پر گھروں میں کام کرے گا۔ گھر پر کاروبار کرنے سے ہماری شخصی زندگی اور محبت کے جذبے پر کیا اثر بڑے گا؟ ہم الیکٹرانک کاٹیج میں کس قسم کی زندگی گزاریں گے؟

چاہئے آپ گھر بیٹھ کر کمپیوٹر کے لئے پروگرام لکھیں، یا کتابچہ لکھیں، یا عمارت کا نقشہ بنائیں یا دور واقع کارخانے میں صناعت کے عمل پر کمپیوٹر کے ذریعے نگاہ رکھیں، ایک

تبدیلی بہرحال دیکھنے میں آئے گی۔ کئی شادی شدہ جوڑے جو اب دن میں کچھ ہی گھنٹے گزار پاتے ہیں۔ کاروباری مصروفیات کے گھر پر آنے سے، کئی کئی گھنٹے ایک ساتھ گزار سکیں گے۔ چند لوگوں کے لئے روزانہ اتنی طویل رفاقت تکلیف دہ بھی ہوسکتی ہے۔ ایسی باہمی رفاقت سے نہ صرف بہت سی شادیاں بچ جائیں گی بلکہ فریقین کے اکٹھے عمل کرنے سے ان کی ازدواجی زندگی بہتر ہوگی۔ آیئے ایک الیکٹرانک کاٹیج کا معائنہ کریں اور دیکھیں کہ لوگ معاشرے میں ایسی بنیادی تبدیلیوں سے کس طرح نبرآزما ہورہے ہیں۔ ظاہر ہے ایسے دور میں ہمیں مختلف اقسام کے طریقہ زندگی وعمل نظر آئیں گے۔

ایسے گھروں کی اکثریت میں ہمیں ایسے جوڑیں ملیں گے جو روایتی طور پر رہ رہے ہیں۔ جہاں خاوند کمپیوٹر پروگرام لکھ رہا ہے اور بیوی بچوں کو پال رہی ہے۔ گھر پر کاروباری عمل کی موجودگی سے میاں بیوی دونوں ایک ہی کام کو جز وقتی طور پر کر رہے ہوگے۔ مثلاً دور واقع کارخانے کے صنعتی عمل پر نگاہ رکھنے کے لئے، میاں بیوی چار گھنٹے گھنٹے کے لئے باری باری کمپیوٹر پر ڈیوٹی دیں سکیں گے۔ اسی گلی میں ذرا آگے چل کر ہم یہ دیکھیں گے کہ میاں بیوی دونوں کے پاس مختلف کام کرنے کو ہے۔ ایک فریق ماہرِ حیاتیات ہے تو دوسرا حساب کتاب رکھنے کا ماہر۔ ایسے ماحول میں بھی جہاں فریقین مختلف شعبوں سے منسلک ہیں، میاں بیوی کا ایک دوسرے کے کام کے بارے میں تھوڑی بہت واقفیت رکھنا اور ہاتھ بٹانا ممکن ہوگا۔ ایسے میں دونوں کے لئے ایک دوسرے سے بالکل الگ تھلگ رہنا ممکن نہیں اور نہ ہی ایک فرد دوسرے کو اپنے کام سے دور رکھ سکے گا۔ اپنے سروے کے دوران آگے بڑھتے ہوئے ہم اگلے مکان میں دیکھتے ہیں کہ میاں بیوی مختلف کاروبار کر رہے ہیں۔ لیکن ان میں دونوں کا برابر کا اشتراک ہے۔ مثلاً خاوند جز وقتی انشورنس ایجنٹ ہے اور عمارتی معمار کا معاون بھی۔ بیوی بھی یہی دونوں کام کرتی ہے لیکن مختلف اوقات میں۔

ایسے نظام میں فریقین کے لئے کام میں تنوع بھی ہے اور دلچسپی بھی۔ ہر ایسے گھر میں جہاں کام میں میاں بیوی کی شراکت ہوتی ہے، ہرفریق دوسرے سے سیکھتا ہے اور کاروباری مسائل حل کرنے میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاتا ہے، جس سے ان کے رشتے میں مضبوطی پیدا ہوتی ہے۔ سب جانتے ہیں کہ زبردستی کی رفاقت سے ازدواجی خوشی حاصل نہیں

ہوسکتی۔ پہلی لہر کے مشترکہ خاندان، جو کہ اقتصادی پیداوار کی اکائیاں تھے، انسانی رشتوں میں حساسیت کا نمونہ تو نہ تھے۔ ایسے خاندانوں کے لئے مخصوص مسائل اور مشکلیں تھیں۔ لیکن ان میں غیر اصولی اور غیر جذباتی رشتے کم ہی ہوتے تھے۔ اکٹھے کام کرنے سے اور کچھ نہیں تو رشتہ میں حدت، قربت، اور یگانگت پیدا ہوتی ہے، آج لوگ جس کی تلاش اور جستجو میں ہیں۔ غرضیکہ گھر پر کاروبار کے وسیع واقع سے نہ صرف خاندانی ڈھانچے میں تبدیلی آئے گی بلکہ خاندان میں شخصی رشتوں پر بھی اس کا اثر ہوگا۔ مشترکہ عمل کی وجہ سے میاں بیوی کے ایک دوسرے کا ساتھ بننے کا موقع بھی فراہم ہوگا۔ یوں محبت کی ایک نئی تعریف بھی نکل سکے گی اور شاندار محبت کا تصور بھی عام ہو سکے گا۔

مثبت عشق

ہم دیکھ چکے ہیں کہ دوسری لہر کی ترقی کے ساتھ خاندانی یونٹ نے کئی ذمہ داریاں دوسرے اداروں کو منتقل کر دیں، تعلیم سکول کو، بیماری کا علاج ہسپتال کو، وغیرہ۔ ذمہ داریوں کی اس منتقلی سے رومانوی محبت کی داغ بیل پڑی۔ پہلی لہر کا ایک شخص شادی کی بابت کیا سوچتا ہوگا کیا وہ میاں (یا بیوی) کے کام میں ماہر ہوگا (گی)۔ علاج معالجے سے واقفیت ہوگی۔ بچوں کو تعلیم دینے کی قابلیت بھی ہوگی یا نہیں۔ کیا ہم دونوں ایک ساتھ مل کر کام کرسکیں گے؟ کیا دوسرا فریق کام کا بوجھ اٹھائے گا یا وہ کام چور ہے۔ کسان تو یہ ضرور پوچھتے تھے کہ کیا ہونے والی بہو مضبوط جسم والی ہے یا لاغر ہے اور کیا بیمار رہتی ہے؟

گھریلو ذمہ داریوں میں بتدریج تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ سوالات بھی بدلتے گئے۔ اب خاندان پیداواری یونٹ، سکول ہسپتال، نرسنگ ہوم کا مجموعہ نہیں تھا۔ ان کی بجائے اب اس کا نفسیاتی کردار زیادہ اہم ہے۔ شادی کی اغراض اب ساتھ، جنسی خوشی، اور سہارا وغیرہ پر ہیں۔ اب شادی کے فریق کی تلاش کا معیار بھی گھٹ کر ایک ہی رہ گیا یعنی محبت۔ عوامی تہذیب نے ہمیں بتایا کہ دنیا کی گاڑی محبت کے ایندھن سے چلتی ہے۔

ظاہر ہے روز مرہ زندگی میں رومانوی خواب کی تعبیر کا کوئی امکان نہیں۔ طبقاتی وابستگی اور آمدنی ازدواجی فریق کی پسند میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ لیکن محبت کو اب سب عوامل پر ترجیح دی جاتی ہے۔ الیکٹرانک کاٹیج کے آنے سے یہ منطق شاید ہمیشہ کے لئے

بدل جائے، جنہوں نے دور دراز مقام پر روزگار کمانے کی بجائے گھر پر کاروبار کرنا ہے۔ وہ اپنے پارٹنر میں جنسی راحت اور نفسیاتی آسودگی یا طبقاتی وابستگی کے علاوہ اور بھی بہت کچھ دیکھیں گے۔ ہوسکتا ہے وہ مثبت محبت کا تقاضا کریں۔جنسی اور نفسیاتی راحت اور اس کے ساتھ پارٹنر کی ہنرمندی (جیسے کہ ان کے دادا جسمانی صحت کی شرط لگاتے تھے) محبت کے ساتھ ساتھ احساس ذمہ داری، ضبط نفس اور کاروبار کے لئے لازم دوسری خصوصیات۔ مستقبل میں خاندان شاید اپنی چند کھوئی ہوئی ذمہ داریاں واپس حاصل کر لے۔ اور یوں ایک دفعہ پھر کثیر المقاصد معاشی یونٹ کا مقام حاصل کر لے ایسی تبدیلی سے شادی کے معیار اور محبت کی تعریف بھی تبدیل ہو جائے گی۔

بچوں میں محنت کی تحریک

الیکٹرانک کاٹیج میں پیدا ہونے والے بچوں کی پرورش بھی مختلف ہو گی۔ پہلے تو یہ کہ وہ بچپن ہی سے گھر میں کاروبار ہوتا دیکھیں گے۔ پہلی لہر کی تہذیب میں بچے شروع دن ہی سے اپنے والدین کو مشغول عمل دیکھتے تھے۔ دوسری لہر کی حالیہ نسلوں کے بچے سکولوں میں رہنے کی وجہ سے عمل کا براہ راست مشاہدہ نہیں رکھتے۔ زیادہ تر اولاد کو شاید علم ہی نہ ہو کہ ان کے والدین کا روزی کمانے کا ذریعہ کیا ہے اور یہ کہ ان کی عملی زندگی کیسے گزرتی ہے۔ اس ضمن میں ایک چھوٹی سی کہانی دیکھتے ہیں۔ ایک کمپنی کا مینجر اپنا دفتر دکھانے کے لئے اپنے بیٹے کو دفتر لے آتا ہے۔لڑکا دفتر میں بچھے عمدہ قالین، مدہم روشنی اور اعلیٰ فرنیچر دیکھتا ہے۔ والد اس کو کمپنی کے خرچ پر کھانا کھلانے ایک عمدہ ریستوران میں لے جاتا ہے۔ جہاں ان کی خوب اچھی طرح خدمت کی جاتی ہے۔لڑکا دل ہی دل میں اس کا موازنہ اپنے گھر میں رہن سہن کے طریقے سے کرتا ہے اور ضبط کا دامن چھوڑ کر والد سے سوال کرتا ہے۔ ابا! یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ کے تو اتنے ٹھاٹھ باٹھ ہیں اور ہم گھر پر اتنے غریب ہیں؟

حقیقت یہ ہے کہ آج کے بچے (خاص طور پر دولت مند گھرانوں کے) اپنے والدین کی زندگی کے اہم ترین حصوں سے بالکل بے خبر ہیں۔ الیکٹرانک کاٹیج میں بچے کاروباری عمل کو نہ صرف دیکھیں گے بلکہ کچھ عمر ہونے پر خود بھی اس میں شامل ہوسکیں گے۔ بچوں کے کام کرنے پر دوسری لہر نے جو پابندیاں عائد کی تھیں، گو وہ نیک نیتی پر مبنی اور

ضروری تھیں۔ لیکن اب ان پابندیوں کا مقصد صرف نوجوانوں کو محنت کی منڈی سے دور رکھنا رہ گیا ہے۔ ان پابندیوں کو گھروں کے اندر نافذ کرنا یوں بھی مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ محنت کی کچھ شکلیں خاص طور پر بچوں کے لئے وضع کی جا سکتی ہیں اور ان کو تعلیمی نصاب میں بھی شامل کیا جا سکے گا۔ اگر کسی نوجوان کے پیچیدہ ترین کاروباری عمل پر دسترس کی قدرت پر شک ہے۔ تو وہ کیلی فورنیا میں کمپیوٹر کی دوکان پر چودہ پندرہ سال کے بچوں کو کمپیوٹر بیچتے دیکھیں جو غالباً غیر قانونی طور پر ملازمت کر رہے ہیں۔ (خود میرے ساتھ یہ ہوا کہ کچے دانتوں والے بچوں نے مجھے کمپیوٹر کی پیچیدگیاں سمجھائیں ہیں) معاشرے میں آج کے نوجوانوں کی مغائرت کی ایک بڑی وجہ ان کا طویل غیر پیداواری کردار ہے۔ جوان پر سن بلوغیت تک پہنچتے پہنچتے ٹھونسا جاتا ہے۔ الیکٹرانک کاٹیج اس عرصے کی طوالت کو کم کر دے گی۔

نوجوانوں میں بے روزگاری ختم کرنے واحد حل شاید انہیں الیکٹرانک کاٹیج میں شامل کرنے میں ہے۔ دوسری لہر کے معاشروں میں یہ مسئلہ سنگین تر ہو رہا ہے۔ جہاں بچوں کے جرائم اور کم سن مجرموں میں تخریب کاری کے مسائل پر قابو پانا مشکل ہو رہا ہے۔ عام طور پر ایسے حالات پر قابو پانے کے لئے غیر جمہوری ہتھکنڈے استعمال کیئے جاتے ہیں۔ مثلاً لازمی فوجی بھرتی یا ٹریننگ۔ الیکٹرانک کاٹیج ایک ایسا متابدل ذریعہ ہے، جس سے نوجوانوں کو واپس معاشی اور اقتصادی طور پر پیداواری کردار ادا کرنے کے مواقع مل سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ جلد ہی ہمیں بچوں کے محنت کے حق میں سیاسی تحریک کا سامنا کرنا پڑے۔ ایسی تحریک نوجوانوں کے اقتصادی استحصال کے خلاف بھی آواز ہو گی۔

برقیاتی خاندان

کاروباری کام کرنے والے گھرانے کو ہم وسیع برقیاتی خاندان بھی کہہ سکتے ہیں جہاں رہن سہن کے طریقے قدرے مختلف ہوں گے۔

پہلی لہر کی تہذیب میں اکثریت مشترکہ خاندان کی شکل میں بستی تھی۔ یہاں کی کئی کئی نسلیں ایک ہی چھت تلے زندگی گزارتیں۔ کچھ ایسے بھی خاندان تھے، جہاں قریبی رشتے داروں کے علاوہ ایک دو غیر بسائے جاتے تھے، جو یتیم ہو چکے تھے یا پھر کھیت میں ہاتھ

بٹانے والے ایک دو کمی بھی گھر میں ٹھہرائے جاتے تھے۔ اس طرح مستقبل کے کاروباری گھرانے میں ایک آدھ غیر بھی رکھا جا سکے گا۔ مثلاً خاوند یا بیوی کی کمپنی کا کوئی ملازم جوان کے کاروباری عمل میں ہاتھ بٹائے گا یا پھر مال سپلائی کرنے والا یا گاہک بھی کچھ دیر گھر میں رکھا جا سکے گا۔۔۔۔بچہ یا بچی بھی کاروبار سیکھنے کے لئے جز وقتی طور پر خاندان کے فرد کے طور پر گھر میں رہ سکے گا۔ ایسے گھرانے کو چھوٹی کاروباری کمپنی کا درجہ دینے کے لئے قانون بھی وضع ہوسکیں گے۔ ہمارا یہ گھرانا برقیاتی طور پر متوسط خاندان بن جائے گا۔

یہ سچ ہے کہ 1960ء اور 1970ء کی دہائیوں میں قائم کردہ کمیون زیادہ تر ناکام ہو گئے، جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ تکنیکی طور پر ترقی یافتہ معاشروں میں ایسے کمیون چلانا مشکل ہے۔ قریبی مشاہدے سے پتہ چلتا ہے کہ زیادہ تر ایسے کمیون ناکام ہوئے جن کی بنیاد نفسیاتی ضروریات کو پورا کرنا تھا کہ (انسانی لین دین میں وضع داری سکھانا اور دوسروں کا علاج کرنا، آپس میں دوستی پروان چڑھانا وغیرہ)، نہ کہ معاشی حالات سنوارنا۔ ان کمیونوں کو تصوراتی تجربہ قرار دیا گیا۔ جو بھی کمیون کامیاب ہوئے ان کا ایک واضح نصب العین تھا۔ ایک اقتصادی بنیاد تھی۔ آج بھی 6% سے زیادہ امریکی اسی انداز میں زندگی گزار رہے ہیں۔ اگلی نسل میں اس تعداد میں دو یا تین گنا اضافہ ہوسکتا ہے اس سے صرف ریاست ہائے امریکہ میں لاکھوں لوگ متاثر ہوں گے۔ ہماری اجتماعی زندگی، عشق ومحبت اور۔ کے لئے، دوستی کے نئے انداز پروان چڑھانے کے لئے معیشت اور صارفانہ حقوق کے تحفظ کے لئے ہی نہیں بلکہ ہماری نفسیات اور شخصیت میں نکھار کے لئے، برقیاتی توسیع شدہ خاندان خاصے دور رس اثرات لے کر آئے گا۔

واضح رہے کہ وسیع برقیاتی خاندان کو گھرانے کی دوسری اشکال سے ممتاز یا بہتر بتانا مقصود نہیں ہے۔ آئندہ آنے والے دور کے پیچیدہ عمرانی ماحول میں گھرانے کی ممکنہ اشکال میں سے ایک شکل یہ بھی ہے۔

والدین کی غلط کاریاں

خاندانی تنظیم کی یہ نئی شکلیں خاصی تکلیف دہ ہونگی۔ کیونکہ خاندانی ڈھانچے میں ہونیوالی کوئی بھی تبدیلی ہمارے طرز زندگی اور کرداروں پر بھی اثر انداز ہوگی۔ ہر سماج اپنے

اداروں کے ذریعہ معاش کی کردار بندی کرتا ہے۔ کارپوریشن اور ٹریڈ یونین مل کر کارکنوں اور منیجروں کی باہمی توقعات کو واضح کرتی ہیں۔ اسکول استاد اور طلباء کے کردار کا تعین کرتے ہیں۔ دوسری لہر کے خاندان نے روزی کمانے والے، گھریلو کام کاج کرنے والی اور بچے کے کردار کا نقشہ پیش کیا ہے۔ جوہری خاندان کے خاتمہ سے اس سے متعلقہ کردار ٹوٹ پھوٹ رہے ہیں۔ جس کا شخصی زندگی پر تکلیف دہ اثر پڑ رہا ہے۔ جس دن سے بیٹی فریڈن کی ہنگامہ خیز کتاب ''دی فیمن ماسک'' شائع ہوئی ہے، اس نے کئی ممالک میں خواتین کے حقوق کی جدید تحریکوں کو جنم دیا ہے۔ بعداز جوہری خاندان کی ضروریات کے مطابق، مرد اور عورت کے کردار کا ازسرنو تعین کرنے کے لئے تکلیف دہ جدوجہد دیکھنے میں آئی ہے فعالیت، قانونی اور ماحولیاتی حقوق، گھریلو ذمہ داریوں اور جنسی کے بارے میں مرد اور عورت کی توقعات اور رویئے میں تبدیلیاں واضح ہوئی ہیں۔ راک موسیقی کے مجلّے ''کراڈیڈی'' کے مدیر پیٹر نوبلر کے مطابق مرد کا پالا اب ایسی عورتوں سے پڑ گیا ہے جو سب قوانین کو توڑنے کے درپے ہیں۔ بے شک یہ قوانین توڑے جانے کے قابل ہیں، لیکن مرد بے چارے کے لئے بہرحال یہ مشکل مرحلہ ہے۔

جنسی کرداروں کو متزلزل کرنے والی ایک بحث اسقاط حمل کے موضوع پر ہے۔ خواتین مصر ہیں کہ سیاست دانوں، پادریوں، ڈاکٹروں اور خاوندوں کی بجائے خواتین خود اپنے جسم کے بارے میں فیصلہ کا حق رکھتی ہیں۔ اس طرح لواطت پسندوں کی مانگ ہے کہ ان کے حقوق کا تحفظ بھی ہونا چاہئے (وہ اس میں کسی قدر کامیاب بھی ہو چکے ہیں)۔ معاشرے میں بچے کی کردار کا بھی ازسرنو تعین ہو رہا ہے۔ بچوں کے حقوق کے لئے تحفظ کا مطالبہ کرنے والی انجمنیں جنم لے رہی ہیں۔ جوں جوں جوہری خاندان کی متبادل شکلیں سامنے آ رہی ہیں، عدالتوں میں جنسی کردار کے ازسرنو تعین سے متعلق مقدموں کی بھرمار ہو رہی ہے۔ کیا طلاق کے بعد میاں بیوی کے نام جائیداد کا بٹوارہ ہونا لازمی ہے؟ کیا ایک بے اولاد جوڑا کسی عورت کو قیمتاً اس بات کے لئے تیار کر سکتا ہے کہ وہ مصنوعی نسل کشی کے ذریعے بچہ پیدا کر کے ان کو دے دے؟ (ایک برطانوی عدالت نے اس کی اجازت نہیں دی، لیکن اسے کتنی دیر تک روکا جا سکے گا؟) کیا ایک ہم جنس اچھی ماں بن سکتی ہے اور طلاق

سے بچے کی ملکیت حاصل کرنے کی حقدار ہے؟ (ایک امریکی عدالت نے اس کا فیصلہ ہاں میں دیا ہے)۔ اچھے والدین بننے کے لئے کیا کرنا چاہئے؟

بولڈر، کولر بوراڈو میں 24 سالہ ٹام ہانسن نے عدالت میں ایک تاریخی ساز مقدمہ دائر کیا۔ اس کے وکیل نے عدالت سے درخواست کی۔ گو کہ والدین غلطیاں کر سکتے ہیں مگر انہیں اپنی غلطیوں کے نتائج کے لئے قانونی اور مالی طور پر ذمہ داری قبول کرنا چاہئے۔ نسن نے عدالت سے والدین کے ظلم کے خلاف قانونی طور پر ساڑھے تین لاکھ ڈالر بطور ہرجانہ کا مطالبہ کیا۔

مستقبل میں داخلے کی آسانی

اس ساری اکھاڑ پچھاڑ اور افراتفری کے عمل میں تیسری لہر کا گھریلو نظام وضع ہو رہا ہے، جس کی بنیاد خاندان کی ہیئت میں تنوع اور شخصی کرداروں میں تبدیلی سے اٹھی ہے۔ خاندانی نظام میں تنوع کے ظاہر ہونے سے اشخاص کے کئی نئے متبادل سامنے آئے ہیں۔ تیسری لہر کی تہذیب کسی کو زبردستی ایک ہی خاندان کے نظام میں رہنے پر مجبور نہیں کرتی۔ اسی وجہ سے ابھرنے والا خاندانی نظام، ہم سب کی اپنی اپنی ضروریات اور ترجیحات کے مطابق خاندان کی شکل اختیار کرنے کے حق کو تسلیم کرتا ہے۔

لیکن فتح کے ڈھول پیٹنے سے پہلے ہمیں اس عبوری دور کی تکالیف سے نبرد آزما ہونا ہے، نظام کہن اور نظام جدید پیدائش کے تصادم کے بیچ پھنسے لاکھوں مجروح انسان کثیر امکانات کے باوجود تنہا زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔

امکانات کے اس تنوع پر قابو پا کر، اس سے فائدہ اٹھانے کے لئے ہمیں متعدد سطح پر، اخلاقیات سے لے کر نظام ٹیکس اور روزگاری پالیسیوں تک میں تبدیلیاں لانا ہوں گی۔

اقتدار کے میدان میں اولاً ہمیں خاندان کے ٹوٹنے سے منسلک احساس ندامت کو ختم کرنا ہو گا۔ اس تقصیر کو اچھالنے کی بجائے ہمارے میڈیا، گرجوں، عدالتوں اور سیاسی نظام کو اس میں کمی کرنے کی سعی کرنا ہو گی۔ جو ہری خاندان سے ہٹ کر اس سے باہر رہنے کے فیصلے کو آسان بنانا ہو گا۔ یہ بات مسلم ہے کہ معاشی حقیقت تیزی سے بدل جاتی ہے،

جب کہ اقدار میں تبدیلی آہستہ آہستہ ہوتی ہے۔ بس ہم نے ایک پرچونی معاشرے کی ضرورت کے مطابق تنوعات کی برداشت والی قدر کو اجاگر کرنا ہے(دوسری تہذیب میں پروان چڑھے لاکھوں لوگ ابھی بھی ایک ہی قسم کے خاندان کو معیاری گردانتے ہیں۔ اور اس میں کسی قسم کے تنوع کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں۔ جب تک یہ نہیں بدلے گا۔ عبوری دور کے رنج والم میں کمی توقع ممکن نہیں۔

قوانین، ٹیکس اور سوشل سیکیورٹی کا نظام، سکول، گھر بنانے اور ڈیزائن کرنے کی پالیسی میں دوسری لہر کے تعصّبات ختم کئے بغیر، افراد کے لئے معاشی زندگی میں گھرانے کی متنوع اشکال کے امکانات سے فائدہ اٹھانا ناممکن ہے یہ سارا سسٹم برسر روزگار خواتین، گھریلو کام کرنے والے خاوند، کنوارے مرد اور عورتوں اور تنہائی میں رہنے والی مطلقہ خواتین کی مخصوص ضروریات کو نظر انداز کرتا ہے۔ دوسر لہر کے معاشروں میں ان سب لوگوں کے خلاف صریحاً پوشیدہ طور پر امتیاز برتا جاتا ہے۔

گو دوسری لہر کی تہذیب نے گھریلو کام کام کو خاص حیثیت دی، لیکن اپنا کام کرنے والوں کی قدر نہ کی۔ گھریلو کام کاج پیداواری نوعت کا ہے لہٰذا معیشت میں اس کی اہمیت کو تسلیم کیا جانا چاہئے۔ ایسا کام کرنے والے مرد یا عورت کو ان کا جائز مرتبہ دلانے کے لئے یا تو ان کو اجرت ادا کرنی چاہئے یا پھر ان کے کام کی اقتصادی قدر کا تعین کرنا چاہئے۔

اکثر مقامات پر روزگار کی پالیسی اس پرانے مفروضہ پر بنائی گئی ہے کہ معاش کا بنیادی ذریعہ خاوند ہے اور بیوی صرف فروعی کام کر کے تھوڑی بہت غیر ضروری کمائی کرسکتی ہے۔ جزوی اور لچکدار اقوات کے مطابق، ملازمتوں کے امکانات پیدا کر کے، ہم کثیر الشکل گھرانوں کے نظام کی ترویج میں آسانی پیدا کر سکتے ہیں۔ اس طرف کچھ پیش رفت کے آثار ہمیں ابھی سے نظر آ رہے ہیں۔ امریکہ کے سٹی بینک نے جب خواتین کو منیجر کے عہدوں پر ترقی دینا شروع کی تو معلوم ہوا کہ مرد منیجروں نے خواتین کو منیجروں کے ساتھ شادی رچانا شروع کر دی۔ سٹی بینک کا ایک پرانا اصول تھا کہ وہ شادی شدہ جوڑوں کو ملازمت نہیں دیتا تھا۔ اب یہ اصول ختم کرنا پڑا۔ لہٰذا اب سٹی بینک میں جوڑوں کی تعداد

بڑھتی جا رہی ہے۔ جن سے بینک اور خاندان دونوں کا فائدہ ہو رہا ہے۔ ممکن ہے کہ جلد ہی ہمیں اس سے بھی زیادہ دور اس تبدیلیاں دیکھنے کو ملیں، نہ صرف میاں بیوی بلکہ سارے خاندان کو ایک پیداواری ٹیم کے طور پر ملازم رکھنے کی طلب بھی پیدا ہو سکتی ہے۔ ہم اس امکان کو اس لئے رد نہیں کر سکتے کہ یہ دوسری لہر کے کارخانوں کے لئے غیر موزوں تھا۔ ایسی پیداواری ٹیم کی کارکردگی کے بارے میں حتمی فیصلہ فی الحال ممکن نہیں، لیکن اس کے بارے میں تحقیق و تجربہ کی حوصلہ افزائی کرنا چاہیئے بلکہ اس کے بارے میں حکومتی اعانت کے امکان پر غور کرنا چاہیئے۔

ان اقدامات سے مستقبل کی جانب ہمارا سفر کم تکلیف دہ ہو جائے گا اور اس عبوری دور میں لاکھوں لوگوں کی تکالیف میں کمی کرنا ممکن ہو گا۔ یہ بات طے ہے کہ تکلیف ہو یا نہ ہو، دوسری لہر کے گھریلو نظام کی جگہ لینے کے لئے ایک، نیا خاندانی نظام جنم پذیر ہے۔ یہ نظام اسی جدید معاشی جرثومے کا اہم ادارہ ہو گا جو تکنیکی جرثومے اور اطلاعاتی جرثومے کے ساتھ جنم پا رہا ہے۔ یہ نظام اس معاشی عمل کی تخلیق کا حصہ ہے، جس سے ہماری نئی نسل ایک نئی تہذیب تشکیل دے رہی ہے۔

باب 17

کارپوریٹ کے تشخص کا بحران

بڑی کارپوریشن صنعتی عہد کی نمائندہ کاروباری تنظیم تھی۔ آج اس قسم کی بڑی بڑی کارپوریشنیں (نجی اور سرکاری دونوں اقسام) دنیا بھر میں کارفرما ہیں۔ جو اشیاء اور خدمات کی پیداوار کا بیشتر حصہ پیدا کر رہی ہیں۔ بادی النظر میں انسان پر اس کی ہیئت طاری ہے۔ بے شمار مسائل پر ان کا غلبہ ہے۔ لاکھوں نوکریاں ان کارپوریشنوں سے وابستہ ہیں۔ اور نہ صرف ہماری اقتصادی بلکہ سرکاری زندگی پر بھی ان کا گہرا اثر موجود ہے۔ ان کے کمپیوٹر اور ہوائی جہاز، ان کی منصوبہ بندی اور تابکاری کی قوت اور بڑے بڑے عظیم الشان منصوبے پایہ تکمیل تک پہنچانے کی صلاحیت، یہ سب ان کارپوریشنوں کی لازوال طاقت کا مظہر ہیں۔ آج جب کہ ہم بیشتر انفرادی طور پر اپنے آپ کو بے بس محسوس کرتے ہیں، یہ کارپوریشنیں تقدیر پر حاوی دکھائی دیتی ہیں۔ لیکن ان کا منظر قدرے مختلف ہے۔ ان کو چلانے والے مرد اور خواتین بے بسی کا شکار ہیں۔ جوہری خاندان، سکول، ابلاغ عامہ اور صنعتی عہد کے دوسرے کلیدی اداروں کی کارپوریشنیں بھی تبدیلی کی تیسری لہر کے سامنے توڑ پھوڑ اور بنیادی تغیرات سے دوچار ہیں۔

کابوکی کرنسی

کارپوریشن کو پیش آنے والی یہی تبدیلی عالمی اقتصادی بحران ہے۔ دوسری لہر کی تہذیب نے تین سو سال کی محنت سے ایک مربوط عالمی منڈی قائم کی۔ جنگ، اقتصادی سرد بازاری اور دوسرے حوادث اس منڈی کے قیام میں رکاوٹیں ڈالتے رہے لیکن ان حادثوں سے دوچار ہو کر عالمی معاشیات نہ صرف ہر بار کھڑی ہوگئی بلکہ پہلے سے بھی زیادہ بڑھ کر ابھری۔

آج معاشیات کو ایک نئے اور بالکل مختلف بحران کا سامنا ہے۔صنعتی دور کے سب حوادث سے ہٹ کر یہ بحران نہ صرف سرمائے پر اثرانداز ہو رہا ہے، بلکہ معاشرے کی توانائی کو بھی بکھیر رہا ہے۔ ماضی کے برعکس، اس بحران سے افراد زر اور بے روزگاری بیک وقت پیدا ہو رہے ہیں۔ ماحولیاتی مسائل سے اس کا براہ راست تعلق ہے۔ٹیکنالوجی کا بالکل جدید اقسام کا قیام اور پیداواری نظام میں مواصلات کی ایک نئی سطح کا دخول بھی اس بحران کا جدید مارکسی فلسفہ کے دعوؤں کے برعکس، صرف سرمایہ داری نظام ہی کو اس بحران کا سامنا نہیں بلکہ اشتراکی نظام بھی اس گرفت میں ہے۔غرضیکہ ساری صنعتی تہذیب کو اس بحران کا سامنا ہے۔

عالمی معیشت میں برپا ہونے والے طوفان سے کارپوریشن کے وجود کو خطرہ لاحق ہے۔ ان کے منیجروں کو غیر مانوس ماحول کا سامنا ہے۔ دوسری جنگ کے خاتمے سے 1975ء کے اوائل تک کارپوریشنیں نسبتاً مستحکم ماحول میں کام کرتی چلی آ رہی ہیں۔ ''ترقی'' ان کا بنیادی نصب العین تھا۔ ڈالر کا راج تھا۔ عالمی منڈیوں میں کرنسی کے بھاؤ عرصہ دراز تک مستحکم رہے تھے۔ عالمی مالی ادارے مثلاً عالمی بینک اور آئی، ایم،ایف جنہیں برٹن وڈز میں سرمایہ دار ممالک نے قائم کیا تھا،سوویت یونین کا قائم کردہ کومیکون کا نظام، دونوں ہی مکمل طور پر فعال تھے۔ایسے میں ماہرین معاشیت اپنے علم سے دولت پیدا کرنے کی پیش گوئیوں میں مصروف تھے اور ایک ایسی معاشی مشین کی بات کرتے تھے جس پر انہیں مکمل عبور حاصل تھا۔کبھی کبھار ہی وہ اس کی درستگی کی بات کرتے تھے۔

آج یہ دعوے کھوکھلے نظر آتے ہیں۔(امریکی صدر مذاقاً امریکی ریاست جارجیا کے اس جوتشی کا ذکر کرتے ہیں جس کی پیش گوئیاں ماہرین معاشیات سے زیادہ سچی ہوتی ہیں)۔ امریکہ کے سابق وزیر خزانہ مائیکل بلیومیتھال کا کہنا ہے اقتصادیات کے ماہرین موجودہ حالات اور بعد از جنگ عظیم کے مالیاتی ڈھانچے کے ملبے کے ڈھیر پر کھڑے ہو کر کارپوریٹ دنیا کے جگادری بڑھتی ہوئی بے یقینی کا شکار ہیں۔کرنسی کے گھٹتے بڑھتے نرخ اور بے ترتیب شرح سود دونوں مل کر مرکزی بینکوں کو جھولا جھلا رہے ہیں۔ ڈالر اور جاپانی ین ایک کابو کی طرح رقص کر رہے ہیں۔ یورپی برادری اپنی موجودہ کرنسی، جس کا عجیب نام ایکو

(Dcu) ہے، لاگو کرنے کے درپے ہے جس کہ عرب شیوخ کروڑوں امریکی ڈالر مارکیٹ میں جھونک رہے ہیں۔ سونے کی نئی قیمتیں نئے ریکارڈ قائم کر رہی ہیں۔

یہ سب کچھ ایسے وقت میں ہو رہا ہے جب ٹیکنالوجی اور ذرائع مواصلات سے عالمی منڈی کی تشکیل نو ہو رہی ہے جس کے نتیجہ میں بین الملکی سطح پر پیداوار ممکن اور لازمی بن رہی ہے۔ کمپیوٹر اور سیارچوں کے گٹھ جوڑ سے برقیاتی بینکاری کا جدید عالمی نظام تشکیل پا رہا ہے جس کی مدد سے ہانگ کانگ، منیلا، سنگاپور، نیویارک، باہاماز جزائر کیمن کے بینکوں کا آپس میں فوری رابطہ ممکن ہو گیا ہے۔ اس وسیع مالیاتی نیٹ ورک میں سٹی بینک، بارکلیز سومی ٹومو، نارونی (سوویت یونین)، کریڈٹ سویس اور نیشنل بینک آف ابوظہبی جیسے بڑے بڑے بینک شامل ہیں، جو مل کر اربوں کی مالیت کی ملکی کرنسی پیدا کر رہے ہیں، جس پر کسی حکومت کا کنٹرول نہیں ہے اور جس کا غبارہ کسی بھی وقت پھٹ سکتا ہے۔

اس لاملکی کرنسی کا بیشتر حصہ یورو ڈالر ہیں۔ وہ ڈالر جو امریکہ سے باہر ہیں۔ 1975ء میں یورو ڈالر کی بڑھتی ہوئی رفتار کے متعلق میں نے لکھا تھا کہ کرنسی کی یہ نئی شکل اقتصادی نظام کے کھیل میں ترپ کے پتے کی حیثیت رکھتی ہے۔ ایک ملک سے دوسرے ملک میں بلاتمیز حدود اپنے سفر میں کہیں یہ یورو ڈالر افراط زر پیدا کرتے تو دوسرے میں توازن کا بحران کھڑا کر دیتے اور تیسرے کی قومی کرنسی کی قیمت گرا دیتے۔ اس وقت اس کرنسی کی تعداد کا تخمینہ 180 ارب یورو ڈالر لگایا جاتا تھا۔

1978ء تک یہ تخمینہ بڑھ کر 400 ارب مالیت کے یورو مارک، یورو فرانک، یورو گلڈر، اور ین تک پہنچ گیا تھا۔ اس کرنسی کا کاروبار کرنے والے بینک، بغیر کسی تحفظ سرمایہ کے، آزادی سے یورو ڈالر کی بڑی بڑی رقوم کے قرضے انتہائی آسان شرائط پر دیتے رہے۔ آج یورو ڈالر کی کل مالیت ایک ارب امریکی ڈالر کے لگ بھگ ہے۔ دوسری لہر کے جس معاشی نظام میں کارپوریشن پروان چڑھتی، اس کی بنیاد قومی مارکیٹ، قومی کرنسی اور قومی حکومت پر تھی۔ اس قسم کا قومی نظام آج کی الیکٹرانک اور لاملکی کرنسی کو کنٹرول کرنے سے قاصر ہے۔ دوسری لہر کے پیدا شدہ ڈھانچے اس کے لئے ناکافی ہیں۔ دراصل آج کا سارے کا سارا عالمی نظام تجارت، جس نے کارپوریشن کو استحکام بخشا، خود تباہی کا شکار ہے۔

MashalBooks.org

عالمی بینک، بین الاقوامی مالیاتی فنڈ اور مالیات اور تجارت کا عمومی میثاق۔۔۔۔سب کے سب تنقید کا نشانہ بنے ہوئے ہیں، یورپی برادری، اپنے براعظم کے لئے ایک نیا نظام تشکیل دینے کی کوششوں میں لگی ہوئی ہے۔ترقی پذیر ممالک اور یورو ڈالر سے مالا مال عرب، مالیاتی منڈیوں میں اپنا اثر ورسوخ بڑھانے کے چکر میں، اپنا مخصوص مالیاتی ادارہ بنانا چاہتے ہیں۔ ڈالر کی حکومت ختم ہو چکی اور عالمی معیشت آخری دموں پر ہے۔ اشیاء اور توانائی کی جز وقتی قلت اور دوسرے وسائل کی فراوانی معاشی ماحول کو مزید پیچیدہ بنا رہی ہے۔ اس طرح صارفین، محنت اور ناظم کے رویوں میں اسراعی تبدیلی، تجارت میں روز افزوں عدم توازن اور غیر صنعتی دنیا کی انتہا پسند سوچ جدید معاشی عوامل بن کر ابھر رہے ہیں۔ یہ ہے وہ پریشان کن ماحول، جس میں کارپوریشنیں اپنی بقا کی جنگ میں مصروف ہیں۔ ان اداروں کے ناظم، اپنی کارپوریٹ طاقت سے کسی بھی حال میں دست برداری ہونے کے لئے تیار نہیں۔ وہ نفع، پیداوار اور ذاتی ترقی کے لئے ہمہ وقت سرگرم عمل رہتے ہیں۔ تاہم روز افزوں بے یقینی، شدید عوامی تنقید اور بڑھتا ہوا سیاسی دباؤ، ان ذہین ناظموں کے ذہن میں بھی۔۔۔۔ اپنی کارپوریشن کے مقاصد، ڈھانچے، ذمہ داری اور اس کے وجود کے متعلق۔۔۔۔ بنیادی سوالات پیدا ہو رہے ہیں۔ دیوہیکل کارپوریشنوں کی اکثریت اپنی شناخت کے بحران میں الجھی ہوئی ہیں۔

اسراعی معیشت

دوسری لہر کے مضبوط ڈھانچے کا اندرونی تصادم تیزی سے بدلتے حالات کارپوریشن کے تشخصی بحران میں مزید شدت پیدا کر رہے ہیں۔تبدیلی کا اسراع ناظمانہ اصولوں میں ایک نیا اضافہ ہے جس کی وجہ سے پریشان حال ناظموں کی تیز رفتار فیصلے کرنا پڑ رہے ہیں۔ ان کے لئے سوچ کا وقت کم سے کم ہوتا جا رہا ہے۔ بینکوں اور دوسرے مالیاتی اداروں میں، کمپیوٹر کی وجہ سے، ان کی کارکردگی قدرے تیز ہے۔ کچھ بینک ایسے علاقوں میں اپنی ساخیں قائم کر رہے ہیں، جہاں وہ بین الاقوامی وقت کے درمیانی فرق کا فائدہ اٹھا سکیں۔ یورومنی'' ۔۔۔۔ بینکوں کا بین الاقوامی جریدہ۔۔۔۔ کے مطابق گھڑی کے اوقات میں فرق بھی کاروباری مسابقت کے حصول کا ذریعہ بن گیا ہے۔

MashalBooks.org

ان حالات میں کارپوریشنیں، چاروناچار مختلف کرنسیوں میں سالانہ یا سہ ماہی کے بجائے، بعض اوقات صرف رات بھر کے لئے، سرمایہ کاری کرنے پر مجبور ہیں۔ ان کارپوریشنوں میں، بین الاقوامی کیش منیجر کا ایک نیا عہدہ نکالا گیا ہے۔ جو چوبیس گھنٹے بین الاقوامی کرنسی مارکیٹ پر الیکٹرانک ذرائع سے نظر رکھ کر، یہ معلوم کرتا ہے کہ بہترین منافع بخش سوداکس مارکیٹ میں دستیاب ہوگا۔ اسی طرح کا اسراع مارکیٹ کے شعبوں میں بھی ہلچل پیدا کر رہا ہے۔"ایڈورٹائزنگ ایج" نامی رسالے کے مطابق مارکیٹنگ کے لوگوں کو کاروبار میں اگلے دن تک زندہ رہنے کے لئے، فوری فیصلے کرنا پڑتے ہیں۔ ٹی وی کمپنیوں کو ناپسندیدہ پروگرام فوراً بند کرنا پڑیں گے۔ اس مسابقانہ ماحول میں پروگراموں کی غیر مقبولیت کا اندازہ کرنے کے لئے ان کے پاس پوری سہ ماہی تو کیا، پانچ یا چھ ہفتے بھی نہیں۔

یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ اشتہاری کمپنیوں کے مشورے سے اشیاء کی فروخت بڑھانے کے لئے ان کی پرچون قیمتوں میں فوری کمی کی گئی۔ غرض اسی طرح انجینئرنگ، صنعت، تحقیق، فروخت، انسانی وسائل۔۔۔ کارپوریٹ زندگی کے ہر شعبے۔۔۔ کے بارے میں فیصلہ سازی کے عمل کے لئے وقت تیزی سے سکڑتا جا رہا ہے۔ اشتراکی صنعتی ممالک میں قدرے سست رفتاری سے، یہی معاملات چل رہے ہیں۔ کامیکون۔۔۔ جو پہلے پنج سالہ منصوبے کے ساتھ قیمتوں پر نظرثانی کرتا تھا۔۔۔ اب ہر سال قیمتیں بڑھانے پر مجبور ہے۔ جلد یا بدیر یہی عمل چھ ہفتے یا اس سے بھی کم وقفے میں دھرانا پڑے گا۔ یہ عمومی اسراع کارپوریٹ زندگی پر مختلف اثرات مرتب کر رہا ہے۔ مختصر پیداواری مدت میں اشیاء کی کمی، اشیاء و خدمات خریدنے کی بجائے لیزنگ اور کرائے پر لینے کا رجحان، اخراجات کے لئے نت نئے انداز، کاریگروں کے لئے مزید تربیت کی ضرورت (تاکہ وہ عمل کے نئے طریقے جان سکیں) کنٹریکٹ کی شرائط میں تبدیلیاں، زیادہ سے زیادہ لین دین اور قانونی خدمات میں اضافہ، قیمتوں میں ردوبدل، کوائف پر زیادہ انحصار، شعبہ خدمات میں لوگوں کی جز وقتی ریل پیل، اداروں کی بڑھتی ہوئی تعداد اور ان سب پر افراط زر سونے پر سہاگہ ہے۔

شدید گرم بازاری سے مشابہ ماحول میں تاجر، بینکار اور کارپوریٹ منیجر، سب اپنے اپنے عمل کے متعلق بنیادی سوال اٹھا رہے ہیں۔ چونکہ ان کی پرورش دوسری لہر کے

مثبت ماحول میں ہوئی ہے۔ انتہائی تیز رفتار تبدیلی کے ہاتھوں، وہ اپنے مانوس ماحول کی دھجیاں اڑتی دیکھ کر پریشان ہیں۔

متنوع معاشرہ

ان سب سے زیادہ حیرت انگیز بات اس تھوک صنعتی معاشرے کی شکست وریخت ہے، جسے چلانے کے لئے انہیں تربیت دی گئی تھی۔ دوسری لہر کے مینجروں کو یہ سکھایا گیا تھا کہ کثیر پیداواریت ہی پیداوار کا بہترین طریقہ ہے اور تھوک منڈی میں صرف معیاری اشیاء چلتی ہیں، جس کے لئے وسیع تقسیم وسائل لازمی ہیں۔ مزید براں، پیداوار میں یکسانیت کے لئے ایک ہی جیسے کاریگروں کی ضرورت ہے اور انہیں یکساں نوعیت کی تراغیب درکار ہیں۔ کامیاب مینجروں کو بتایا جاتا تھا کہ کاروباری مقاصد کے حصول کے لئے ہم آہنگی، مرکزیت، عددی کثرت اور ارتکاز لازم ہیں۔ دوسری لہر کے دور میں یہ مفروضے واقعی درست تھے۔ آج تیسری لہر کے ٹکراؤ سے کارپوریٹ مینجروں کو پتہ چل رہا ہے کہ ان کے سارے پرانے مفروضے ناکارہ ہو رہے ہیں جس وسیع سماج کے لئے یہ کارپوریشنیں وجود میں آئی تھیں، وہ خود اب محدودیت کی جانب گامزن ہے۔ اطلاعات، پیداوار اور خاندان ہی نہیں بلکہ مارکیٹ اور محنت بھی چھوٹے چھوٹے اور مختلف النوع حصوں میں بٹ رہے ہیں۔ وسیع مارکیٹ بھی اب متعدد حصوں میں بٹ چکی ہے۔ ہر حصہ ایک چھوٹی مارکیٹ ہے جس میں صارفین کی پسند کے مطابق ہر شے کے مختلف ماڈل، رنگ، سائز، قسم اور خصوصیات کی رسد ہونا چاہئے۔ خود ان زر کی منڈیوں کا حجم مسلسل پھیل رہا ہے۔ امریکی ٹیلی فون کمپنی کا پروگرام تھا کہ وہ ہر امریکی گھر میں ایک جیسا کالا ٹیلی فون سیٹ فراہم کریگی۔ اب وہ کمپنی ہزار ہا قسم کے ٹیلی فون آلات اور پرزے بنا رہی ہے۔ گلابی، ہرے، اور سفید ٹیلی فون سے لے کر نابینا لوگوں، کمزور آواز والوں کے لئے اور عمارتی اور دوسرے تعمیراتی کاموں پر استعمال ہونے والے مضبوط ٹیلی فون سیٹ بنا رہی ہے۔ مارکیٹ کو تھوک بنیادوں پر چلانے والے ڈیپارٹمنٹل سٹورز اب اپنی اپنی چھت تلے چھوٹی لیکن مخصوص اشیاء بیچنے کی دوکانیں کھولنے کی اجازت دے رہے ہیں۔

ترقی یافتہ ممالک میں اشیاء خدمات کی تیزی سے بڑھتی ہوئی تعداد اور تنوع کے

لئے ،بعض لوگ کارپوریشن کومورد الزام ٹھہراتے ہیں کہ وہ اپنی اشتہاری تحریکوں کے ذریعے صارفین کوفرضی ضروریات کا احساس دلا کر، اپنی اشیاءخریدنے پر اکساتی ہیں اور معمولی سے فرق کے ساتھ، ایک شے کے مختلف ماڈل بنا کر،خوب منافع کماتی ہیں۔ یہ الزامات غلط نہیں لیکن ایک دوسرے تناظر میں دیکھنے سے معلوم ہو گا کہ اشیاء و خدمات میں بڑھتا ہوا تنوع اس بات کا غماز ہے کہ تیسری لہر کی متنوع معاشرے میں طرح طرح کی اقدار، طرز زندگی اورضروریات ہوں گی۔

روز افزوں معاشی تنوع کے ساتھ ساتھ محنت کی مارکیٹ میں بھی نت نئے پیشوں کی طلب ابھر رہی ہے۔ خاص طور پر سفید کالراور خدمات کے شعبوں میں۔۔۔۔اخبارات میں۔۔۔۔منی کمپیوٹر پروگراموں اور وائی ڈک سیکرٹری جیسی ملازمتوں کے لئے اشتہارات چھپ رہے ہیں۔ خدمات کے شعبے پر ایک مذاکرے میں، میں نے یک ماہرنفسیات کو 68 نئے پیشوں کی فہرست گنواتے سنا ہے۔ مثلاً صارف کے وکیل، جنسی مشیر،عوام کا دفاع کرنے والا، کیمیائی نفسیات کا معالج اورمحتسب وغیرہ۔ ملازمتوں کی تخصیص کے ساتھ ساتھ ان پر کام کرنے والے بھی اپنی نسلی، مذہبی، پیشہ ورانہ، جنسی اور انفرادی خصوصیات کا گہرا احساس اپنے ساتھ لاتے ہیں، دوسری لہر کے تمام دور میں اپنی انفرادیت کو وسیع البنیاد سماج میں ضم کرنے کا مطالبہ کرنے والے گروہ، اب اپنی اپنی خصویات برقرار رکھنے کی ضد پر اتر آئے ہیں۔ وہ اپنی خصوصی شناخت پر زور دیتے ہیں۔ دوسری لہر کی کارپوریشنیں۔۔۔۔جن کا فلسفہ عمل، وسیع معاشرے کی ضروریات کے مطابق تشکیل پایا تھا۔۔۔۔اپنے ملازمین اور گاہکوں کے اس بڑھتے ہوئے تنوع کی وجہ سے بے حد پریشان ہیں۔

اگرچہ یہ معاشرتی تنوع امریکہ میں سب سے زیادہ واضح ہے لیکن اور بہت سے ملکوں میں بھی تیزی سے محسوس ہو رہا ہے۔ برطانیہ جوکبھی ہم نسل افراد کا سماج تھا۔ اب وہاں پاکستانیوں،عربوں، ہندوؤں، قبرصیوں، ایشیائی یوگنڈا والوں، ترکی اور ہسپانویوں کی خاصی بڑی تعداد نظر آتی ہے۔ یہ سب لوگ انگریز آبادی کے ساتھ گھل مل گئے ہیں۔ ساتھ ہی برطانیہ میں آنے والے جاپانی، امریکی، جرمن، ولنڈیزی، عرب اور افریقی سیاحوں کی ایک بہت بڑی تعداد امریکی برگر اور جاپانی ٹیمپورا کھاتے نظر آتے ہیں۔ وہاں کئی

دوکانداروں نے اپنی دوکانوں پر اس طرح کے نشان لگا رکھے ہیں: ''ہمارے ہاں ہسپانوی بولنے والے ملازم موجود ہیں''۔

دنیا بھر میں نسلی اقلیتیں اپنی پہچان منوا رہی ہیں۔ نوکریوں، آمدنی اور کارپوریشنوں کی ملازمتوں میں ترقی کا مطالبہ کر رہی ہیں۔ آسٹریلیا کی کے قدیم باشندے، نیوزی لینڈ کے مقامی کینڈا کے اسکیموں، سیاہ فام اور ریڈ انڈین، امریکہ کی دیگر مشرقی اقلیتیں (جو اب تک سیاسی طور پر غیر متحرک تھیں) امریکہ کے کونے کونے میں مصروف عمل ہیں ''دیسی'' امریکی اپنی ''سرخ طاقت'' کا لوہا منوانا چاہتے ہیں اور اپنی قبائلی زمینوں کی واپسی چاہتے ہیں، جس میں وہ تیل برآمد کرنے والے ممالک سے سیاسی اور معاشی امداد کے حصول کی کوششیں بھی کر رہے ہیں۔

ترقی یافتہ صنعتی ممالک میں جاپان،۔۔۔۔ جو کبھی سب سے زیادہ ہم رنگ سماج تھا۔ میں بھی تنوع کے آثار نمایاں ہوتے جا رہے ہیں۔ ایک ان پڑھ مجرم نے رہائی کے بعد اپنی اقلیت کے حقوق کا مطالبہ کھڑا کر دیا ہے۔ کوریا سے آئے ہوئے لوگ بھی جاپان میں بے چین ہیں۔ صوفیہ یونیورسٹی کے ماہر عمرانیات مسا کی تکان نے یہ کہہ کر اپنے اندیشے کا اظہار کیا ہے کہ ''جاپانی سماج تیزی سے اپنی یکسانیت کھو کر، انتشار کی طرف بڑھ رہا ہے''۔

ڈنمارک میں مقامیوں اور تارکین وطن مزدوروں کے درمیان گلیوں میں لڑائی جھگڑے ہوتے ہیں۔ بیلجیئم میں ولنڈیزی فلامشوں اور برسلز کے باشندوں میں صنعتی دور سے پہلے کی رنجشیں پھر پیدا ہوگئی ہیں۔ کینیڈا میں کیوبک کے صوبہ کی آزادی کی دھمکیوں کے پیش نظر مانٹریال میں واقع کارپوریشنوں کے صدر دفاتر میں تالہ بندی ہو رہی ہے اور سارے کینیڈا میں برطانوی نژاد نسل فرانسیسی زبان سیکھنے کے سریع رفتار کورس کر رہی ہے۔ سماج کی تھوک بندی کرنے والی طاقتیں اب الٹی سمت چل پڑی ہیں۔ اسراعی ٹیکنالوجی کے اس دور میں قوم پرستی علاقائیت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ذرائع ابلاغ ایک وسیع تہذیب پیدا کرنے کی بجائے اس میں تنوع اور سویع پیداواریت سے ماورا ترقی سے قریبی مماثلت رکھتے ہیں۔ یہ سب تبدیلیاں باہم مل کر سماج میں پیداواری نظام کو مکمل تبدیل کر دیں گی، جس کے نتیجے میں وسیع البنیاد سماجی ذہن کے ناظموں کو ایک پریشان کن دنیا سے نمٹنا پڑ رہا ہے۔

MashalBooks.org

کارپوریشن کی نئی تعریف

کارپوریٹ تشخص کے بحران کو کارپوریشن کی نئی تعریف کی عالمی طلب اور زیادہ گھمبیر بنا رہی ہے۔ امریکی رسالے ہارورڈ بزنس ریویو کے ایڈیٹر ڈیوڈ ایونگ کے مطابق ''کارپوریشن کے خلاف عوامی غصہ شدید ہوتا جا رہا ہے'' ایونگ اس موضوع پر 1977ء کی ایک تحقیق کا حوالہ دیتا ہے جس کے نتائج نے کارپوریٹ دنیا کو ہلا کر رکھ دیا۔ اس تحقیق کے مطابق 50 فیصد صارف یہ سمجھتے ہیں کہ گاہکوں کی جانب مارکیٹ کا رویہ پہلے کی نسبت خاصا خراب ہوگیا ہے۔ ہر پانچ میں سے تین متفق تھے کہ اشیاء کا معیار گھٹ گیا ہے اور 1/2 کا اعتماد اشیاء پر مندرجہ گارنٹی پر باقی نہیں رہا۔ ایونگ ایک بوکھلائے ہوئے تاجر کا ذکر کرتا ہے، جو اپنے آپ کو ہ زلزلہ کی چوٹی پر کھڑا محسوس کرتا ہے۔ ایونگ کے مطابق لوگوں کو صرف غصہ یا پریشانی ہی لاحق نہیں بلکہ بعض اوقات وہ لاشعوری طور پر جدید ٹیکنالوجی اور نت نئے کاروبار سے اپنے خوف کا اظہار بھی کرتے ہیں۔

ممتاز اکاؤنٹنگ کارپوریشن پرائس ہاؤس کے ایک منتظم جان سی بیگلر کے مطاب عظیم کساد بازاری کے بعد امریکی کارپوریشن پر اتنا کم اعتبار کبھی نہیں رہا، جتنا آج ہے۔ امریکی کاروبار اور حساب کاری کی کمپنیوں کو دوبارہ زمینی سطح پر لا کر ہمارے ہر عمل کی از سرنو توجیہہ مانگی جا رہی ہے۔ کارپوریٹ کارکردگی کو نئے اور انجان طور طریقوں سے جانچا جا رہا ہے۔ ایسے ہی رویئے مغربی یورپ اور اشتراکی صنعتی سماج میں بھی ابھر رہے ہیں۔ جاپان کی ٹویوٹا کاپوریشن کے میگزین کے مطابق جاپانی شہریوں کی جدید تحریک کارپوریشن پر روز مرہ عوامی زندگی میں دخل اندازی کا الزام بنتی رہی ہے مگر یہ تحریک ان سے قطعی مختلف ہے کیونکہ ظہور پذیر تیسری لہر کی تہذیب کے مفروضے اس تنقید کی بنیاد ہیں۔

دوسری لہر کے زمانے میں کارپوریشن کو ایک معاشی اکائی سمجھا جاتا تھا اور اس پر تنقید بھی معاشی مسائل کی وجہ سے کی جاتی تھی۔ مثلاً مزدوروں کی کم اجرت، قیمتیں یکساں سطح پر رکھنے کے لئے اجارہ داری کا قیام، غیر معیاری اشیاء کی پیداوار وغیرہ۔ تاہم یہ سارے نقاد کارپوریشن کو اپنی وضع کردہ تعریف کے مطابق ایک معاشی اکائی جانتے تھے۔

آج کے نقادوں کے مقروضے مختلف ہیں۔ ان کا ہدف تنقید معاشی زندگی کا

سیاست، اخلاقیات اور دوسرے شعبہ ہائے زندگی سے لاتعلق ہونا ہے۔ وہ نہ صرف کارپوریشن کی معاشی کارکردگی سے غیر مطمئن ہیں بلکہ اسے ماحول سے لے کر ناظم کی شخصیت پر اعصابی تناؤ تک ہر چیز کے لئے، مورد الزام ٹھہراتے ہیں۔ کیمیائی زہر کا پھیلاؤ، ادویات کے غریبوں پر تجربات، غیر صنعتی ممالک کی ترقی کی راہ میں رکاوٹیں، نسل پرستی، جنسی بے راہروی، دھوکہ بازی، حقائق سے چشم پوشی، غرض ہر طرح کے الزمات کارپوریشن پر دھرے جاتے ہیں۔ ان پر چلی کے فاشٹ جرنیلوں، جنوبی افریقہ کے سفید فام نسل پرستوں اور اطالوی کیمونسٹ پارٹی کی حمایت کے الزامات بھی موجود ہیں۔ اگرچہ الزامات درست ثابت ہوئے ہیں مگر مسئلہ ان الزامات کی صحت کا ہے ہی نہیں تیسری لہر کی تہذیب سے ایسی توقعات وابستہ کی جارہی ہیں کہ جن سے کارپوریشن اشیاء کی پیداوار کر کے نہ صرف منافع لائے بلکہ پیچیدہ ماحولیاتی، اخلاقی، سیاسی، نسلی، جنسی اور معاشی مسائل کے حل ڈھونڈنے میں عملی مدد بھی کرے۔ کارپوریشن۔۔۔ تنقید، قانون، سازی اور اپنے باشعور ناظموں کے ہاتھوں مجبور ہو کر، محض ایک معاشی اکائی سے کہیں آگے بڑھ کر ایک کثیر المقاصد ادارے کی شکل اختیار کرتی جا رہی ہے۔

پانچ طرفہ دباؤ

پیداواری حالات میں درج ذیل پانچ انقلابی تغیرات کی وجہ سے کارپوریشن کی ازسرنو تعریف کرنا لازمی ہو گیا ہے۔

(1) ماحولیاتی مادی تبدیلی۔

(2) معاشی قوتوں کی نئی ترتیب۔

(3) اطلاعات کا کردار۔

(4) حکومتی اداروں اور

(5) اخلاقیات میں تبدیلیاں۔

ماحولیاتی تبدیلی کی وجہ کا تعلق حیاتیاتی دائرے سے ہے۔ 1950ء کے عشرے کے وسط میں۔۔۔ امریکہ میں دوسری لہر کے عروج کا زمانہ۔۔۔ دنیا کی کل آبادی پونے تین ارب تھی۔ آج تعداد بڑھ کر 4ارب سے زیادہ ہو گئی ہے۔ اس وقت دنیا میں 87ارب

برطانوی توانائی کی اکائیاں استعمال ہو رہی تھیں جو اب بڑھ کر 260 ارب (Btu) اکائیاں سالانہ ہو گئی ہیں۔ اس زمانے میں جست کا استعمال 27 لاکھ ٹن کے لگ بھگ تھا۔ آج یہ اصراف 56 لاکھ ٹن ہو چکا ہے۔ جس انداز میں بھی دیکھا جائے، ہمارے دنیا کے وسائل خرچ کرنے کی رفتار میں تیزی سے اضافہ ہوا ہے، جس سے ہمارا حیاتیاتی دائرہ خطرے کی گھنٹیوں سے بج اٹھا ہے۔ ماحولیاتی آلودگی، صحراؤں کا پھیلاؤ، سمندری زہر آلودگی، موسموں میں خفیف تبدیلیاں۔۔۔۔ ان سب علامات کو نظر انداز کرنے کا مطلب کسی بڑے حادثے کو دعوت دینا ہے۔ ان خطرات کا مقابلہ کرنے کے لئے ہمیں دوسری لہر کے پیداواری طریقوں کو چھوڑنا ہوگا، کارپوریشن معاشی پیداوار کی تنظیم کا اہم ترین ذریعہ ہے اور یہی اپنی کارکردگی کی وجہ سے ماحول کو سب سے زیادہ متاثر کر رہی ہے۔ اگر ہم انسانیت کی بقا اور معاشی ترقی چاہتے ہیں تو مستقبل کے ناظموں کو کارپوریشن کے منفی ماحولیاتی اثرات کو مثبت بنانا ہوگا۔ اگر یہ ذمہ داری کارپوریشن نے خود قبول نہ کی تو عالمی ماحول میں برپا ہوتی ہوئی تبدیلیاں انہیں یہ ذمہ داریاں پوری کرنے پر مجبور کر دیں گی۔ کارپوریشن کی یہ اضافی ماحولیاتی ذمہ داری، کسی نیک نیتی کی وجہ سے نہیں بلکہ، پیداوار اور حیاتیاتی دائرے کے رشتے میں مادی تبدیلی کے نتیجے میں جنم لے رہی ہے۔

تغیر پذیر معاشی ماحول۔۔۔۔ دباؤ کی دوسری وجہ ہے۔ یہ ماحول مسلسل زیادہ منظّم ہوتا جا رہا ہے۔ ایک وقت تھا کہ کمپنیوں کو مہیا معاشی ماحول غیر منظّم تھا۔ آج وہ معاشی دائرہ، امریکہ میں خاصا منظّم ہے۔ وہاں شہریوں کی متمول انجمنیں، مزدور تنظیمیں اور ایسے ہی دوسرے کئی گروہ سرگرم عمل ہیں۔ تیرہ لاکھ ستر ہزار امریکی کمپنیوں کا اوسطً 90.000 سکولوں اور یونیورسٹیوں، تین لاکھ تیس ہزار گرجا گھروں اور تیرہ ہزار قومی اداروں کی لا تعداد شاخوں اور مقامی ماحولیاتی، معاشی، مذہبی، تربیتی اداروں اور شہری تنظیموں سے پڑتا ہے۔ ان رشتوں کو موزوں اور مناسب رکھنے کے لئے ایک لاکھ چوالیس ہزار قانونی مشاورتی کمپنیاں کام کر رہی ہیں۔

اس گنجان آباد معاشی کرے میں کارپوریٹ عمل کا اثر بے چارے فرد پر ہی نہیں پڑتا بلکہ کئی منظّم گروہوں سے بھی اس کا پالا پڑتا ہے۔ ان میں سے بعض گروہ خاصے متمول

ہیں اور انہوں نے ماہرین کی خدمت حاصل کر رکھی ہیں۔ ان کے اپنے اخبارات و رسائل ہیں اور اعلیٰ ترین سیاسی قوتوں تک ان کی پہنچ بھی ہے۔ سو کارپوریٹ عمل اک کڑے احتساب سے گزرتا ہے۔ کارپوریشن کی پیدا کردہ معاشی آلودگی مثلاً بے روزگاری، آبادی کی منتقلی کے جواب میں، اس پر شہریوں کا مزید دباؤ پڑنے لگتا ہے۔ اسے معاشی پیداوار کے ساتھ ساتھ دوسری شہریوں کا مزید دباؤ پڑنے لگتا ہے۔ اسے معاشی پیداوار کے ساتھ ساتھ دوسری معاشی ذمہ داریوں کا احساس دلایا جاتا ہے۔ ابلاغی دائرے میں وقوع پذیر تبدیلیاں، دباؤ کی تیسری شکل کو جنم دے رہی ہیں۔ روز افزوں سماجی متنوع اجتماعیت کی وجہ سے کارپوریشن سمیت مختلف سماجی اداروں میں معمولی کے تعلقات رکھنے کے لئے ابلاغی تبادلہ جات کی ضرورت ہوتی ہے۔ دوسری لہر کے پیداواری طریقے اپنانے سے اطلاعات کے خام مال کی حیثیت میں طلب بڑھ جاتی ہے۔ اب کمپنیاں کوائف کی خاصی بڑی مقدار ہضم کر کے نت نئی شکلوں میں ان کی تشہیر کرتی ہیں۔ پیداواری نظام میں بالغیات کے اس بنیادی کردار نے تقریباً ہر ادارے میں ابلاغیاتی ناظم کی اسامی پیدا کر دی ہے۔ اس طرح مادی اور معاشی ماحول کی طرح اطلاعات ماحول بھی تشکیل پا گیا ہے۔

اطلاعات کی اہمیت کی بدولت کارپوریٹ کوائف پر اجارہ داری کی خاطر زبردست مار دھاڑ نظر آ رہی ہے۔ مثلاً یہ عوامی مطالبہ کہ کمپنیاں عموماً اور آئل کمپنیاں خصوصاً اپنا نفع نقصان کا حساب عوام کے سامنے پیش کریں۔ اشتہارات میں حقائق کی عکاسی اور قرضوں کی شرائط سے عمومی واقفیت کے مطالبات، اس نئے دور میں اطلاعاتی اثرات بھی ماحولیاتی یا معاشی اثرات کی سی اہمیت کے حامل ہوں گے۔ کارپوریشن اقتصادی پیداوار کا ذریعہ ہی نہیں بلکہ اطلاعاتی پیداوار کا وسیلہ بن گئی ہے۔

کارپوریشن پر چوتھا دباؤ سیاسی طاقت کے دائرے، بڑھتے ہوئے سماجی تنوع اور تبدیلی کے اسراع کا نتیجہ ہے۔ حکومتی امور میں بڑھتی ہوئی پیچیدگی کی وجہ سے کارپوریشنوں کو حکومتی اداروں سے نمٹنے میں زیادہ مشکلات کا سامنا ہے۔ نوکر شاہی ادارے اپنی زبوں حالی کے ہاتھوں مجبور نت نئے حکومتی ادارے قائم کئے جا رہے ہیں۔ یوں ہر کارپوریشن کو مقامی، علاقائی، قومی اور بین الاقوامی سیاست میں ملوث ہونا پڑ رہا ہے۔ کارپوریشن کا ہر

فیصلہ سیاسی مضمرات کا حامل ہوتا ہے، جس کے نتائج کی ذمہ داری بھی کارپوریشن کو قبول کرنا پڑتی ہے۔ دوسری لہر کے اس آخری دور میں کارپوریشن سمیت تمام ادارے شدید اخلاقی دباؤ کی زد میں آ گئے ہیں۔ کارپوریٹ بدعنوانی اور مک مکا کے الزامات آئے دن عوام کے سامنے آتے رہتے ہیں۔ لاک ہیڈ کارپوریشن کی رشوت جاپانی حکومت کا تختہ الٹنے کا سبب بن جاتی ہے۔ لین کارپوریشن جنوبی افریقہ کو اسلحہ فروخت کرنے میں ملوث ہے۔ گلف آئل کے چیئر مین کو رشوت ستانی کے الزام میں اپنے عہدے سے علیحدہ ہونا پڑا ہے۔ برطانوی ڈسٹلرز کمپنی کی دوائی کے استعمال ہونے سے اپاہج ہونے والوں کے لئے ناکافی معاوضہ اور میکڈونلڈ ڈگلس کے ڈی سی 10 ہوائی جہاز کے پے در پے حادثات کا شکار سواریوں کے معاوضے پر عوامی غم وغصہ کی شدید لہر پیدا ہوئی ہے۔

کارپوریشن کا اخلاقی رویہ بھی سماجی اقدار پر بالواسطہ اثر انداز ہوتا ہے۔ اس کی اہمیت بھ کارپوریشن کے مادی اور معاشی ماحول پر اثرات سے کم نہیں۔ اسی لئے کارپوریشن کی کارکردگی کے اخلاقی اثرات کی اہمیت بڑھتی جا رہی ہے۔ اس پانچ طرفہ دباؤ کی وجہ سے کارپوریشن کی اب محض معاشی ضروریات پوری کرنے والی اکائی کی حیثیت نہیں رہی جس کی مطمح نظر صرف نفع کمانا ہوتا تھا، بلکہ جدید پیداواری تصور کے تحت کارپوریٹ عمل کے ماحولیاتی، معاشی، اطلاعاتی، سیاسی اور اخلاقی پہلو بھی اتنی ہی اہمیت کے حامل ہیں۔ پہچان اور تعریف کی سطح پر کارپوریشین کا مقصد اب مفرد سے بڑھ کر اجتماعی ہو گیا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کارپوریشنیں اندرونی طور پر دو گروہوں میں منقسم ہو جائیں، جن میں ایک گروہ دوسری لہر کے اقتصادی مقاصد کا حامی ہو، جب کہ دوسرا تیسری لہر کے پیداواری حالات کے مطابق کارپوریشن کو کثیر المقاصد ادارہ بنانے کا خواہاں ہو۔

کثیر المقاصد کارپوریشن

دوسری لہر کی ثقافت کے عادی ذہنوں کے لئے کثیر المقاصد اداروں کا تصور کرنا بھی خاصا مشکل ہے۔ ایک ہسپتال کے معاشی اور طبی کردار کو جاننا، کسی سکول کے سیاسی اور تعلیمی کردار یا کارپوریشن کے بھرپور غیر معاشی کردار کو پہچاننے سے کم مشکل نہیں۔ دوسری لہر کے پنشن یافتہ ہنری فورڈ 2 کے مطابق کارپوریشن صرف سماج کی معاشی ضروریات پوری

کرنے والا ایک ادارہ ہے اور کاروبار سے غیر وابستہ دیگر معاشی یا سماجی ضروریا سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ فورڈ اور دوسری لہر کے حامیوں کی پیداواری نظام کی تعریف کے دفاع سے قطع نظر، کئی کمپنیاں اپنی حکمت عملی اور مقاصد پر نظر ثانی کر رہی ہیں۔

تعلقات عامہ تحریکیں اکثر حقائق پر پردہ ڈالتی ہیں۔ معاشی ذمہ داری کا شور مچانے والے چمکتے دمکتے اشتہاروں کا مقصد اکثر اوقات کمپنیوں کی لوٹ کھسوٹ کی پالیسیوں سے توجہ ہٹانا ہوتا ہے۔ بہر حال دوسری لہر کے دباؤ کے تحت، کمپنیاں اپنے مقاصد، تنظیم اور ذمہ داریوں کے بارے میں نیا انداز فکر اختیار کرنے پر مجبور ہیں۔ ایک سر کردہ آئل کارپوریشن اپنے ایک اشتہار میں نئے رنگ(Paint) کی درجہ بندی کی اپنی پالیسی کا اعلان اس طرح کرتی ہے کہ اس میں پلانٹ کے معاشی معیار کے علاوہ علاقائی معاشی اثرات کا بھی تفصیلی جائزہ لیا جاتا ہے اور اس میں ماحول اور مقامی ملازمتوں کی حالت(خصوصاً اقلیتوں) کا تفصیلی ذکر بھی ہوتا ہے۔ اور جن دو جگہوں پر معاشی معیار یکساں ہو لیکن معاشی اثرات مختلف ہوں تو معاشی عوامل کو ترجیح ملتی ہے۔ بڑی بڑی امریکی کمپیوٹر کمپنیوں میں سے ایک ڈیٹا کنٹرول کارپوریشن دوسری کمپنی میں مدغم ہونے کی تجویز کا نہ صرف مالی اور معاشی پہلوؤں کا بلکہ ملازمین کے ادغام اور ڈیٹا کنٹرول فیکٹری کی رہائشی کالونیوں سمیت سب متعلقہ عوامل کا جائزہ لیتی ہے۔ بعض کمپنیاں شہر چھوڑ کر نواحی علاقوں میں منتقل ہو رہی ہیں۔ جب کہ ڈیٹا کنٹرول اپنے پلانٹ واشنگٹن، سینٹ پال اور دوسرے کئی شہروں کے عین وسط میں لگا رہی ہے تا کہ اقلیتوں کے لئے ملازمت کے مواقع فراہم ہوں اور خستہ حال علاقوں کی تعمیر نو کی جا سکے۔ کارپوریشن کا پانا مطمح نظر یہ ہے کہ لوگوں کا معیار زندگی بلند کیا جائے، مساوات کو رواج دیا جائے۔ انسانی اہلیت کے استعمال کے امکانات میں اضافہ کیا جائے۔

ایک کارپوریشن کے لئے مساوات کا علم بردار ہونا بلاشبہ عجیب سی بات ہے۔ امریکہ میں خواتین اور غیر یورپی نسلوں کے حقوق کا تحفظ ان کی قومی حکمت عملی کا مظہر ہے۔ کچھ کمپنیاں تو ایسے مینجروں کی مالی مدد کرتی ہیں جو اقلیتی حقوق کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ خوراک کی ایک بڑی کمپنی پلز بری نے صرف اپنی پیداوار کی فروخت کا منصوبہ بناتی ہے بلکہ خواتین اور دوسری اقلیتوں کی ملازمت، تدریب اور ترقی کے لئے بھی پالیسیاں بناتی ہے۔

منیجروں کی ترقی ان مقاصد کے حصول سے منسلک کر دی گئی ہے۔اے ٹی اینڈ ٹی کارپوریشن میں منیجروں کی کارکردگی کی سالانہ رپورٹ میں اقلیتی حقوق کے تحفظ کے لئے ان کی کوششوں کا ذکر بھی ہوتا ہے۔ نیویارک کے کیمیکل بنک کے منیجروں کی کارکردگی کا 10 فیصد سے 15 فیصد حصہ ان کی معاشی ذمہ داری سے متعلق ہوتا ہے۔ مثلاً غیر کاروباری تنظیموں کو قرضے فراہم کرنا، معاشی اداروں میں ان کا حصہ اور اقلیتوں کو ملازمت کے مواقع دینا۔ ایک اخباری کمپنی گینٹ کا ایڈمنسٹریٹر لین نیو ہارتھ مقامی اشاعتی اداروں کو متنبہ کرتا رہتا ہے کہ ان کے بونس کے تعین میں معاشی ذمہ داریوں کے احساس کو زیادہ اہمیت دی جانی چاہئے۔ کئی بڑی کارپوریشنوں کی کارکردگی کے ماحولیاتی اثرات سے متعلق منیجروں کی ترقی اور رسوخ میں خاصا اضافہ ہوا ہے۔ کمپنیاں ایسی کمیٹیاں بنا رہی ہیں جو جدید کارپوریٹ ذمہ داریوں کے بارے میں سفارشات مرتب کریں گی۔

کچھ اقدامات تو شاید تعلقات عامہ اصولوں کے تحت، کارپوریشن کی شہرت بڑھانے کے لئے کئے گئے ہیں۔ بہرحال اس سے حالات کے متعلق ان کمپنیوں کی حساسیت ضرور ظاہر ہوتی ہے۔ حساسیت کی وجہ چاہئے نئے حکومتی قوانین ہوں یا عوامی غم و غصے کا خوف، کمپنیوں کے منتظم، بہرحال آہستہ آہستہ اپنے اداروں کی کثیر مقصدی حیثیت تسلیم کرتے جارہے ہیں۔

متعدد اہم نکات

نئی کثیر المقاصد کارپوریشن کی اہم ضروریات میں سے ایک ضرورت ذہین منیجروں کی ہے۔ جو کمپنی کے مختلف مقاصد کا جائزہ لے کر، ان کے حصول کا راستہ تجویز کر سکیں اور کثیر مقاصد کے بیک وقت حصول کے لئے موزوں حکمت عملی بنا سکیں اور اس میں بیک وقت تنوع کا بھی خاص خیال رکھیں۔ یہ حکمت عملی دوسری لہر کے منیجروں کی ذہنیت سے بالکل مختلف ہوگی۔ مقاصد کی کثرت تسلیم کرنے کے بعد، کمپنیوں کو کارکردگی کی جانچ پڑتال کے معیار بھی وضع کرنا ہونگے۔ دوسری لہر کے دوران، تنظیم کاری، ایک وقت میں ایک ہی اہم نکتے کے گرد متشکل ہوتی تھی۔ تیسری لہر کے کارپوریشن کے منتظموں کو گوناگوں اور باہم مربوط نکات۔۔۔۔ سماجی، ماحولیاتی، اطلاعاتی، سیاسی، اور اخلاقی نکات۔۔۔۔ پر اپنی توجہ

مرکوز کرنا ہو گی۔ آج کل مینجر خواتین وحضرات اس پیچیدگی کے ہاتھوں بوکھلاہٹ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ تیسری لہر کی تنظیم سازی کے آلات سے تہی ہونے کی وجہ سے کارپوریٹ نفع نقصان کے طور طریقے تو بخوبی جانتے ہیں مگر اس کے غیر معاشی مقاصد کا اندازہ لگانا، ان کے بس کی بات نہیں۔ پرائس واٹر کنٹرول کے جان سی بیگلر کے مطابق مینجروں سے ایسے مقاصد کی خاطر کی گئی کارکردگی کا حساب مانگا جا رہا ہے۔ تاہم اس سلسلے میں احتساب کا معیار تو کجا احتساب کے لئے مناسب ذخیرہ الفاظ بھی مجتمع نہیں کیا جا سکتا۔

آج کل احتساب کے لئے نئی زبان کی تلاش جاری ہے۔ حقیقی اکاؤنٹنگ بھی اپنے محدود اقتصادی دائرے سے نکل ایک انقلاب سے دو چار ہو رہی ہے۔ امریکی اکاؤنٹس ایسوسی ایشن نے حال ہی میں ایسی دو کمپنیوں کی رپورٹیں شائع کی ہیں۔ ''موثر غیر مالی اقدامات'' اور ''موثر معاشی پروگرام کے لئے ضروری اقدامات'' ان کے عنوانات ہیں۔ ہر دو رپورٹوں میں 250 تحقیقی مقالے اور دستاویزات شامل ہیں جو اپنی جگہ تحقیقی حد کی ایک انتہا ہے۔ فلاڈیلفیا کی ایک مشاورتی کمپنی ''انسانی وسائل کا نیٹ ورک'' امریکہ کی بڑی بڑی کارپوریشن کے ساتھ مل کر ایسے طریقے وضع کر رہی ہے، جن سے ہر صنعت میں کارپوریشن کے فوق المعاش مقاصد کا تعین کیا جا سکے۔ اس کوشش میں ان مقاصد کو کارپوریٹ پلان میں شامل کرنے کے طریقوں کی تیاری اور کمپنیوں کی غیر معاشی کارکردگی کو پرکھنے کے معیار کی تلاش بھی شامل ہے۔

دریں اثناء واشنگٹن میں وزیر تجارت انیتا کرپس نے حکومتی معاشی سرگرمیوں کو پرکھنے کے لئے بھی معیار قائم کرنے پر زور دیا ہے۔ ایسے عمومی معیار، جنہیں کمپنیاں بھی اپنی کارکردگی اور اس کے معاشی مطالعہ کرنے کے لئے استعمال کر سکیں۔ اسی طرح کی پابندیاں یورپ میں بھی لگائی جا رہی ہیں۔ برلن کے بین الاقوامی ادارہ برائے ماحولیات اور معاشرہ کی تحقیق کے مطابق کئی بڑی اور درمیانے سائز کی یورپی کمپنیاں بھی اپنی کارکردگی کے معاشی اثرات کا تجرباتی مطالعہ کر رہی ہیں مغربی جرمنی کی تقریباً 20 کمپنیاں باقاعدگی سے سماجی رپورٹ شائع کرتی ہیں اور لگ بھگ سو کمپنیاں اس طرح کے معاشی مطالعے اپنے کارکنوں کے لئے باقاعدہ تیار کرتی ہیں۔ ان میں سے بعض رپورٹیں محض فرض ہیں اور ان میں

MashalBooks.org

کارپوریشن کی نیک نامی کے قصیدوں کے سوا کچھ بھی نہیں، جب کہ بعض رپورٹیں حیرت انگیز حد تک بے لاگ، معروضی اور تنقیدی نقطہ نظر سے متصف ہیں۔ خوراک کی ایک سوئس کمپنی ایم جی بی نے ایک رپورٹ میں باقاعدہ اعتراف کیا ہے کہ وہ اپنی خاتون کارکنوں کو مردوں کی نسبت کم اجرت دیتی ہے اور اس کے بہت سے صنعتی مراحل محنت کے نقطہ نظر سے خاصے بے زار کن ہیں۔ مزید براں، چار سال میں اس کی فیکٹری میں نائٹرس ڈائی آکسائیڈ کا اخراج خاصا بڑھ چکا ہے۔ایم جی بی کے ایم ڈی پیٹر آرنلڈ کا کہنا ہے۔ ''کسی بھی کاروباری ادارے کے لئے اپنے مقاصد اور ان کے نتائج کے درمیانی فرق کو تسلیم کرنا خاصی بہادری کا کام ہے''۔ سویڈن، سولٹزر لینڈ اور جرمنی کی چند کمپنیاں سالانہ سماجی رپورٹ کے نام سے ایک ایسی دستاویز جاری کرتی ہیں جس میں معاشی اور فوق المعاش کوائف اور ان کا باہمی رشتہ پیش کیا جاتا ہے۔ شیل کارپوریشن اس کے لئے مقصدی اکاؤنٹنگ کا طریقہ استعمال کرتی ہے۔ اس میں کارپوریشن کے ٹھوس معاشی، ماحولیاتی اور سماجی مقاصد کی فہرست، ان کے حصول کے راستے اور ان پر متوقع اخراجات کی تفصیلات شامل ہیں۔

شیل کی رپورٹ میں پانچ مقاصد کا ذکر کیا گیا ہے۔ان میں ایک مقصد سرمایہ کاری پر مناسب منافع کمانا ہے۔ رپورٹ کے مطابق کمپنی اپنے سارے مقاصد کو مساوی اہمیت دیتی ہے، چاہئے وہ معاشی نوعیت کے ہوں یا غیر معاشی، مقصدی اکاؤنٹس کے طریقے سے کمپنیوں کو اپنے فوق المعاش مقاصد کو واضح کرنا لازمی ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ان کے مقاصد کے حصول کے طریقے اور ان پر صرف ہوتے وقت کا حساب بھی عوام کے سامنے رکھنا پڑتا ہے۔ برمنگھم یونورسٹی کے اکاؤنٹس کے پروفیسر ٹریور کیمبلنگ نے اپنی کتاب ''سماجی اکاؤنٹنگ'' میں اکاؤنٹنگ کے بنیادی اصولوں میں ایسی ترامیم کی ضرورت پر زور دیا ہے جن سے حساب کاروں اور معاشی ماہروں کا کام ان ماہرین عمرانیات کی تحقیق سے مربوط ہو سکے۔ جنھوں نے سماجی معیار اور سماجی اکاؤنٹنگ کے طریقے دریافت کئے ہیں۔ ہالینڈ کے شہر ڈیلفٹ کے مینجمنٹ سائنسز کالج کے سیکرٹری کارنیلیس برے ورڈ نے کارپوریٹ کارکردگی پرکھنے کے کثیر جہتی معیار مرتب کئے ہیں۔ پروفیسر بر ورڈ کے مطابق ان معیاروں کی ضرورت معاشرے میں پیدا شدہ گہری تبدیلیوں کی وجہ سے پیش آئی۔ چنانچہ اب معاشرہ

صرف معاشی پیداوار پر اکتفا کرنے کے بجائے کامل خوشحال کے مقصد کی جانب بڑھ رہا ہے۔ اسی طرح وہ تخصیصی فرائض کی بجائے کثیرعلمی رویئے کی جانب مائل ہو رہا ہے۔ ان دوتبدیلیوں کے نتیجے میں کارپوریشن کہیں زیادہ ذمہ دار ادارہ بن کر ابھرے گی۔

پروفیسر برے ورڈ نے 32 معیاروں کی فہرست بنائی ہے، جن سے کارپوریشن کو اپنی کارکردگی جانچنا چاہئے ۔ یہ معیار کارپوریشن کے گاہکوں، حصہ داروں، مزدور انجمنوں اور ماحولیاتی تنظیموں سے تعلقات سے لے کر، اس کی اپنی تنظیم سازی تک متعلق ہیں۔ برے ورڈ کے مطابق یہ 32 بھی وہ چند معیار ہیں۔ ''جن کی بڑی تعداد سے مستقبل کی کمپنیوں کو اپنی کارکردگی کا جائزہ لینا پڑے گا''۔

دوسری لہر کے معاشی ڈھانچے میں شکست وریخت، سرعت انگیز تبدیلیاں، سماج میں تخصیصیت کا رواج اور منظّم اداروں کی بھرمار، پیداواری طریقوں میں اطلاعاتی، سیاسی اور اخلاقی تبدیلیاں۔۔۔۔ ان سب کے نتیجے میں دوسری لہر کی کارپوریشن اب دقیانوسی ہو کر رہ گئی ہے۔ آج پیداوار اور پیداواری اداروں کی نئی تعریف کی جا رہی ہے اور اس طرح ایک نئی قسم کی کارپوریشن کے خدوخال واضح ہوتے جا رہے ہیں۔ امریکی یونیورسٹی برائے تنظیم سازی کے پروفیسر ولیم کا کہنا ہے: جس طرح زرعی سماج کے صنعتی سماج میں تبدیلی ہونے پر جاگیردارانہ حویلی کی جگہ کاروباری کمپنی نے لے لی، اسی طرح پرانی طرز کی کمپنی کی جگہ ایک جدید معاشی ادارہ کی تشکیل ضروری ہو گئی ہے۔ اس نئے ادارے کے لئے معاشی اور فوق المعاشی مقاصد دونوں کا حصول ممکن ہو گا اور اس کے ہمہ جہتی نتائج برآمد ہوں گے۔ کارپوریشن میں یہ ہیئتی تغیر ان وسیع تر تغیرات کا حصہ ہے جو سارے معاشی دائرے کے ساتھ ساتھ، مکینکی دائرے اور اطلاعاتی دائرے میں بھی وقوع پذیر ہو رہے ہیں۔ ان سب کے مجموعے کو ہم ایک عظیم تاریخی موڑ کہہ سکتے ہیں۔ صرف ان وسیع وعریض اداروں میں ہی تبدیلیاں نہیں آ رہیں بلکہ ہماری اپنی روز مرہ کی زندگی میں بے تحاشہ تبدیلیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ تہذیب کی بنیادوں میں تبدیلی کے ساتھ زندگی گزارنے کے نئے ضابطے بھی جنم لیتے ہیں۔

باب18

نئے منکشف ہوتے ضابطے

لاکھوں متوسط گھرانوں میں ایک روایتی ڈرامہ اکثر اوقات ہوتا رہتا ہے۔ حال ہی میں کالج کی تعلیم مکمل کرنے والا بیٹا یا بیٹی رات کے کھانے کے لئے دیر سے گھر پہنچتا ہے۔ ہاتھ میں آسامیوں کے اشتہارات والا اخباری صفحہ اور چہرے پر دن بھر کی تکان اور کبیدگی کے اثرات لئے اچانک وہ پھٹ پڑتا ہے۔''یہ نو سے پانچ بجے تک کی نوکری ذلت اور خواری کے سوا کچھ بھی نہیں۔ کوئی عزت نفس رکھنے والا آدمی ایسی غلامی برداشت نہیں کر سکتا''۔

اسی لمحے والدین کھانے کے کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔ دونوں ہی ستم رسیدہ ہیں۔ باپ نو سے پانچ بجے تک کی ملازمت سے فارغ ہو کے آیا ہے اور ماں بجلی اور گیس کے بل ادا کر کے سٹپٹائی واپس لوٹی ہے۔ ایسے حالات بارہا وہ بھگت چکے ہیں۔ اپنے بچے کو وہ کسی بڑی کمپنی میں ملازمت تلاش کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ وہ ان کے مشورے پر قطعی کان نہیں دھرتا، بلکہ طنزیہ انداز میں کہتا ہے: بڑی کمپنیاں۔۔۔۔ چھوٹی کمپنیاں کہیں بہتر ہیں۔ ملازمت تو ملازمت ہی ہے۔ جانے یہ اعلیٰ تعلیم کس لئے ہوتی ہے؟ کیا فائدہ اس سب سے؟

حیرت زدہ ماں باپ اپنے بچے کو، اپنی ہر بات پر، مزید بھڑکتا دیکھ رہے ہیں۔ دکھ اور یاسیت کی انتہا ہونے پر بھی وہ صرف اتنا کہہ پاتے ہیں۔''آخر یہ دنیا سے نمٹنا کب سیکھیں گے'' یہ مناظر امریکی یا یورپی خوشحال گھرانوں تک ہی محدود نہیں بلکہ جاپانی کارپوریشنوں کے سربراہ بھی نوجوانوں میں عدم تنظیم، ناپاسداری وقت، ادارے سے غیر وابستگی اور گرتی ہوئی کارکردگی پر تلملاتے رہتے ہیں، حتیٰ کہ سوویت یونین میں درمیانی طبقے

کے والدین کو بھی ایسی ہی صورت حال کا سامنا ہے۔

کہیں روایتی نسلی نفادت تو نہیں؟ یا کوئی اور نئی بات ہے؟ کیا نوجوانوں اور ان کے والدین ایک ہی ''حقیقی دنیا'' کی بات تو نہیں کر رہے؟ دراصل جو کچھ ہماری آنکھوں کے سامنے ہے وہ حقیقت پسند بوڑھوں اور رومانی نوجوانوں کے مابین کوئی تاریخی مقابلہ نہیں، درحقیقت، جو چیز آج حقّی ہے، وہ کل حقیقی نہیں بھی ہوسکتی، چونکہ رویوں کا بنیادی ضابطہ۔۔۔۔جس میں سماجی زندگی کے بنیادی اصول ہوتے ہیں۔۔۔۔تیسری لہر کی اسراعی آمد کے ساتھ ساتھ، انتہائی تیزی سے بدل رہا ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ دوسری لہر اپنے ساتھ اصول وضوابط کا ایک پلندہ لائی جو ہر شخص کے رویئے پر اثر انداز ہوا۔ یہ ضابطے معیار کے طور پر کاملیت کے ساتھ بیک وقت اور یکساں طور پر کاروبار، حکومت اور عام زندگی۔۔۔۔جن پر پابندی وقت اور تنظیم حاوی تھی۔۔۔۔میں بروئے کار لائے گئے۔

آج پھر ایک نیا ضابطہ تشکیل پا رہا ہے جو موجودہ متنوع جدید معیشت، ذرائع ابلاغ، خاندان اور کارپوریٹ زندگی کے لئے نئے اصول بنائے گا۔مختلف النوع اجتماعات میں بوڑھوں اور جوانوں کے درمیان اختلاف کی اصل وجہ، ضابطہ عمل کے انتخاب پر عدم اتفاق ہے۔ یہ نیا ضابطہ دوسری لہر کے بیشتر نظریات کی نفی کرتا ہے۔مثلاً پابندی وقت۔ وقتی ہم آہنگی، معیاریت، مرکزیت اور پیشہ ورانہ تخصیص۔ہمیں ان سب مفروضات کو حقیقی نظر سے جانچنا ہے، نئے اور پرانے کا موازنہ کرنا ہے اور اس الجھن آمیز کشمکش اور تناؤ کو سمجھنا ہے، جو ہمیں گھیر گھار کر، ہماری توانائیوں اور عزت نفس کا للکار رہی ہے۔

نو سے پانچ بجے کا خاتمہ

ذرا ان والدین کی یاسیت اور دل برداشتگی کا اندازہ کریں۔ جنہوں نے دوسری لہر کی مشینی تہذیب میں، سونے جاگنے، کھانے پینے، دفتر آنے جانے، کام اور تفریح غرض ہر عمل میں پابندی اوقات کو اپنا کر، خود کو مشینی ارتعاش سے ہم آہنگ کر لیا تھا۔ اوائل عمر میں ہی پابندی وقت احساس شعور کا حصہ بنا دیا گیا۔ وہ متعجب ہوتے ہیں کہ ان کے بچے وقت کی پاس داری کیوں نہیں کرتے' وہ نو سے پانچ بجے تک کام کرنے میں عار کیوں سمجھتے ہیں۔ جب کہ وہ ماضی میں اسی طرح۔۔۔۔بغیر کسی اعتراض کے۔۔۔۔کام کرتے رہے ہیں۔

MashalBooks.org

دراصل تیسری لہر میں وقت کا مفہوم بالکل بدل گیا ہے۔ دوسری لہر نے زندگی کو مشینی رفتار سے ہم آہنگ کیا تھا لیکن تیسری لہر، میکانکی آہنگ کو چیلنج کر کے ہمارے بنیادی سماجی اتار چڑھاؤ کو بدل کر ہمیں مشین سے نجات دلا رہی ہے۔ یہ بات ذہن نشین ہو تو ہمیں یہ جان کر خوشی ہو گی کہ 1970ء کے عشرے میں ایک اسراعی تبدیلی ہوئی تھی اور وہ تھی ''لچکدار اوقات'' اس کے تحت مزدور ایک مخصوص حد میں اپنے اوقات کار خود منتخب کر سکتے تھے۔ مزدوروں اور کارکنوں کے بیک وقت فیکٹری یا دفتر پہنچنے کے بجائے، لچکدار اوقات اپنانے والے ادارے چند ایسے اوقات مقرر کر دیتے تھے جن کے دوران سارے کارکنوں کی کام پر حاضری لازمی تھی اور باقی اوقات اختیاری تھے، یعنی ہر کارکن اپنی آسانی اور سہولت کے مطابق باقی اوقات کا انتخاب کر سکتا تھا۔ جیسے سحر خیز لوگ آٹھ بجے صبح اپنے کام کا آغاز کر سکتے تھے اور رات کو دیر تک جاگنے والے، صبح دس، ساڑھے دس بجے اپنے کام پر آ سکتے تے۔ اس طرح کارکنوں کو گھریلو کام کاج، خریداری یا بچے کو ڈاکٹر کے پاس لے جانے کا وقت مل سکتا ہے۔ اگر وہ اپنا پسندیدہ کھیل صبح یا دوپہر کو کھیلنا چاہتے ہوں تو اس کے مطابق اپنے اوقات کار میں تبدیلی لا سکتے ہیں۔ قصہ مختصر، وقت کی بھی تخصیص ہونے لگی ہے۔

1965ء میں ''لچکدار اوقات'' کی تحریک اس وقت شروع ہوئی جب ایک جرمن معیشت دان کرسٹل کیمر نے زیادہ سے زیادہ ماؤں کو ملازمتوں کے میدان میں لانے کے لئے یہ تجویز پیش کی۔ 1967ء میں جرمن ہوائی جہاز بنانے والی کمپنی ''ڈوئچے بوئنگ'' نے محسوس کیا کہ اس کے کارکنوں کو بروقت کام پر پہنچنے کے لئے سخت رش والی ٹریفک سے گزرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ اس کے ناظموں نے اپنے کارکنوں کو معینہ اوقات سے انحراف کر کے، اپنے اوقات کار کے چناؤ کا حق دے دیا۔ دو سال کے اندر اندر بارہ ہزار کارکنوں نے لچکدار اوقات اختیار کر لئے۔ کمپنی کے کچھ شعبوں نے تو متعین اوقات۔۔۔۔ جب ہر کارکن کی حاضر لازمی تھی۔۔۔۔ بھی ختم کر ڈالے۔

1972ء میں ''یوروپا'' نامی رسالے نے رپورٹ شائع کی کہ۔۔۔۔ لگ بھگ دو ہزار جرمن کمپنیوں میں منضبط اوقات کار کا قومی تصور ناپید ہو گیا ہے۔۔۔۔ اور اس کی وجہ لچکدار اوقات کا متعارف کیا جانا ہے۔ 1977ء تک 50 لاکھ جرمن کارکن لچکدار اوقات اپنا

MashalBooks.org

چکے تھے۔ فرانس، فن لینڈ، ڈنمارک، سویڈن اور پولینڈ کی 22 ہزار کمپنیاں، اپنے چالیس لاکھ ملازموں سمیت اس نظام کو اپنا چکی تھیں۔15 فیصد سے 20 فیصد سوئس صنعتی کمپنیاں بھی اس نظام کی جانب گامزن تھیں۔ جلد ہی یورپ سے باہر بین الاقوامی کمپنیوں نے بھی یہ نظام اپنانا شروع کر دیا۔ نیسلے اور لفتھانزا نے امریکہ میں اپنی تمام سرگرمیوں کے لئے یہی لچکدار اوقات اپنائے۔ ان دنوں امریکہ کی 13 فیصد کمپنیاں لچکدار اوقات کو اختیار کر چکی تھیں۔ امریکی تنظیم ساز ایسوی ایشن کی ایک تحقیق کے مطابق جلد ہی یہ شرح 17 فیصد ہو جائے گی، جس سے 80 لاکھ کارکن مستفید ہوں گے۔

دوسری لہر کی حامی چند دقیانوسی مزدور تنظیموں نے اس نظام کا راستہ روکنا چاہا مگر مزدوروں نے انفرادی طور پر لچکدار اوقات کو اپنے لئے زیادہ کارآمد پایا۔ لندن کی ایک انشورنش کمپنی کے مطابق، نوجوان شادی شدہ خواتین نے یہ نظام بہت پسند کیا۔ ایک سوئس سروے کے مطابق 95 فیصد کارکن نئے نظام کے حامی ہیں۔ 35 فیصد مردوں نے تو یہ کہا کہ اس اختیاری نظام کی وجہ سے وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ زیادہ وقت گزار سکتے ہیں۔

ایک شادی شدہ حبشی خاتون کو بوسٹن کے ایک بینک سے کام پر تاخیر سے پہنچنے کی وجہ سے، نوکری سے جواب ملنے ہی والا تھا کہ بینک نے لچکدار اوقات کا نظام اپنا لیا۔ چنانچہ اس کا دفتر دیر سے آنا، قابل اعتراض نہیں رہا۔ خاتون کو بینک پہنچنے سے پہلے اپنے منجھلے بیٹے کو اسکول چھوڑنا ہوتا تھا اور اسی وجہ سے وہ اپنے دفتر لیٹ پہنچتی تھی (تاہم نسلی امتیاز والوں نے اس کی سیاہ رنگت کو، اس عادت کے لئے ذمہ دار ٹھہرایا تھا)۔

آجروں نے، اپنے طور پر لچکدار اوقات کے نتیجے میں بلند شرح پیداوار، کام سے کم غیر حاضری اور دوسرے فوائد کو محسوس کیا۔ ہر جدت طرازی میں کچھ نہ کچھ مشکلات تو ہوتی ہیں لیکن امریکی تنظیم ساز ایسوسی ایشن کے ایک مطالعہ کے مطابق صرف 2 فیصد کمپنیوں نے اس نظام کو آزمانے کے بعد رد کیا۔ لفتھانزا کے ایک منیجر نے بڑے معنی خیز انداز میں تبصرہ کیا۔ ''پابندی وقت نام کے کسی مسئلے کا کوئی وجود ہے ہی نہیں''۔

بے خواب دیو:

اگرچہ لچکدار اوقات کی بے پناہ تشہیر ہو رہی ہے لیکن یہ دوسری لہر کے ہمراہ آئے

وقت کی تشکیل نو کا محض معمولی سا حصہ ہے۔ رات کے کام کا رواج تیزی سے بڑھتا جا رہا ہے۔ یہ بات صرف ایکرون یا بالٹی مور جیسے صنعتی شہروں سے ہی مختص نہیں بلکہ خدمات کے تیزی سے پھیلتے ہوئے شعبے یا کمپیوٹر کی ترقی یافتہ صنعت میں بھی لچکدار اوقات کا رواج پا رہے ہیں۔ فرانسیسی اخبار لی موندے کے مطابق جدید شہر وہ دیو ہے جو جاگتا رہتا ہے اور اس میں۔۔۔شہریوں کا معتدبہ حصہ عمومی اوقات کار سے ہٹ کر کام میں مصروف ہوتا ہے۔ صنعتی ملکوں میں رات کے دوران کام کرنے والے کارکنوں کی تعداد 15 سے 25 فیصد کے درمیان ہے۔ فرانس میں ایسے کارکن 1957ء میں صرف 12 فیصد تھے جو 1974ء میں 21 فیصد ہو گئے۔ اور 1977ء کے درمیان، امریکہ میں یہ شرح 13 فیصد سے بڑھ گئی اس طرح کارکنوں کی کل تعداد، جز وقتی ملازمین سمیت، ایک کروڑ 35 لاکھ تک پہنچ گئی۔ جز وقتی کارکنوں میں اس سے بھی زیادہ اضافہ ہوا۔ ڈیٹرائٹ میں، کے جے ایل ہڈسن سٹورز کے 5 6 فیصد کارکن جز وقتی ہیں۔ امریکہ اور کینیڈا میں پروڈیشنل انشورنس کمپنی میں 1600 جزوقتی ملازم ہیں۔ امریکہ میں ہر پانچ کارکنوں میں سے ایک رضا کارانہ طور پر جزوقتی کام کرنے والا ہے۔ 1954ء سے جزوقتی ملازمتوں میں اضافہ ہمہ وقتی ملازمتوں کی نسبت دگنا رہا ہے جارج ٹاؤن یونیورسٹی کی ایک تحقیق کے مطابق، یہ نظریہ اتنا مقبول ہوا کہ آنے والے دور میں ساری ملازمتیں ہی جز وقتی ہوا کریں گی۔ اس سلسلے میں 68 کمپنیوں کے ضروری کوائف اکٹھے کئے گئے، جہاں نصف کارکن جزوقتی کام کر رہے تھے۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ گزشتہ بیس سال میں جزوقتی ملازمتوں کا پھیلاؤ کی وجہ سے روزگار کے مواقع دگنے ہو گئے۔ جزوقتی ملازمتوں کا پھیلاؤ خواتین، بزرگوں اور نوجوانوں کو خصوصاً پسند آیا کیونکہ وہ کم تنخواہ پر ترجیحاً اس طرح کا کام کرتے تا کہ انہیں اپنے مشاغل، کھیل یا مذہب، سیاست یا فنون لطیفہ کے لئے زیادہ وقت مل سکے۔

یہ دوسری لہر کے اصول یکسانیت یا ہم آہنگی سے ذرا لگا نیں کھاتا۔ لچکیلے اوقات، جزوقتی کام اور رات کے وقت کام کرنا۔۔۔ ان سب سے ظاہر ہے کہ لوگ نو سے پانچ بجے تک کام کرنا پسند نہیں کرتے۔ مزید برآں سارا سماج ہی چوبیس گھنٹے کی عملیت کی جانب گامزن ہے۔ پیداواری ٹائم فریم میں تغیرات کے ساتھ، صارفین کی ترجیحات میں بھی

متوازی تبدیلیاں ہوتی نظر آ رہی ہیں۔ رات رات بھر کھلی روشن اور جگمگاتی مارکیٹوں پر نظر ڈالئے۔ کیلی فورنیا میں چار بجے صبح بھی خرید و فروخت ہو سکتی ہے۔ جلد ہی مشرقی ساحلی ریاستیں بھی اسی رنگ میں رنگی جائیں گی۔

امریکہ کے مشرقی علاقے میں سپر مارکیٹ کے ایک سلسلے(Chain) کے ترجمان کا کہنا ہے کہ اس کی کمپنی تمام رات اپنی دوکانیں کھلی رکھے گی کیونکہ لوگ پہلے کی نسبت اب رات گئے تک جاگتے ہیں۔ ٹائمز کے فیچر رائٹر نے ایسے ہی ایک سٹور پر پوری رات گزار کر یہ دیکھا کہ کتنی مختلف قسم کے لوگ، ان تاخیری اوقات کا فائدہ اٹھاتے ہیں: ایک ٹرک ڈرائیور، جس کی بیوی بیمار ہے، اپنے گھر کے چھ افراد کے لئے خریداری کر رہا ہے۔ ایک خاتون۔۔۔۔ جو اپنے دوست سے طے شدہ ملاقات سے پہلے۔۔۔۔ اپنی نیک خواہشات کے اظہار کے لئے کارڈ خرید رہی ہے۔ ایک باپ، جسے رات بھر اپنی بیمار بیٹی کی تیمارداری کرنا ہے، بیٹی کے لئے کھلونے لے رہا ہے۔ ایک خاتون سرامکس کی کلاس ختم کر کے، اپنے کھانے پینے کے سامان کی، ہفتہ بھر کی خریداری کرنے آئی ہے۔ ایک نوجوان موٹر سائیکل سوار صبح سویرے تین بجے کے لگ بھگ تاش خریدنے چلا آ رہا ہے۔ دوست علی الصبح مچھلی کے شکار کے لئے جاتے ہوئے سٹور میں آ گھسے۔

اس طرح کھانے پینے کے اوقات میں بھی ہم آہنگی اور یکسانیت ختم ہوتی جا رہی ہے۔ لوگ ایک ہی وقت میں کھانا نہیں کھاتے، برگر کی طرح کا فوری کھانا، جب چاہیں مل جاتا ہے۔ اس سے کھانے کے تین اوقات کا پرانا تصور بھی ٹوٹتا جا رہا ہے۔ ٹی وی دیکھنے کی عادتوں میں تبدیلی آ رہی ہے چنانچہ شہری جوانوں، رات کے کارکنوں اور بے خوابی میں مبتلا عام لوگوں کے لئے، ٹی وی کے خصوصی پروگرام، خاص اوقات میں پیش کئے جاتے ہیں۔ دریں اثناء بینک بھی اپنے متعین اوقات کار سے ہٹ کر کر لچکدار اوقات میں جانب پیش رفت کر رہے ہیں۔

مین ہٹن سٹی بینک اپنی خود کار بینکاری کے ایک ٹی وی اشتہار میں، زور شور سے اعلان کرتا ہے: آپ عنقریب بینکاری میں ایک انقلابی آغاز کا مشاہدہ کرنے جا رہے ہیں۔ یہ ہے سٹی بینک کی چوبیس گھنٹے کی سروس۔۔۔۔ جب آپ چاہیں، اپنا روز مرہ کا بینکنگ کام

MashalBooks.org

نمٹا سکتے ہیں۔ ڈان سلیٹر صاحب اگر صبح سویرے اپنے کھاتے کا بیلنس معلوم کرنا چاہتے ہوں تو ایسا ممکن ہے، اور برائن ہالینڈ جب بھی چاہیں، اپنے کھاتے سے رقم نکلوا سکتے ہیں۔ آپ اور میں جانتے ہیں کہ زندگی سوموار سے جمعہ تک تین بجے دوپہر کے بعد رکتی نہیں۔۔۔سٹی بینک کو کبھی نیند نہیں آتی۔ آج کل دفتر اوقات میں ایسی تبدیلیاں آ رہی ہیں جو ہمارے طرز زندگی کو دوسری لہر کے آہنگ سے توڑ کر ایک نئی آفاقی سمت دے رہی ہیں، وقت کی یہ تخصیص، دوسری تبدیلیوں۔۔۔ جو تیسری لہر کی معاشی زندگی کے دوسرے شعبوں میں نظر آ رہی ہیں۔۔۔ کے عین متوازی ہے۔

دوست کے ساتھ پروگرام

وقت کی ازسرنو تشکیل کے سماجی نتائج کا کچھ کچھ احساس ہمیں ہونے لگا ہے۔ اختیاری اوقات کار کی وجہ سے کچھ عملی مشکلات ضرور کم ہوئیں لیکن اس سے فرد کی تنہائی اور سماجی علیحدگی میں اضافہ بھی ہوگا۔ اگر افراد خانہ اور دوست سب مختلف اوقات میں اپنے کام پر آنا جانا شروع کر دیں گے تو ایک دوسرے کے ساتھ کس وقت مل بیٹھیں گے۔ کلب، گرجا، سکول کا کھیل کا میدان یا نکڑ کا ہوٹل۔۔۔ ان سب کی روایتی اہمیت خاصی کم ہو جائے گی۔ ان کی جگہ تیسری لہر کے نئے اداروں کی تشکیل لازمی ہے تاکہ سماجی زندگی بے کیف اور بے معنی نہ ہو جائے۔ مثلاً کمپیوٹر کا خدماتی نظام۔۔۔ جو نہ صرف آپ کے مصروفیات آپ کو یاد دلائے بلکہ آپ کے دوستوں اور اہل خاندان کی سرگرمیوں کے متعلق معلومات بھی رکھے تاکہ کوئی بھی محض ایک بٹن دبا کر یہ جان سکے کہ فلاں شخص سے کس وقت اور کہاں ملاقات ممکن ہوگی۔

وقت کی تخصیص کے اور بھی کئی اثرات ہوں گے۔ مثلاً دوسری لہر کے غیر لچکدار اوقات کی وجہ سے صبح و شام یکساں اوقات میں سڑکوں پر ٹریفک کا بے حد رش نظر آتا ہے۔ وقت کی تخصیص سے زمان و مکان، دونوں میں، ٹریفک کا بہاؤ تبدیل ہو رہا ہے۔ مخصوص اوقات میں اگر صبح ایک سمت میں اور شام کو مخالف سمت میں ٹریفک کا بہاؤ نظر آئے تو ظاہر ہے وہاں دوسری لہر کی ہم آہنگی چھائی ہوئی ہے اور اگر ٹریفک کا بہاؤ دن بھر ہر سمت میں یکساں رہتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ اس جگہ تیسری لہر کی صفات جڑ پکڑ رہی ہیں اور وہاں صنعتی

مزدوروں کی نسبت شعبہ خدمات کے کارکنوں کی تعداد میں زیادہ اضافہ ہوا ہے۔ لچکدار اوقات مستعمل نظر آتے ہیں۔ جزوقتی اور شبینہ عملیت رائج ہوگئی ہے اور رات بھر کھلی رہنے والی کاروباری مصروفیت (سپر مارکیٹ، بینک، پیٹرول پمپ اور ریسٹوران) پھل پھول رہی ہے۔ لچکدار اوقات اور انفرادی اوقات کی وجہ سے توانائی کا صرف کم ہو رہا ہے، ماحولیاتی آلودگی میں بھی کمی آ رہی ہے۔

امریکہ کی بہت سی ریاستوں میں، بجلی کے نرخ اوقات کا مطابقت سے رکھے جاتے ہیں تا کہ کسی خاص وقت بجلی کا زیادہ استعمال نہ ہو۔ کنکٹیکٹ کے محکمہ ماحولیات نے کمپنیوں سے وفاقی ماحولیاتی معیار کی پاسداری کے لئے لچکدار اوقات اپنانے کی اپیل کی ہے۔ وقت سے متعلقہ تبدیلیوں کی یہ کچھ مثالیں ہیں۔ اس جانب ترقی کے ساتھ ساتھ آئندہ سالوں اور عشروں میں کہیں زیادہ طاقتور اور ماورائے فہم نتائج کی توقع کی جا سکتی ہے۔ ہماری روزانہ زندگی میں اس کی نت نئے اثرات مرتسم ہوں گے۔ فنون لطیفہ سے لے کر ہمارے اپنے جسم بھی اس تبدیلی کی لپیٹ میں آ جائیں گے کیونکہ کوئی انسانی عمل بھی وقت کے دائرے سے باہر نہیں۔

کمپیوٹر اور منشیات

گہری نفسیاتی، معاشی اور تکنیکی قوتیں، تیسری لہر کے نئے آہنگ کا منبع ہیں۔ یہ ایک سطح پر لوگوں کی تبدیل شدہ فطرت میں ابھرتی ہیں۔ آج کی پود۔۔۔اپنے والدین سے زیادہ خوشحال اور پڑھی لکھی اور متنوع زندگی سے آشنا۔۔۔ اجتماعی عمومیت اور ہم آہنگی سے انکاری ہے۔ اپنے پیداواری عمل اور کارخانہ عمل میں تنوع کی وجہ سے نہ صرف وہ اپنا انفرادی تشخص تسلیم کروا رہے ہیں بلکہ سماج کے نافذ کردہ عملی گوشاروں کے خلاف مزاحمت بھی کر رہے ہیں۔ دوسری سطح پر تیسری لہر کے انفرادی آہنگ کو، ہماری زندگی میں سرایت کرتی جدید ٹیکنالوجی کی وسعت میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً گھر بیٹھے، وی سی آر کے ذریعے ٹی وی پروگرام ریکارڈ کرنے کی صلاحیت کے ذریعے ہم جب چاہیں اپنا پسندیدہ پروگرام دیکھ سکتے ہیں۔ سٹیون برل نامی کالم نگار لکھتا ہے: اور دو تین سال میں غالباً ٹی وی اپنے ناظرین پر، اپنی مرضی کے اوقات ٹھونسنا ختم کر دے گا۔ بڑے بڑے ٹی وی نیٹ

ورکس۔۔۔۔ این بی سی، بی بی سی یا این ایچ کے۔۔۔۔ کی نشریات میں ہم آہنگی کی قوت ختم ہوتی جا رہی ہے۔ کمپیوٹر کا استعمال بھی ہمارے شیڈیولز اور وقت کے بارے میں ہمارے تصورات کو نئی شکل دے رہا ہے۔ دراصل کمپیوٹر ہی نے بڑی بڑی کمپنیوں میں لچکدار اوقات کو ممکن العمل بنایا ہے۔ اس ٹیکنالوجی کی وجہ سے ہزاروں انفرادی اوقات اور لچکدار اوقات کار کو ایک تانے بانے میں بننا ممکن ہو گیا ہے۔ ضروری معلومات تک ہماری رسائی اور بیک وقت یا مختلف اوقات میں اس کا تبادلہ یقینی بنا کر کمپیوٹر ہمارے ابلاغی نقوش بھی تبدیل کر رہا ہے۔

اس کی وضاحت کمپیوٹر کانفرنس کرنے والوں کی روز افزوں تعداد سے کی جا سکتی ہے۔ لوگ گھر یا دفتر سے اپنے کمپیوٹر کے ذریعے اطلاعات کا باہمی تبادلہ کر سکتے ہیں۔ اطلاعاتی تبادلے کے الیکٹرانک سسٹم کی مدد سے مختلف ممالک کے لگ بھگ 660 سائنس دان، مستقبل کے ماہرین، تعلیم ساز اور منصوبہ ساز طرح طرح کے موضوعات پر طویل بحث و مباحث میں مصروف رہتے ہیں۔ ٹیلی پرنٹر یا ٹی وی سکرین کے ذریعے، ضروری اطلاعات کے فوری تبادلے کی سہولت ان کے پاس ہے۔ یوں مختلف علاقوں کے لوگ بالکل مختلف اوقات میں، اپنی سہولت کے مطابق جب چاہیں ضروری معلومات ارسال یا وصول کر سکتے ہیں۔ کوئی شخص چاہے تو صبح تین بجے بھی کام شروع کر سکتا ہے یا پھر بہت سے لوگ بیک وقت باہمی تبادلہ خیال کر سکتے ہیں۔ کمپیوٹر کے زیر اثر وقت کے متعلق ہماری سوچ پر خاصا گہرا اثر پڑا ہے۔ کمپیوٹر ہمارے لئے جدید ذخیرہ الفاظ ترتیب دے رہا ہے (مثلاً حقیقی وقت جیسی اصطلاحات) اور یہ عمل ہماری زندگی کے واقعات کو نیا رنگ اور عنوان دے کر ہمارے خیالات اور تصورات کو زیادہ واضح کر رہا ہے۔ اوقات کار اور رفتار کار کے تعین میں کمپیوٹر، گھڑی کی جگہ لیتا جا رہا ہے۔

کمپیوٹر انتہائی سرعت سے کام سر انجام دیتا ہے۔ اسی لئے ہم اسے وقت کی لاشعوری رفتار۔۔۔۔ انسانی حسیات کے لئے انتہائی مختصر وقفے جنہیں تلاش کرنا تو درکنار انسانی اعصاب ان کی رفتار کا اندازہ ہی نہیں کر سکتے۔۔۔۔ کا نام دیتے ہیں۔ آج کل مائیکرو کمپیوٹر سے چلنے والی پرنٹنگ مشین دس بیس ہزار لائنیں ایک منٹ میں چھاپ سکتی ہے،

یعنی شخصی مطالعاتی رفتار سے 200 گنا تیز رفتار اور یہ ذہن میں رہے کہ یہ کمپیوٹر کا سست ترین عمل ہے۔ 20 سال کے دوران سائنس دان ملی سیکنڈ (ایک ہزار واں حصہ سیکنڈ) سے کہیں آگے نینو سیکنڈ (ایک ارب واں حصہ) کی تقسیم تک جا پہنچے ہیں۔ وقت کا سکڑاؤ ہماری تصوراتی حدوں سے بھی ماوراء ہے۔ عام فہم تقابلی جائزہ اس طرح دیکھئے کہ کسی شخص کی 80.000 گھنٹے پر محیط عملی زندگی (اگر اوسط عمر 40 سال ہو اور 2000 گھنٹے سالانہ اوسط عمل ہو) کو صرف 48 منٹ کے مختصر وقفے میں اکٹھا کر دیا جائے۔ کمپیوٹر کے علاوہ بھی اور کئی اشیاء اور ٹیکنالوجیز وقت کی تخصیص کا باعث بن رہی ہیں۔ کیف آگیں ادویات کا استعمال وقت کے بارے میں ہمارے محسوسات میں تبدیلیاں پیدا کرتا ہے۔ اچھی قسم کی منشیات کی دریافت یا ایجاد سے اچھے یا برے وقت کا دورانیہ بھی ایک شخصی تجربہ ہو کر رہ جائے گا جو ہر فرد کے لئے مختلف ہوسکتا ہے۔

دوسری لہر کے دوران مشین اور انسان میں ایک بے ہودہ ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ صنعتی پیداواری سلسلے اور کارکنوں کے عمل میں یکسانیت ابھاری گئی۔ اس کے بے شمار معاشی فوائد بھی حاصل ہوئے۔ اب مشینوں کی ہم آہنگی اپنی اعلیٰ ترین سطح پر ہے اور تیز ترین کارکن بھی مشینی رفتار کے آگے بے بسی کا شکار ہو رہا ہے۔ اس سریع الاثر ٹیکنالوجی کا فائدہ اٹھانے کے لئے انسان اور مشینی ہم آہنگی کا خاتمہ ضروری ہے۔ باالفاظ دیگر دوسری لہر نے انسان کو مشین کے رحم وکرم پر چھوڑ کر ہر جانب جبری یکسانیت کو جنم دیا تھا۔ سرمایہ دار اور اشتراکی دونوں معاشروں میں کم وبیش یہی عمل دہرایا گیا۔ اب مشینی ہم آہنگی اعلیٰ ترین سطح کو چھو لینے کے بعد انسان کو مشین کے جبر سے آزادی دلا رہی ہے۔

ہماری زندگی میں پابندی وقت کے مفہوم میں تبدیلی بھی اسی تغیر کا نفسیاتی اثر ہے۔ ہم ہمہ گیر پابندی وقت کے بجائے منتخب یا صورت حال سے مطابقت رکھتی پابندی وقت کی جانب گامزن ہیں۔ وقت کی پاس داری کا مفہوم۔۔۔۔ ہمارے بچوں کو شاید اس کا احساس ہی نہیں۔۔۔۔ اب وہ نہیں رہا جو پہلے ہوا کرتا تھا۔ ہمیں پتہ ہے کہ پہلی لہر کی زرعی تہذیب میں پابندی وقت کا کوئی مفہوم نہیں تھا اور اس کی وجہ عمل میں باہمی انحصار کا نہ ہونا تھا۔ دوسری لہر کے دوران کسی ایک کارکن کے دیر سے کام پر پہنچنے سے ساری فیکٹری یا دفتر

MashalBooks.org

کی کارکردگی متاثر ہوتی۔ اسی لئے پابندی وقت ایک اہم ثقافتی اصول کی حیثیت سے ابھری۔

تیسری لہر کے انفرادی اوقات کی آمد کے ساتھ ہی کام پر دیر سے آنے کے اثرات غیر اہم ہو گئے۔ دیر سے پہنچنے سے کچھ ساتھیوں کا حرج تو ہو سکتا ہے لیکن بعض خصوصی کاموں کو چھوڑ کر پیداواری عمل پر اس کے اثرات گھٹتے جا رہے ہیں۔ نئی پود کو یہ سمجھانا ہمارے لئے خاصا مشکل ہے کہ پابندی کب واقعی ضروری ہے اور کب صرف عادتاً یا رواداری کی حد تک۔ چند مخصوص سرگرمیوں کے سوا جن میں پابندی وقت اہم ہے کمپیوٹر کا عمل دخل اور چوبیس گھنٹے کے کاروباری اوقات متعارف ہونے کے بعد بہت کم کارکنوں کی کارکردگی کا انحصار وقت کی پابندی پر رہ گیا ہے۔ چنانچہ پابندی وقت کا تکلف ختم ہوتا جا رہا ہے اور خصوصاً نوجوانوں میں یہ عمل اخلاقیات کی طرح محض معروضی حقیقت بنتا جا رہا ہے۔

الغرض تیسری لہر کے پھیلاؤ کے ساتھ دقیانوسی پیداواری طریقے متروک ہو رہے ہیں اور وقت کے ساتھ ساتھ سارے تہذیبی رشتوں میں تغیرات آ رہے ہیں۔ زندگی کو اجیرن کر دینے والی دوسری لہر کی میکانکی ہم آہنگی اب اپنے اختیار پر ہے۔ نو سے پانچ کے اوقات کار کے لئے ناپسندیدگی کا اظہار کرنے والے نوجوان شاید اپنے رویوں کی توجیہہ نہ کر پائیں لیکن اب وقت خود بدل گیا ہے اور ہم اس سے متعلقہ ضابطوں میں بھی تبدیلیاں لے آئے ہیں۔

معیار پسند ذہنیت کے بعد

تیسری لہر کی یکسانیت اور ہم آہنگی کے ہی نقوش زائل نہیں کر رہی بلکہ اس کے ایک اور بنیادی ضابطے ''معیاریت'' میں بھی تبدیلی لا رہی ہے۔ دوسری لہر کے خفیہ سماجی ضابطے نے اقدار، اوزان، فاصلوں، پیمائشوں، کرنسیوں، اشیاء اور قیمتوں میں ''معیاریت'' کو نافذ کیا۔ اس کے تاجروں نے بڑی محنت سے ہر اچھی چیز میں یکسانیت پیدا کرنے کی کوشش کی لیکن آج کا تاجر معیار کی بجائے گاہک کی پسند کے مطابق کم قیمت پر اشیاء بنا کر فروخت کرنا چاہتا ہے اور اس کے لئے مناسب ترقی یافتہ ٹیکنالوجی ڈھونڈتا ہے۔ تنوع کے رواج کے ساتھ ملازمتوں میں یکساں نوعیت کے عمل کے کارکنوں میں کمی ہوتی جا رہی ہے۔

ہر مزدور کی اجرت اور اضافی آسائشات میں فرق پیدا ہونے لگا ہے۔ مزدور خود بھی ایک دوسرے سے مختلف ہونے لگے ہیں اور چونکہ وہ اور ہم سبھی روایتی پیداوار کے بجائے متوازی تخصیص مارکیٹنگ، اشیاء کی تھوک خرید اور اصراف میں نمایاں ہوتی جا رہی ہے۔ صارفین خریدیاری میں اپنی پسند کا اظہار صرف ان اشیاء سے اپنی نفسیاتی مادی ضروریات کی تکمیل کی صلاحیت کی وجہ سے نہیں کرتے بلکہ اپنی مطلوبہ اشیاء و خدمات کی وسیع تر ترتیب میں اس کی موزونیت کا بھی خیال رکھتے ہیں۔ یہ انتہائی انفرادی شکلیں، اپنی پیدا کردہ طرز ہائے زندگی کی طرح عبوری ہوتی ہیں۔ پیداوار کی طرح صرف کی بھی خاص شکل ہوتی ہے۔ معیاری پیداوار کے بعد کا دور اپنے ساتھ بعد از معیاری اصراف بھی لا رہا ہے۔

دوسری لہر کے زمانے کی معیاری قیمتیں بھی اب کم معیاری ہو رہی ہیں کیونکہ شخصی خواہشات کے مطابق بنائی گئی اشیاء کی قیمتیں بھی ظاہر ہے مختلف ہونگی۔ گاڑی کی قیمت اس میں لگی ہوئی اشیاء کے مطابق مختلف ہو گی۔ اسی طرح ہائیفائی سیٹ کی قیمت کا انحصار بھی اس کی اپنی قوت اور صارف کی مرضی کے مطابق متنوع اضافی اشیاء پر ہو گا۔ ہوائی جہاز، بحری آئل فیلڈز کے پلیٹ فارم، کمپیوٹر اور دوسری ترقی یافتہ ٹیکنالوجی میں ہر اکائی کی قیمت علیحدہ علیحدہ ہوتی ہے۔ میدان سیاست میں بھی یہی کچھ ہو رہا ہے۔ جوں جوں قومی انفاق رائے کا فقدان بڑھ رہا ہے، آراء کا معیار بھی گھٹتا جا رہا ہے۔ ہزاروں نئے نئے گروہ اپنے مقاصد کے حصول کی جنگ میں مصروف ہیں۔ یوں تہذیب کے معیاروں میں بھی تصادم ہو رہا ہے۔

تیرہویں باب میں مذکور، ذرائع ابلاغ کے متعارف ہونے کے بعد وسیع پیمانے کی ذہنیت میں ٹکراؤ ہو رہا ہے۔ ذرائع ابلاغ کی تخصیص کا اظہار چھوٹے چھوٹے رسالوں، فوٹو سٹیٹ کاپیوں، نیوز لیٹرز، کے ساتھ ساتھ کیبل، کیسٹ، ٹی وی اور کمپیوٹر کی آمد سے ہو رہا ہے۔ اس طرح دوسری لہر کی ٹیکنالوجی سے قائم شدہ تصور ''معیاریت'' ختم ہوتا جا رہا ہے۔ مختلف طرح کے تصورات، افکار، اقدار اور استعارے سماج میں پھیلائے جا رہے ہیں۔ ہم اپنی مرضی کی بنی ہوئی اشیاء استعمال کر رہے ہیں اور ساتھ ہی دنیا کو اپنی خواہش کی شکل دینے کے لئے متنوع استعارے بھی استعمال کر رہے ہیں۔ جرمن قومی آرٹ گیلری کے ڈائریکٹر ڈائٹر ہانش کا نقطہ نظر آرٹ نیوز نامی رسالے میں اس طرح دیا گیا ہے۔ ''ضروری

نہیں کہ کولون میں پسند کی جانے والی شے کو میونخ بھی قبول کرے یا سٹٹ گزٹ میں کامیاب ہونے والی شے ہیمبرگ کے لوگوں کو بھی قابل قبول ہو۔ گروہی مفادات کی حکمرانی کی بدولت قومی ثقافت کا احساس ہی ختم ہوتا جا رہا ہے۔'' پروٹسٹنٹ فرقے کے امریکی جریدے ''موجودہ میسحیت'' کے ایڈیٹر نے ثقافتی تخصیص اور لامعیاریت کو بڑے دلچسپ انداز میں اجاگر کیا ہے۔ اپنے ایک حالیہ مضمون میں انہوں نے لکھا۔ ''انجیل کے ان گنت تراجم سے بہت سے عیسائی خاصے پریشان ہیں۔ ماضی میں اتنی مختلف قسم کے ترجے ملنے کا سوچا بھی نہ جا سکتا تھا۔ تاہم ہم ان میں سے کسی ترجے کو بھی معیاری قرار نہیں دے سکتے۔'' انجیل کے ترجے جیسے تنگ حدود میں بھی مذہب کی طرح معیار کا تصور ختم ہو رہا ہے۔ ہماری پسند کی طرح ہمارے عقائد میں بھی یکسانیت اور ہم آہنگی کم ہوتی جا رہی ہے۔ چنانچہ ہم ہکسلے یا آرویل کی پیش کردہ غیر انفرادی بے نام اور غیر انسانی دوسری لہر کی تہذیب سے جان چھڑا کر متنوع طرز زندگی اور اعلیٰ انفرادی تشخص کی جانب پیش قدمی کر رہے ہیں ہم ''معیاریت کے زمانے کے بعد کی ذہنیت'' اور ''بعد از معیاریت عوام'' کو ابھرتے دیکھ رہے ہیں۔

اس دور کے اپنے مخصوص سماجی، نفسیاتی اور فلسفیانہ مسائل ہوں گے جن میں سے بعض، ہمیں اپنے گرد پھیلتی تنہائی اور سماجی اکیلے پن میں محسوس بھی ہو رہے ہیں لیکن یہ دوسری لہر کی ہم آہنگی کے نتیجے میں آنے والی مشکلات سے قدرے مختلف ہیں۔

ترقی یافتہ ممالک میں بھی تیسری لہر ابھی پوری طرح غالب نہیں آئی۔ اسی لئے دوسری لہر کی طاقتور کشش ہمیں اپنی جانب کھینچتی محسوس ہوتی ہے، دوسری لہر کے بعض کاروبار ایسے ہیں جن کا کچھ حصہ ابھی تکمیل طلب ہے۔ مثلاً، امریکہ میں مجلد کتابوں کا کام اب وسعت کی اس طرح پر آیا ہے جو بغیر جلد والی کتابوں کے اور دوسری بہت سی اشیائے صرف کے کاروبار نے سالوں پہلے حاصل کر لیا تھا۔ دوسری لہر کی کچھ تحریکیں تو اب شیخ چلی کا خواب لگتی ہیں۔ مثلاً امریکی نظام پیمائش کو اس مرحلے پر یورپی نظام سے منطبق کرنے کے لئے، اعشاری نظام اپنانے کی تحریک یا نوکر شاہی کے بلند و بالا ایوانوں میں، برسلز میں موجود مشترکہ منڈی کے ناخداؤں کی طرح۔۔۔۔ گاڑی کے شیشوں سے لے کر کالج کے ڈپلوموں

تک۔۔۔۔ ہر شے میں ہم آہنگی کی شدید خواہش۔

آج بھی امریکہ میں بعض تحریکیں وقت کو پیچھے لے جانے کی شدید جدوجہد میں مصروف ہیں۔ مثلاً امریکی سکولوں میں ابتدائی طور پر طریقوں کی جانب مراجعت کا سلسلہ۔ اگرچہ امریکہ کی عمومی تعلیم میں بے پناہ خرابیاں ہیں تاہم ان کا حل سکولوں میں یکسانیت پیدا کرنا نہیں بلکہ تخصیصی سماج میں موزوں اور نئی حکمت عملی بنانے میں ہے۔ ہم آہنگی کے نفوذ کی یہ سب تحریکیں ایک مرتی ہوئی تحریک کے آخری عوامل ہیں یہ تیسری لہر زندگی کو معیار کے سانچوں میں ڈھالے جانے کے بجائے مزید متنوع بنانے پر زور دیتی ہے۔ خود کار پیداوار کی طرح یہی بات ہمارے تصورات، سیاسی وفاداری، جنسی رویوں، تعلیمی طریقوں، غذائی عادات، مذہبی سوچ، نسلی رویوں، موسیقی کے مذاق، فیشن اور گھریلو ہیئت پر بھی صادق آتی ہے۔اس تاریخی موڑ پر دوسری لہر کا ایک کلیدی اصول۔۔۔۔''معیاریت'' اپنے اختتام کی جاب بڑھ رہا ہے۔

جدید قالب

صنعتی طرز کی ہم آہنگی اور معیاریت سے جس تیزی سے ہم نے جان چھڑائی ہے، اسے دیکھنے کے بعد، سماجی ضابطوں پر ہمارے نظر ثانی کے عمل کے متعلق کسی کو بھی حیرت زدہ نہیں ہونا چاہئے۔ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ ہر معاشرے کو کسی قدر مرکزیت اور لامرکزیت، دونوں کی ضرورت ہوتی ہے لیکن دوسری لہر کے دور میں اول لاذکر کو اہمیت دی گئی۔ ہملٹن، لینن اور روز ویلٹ تک ''معیاریت'' کے سبھی رہنماؤں نے مرکزیت پسندوں کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر ''صنعتیت'' کی تعمیر میں مدد دی۔ آج گنگا الٹی بہہ رہی ہے۔ نئی سیاسی جماعتیں، جدید طریق ہائے تنظیم اور نئے نظریات دوسری لہر کے مرکزیت کے اصول کو للکارتے ہوئے منظر عام پر آ رہے ہیں۔ کیلیفورنیا سے کیف تک لامرکزیت ایک سیاسی نعرے کی شکل اختیار کر چکی ہے۔

سویڈن میں لامرکزیت کی متعدد حامی جماعتوں نے مرکزیت پسند سوشل ڈیموکریٹ پارٹی کی چودہ سالہ حکومت کو انتخابات میں شکست دے دی۔ فرانس میں مرکزیت اور لامرکزیت پسندوں میں شدید کشمکش ہو رہی ہے۔ یہی حال برطانیہ میں بھی ہے۔ جہاں

MashalBooks.org

سکاٹ قوم پرستوں نے ''انتہائی لامرکزیت'' کا نعرہ لگا رکھا ہے۔ اسی طرح کی کئی تحریکیں مغربی یورپی ملکوں میں بھی چل رہی ہیں۔ نیوزی لینڈ میں حال ہی میں قائم شدہ ایک چھوٹی سی ویلیوز پارٹی کے منشور میں مقامی اور علاقائی حکومت کے اختیارات میں اضافے کا مطالبہ شامل ہے۔ وہ مرکزی حکومت کے حجم اور اختیارات میں کمی چاہتے ہیں۔ امریکہ میں بھی لامرکزیت کے حامی بڑھتے جا رہے ہیں۔ بعض تحریکیں تو ٹیکس کے خلاف (غلط یا صحیح) ملک گیر بغاوت میں شریک ہیں۔ شہری سطح پر بھی لامرکزیت مقبول ہو رہی ہے جس میں مقامی رہنما ''محلّہ جاتی طاقت'' پر زور دے رہے ہیں۔ ان میں بہت سے ایسے ہیں جو واشنگٹن کی حکومت کو کئی مقامی مشکلات میں مدد ہونے کے بجائے ان کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ امریکی تعمیرات اور شہری ترقی کی وزارت کے اسسٹنٹ سیکرٹری مونسائنر جینو بارونی۔۔۔۔ جو خود بھی شہری حقوق اور محلّہ جاتی قوت کے سرگرم حامی رہ چکے ہیں۔۔۔۔ کے مطابق یہ چھوٹے چھوٹے غیر مرکزی گروہ مشینی سیاست کی شکست و ریخت اور متنوع مقامی حالات اور لوگوں سے نمٹنے میں بڑی حکومت کی نا اہلیت کی عکاسی کرتے ہیں۔ نیویارک ٹائمز کا کہنا ہے۔ ''محلّہ جاتی قوت'' کے سرگرم حامی واشنگٹن اور ملک بھر میں فتوحات حاصل کرتے جا رہے ہیں۔

لامرکزیت کا یہی اصول برکلے، ییل (Yale) کی امریکی یونیورسٹی سے لندن کی تعمیراتی منصوبہ ساز ایسوسی ایشن تک سرایت کرتا جا رہا ہے، جہاں طلبہ مستقبل کی بستیوں کو جزوی طور پر خود کفیل کرنے ے لئے ماحولیاتی کنٹرول، شمسی حرات، یا شہری زراعت کے لئے نئی ٹیکنالوجیز کی جستجو میں لگے ہوئے ہیں۔ ان نوجوان منصوبہ سازوں اور تعمیراتی، ماہروں کے کام کے عملی نتائج اس وقت برآمد ہونا شروع ہوں گے۔ جب یہ سماج میں اپنے ذمہ دارانہ مقام پر پہنچیں گے۔ آج لامرکزیت کی اصطلاح انتظامی شعبوں میں استعاراتی حیثیت حاصل کر چکی ہے اور بڑی بڑی کمپنیاں اپنے شعبوں کو چھوٹے چھوٹے خود مختار ''منافع کے مراکز'' میں تبدیل کرنے کی دوڑ دھوپ میں لگی ہوئی ہیں۔ ایس مارک انکارپوریشن اس کی ایک عمومی مثال ہے۔ یہ خوراک، کیمیکلز، تیل اور انشورنس کا کاروبار کرتی ہے۔ حال ہی میں اس کی تنظیم نو۔۔۔۔ لامرکزیت کی بنیادوں پر۔۔۔۔ کر کے اس کے منافع کے ایک ہزار

MashalBooks.org

مختلف مراکز بنائے گئے ہیں۔ ان میں ہر مرکز اپنی تمام سرگرمیوں کا خود ذمہ دار ہے۔ ''ماضی میں ہماری کاروباری تنظیم مجموعہ اضداد تھی۔ ایس مارک کے چیئر مین رابرٹ رینی کا کہنا ہے۔ ''ہمارے پاس مشترکہ کاشوں کو آگے بڑھانے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ ہم اسے چھوٹے چھوٹے مراکز میں تقسیم کر دیں۔''

''فوری نتیجہ یہ ہوا کہ۔۔۔۔''بزنس ویک کا تجزیہ یوں تھا،''عمومی فیصلوں کا بوجھ رینی کر کے شانوں سے ہٹ گیا۔

اب ایس مارک کے مالی انتظامات کے سوا، ہر جگہ لامرکزیت کا مشادہ کیا جا سکتا ہے۔'' ایس مارک نے تو کئی بار اپنی تنظیم نو کی ہو گی۔ اہم بات یہ نہیں بلکہ اس میں موجود وہ رجحان ہے، جو رواج پا رہا ہے۔ ہزار ہا کمپنیاں، اپنی روز مرہ کاروباری سرگرمیوں پر مرکزی کنٹرول کو ختم کرنے کے لئے اپنی اپنی تنظیم نو کر رہی ہیں۔

دوسری لہر کی ایک عام کمپنی یا سرکاری شعبہ ایک فرد ایک افسر کے اصول پر منظّم تھا۔ ایک منتظم یا ملازم کے کئی ماتحت کارکن تو ممکن تھے مگر وہ خود ایک مالک کو ہی رپورٹ دیتا تھا۔ غرض ہر حکم کا نقطہ آغاز ایک ہی مرکز تھا۔ آج یہ سلسلہ اپنے ہی بوجھ تلے بری طرح لڑکھڑا رہا ہے۔ ترقی یافتہ صنعتوں، خدمات کے پیشوں اور کئی سرکاری شعبوں میں اس کے برعکس، اکثر لوگ ایک زیادہ ناظموں کو جواب دہ ہیں۔

میں نے اپنی پچھلی کتاب ''صدمہ مستقبل'' میں اشارتاً کہا تھا کہ دیوہیکل اداروں میں عارض نوعیت کے فعال یونٹ بنائے جا رہے ہیں۔ مثلاً؟ ٹاسک فورس، شعبہ جاتی کمیٹی، پراجیکٹ ٹیم وغیرہ۔ اس وقت میں نے اسے وقتی نظام سے موسوم کیا تھا۔ بعد میں کئی کمپنیوں نے ان عارضی تنظیموں کا ایک نیا ڈھانچہ۔۔۔۔ قالبی تنظیم۔۔۔۔ تشکیل دیا۔ اس میں مرکزی کنٹرول کے بجائے کثیر حکمی نظام چلتا ہے۔ اس تشکیل نو میں ہر کارکن ایک تنظیم کا رکن ہوتا ہے جو اپنے سربراہ کو روایتی طور پر رپورٹ کرتا ہے، ساتھ ہی اسے ایک عارضی ٹیم میں بھی شامل کیا گیا ہے۔ اس ٹیم کے ذمے وہ کام لگائے جاتے ہیں جو کوئی شعبہ تن تنہا نہیں کر سکتا، یوں ایک مثالی ٹیم میں صنعت، تحقیق، فروخت، انجینئرنگ، سرمایہ اور دوسرے شعبوں سے مختلف لوگ شامل ہو سکتے ہیں۔ اس ٹیم کا ہر رکن ٹیم کے قائد کو بھی رپورٹ کرتا ہے۔ چنانچہ

اب لاکھوں ملازمین ایسے ہیں جو نہ صرف ادارتی امور کے لئے اپنے باس کو رپورٹ کرتے ہیں بلکہ نتائج کے حصول کے لئے کارگزار ٹیم کے قائد کو بھی رپورٹ کرتے ہیں۔ اس طرح کارکنوں کو بیک وقت کئی امور پر توجہ دینے کا موقع مل جاتا ہے۔ اطلاعاتی بہاؤ میں اضافہ ہوتا ہے۔ کارکنوں کے مسائل کے حل میں اپنے شعبے سے ہٹ کر وسعت نظری بھی جنم لیتی ہے۔ ادارے کومختلف النوع اور سرعت انگیز تبدیلی حالات کی مزاحمت کی طاقت بھی ملتی ہے اور مرکزیت کا اصول بھی رد ہو جاتا ہے۔ قالبی طرز تنظیم کی ابتداء امریکہ میں جنرل موٹرز اور سویڈن میں سکاندیا انشورنس سے ہوئی تھی اور اب یہ ہسپتالوں، اکاؤنٹنگ کمپنیوں سے لے کر امریکی کانگریس تک میں۔۔۔۔ جہاں روایتی کمیٹیوں کے ساتھ ساتھ ہر طرح کے غیر رسمی حساب گھر اور علاقائی انتخابی دفاتر بھی جنم لے رہے ہیں۔۔۔۔ نظر آ رہی ہے۔ بوسٹن یونیورسٹی کے ایس۔ ایم۔ ڈیوس اور ہارورڈ کے پی آر لارنس کے الفاظ میں قالبی تنظیم کوئی چھوٹی سے انتظامی تکنیک یا عارضی فیشن نہیں بلکہ اپنی جدت کے اعتبار سے کاروباری تنظیم کی یہ بالکل نئی صنف ہے۔ دوسری لہر کے ایک اہم خصوصیت ایک باس والا نظام کی بہ نست یہ صنف بنیادی طور پر کم مرکزیت کی سوچ کی مظہر ہے۔

اہم ترین بات یہ ہے کہ ہم سماج کی ساری معیشت کو لامرکزیت کی جانب لے جا رہے ہیں۔ چند روایتی عظیم الشان بینکوں کی نسبت چھوٹے علاقائی بینکوں کی حیرت انگیز ترقی اس حقیقت کا مظہر ہے۔ جیسے جیسے صنعت جغرافیائی فاصلوں میں پھیلتی جا رہی ہے، کمپنیاں، جن کا انحصار پہلے ''مالی مراکز'' میں واقع بینکوں پر تھا، اب زیادہ تر علاقائی بینکوں کی جانب مائیل ہو رہی ہیں۔ نیش ویل کے فرسٹ امریکن بینک کے چیئر مین کیستھ ایل رابرٹس کا کہنا ہے۔ ''امریکہ میں بینکاری کا مستقبل صرف مالی مرکز کے بینکوں سے ہرگز وابستہ نہیں۔'' بینکاری نظام میں جو کچھ ہو رہا ہے، وہی کچھ ساری معیشت میں منعکس ہو رہا ہے۔

دوسری لہر کی ثقافت نے ہمیں قومی مارکیٹ اور قومی معیشت کا حقیقی تصور دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی معاشی تنظیم کے قومی آلات کو ارتقاء نصیب ہوا۔ اشتراکی قوموں میں مرکزی منصوبہ بندی اور سرمایہ دار ملکوں میں مرکزی بینک اور قومی مالیاتیاور ٹیکس پالیسی کا نظام خوب پھلے پھولے۔ دوسری لہر کے سیاسی اور معاشی ماہرین، آج ان تمام آلات کی ناکامی پر

بوکھلائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اگرچہ اس حقیقت کا ادراک بہت کم لوگوں کو ہے تاہم قومی معیشتیں انتہائی سرعت سے علاقائی اور شعبہ جاتی مرحلوں (قومیتی معیشتیں، اپنے اپنے مخصوص اور مختلف مسائل میں گھری) میں سمٹ رہی ہیں۔ امریکہ کی سن بیلٹ، اٹیلی کا میزو جیورنو اور جاپان کا کانسائی، صنعتی دور کی طرح یکساں انداز کی ترقی کرنے کے بجائے توانائی کی ضروریات، پیشہ ورانہ مہارت، وسائل، تعلیمی سطح، ثقافت اور دوسرے کلیدی عوامل میں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیئت اختیار کر رہے ہیں۔ مزید برآں ان علاقائی معیشتوں میں سے بعض اپنی بلند شرح افزائش کی وجہ سے چند سال پہلے کی قومی معیشتوں کے برابر پہنچ گئی ہیں۔ معاشی بحران پر قابو پانے کی حکومتی کوششیں ان حقائق کو نظر انداز کرنے کی وجہ سے ہی ناکام ہو رہی ہیں۔ افراط زر یا بے روزگاری کا علاج، قومی ٹیکس میں اضافے یا کمی کرنے یا ایسی ہی دوسری یکساں مالیاتی حکمت عملیاں اختیار کرنے سے مرض کی شدت بڑھتی جا رہی ہے۔

تیسری لہر کی معیشتوں کو دوسری لہر کے آلات کے ذریعے سنبھالا دینے والوں کا حال بالکل اس ڈاکٹر جیسا ہے جو صبح سویرے ہسپتال پہنچ کر تمام مریضوں کو اپنی آنکھیں بند کئے۔۔۔۔ ایڈرنیلین کا ٹیکہ تجویز کرتا جاتا ہے، چاہے کسی کی ٹانگ ٹوٹی ہوئی ہو، تلی پھٹ گئی ہو، دماغ میں ٹیومر یا پاؤں میں پھنسی نکلی ہوئی ہو۔ صرف غیر مجتمع اور لامرکزی معاشی تنظیم سازی کے ذریعے ہی نئی معیشت کو چلایا جا سکتا ہے کیونکہ ہم آہنگی اپنی جلو میں لئے، یہ معیشت خود بھی آہستہ آہستہ لامرکزیت کی جانب رواں دواں ہے۔

عدم مرکزیت کی جانب یہ ساری پیش رفت۔۔۔۔ چاہے سیاست میں ہو یا کارپوریٹ دنیا میں، سرکاری اداروں میں ہو یا بذات خود معیشت میں (ذرائع ابلاغ، کمپیوٹر کی قوت کی تقسیم کاری، توانائی کے نظام اور دوسرے کئی شعبوں میں متوازی نشوونما کی معاونت کے ساتھ)۔۔۔۔ ایک نئے سماج کو جنم دے رہی ہے۔ اس سماج میں ماضی کے ضابطے بے کار اور فرسودہ تصور ہوں گے۔

چھوٹا بڑے ہی میں خوبصورت لگتا ہے

دوسری لہر کے سماجی ضابطے کے بہت سے دوسرے حصے بھی تیسری لہر کی آمد کے

ساتھ بری طرح زد میں ہیں۔ چنانچہ دوسری لہر کی تکثیر پسندی، جو بے پناہ اہمیت کی حامل تھی، شدید تنقید کا شکار ہے۔ چھوٹی شے میں خوبصورتی کے قائل، بڑی شے کو بہتر سمجھنے والوں پر بری طرح حملہ آور ہیں۔

''چھوٹی چیز میں خوبصورتی ہے'' نامی کتاب 1970ء کے عشرے میں دنیا کی سب سے زیادہ بکنے والی اور موثر کتابوں میں شامل تھی۔'' کفایت شعاری کا رجحان مسلسل کم ہو رہا ہے۔ یہ احساس عام ہے کہ بہت سی کمپنیاں کفایت شعاری کی ساری حدیں پھلانگ گئی تھیں۔ کارپوریشنیں اب اپنے ورکنگ یونٹوں کے حجم میں کمی کے طریقے ڈھونڈ رہی ہیں۔ جدید ٹیکنالوجی اپنانے اور خدمات کے شعبے میں وسعت آنے کے ساتھ آپریشن کے پیمانوں میں خاصی کمی واقع ہوئی ہے۔ دوسری لہر کی روایتی فیکٹری۔۔۔۔ایک ہی چھت تلے ہزار رہا کارکنوں کا مصروف عمل ہونا۔۔۔۔صنعتی ممالک میں غائب ہوتی جا رہی ہے۔

آسٹریلیا میں کار بنانے والی کمپنی کے صدر سے ملاقات کے دوران میں نے اس سے مستقبل کے کار پلانٹ کی تفصیلات کے متعلق سوال کیا۔ اس نے انتہائی پر اعتماد لہجے میں جواب دیا۔''ایک ہی چھت تلے، سات ہزار کارکنوں کے ساتھ روبہ عمل فیکٹری، اب کبھی نہیں بناؤں گا۔ میں اسے چھوٹی چھوٹی کئی اکائیوں میں تقسیم کروں گا۔ ہر اکائی میں تین یا چار سو کارکن ہوں گے۔ کارخانے کی عملی تقسیم کے لئے ایسی ٹیکنالوجی اب بھی موجود ہے۔'' اسی طرح کے خیالات مجھے کچھ اور صنعتوں کے سربراہوں سے بھی سننے کا موقع ملا۔

آج ہمیں یہ احساس ہوتا ہے کہ خوبصورتی چھوٹائی یا بڑائی میں نہیں بلکہ چھوٹے اور بڑے مدارج ماموزوں اور ذہانت آمیز امتزاج ہی اصل خوبصورتی ہے۔ یہ وہ چیز ہے جسے ''چھوٹی چیز میں خوبصورتی ہے۔'' نامی کتاب کے مصنف ای ایف شمیکر اپنے پیروکاروں سے کہیں بہتر سمجھتے تھے۔ انہوں نے ایک دفعہ اپنے ساتھیوں سے کہا ''اگر وہ چھوٹے اداروں کو دنیا کے باسی ہوتے تو وہ ''بڑائی میں خوبصورتی ہے'' نامی کتاب کے مصنف ہوتے۔ ہمارے موجودہ تجربات کے دوران ایسی اداراتی شکلیں بھی ابھر رہی ہیں جو دونوں قسموں کی بہترین خصوصیات کے امتزاج کی حامل ہوں گی۔ مثلاً؟ امریکہ، برطانیہ، ہالینڈ اور دوسرے کئی ممالک میں محصول کے بغیر کاروباری اجازت ناموں اجراء کیا جا رہا ہے۔ عموماً

ایسے اجازت ناموں کی ضرورت سرمایہ کی کمی کو پورا کرنے یا ٹیکس بچت کے طریقے کے طور پر پڑتی ہے۔ ان پر تنقید کی جا سکتی ہے لیکن اس طرح چھوٹے چھوٹے یونٹوں کی تیز رفتار تشکیل اور بڑے نظاموں کے تحت انکا باہمی اتصال، بہتر طریقے سے ممکن ہے۔ ان میں مرکزیت اور لا مرکزیت دونوں اصولوں کا موزوں اطلاق ہوتا ہے۔ یہ بڑی اور چھوٹی دونوں طرح کی تنظیموں کو ملانے کی اچھی کوشش ہے۔ دوسری لہر کی ''تکثیریت'' اب اپنے اختتام پر ہے اور اندازہ جاتی درجہ عمل پذیر ہے۔

سماج بھی دوسری لہر کی تخصیص اور پیشہ ورائیت پر کڑے انداز میں نظرثانی کر رہا ہے۔ دوسری لہر کے ضابطوں نے ماہروں کو بے پناہ اہمیت دی تھی کیونکہ اس کے بنیادی اصولوں میں سے ایک اصول یہ تھا کہ ''کامیابی صرف مہارت کے مرہون منت ہے'' آج ہم سیاست سمیت ہر شعبے میں اختصاص کی جانب رویوں میں بنیادی تبدیلی رونما ہوتے دیکھ رہے ہیں۔ کبھی ماہرین کو عقل و دانش کا غیر جانبدار اور قابل اعتماد مرکز سمجھا جاتا تھا۔ لیکن اب وہ عوامی اعتماد کے اس مرتبے پر فائز نہیں رہے۔ خود غرضی اور تنگ نظری کی وجہ سے انہیں شدید تنید کا سامنا ہے۔ ماہرانہ طاقت کو کنٹرول کرنے کے لئے غیر ماہرین کو ان کے ساتھ فیصلہ ساز اداروں ہسپتالوں اور کئی دوسری تنظیموں میں شریک کرنے کی متعدد کوششیں ہمارے اردگرد ہو رہی ہیں۔

والدین اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت صرف ماہر اساتذہ پر چھوڑنے کے لئے رضا مند نہیں، وہ ان سے متعلق فیصلوں میں خود بھی شریک ہونا چاہتے ہیں۔ شہری سیاست اور شہریوں کی دلچسپی کے متعلق واشنگٹن کی ایک ٹاسک فورس نے کچھ برس قبل اس نئے رویئے کے متعلق کہا تھا۔ ''اپنی خواہشات کے متعلق جاننے کے لئے آپ کو کسی مہارت کی ضرورت نہیں۔''

دوسری لہر نے ''ارتکاز'' کے اصول کو بھی خوب پروان چڑھایا۔ اس کے تحت دوسری لہر نے سرمایہ، توانائی، وسائل اور لوگوں کو اکٹھا کیا۔ اس نے لوگوں کی ایک بڑی تعداد کو شہروں میں لا بسایا۔ اب یہ سارا عمل الٹی سمت ہونا شروع ہو گیا ہے۔ سکولوں، ہسپتالوں اور دماغی امراض کے اداروں کے ارتکاز کو ختم کیا جا رہا ہے۔ ہم توانائی کے مرتکز

وسائل پر اپنا انحصار کم کر کے توانائی کی غیر مرتکز شکلوں کی جانب بڑھنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ الغرض ہم دوسری لہر کی تہذیب کے ضابطوں۔۔۔۔ معیاریت، زمانی و مکانی ہم آہنگی، مرکزیت، تکثیریت، تخصیص اور ارتکاز۔۔۔۔ کا مرحلہ دار جائزہ لے کر یہ بتانے کی پوزیشن میں ہیں کہ تیسری لہر کی تہذیب کے ظہور کے ساتھ، ہماری روزمرہ زندگی اور ہماری سماجی فیصلہ سازی پر اثرانداز ہونے والے، یہ ضوابط کس طرح خود بھی انقلابی عمل سے گزر رہے ہیں۔

مستقبل کی تنظیم

دوسری لہر کی تمام اصولوں کو یک جا کر کے جب ایک اداراتی شکل میں روبہ عمل لایا گیا تو نتیجہ ایک کلاسیکی صنعتی نوکر شاہی کی شکل میں سامنے آیا۔ ایک عظیم، تدریجی، مستقل، بالائی سطح تک پھیلی ہوئی میکانکی تنظیم جو نسبتاً مستحکم صنعتی ماحول میں متواتر یکساں اشیاء کی پیداوار اور مکرر فیصلے کرنے کی اہلیت رکھتی تھی۔ اب نئے اصولوں کی تشکیل اور باہمی عملی اطلاق، ہمیں مستقبل کی بالکل ہی جدید تنظیموں کی سمت بڑھا رہا ہے۔ تیسری لہر کی یہ تنظیمیں تدریجاً منقطع شکل کی ہوتی ہیں۔ ان کے بالائی درجے میں کم لوگ ہوتے ہیں ان کا نظام چھوٹے چھوٹے یونٹوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ جن میں ضرورت کے مطابق عارضی ربط ہوتا رہتا رہے۔ ان میں سے ہر یونٹ خارجی دنیا کے ساتھ رابطوں میں مکمل خود مختار ہوتا ہے، یعنی ان کی اپنی خارجہ پالیسی ہوتی ہے اور اکثر و بیشتر معاملات میں انہیں مرکز سے مشورہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ تنظیمیں عموماً چوبیس گھنٹے اپنے دائرہ کار میں مشغول رہتی ہیں۔ تاہم ان میں اور نوکر شاہی میں ایک اور بنیادی فرق ہے۔ یہ دوہرے مقصد یا کثیر المقاصد تنظیمیں ہوتی ہیں اور اپنی ضرورت کے مطابق مختلف ہیئتیں اختیار کر سکتی ہیں۔ مثلاً: مسلح افواج، جو دوران امن کئی جمہوری اور سماجی کاموں میں شریک ہوتی ہیں لیکن دوران جنگ انتہائی مرکزی اور استبدادی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اس کی تنظیمی فلسفے میں دونوں شکلیں اختیار کر لینے کی استعداد موجود ہے۔ ہم فٹ بال ٹیم کی مثال بھی دے سکتے ہیں۔ اس کے کھلاڑی کھیل کے گراؤنڈ میں ٹی کی شکل اور کئی دوسری شکلوں میں فٹ بال کھیل سکتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اس کے کھلاڑی، سیٹی کی آواز پر، ساکر، بیس بال یا باسکٹ

بال کھیلنے کے لئے مختلف منضبط شکلیں اختیار کر سکتے ہیں۔ ان تنظیمی کھلاڑیوں کو ماحول کے مطابق خود کو ڈھالنے کے لئے باقاعدہ تربیت کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ دستیاب تنظیمی ڈھانچوں اور کردار کی ضرورت سے ذاتی مطابقت پیدا کرنے میں کوئی دشواری محسوس نہ کریں۔

ہمیں ایسے منتظم چاہئیں جو کھلے ڈلے ماحول میں اپنی خدا داد صلاحیتوں کا بھرپور استعمال جانتے ہوں۔ وہ ایک طرف تو مصرف اہرام جیسے دیوہیکل ادارے میں کام کر سکتے ہوں اور دوسری جانب کالڈر موبیل کی طرح نظر آتی اتنی چھوٹی کمپنی میں بھی کام کر سکتے ہوں جس کی نیم خود مختار اکائیوں کا تانا بانا ایسے معمولی انتظامی ڈھانچے سے منسلک ہو کہ ہلکی سی ہوا بھی جسے ہلا ڈالے۔

مستقبل کے ان اداروں کی تفصیلات بیان کرنے کے لئے فی الحال تو ہمارے پاس ضروری ذخیرہ الفاظ بھی نہیں میٹرکس یا ایڈہاک قسم کی اصطلاحات نا کافی لگتی ہیں۔ مختلف نظریہ دانوں نے مختلف الفاظ تجویز کئے ہیں۔ شعبہ اشتہارات سے متعلق لیسٹر ونڈر مین کا کہنا ہے ''متعلقہ اشیاء کی مجموعی علم رکھنے والے گروپ، دانش ور کمانڈوز بنکر۔۔۔۔ قدیم دقیانوسی ڈھانچے کو بدل ڈالیں گے۔'' ٹونی جج ہمارے دور کے ایک عظیم اداراتی نظریہ دان نے مستقبل کی ان ابھرتی ہوئی تنظیموں کے ''نیٹ ورک'' کی خاصیت کے متعلق خاصا کھل کر لکھا ہے اور چیزوں کے علاوہ وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ ''کوئی شخص بھی نیٹ ورک کو مربوط نہیں کرتا۔ شریک ادارے خود ہی اس طرح مربوط ہو جاتے ہیں کہ اسے ''خود کار رابطے کا نام دیا جا سکتا ہے۔'' کسی اور جگہ اس نے انہیں بک منسٹر فلر کے منضبط استقلال کے معنوں میں بیان کیا ہے۔

چاہے ہم کوئی بھی اصطلاحات استعمال کریں، انقلابی تبدیلی ظہور پذیر ہو رہی ہے۔ ہم محض نئی اداراتی اشکال کی پیدائش میں ہی شامل نہیں ہو رہے بلکہ ایک نئی تہذیب جنم لیتے دیکھ رہے ہیں۔ ایک نئی کوڈ بک تیار ہو رہی ہے۔۔۔۔ تیسری لہر کے اصولوں کا سیٹ۔ سماجی تحفظ کے لئے عملی میدان میں تازہ قواعد ضوابط۔

یہ قطعی حیرانی کی بات نہیں کہ صنعتی دور کی کوڈ بک سے ابھی تک چمٹے ہوئے

والدین خود کو اپنے بچوں سے متضاد رویوں کا حامل محسوس کرتے ہیں۔ بچے اگر نئے اصولوں سے بالکل ہی بے بہرہ نہیں تو وہ پرانے ضابطوں کو غیر متعلق ہوتے دیکھ کر بے یقینی کا شکار ہو رہے ہیں۔ ہم اور ہمارے بچے یکساں طور پر دوسری لہر کے دم توڑتے نظام اور آنے والے کل کی تیسری لہر کی تہذیب کے درمیان پھنسے ہوئے ہیں۔

اہم ترین بات یہ ہے کہ ہم سماج کی ساری معیشت کو لامرکزیت کی جانب لے جا رہے ہیں۔ چند روایتی عظیم الشان بینکوں کی نسبت چھوٹے علاقائی بینکوں کی حیرت انگیز ترقی اس حقیقت کا مظہر ہے۔ جیسے جیسے صنعت جغرافیائی فاصلوں میں پھیلتی جا رہی ہے، کمپنیاں، جن کا انحصار پہلے ''مالی مراکز'' میں واقع بینکوں پر تھا، اب زیادہ تر علاقائی بینکوں کی جانب مائل ہو رہی ہیں۔ نیش ویل کے فرسٹ امریکن بینک کے چیئرمین کیستھ ایل رابرٹس کا کہنا ہے۔''امریکہ میں بینکاری کا مستقبل صرف مالی مراکز کے بینکوں سے ہرگز وابستہ نہیں۔'' بینکاری نظام میں جو کچھ ہو رہا ہے، وہی کچھ ساری معیشت میں منعکس ہو رہا ہے۔

دوسری لہر کی ثقافت نے ہمیں قومی مارکیٹ اور قومی معیشت کا حقیقی تصور دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی معاشی تنظیم کے قومی آلات کو ارتقاء نصیب ہوا۔ اشتراکی قوموں میں مرکزی منصوبہ بندی اور سرمایہ دار ملکوں میں مرکزی بینک اور قومی مالیاتی اور ٹیکس پالیسی کا نظام خوب پھلے پھولے۔ دوسری لہر کے سیاسی اور معاشی ماہرین، آج ان تمام آلات کی ناکامی پر بوکھلائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اگرچہ اس حقیقت کا ادراک بہت کم لوگوں کو ہے تاہم قومی معیشتیں انتہائی سرعت سے علاقائی اور شعبہ جاتی مرحلوں (قومیتی معیشتیں، اپنے اپنے مخصوص اور مختلف مسائل میں گھری) میں سمٹ رہی ہیں۔ امریکہ کی سن بیلٹ، اٹلی کا میزو جیورنو اور جاپانی کا کانسائی، صنعتی دور کی طرح یکساں انداز کی ترقی کرنے کے بجائے توانائی کی ضروریات، پیشہ ورانہ مہارت، وسائل، تعلیمی سطح، ثقافت اور دوسرے کلیدی عوامل میں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیئت اختیار کر رہے ہیں۔ مزید برآں ان علاقائی معیشتوں میں سے بعض اپنی بلند شرح افزائش کی وجہ سے چند سال پہلے کی قومی معیشتوں کے برابر پہنچ گئی ہیں۔ معاشی بحران پر قابو پانے کی حکومتی کوششیں ان حقائق کو نظر انداز کرنے کی وجہ سے ہی ناکام ہو رہی ہیں۔ افراط زر یا بے روزگاری کا علاج، قومی ٹیکس میں اضافے یا کمی کرنے یا

ایسی ہی دوسری یکساں مالیاتی حکمت عملیاں اختیار کرنے سے مرض کی شدت بڑھتی جا رہی ہے۔

تیسری لہر کی معیشتوں کو دوسری لہر کے آلات کے ذریعے سنبھالا دینے والوں کا حال بالکل اس ڈاکٹر جیسا ہے جو صبح سویرے ہسپتال پہنچ کر تمام مریضوں کو اپنی آنکھیں بند کئے۔۔۔۔ایڈرنیلن کا ٹیکہ تجویز کرتا جاتا ہے، چاہے کسی کی ٹانگ ٹوٹی ہوئی ہو، تلی پھٹ گئی ہو، دماغ میں ٹیومر ہو یا پاؤں میں پھنسی نکلی ہوئی ہو۔صرف غیر مجتمع اور لامرکزی معاشی تنظیم سازی کے ذریعے ہی نئی معیشت کو لایا جا سکتا ہے کیونکہ عالمی ہم آہنگی اپنے جلو میں لئے، یہ معیشت خود بھی آہستہ آہستہ لامرکزیت کی جانب رواں دواں ہے۔

عدم مرکزی یت کی جانب یہ ساری پیش رفت۔۔۔۔۔ چاہئے سیاست میں ہو یا کارپوریٹ دنیا میں، سرکاری اداروں میں ہو یا بذات خود معیشت میں (ذرائع ابلاغ، کمپیوٹر کی قوت کی تقسیم کاری، توانائی کے نظام اور دوسرے کئی شعبوں میں متوازی نشوونما کی معاونت کے ساتھ)۔۔۔۔ایک نئے سماج کو جنم دے رہی ہے۔اس سماج میں ماضی کے ضابطے بے کار اور فرسودہ تصور ہوں گے۔

چھوٹا بڑے ہی میں خوبصورت لگتا ہے

دوسری لہر کے سماجی ضابطے کے بہت سے دوسرے حصے بھی لہر کی آمد کے ساتھ بری طرح ترامیم کی زد میں ہیں۔ چنانچہ دوسری لہر کی تکثیر پسندی، جو بے پناہ اہمیت کی حامل تھی، شدید تنقید کا شکار ہے۔ چھوٹی شے میں خوبصورتی کے قائل، بڑی شے کو بہتر سمجھنے والوں پر بری طرح حملہ آور ہیں۔

''چھوٹی چیز میں خوبصورتی ہے'' نامی کتاب 1970ء کے عشرے میں دنیا کی سب سے زیادہ بکنے والی اور موثر کتابوں میں شامل تھی۔'' کفایت شعاری کا رجحان مسلسل کم ہوررہا ہے۔ یہ احساس عام ہے کہ بہت سی کمپنیاں کفایت شعاری کی ساری حدیں پھلانگ گئی تھیں۔ کارپوریشنیں اب اپنے روکنگ یونٹوں کے حجم میں کمی کے طریقے ڈھونڈ رہی ہیں۔ جدید ٹیکنالوجی اپنانے اور خدمات کے شعبے میں وسعت آنے کے ساتھ آپریشن کے پیمانوں میں خاصی کمی واقع ہوئی ہے۔ دوسری لہر کی روایتی فیکٹری۔۔۔۔ایک ہی چھت تلے

ہزار ہا کارکنوں کا مصروف عمل ہونا۔۔۔ صنعتی ممالک میں غائب ہوتی جا رہی ہے۔

آسٹریلیاں میں کار بنانے والی کمپنی کے صدر سے ملاقات کے دوران میں نے اس سے مستقبل کے کار پلانٹ کی تفصیلات کے متعلق سوال کیا۔ اس نے انتہائی پر اعتماد لہجے میں جواب دیا۔ ''ایک ہی چھت تلے، سات ہزار کارکنوں کے ساتھ روبہ عمل فیکٹری، اب کبھی نہیں بناؤں گا۔ میں اسے چھوٹی چھوٹی کئی اکائیوں میں تقسیم کروں گا۔ ہر اکائی میں تین یا چار سو کارکن ہوں گے۔ کارخانے کی عملی تقسیم کے لئے ایسی ٹیکنالوجی اب بھی موجود ہے۔'' اسی طرح کے خیالات مجھے کچھ اور صنعتوں کے سربراہوں سے بھی سننے کا موقع ملا۔

آج ہمیں یہ احساس ہوتا ہے کہ خوبصورتی چھوٹائی یا بڑائی میں نہیں بلکہ چھوٹے اور بڑے مدارج ما موزوں اور ذہانت آمیز امتزاج ہی اصل خوبصورتی ہے۔ یہ وہ چیز ہے جسے ''چھوٹی چیز میں خوبصورتی ہے۔'' نامی کتاب کے مصنف ای ایف شمیکر اپنے پیروکاروں سے کہیں بہتر سمجھتے تھے۔ انہوں نے ایک ذفعہ اپنے ساتھیوں سے کہا ''اگر وہ چھوٹے اداروں کو دنیا کے باسی ہوتے تو وہ ''بڑائی میں خوبصورتی ہے'' نامی کتاب کے مصنف ہوتے۔ ہمارے موجودہ تجربات کے دوران ایسی اداراتی شکلیں بھی ابھر رہی ہیں جو دونوں قسموں کی بہترین خصوصیات کے امتزاج کی حامل ہوں گی۔ مثلاً؟ امریکہ، برطانیہ، ہالینڈ اور دوسرے کئی ممالک میں محصول کے بغیر کاروباری اجازت ناموں اجراء کیا جا رہا ہے۔ عموماً ایسے اجازت ناموں کی ضرورت سرمایہ کی کمی کو پورا کرنے یا ٹیکس بچت کے طریقے کے طور پر پڑتی ہے۔ ان پر تنقید کی جا سکتی ہے لیکن اس طرح چھوٹے چھوٹے یونٹوں کی تیز رفتار تشکیل اور بڑے نظاموں کے تحت انکا باہمی اتصال، بہتر طریقے سے ممکن ہے۔ ان میں مرکزیت اور لا مرکزیت دونوں اصولوں کا موزوں اطلاق ہوتا ہے۔ یہ بڑی اور چھوٹی دونوں طرح کی تنظیموں کو ملانے کی اچھی کوشش ہے۔ دوسری لہر کی ''تکثیریت'' اب اپنے اختتام پر ہے اور اندازہ جاتی درجہ عمل پذیر ہے۔

سماج بھی دوسری لہر کی تخصیص اور پیشہ ورائیت پر کڑے انداز میں نظرثانی کر رہا ہے۔ دوسری لہر کے ضابطوں نے ماہروں کو بے پناہ اہمیت دی تھی کیونکہ اس کے بنیادی اصولوں میں سے ایک اصول یہ تھا کہ ''کامیابی صرف مہارت کے مرہون منت ہے'' آج

ہم سیاست سمیت ہر شعبے میں اختصاص کی جانب رویوں میں بنیادی تبدیلی رونما ہوتے دیکھ رہے ہیں۔ کبھی ماہرین کو عقل و دانش کا غیر جانبدار اور قابل اعتماد مرکز سمجھا جاتا تھا۔ لیکن اب وہ عوامی اعتماد کے اس مرتبے پر فائز نہیں رہے۔ خود غرضی اور تنگ نظری کی وجہ سے انہیں شدید تنید کا سامنا ہے۔ ماہرانہ طاقت کو کنٹرول کرنے کے لئے غیر ماہرین کو ان کے ساتھ فیصلہ ساز اداروں ہسپتالوں اور کئی دوسری تنظیموں میں شریک کرنے کی متعدد کوششیں ہمارے اردگرد ہو رہی ہیں۔

والدین اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت صرف ماہر اساتذہ پر چھوڑنے کے لئے رضا مند نہیں، وہ ان سے متعلق فیصلوں میں خود بھی شریک ہونا چاہتے ہیں۔ شہری سیاست اور شہریوں کی دلچسپی کے متعلق واشنگٹن کی ایک ٹاسک فورس نے کچھ برس قبل اس نئے رویئے کے متعلق کہا تھا۔ ''اپنی خواہشات کے متعلق جاننے کے لئے آپ کو کسی مہارت کی ضرورت نہیں۔''

دوسری لہر نے ''ارتکاز'' کے اصول کو بھی خوب پروان چڑھایا۔ اس کے تحت دوسری لہر نے سرمایہ، توانائی، وسائل اور لوگوں کو اکٹھا کیا۔ اس نے لوگوں کی ایک بڑی تعداد کو شہروں میں لا بسایا۔ اب یہ سارا عمل الٹی سمت ہونا شروع ہو گیا ہے۔ سکولوں، ہسپتالوں اور دماغی امراض کے اداروں کے ارتکاز کو ختم کیا جا رہا ہے۔ ہم توانائی کے مرتکز وسائل پر اپنا انحصار کم کر کے توانائی کی غیر مرتکز شکلوں کی جانب بڑھنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ الغرض ہم دوسری لہر کی تہذیب کے ضابطوں۔۔۔۔ معیاریت، زمانی و مکانی ہم آہنگی، مرکزیت، تکثیریت، تخصیص اور ارتکاز۔۔۔۔ کا مرحلہ دار جائزہ لے کر یہ بتانے کی پوزیشن میں ہیں کہ تیسری لہر کی تہذیب کے ظہور کے ساتھ، ہماری روزمرہ زندگی اور ہماری سماجی فیصلہ سازی پر اثرانداز ہونے والے، یہ ضوابط کس طرح خود بھی انقلابی عمل سے گزر رہے ہیں۔

مستقبل کی تنظیم

دوسری لہر کی تمام اصولوں کو یک جا کر کے جب ایک اداراتی شکل میں روبہ عمل لایا گیا تو نتیجہ ایک کلاسیکی صنعتی نوکر شاہی کی شکل میں سامنے آیا۔ ایک عظیم، تدریجی، مستقل،

بالائی سطح تک پھیلی ہوئی میکانکی تنظیم جو نسبتاً مستحکم صنعتی ماحول میں متواتر یکساں اشیاء کی پیداوار اور مکرر فیصلے کرنے کی اہلیت رکھتی تھی۔ اب نئے اصولوں کی تشکیل اور باہمی عملی اطلاق، ہمیں مستقبل کی بالکل ہی جدید تنظیموں کی سمت بڑھا رہا ہے۔ تیسری لہر کی یہ تنظیمیں تدریجاً منقطع شکل کی ہوتی ہیں۔ ان کے بالائی درجے میں کم لوگ ہوتے ہیں ان کا نظام چھوٹے چھوٹے یونٹوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ جن میں ضرورت کے مطابق عارضی ربط ہوتا رہتا رہے۔ ان میں سے ہر یونٹ خارجی دنیا کے ساتھ رابطوں میں مکمل خود مختار ہوتا ہے، یعنی ان کی اپنی خارجہ پالیسی ہوتی ہے اور اکثر و بیشتر معاملات میں انہیں مرکز سے مشورہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ تنظیمیں عموماً چوبیس گھنٹے اپنے دائرہ کار میں مشغول رہتی ہیں۔ تاہم ان میں اور نوکر شاہی میں ایک اور بنیادی فرق ہے۔ یہ دوہرے مقصد یا کثیر المقاصد تنظیمیں ہوتی ہیں اور اپنی ضرورت کے مطابق مختلف ہیئتیں اختیار کرسکتی ہیں۔ مثلاً: مسلح افواج، جو دوران امن کئی جمہوری اور سماجی کاموں میں شریک ہوتی ہیں لیکن دوران جنگ انتہائی مرکزی اور استبدادی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اس کی تنظیمی فلسفے میں دونوں شکلیں اختیار کر لینے کی استعداد موجود ہے۔ ہم فٹ بال ٹیم کی مثال بھی دے سکتے ہیں۔ اس کے کھلاڑی کھیل کے گراؤنڈ میں ٹی کی شکل اور کئی دوسری شکلوں میں فٹ بال کھیل سکتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اس کے کھلاڑی، سیٹی کی آواز پر، ساکر، بیس بال یا باسکٹ بال کھیلنے کے لئے مختلف منضبط شکلیں اختیار کر سکتے ہیں۔ ان تنظیمی کھلاڑیوں کو ماحول کے مطابق خود کو ڈھالنے کے لئے باقاعدہ تربیت کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ دستیاب تنظیمی ڈھانچوں اور کردار کی ضرورت سے ذاتی مطابقت پیدا کرنے میں کوئی دشواری محسوس نہ کریں۔

ہمیں ایسے منتظم چاہئیں جو کھلے ڈلے ماحول میں اپنی خدا داد صلاحیتوں کا بھرپور استعمال جانتے ہوں۔ وہ ایک طرف تو مصرف اہرام جیسے دیوہیکل ادارے میں کام کر سکتے ہوں اور دوسری جانب کالڈر موبیل کی طرح نظر آتی اتنی چھوٹی کمپنی میں بھی کام کر سکتے ہوں جس کی نیم خود مختار اکائیوں کا تانا بانا ایسے معمولی انتظامی ڈھانچے سے منسلک ہو کہ ہلکی سی ہوا بھی جسے ہلا ڈالے۔

مستقبل کے ان اداروں کی تفصیلات بیان کرنے کے لئے فی الحال تو ہمارے پاس ضروری ذخیرہ الفاظ بھی نہیں میٹرکس یا ایڈہاک قسم کی اصطلاحات نا کافی لگتی ہیں۔ مختلف نظریہ دانوں نے مختلف الفاظ تجویز کئے ہیں۔ شعبہ اشتہارات سے متعلق لیسٹر وَنڈر مین کا کہنا ہے ''متعلقہ اشیاء کی مجموعی علم رکھنے والے گروپ، دانش ور کمانڈوز بنکر۔۔۔۔ قدیم دقیانوسی ڈھانچے کو بدل ڈالیں گے۔'' ٹونی بج ہمارے دور کے ایک عظیم اداراتی نظریہ دان نے مستقبل کی ان ابھرتی ہوئی تنظیموں کے ''نیٹ ورک'' کی خاصیت کے متعلق خاصا کھل کر لکھا ہے اور چیزوں کے علاوہ وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ ''کوئی شخص بھی نیٹ ورک کو مربوط نہیں کرتا۔ شریک ادارے خود ہی اس طرح مربوط ہو جاتے ہیں کہ اسے ''خود کار رابطے کا نام دیا جا سکتا ہے۔'' کسی اور جگہ اس نے انہیں بک منسٹر فلر کے منضبط استقلال کے معنوں میں بیان کیا ہے۔

چاہے ہم کوئی بھی اصطلاحات استعمال کریں، انقلابی تبدیلی ظہور پذیر ہو رہی ہے۔ ہم محض نئی اداراتی اشکال کی پیدائش میں ہی شامل نہیں ہو رہے بلکہ ایک نئی تہذیب جنم لیتے دیکھ رہے ہیں۔ ایک نئی کوڈ بک تیار ہو رہی ہے۔۔۔۔ تیسری لہر کے اصولوں کا سیٹ۔ سماجی تحفظ کے لئے عملی میدان میں تازہ قواعد ضوابط۔

یہ قطعی حیرانی کی بات نہیں کہ صنعتی دور کی کوڈ بک سے ابھی تک چمٹے ہوئے والدین خود کو اپنے بچوں سے متضاد رویوں کا حامل محسوس کرتے ہیں۔ بچے اگر نئے اصولوں سے بالکل ہی بے بہرہ نہیں تو وہ پرانے ضابطوں کو غیر متعلق ہوتے دیکھ کر بے یقینی کا شکار ہو رہے ہیں۔ ہم اور ہمارے بچے یکساں طور پر دوسری لہر کے دم توڑتے نظام اور آنے والے کل کی تیسری لہر کی تہذیب کے درمیان پھنسے ہوئے ہیں۔

باب19

صانف کی آمد

عظیم الشان تاریخی تبدیلیوں کا بعض اوقات علامتی اظہار روز مرہ کے رویئے میں چھوٹی چھوٹی تبدیلیوں سے ہوتا ہے۔ ایسی ہی ایک تبدیلی۔۔۔۔ جو اپنی بے پناہ اہمیت کے باوجود نظر انداز ہو گئی۔۔۔۔ 1970ء کے عشرے کے شروع میں اس وقت رونما ہوئی، جب ایک نئی پراڈکٹ نے فرانس، انگلینڈ، ہالینڈ، اور دوسرے یورپی ملکوں کی دوا ساز صنعت پر دھاوا بولنا شروع کیا۔ یہ نئی پراڈکٹ حمل کی ٹیسٹ کٹ تھی، جسے خود ہی استعمال کیا جاسکتا تھا۔ چند ہی سالوں میں یورپی خواتین میں ان کٹوں کی فروخت شدہ تعداد کا اندازہ 15 سے 20 ملین تک لگایا گیا۔ جلد ہی امریکی اخبارات میں ایسے اشتہارات آنا شروع ہو گئے ''آپ حاملہ ہیں؟ جتنی جلدی آپ کو پتہ ہوگا اتنا ہی بہتر ہے۔'' جب ایک امریکی کمپنی وارنر لیم برٹ نے اسی کٹ کو اس کے برانڈ نیم کے ساتھ مارکیٹ میں متعارف کرایا تو اس کے حیرت انگیز نتائج برآمد ہوئے۔ 1980ء تک اٹلانٹک کے دونوں جانب لاکھوں خواتین، معمول کے مطابق خود ہی وہ کام سرانجام دے رہی تھیں جس کے لئے پہلے انہیں ڈاکٹروں اور لیبارٹریوں سے رجوع کرنا پڑتا تھا۔

یہ واحد شے نہیں تھی جس نے ڈاکٹر کی محتاجی سے بے نیاز کر دیا۔ میڈیکل ورلڈ نیوز کے مطابق ''خود حفاظتی۔۔۔۔ یہ نظریہ کہ لوگ طبی طور پر زیادہ خود انحصاری کر سکتے ہیں اور انہیں یہ کرنا بھی چاہئے۔۔۔۔ تیزی سے مقبولیت حاصل کرنے والا نظریہ ہے۔۔۔۔ سارے براعظم میں عام لوگ سٹیستھ سکوپس اور بلڈ پریشر کے آلات استعمال کرتے ہیں، خود ہی چھاتی اور پستان کے داغ دھبوں کے ٹسٹ کر لیتے ہیں، یہاں تک کہ ابتدائی جراحی بھی کر ڈالتے ہیں۔''

MashalBooks.org

آج کل مائیں گلے کا کلچر(Throatculture) کر رہی ہیں۔سکول پاؤں کی حفاظت سے لے کر''فوری(Pediatrics)'' تک ہر علاج کے کورسز پیش کرتے ہیں اور امریکہ میں 1300 سے زیادہ کاروباری مراکز، ہوائی اڈوں اور ڈیپارٹمنٹل سٹورز پر نصب شدہ سکے کے ذریعے چلنے والی مشینوں پر لوگ اپنا بلڈ پریشر خود ہی چیک کر رہے ہیں۔

1972ء تک غیر معالجوں کو بہت معمولی تعداد میں طبی آلات بیچے گئے۔لیکن اب آلات کی فروخت کا بڑھتا ہوا حصہ گھروں میں مستعمل ہو رہا ہے۔ اوٹو سکوپس، کان صاف کرنے کی اختراعات، ناک اور گلے کے (Irrigators)اور خصوصی صحت کی مصنوعات تیزی سے فروخت ہو رہی ہیں کیونکہ لوگ اپنی صحت کے متعلق زیادہ ذمہ داری اپنے سر لے رہے ہیں۔اس طرح ان کا ڈاکٹر کے پاس جانا اور ہسپتال میں قیام مختصر ہوتا جا رہا ہے۔

بظاہر ممکن ہے یہ محض ایک خبط محسوس ہو، پھر بھی اپنی تکلیف یا اپنے مسائل کا خود علاج (بجائے کسی اور کو پیسے دے کر اس سے کام کرایا جائے) ہماری اقتدار میں، مرض سے متعلق ہماری وضاحت، جسم اور خود اپنی ذات کے متعلق ہمارے تصور میں اچھی خاصی تبدیلی کا مظہر ہے۔ اس تصور کی حقیقی تاریخی اہمیت سمجھنے کے لئے ہمیں پیچھے ایک طائرانہ نظر ڈالنا ہوگی۔

مخفی معیشت

پہلی لہر کے دوران زیادہ تر لوگ اپنی پیداوار خود ہی صرف کر ڈالتے تھے۔عمومی مفہوم میں وہ نہ صانع تھے اور نہ صارف۔ انہیں ''صانف'' کا نام دینا زیادہ مناسب ہوگا۔ یہ صنعتی انقلاب تھا جس نے معاشرے میں کسی تیز دھار آلے کی طرح گھس کر ان دونوں افعال کو جدا کر دیا اور اس طرح ان کرداروں کے جنم لینے کا باعث بنا جنہیں آج صانع اور صارف کے نام دیتے ہیں۔ اس تقسیم کے نتیجے میں مارکیٹ یا باہمی تبادلے کا نیٹ ورک۔۔۔۔ چینلز کا وہ گورکھ دھندا جس کے ذریعے آپ کی بنائی ہوئی اشیاء اور خدمات مجھ تک اور میری تیار کردہ اشیاء اور خدمات آپ تک پہنچتی ہیں۔۔۔۔ انتہائی تیز رفتاری سے پھیلنے لگا۔

MashalBooks.org

شروع میں، میں یہ تذکرہ کر چکا ہوں کہ دوسری لہر کے ساتھ ہم استعمال کے لئے پیداوار پر مبنی زرعی معاشرے۔۔۔۔ واقعتاً صانف کی معیشت۔۔۔۔ سے ''تبادلے کے لئے پیداوار'' پر مبنی صنعتی معاشرے کی جانب چلے گئے۔ حقیقی صورت حال بہر حال خاصی پیچیدہ تھی جس طرح پہلی لہر کے دوران تبادلے کے لئے تھوڑی بہت مقدار۔۔۔۔ مارکیٹ کے لئے بھی موجود ہوتی تھی، اسی طرح دوسری لہر کے زمان میں ذاتی استعمال کے لئے پیداوار کی تھوڑی سی مقدار بچ رہتی تھی۔

چنانچہ معیشت کے متعلق سوچ بچار کا زیادہ عاقلانہ انداز یہ ہے کہ اسے دو سیکٹرز کی اکائی جان کر اس پر غور وفکر کیا جائے۔ سیکٹر الف میں وہ سارا کام شامل ہے جو لوگ بلا معاوضہ براہ راست اپنے لئے اپنے خاندان اور اپنی برادری کے لئے کرتے ہیں۔ سیکٹر ب میں وہ تمام اشیاء و خدمات شامل ہوتی ہیں جو تبادلہ کے نیٹ ورک یا مارکیٹ کے ذریعے قابل فروخت یا قابل تبادلہ ہوں۔

یہ انداز نظر ہو تو اب ہم کہہ سکتے ہیں کہ پہلی لہر کے دور میں سیکٹر الف۔۔۔۔ ذاتی استعمال کی پیداوار پر استوار۔۔۔۔ قومی ہیکل تھا جبکہ سیکٹر ب محدود تھا۔ دوسری لہر کے دوران حقیقت اس کے بالکل برعکس تھی۔ درحقیقت مارکیٹ کے لئے اشیاء و خدمات کی پیداوار اس تیزی سے پھیلی کہ دوسری لہر کے معیشت دان سیکٹر الف کا وجود ہی فراموش کر بیٹھے۔ ''معیشت'' کے لفظ کی تعریف میں مارکیٹ کے لئے پیش نہ کی جانے والی اشیاء و خدمات کو شامل ہی نہیں کیا گیا اور اس طرح صانف نظر سے اوجھل ہو گیا۔

مثال کے طور پر اسے یوں سمجھیں کہ عورتوں کا گھر میں کیا جانے والا سارا کام۔۔۔۔ صفائی ستھرائی، بچوں کی نگہداشت، برادری کی دیکھ بھال جیسے بلا معاوضہ کام۔۔۔۔ ''غیر معاشی جان کر سرے سے ہی نظر انداز کر دیا گیا۔ حالانکہ سیکٹر ب کا سارا ڈھانچہ۔۔۔۔ ظاہر معیشت۔۔۔۔ سیکٹر الف (مخفی معیشت) کی پیدا کردہ اشیاء و خدمات کے بغیر اپنا وجود ہی برقرار نہیں رکھ سکتا تھا۔

اگر گھر پر بچوں کی دیکھ بھال کرنے والے نہ ہوتے تو سیکٹر ب کے لئے اجرتی کارکنوں کا یا اگلی نسل کا وجود ہی نہ ہوتا اور پورا نظام اپنے ہی بوجھ سے زمین پر آ گرتا۔ کیا

کوئی بھی انتہائی ترقی یافتہ پیداوار کی حامل معیشت کا بغیر ایسے کارکنوں کے تصور بھی کر سکتا ہے جنہیں بچپن میں نہانا دھونا سکھایا گیا ہو، بولنا سکھایا گیا ہو اور ثقافت سے روشناس کرایا گیا ہو۔سیکٹر ب کے پیداوار کا بنتا کیا، اگر اس کے کارکن ان بنیادی اور کم از کم خصوصیات کے بھی حامل نہ ہوتے؟ دوسری لہر کی معیشتوں میں نظر انداز کئے جانے کے باوجود حقیقت یہی ہے کہ دونوں سیکٹر بری طرح ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔

آج بھی دوسری لہر کے معاشرے کے اپنے ٹرمینل بحران میں مبتلا ہونے کے باوجود سیاست دان اور ماہرین صرف سیکٹر کی نقل وحمل پر مبنی اقتصادی شماریات پر ہی زور دیتے نظر آتے ہیں۔ انہیں گھٹتی ہوئی شرح ''افزائش اور پیداواریت'' کا بڑا دکھ ہوتا ہے اور جب تک وہ دوسری لہر کی سوچ کے انداز اپنائے رکھیں گے، سیکٹر الف کو نظر انداز کئے رکھیں گے، اسے معیشت سے خارج سمجھیں گے۔۔۔۔۔ اور جب تک صانف مخفی رہے گا۔۔۔۔ یہ لوگ ہمارے اقتصادی معاملات سنبھالنے کے قابل نہیں ہونگے کیونکہ قریبی مشاہدے سے ان دونوں سیکٹروں یا پیداواری شکلوں کے باہمی تعلق میں بنیاید تبدیلی کی شروعات محسوس ہونے لگتی ہے۔ صانع اور صارف کو جدا کرنے والا خط آہستہ آہستہ دھندلاتا جا رہا ہے۔ ہم صانف کی ابھرتی ہوئی اہمیت محسوس کر رہے ہیں اور اس سے بھی کہیں آگے ہم ایک تکلیف دہ تبدیلی جنم لیتے دیکھ رہے ہیں جو بالآخر ہماری زندگیوں میں اور مالی نظام میں مارکیٹ کے کردار کو بدل کر رکھ دے گی۔

یہاں ہمیں ان لاکھوں لوگوں کا خیال آتا ہے جنھوں نے اپنے لئے وہ خدمات بھی سرانجام دینا شروع کر دی ہیں، جو کبھی صرف ڈاکٹروں کا خاصا تھا۔ اس طرح یہ لوگ سیکٹر ب سے سیکٹر الف (آشکار معیشت، معیشت دان جس سے آگاہ ہیں) کی بھولی بسری خیالی معیشت کی جانب کچھ پیداوار شفٹ کرنے کا حقیقی کام کر رہے ہیں۔ وہ ''صانف کا کام'' کر رہے ہیں اور اس میں تنہا نہیں ہیں۔

پٹو افراد اور بیوہ خواتین

1970ء میں برطانیہ میں مانچسٹر کی ایک گھریلو خاتون کیتھرین فشر نے سالہا سال تک اپنا ہی گھر چھوٹ جانے کے خوف میں مبتلا رہ کر اسی طرح کے واہموں کے شکار

MashalBooks.org

دوسرے افراد کے لئے ایک ادارہ بنایا۔ آج فوبکس سوسائٹی نامی اسی ادارے کی کئی شاخیں ہیں اور اعلیٰ ٹیکنالوجی اقوام میں اس جیسے ہزاروں ادارے لوگوں کی مدد کے لئے تشکیل دیئے جا رہے ہیں تا کہ لوگ براہ راست اپنے نفسیاتی، طبی، سماجی یا جنسی مسائل طے کر سکیں۔

ڈیٹرائٹ میں لگ بھگ پچاس ''متوفی کے لواحقین کے گروپ'' قائم ہو چکے ہیں جو کسی عزیز یا دوست کے انتقال کے بعد افسردہ افراد کی معاونت کرتے ہیں۔ آسٹریلیا میں Grow نامی ایک تنظیم سابقہ ذہنی مریضوں اور ''نروس افراد'' کو اکٹھا کرتی ہے۔ Grow کے دفاتر ہوائی، نیوزی لینڈ اور آئرلینڈ میں بھی موجود ہیں۔ بائیس ریاستوں میں ''ہم جنس لڑکیوں اور لڑکوں کے والدین'' نامی ایک تنظیم ہم جنس بچوں کے والدین کی اعانت کے لئے تشکیل پذیر ہے۔ برطانیہ میں Depressives Associated کے تقریباً 60 دفاتر ہیں۔ ''نا معلوم عادی نشہ باز'' اور ''سیاہ پھیپھڑوں'' کی تنظیم ''شریک حیات کے بغیر والدین'' اور ''بیوہ سے بیوہ تک'' جیسی نئی تنظیمیں ہر جگہ تشکیل پا رہی ہیں۔

بلاشبہ یہ کوئی نئی بات نہیں مصیبت میں لوگ اکٹھے ہو کر اپنے مسائل پر بات چیت کرتے ہیں اور ایک دوسرے سے بہت کچھ سیکھتے رہے ہیں۔ لیکن تاریخ دانوں کو، اپنی مدد آپ کی تحریک کی جنگلی آگ کی طرح تیز رفتاری سے پھیلنے کی مثال، پہلے کبھی بمشکل ہی نظر آئے گی۔

نئی انسانی خدمات کے ادارے کے رابطہ کار فرینک ریس مان اور ایلن گارٹنر کے اندازے کے مطابق، صرف امریکہ میں اب 5 لاکھ سے زیادہ ایسے گروپ موجود ہیں یعنی ہر 435 افراد کے لئے ایک، اور ایسے نئے نئے گروپ روز بروز پیدا ہو رہے ہیں۔ ان میں سے بہت سی وقتی ہوتے ہیں لیکن ہر غائب ہونے والی تنظیم کی جگہ لینے کے لئے بہت سی دوسری موجود ہوتی ہیں۔

یہ تنظیمیں خاصی متنوع اقسام کی ہیں۔ بعض ماہرین کے متعلق نت نئے شبہات کا شکار ہیں اور ان کے بغیر ہی گزارا کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ وہ مشاورت۔۔۔۔ ذاتی تجربات پر مبنی آراء کا باہمی تبادلہ۔۔۔۔ پر زیادہ بھروسہ کرتی ہیں اور پیشہ ور حضرات کے روایتی مشوروں کو اہمیت نہیں دیتیں۔ بعض ادارے مصیبت میں گھرے افراد کی اعانت کے

لئے تیار رہتے ہیں۔بعض دوسرے ادارے قانون سازی یا ٹیکس کے ضابطوں میں تبدیلیوں کے لئے جدوجہد کرتے ہوئے سیاسی کردار ادا کرتے ہیں۔ بہت سی تنظیمیں مذہبی نوعیت کی ہوتی ہیں۔بعض بین الاقوامی برادری کا رنگ لئے ہوتی ہیں جن کے اراکین نہ صرف باہم میل جول رکھتے ہیں بلکہ واقعتاً اکٹھے رہتے ہیں۔

ایسے گروپ اب علاقائی بلکہ بین الاقوامی تعلق بھی پیدا کر رہے ہیں۔جس حد تک بھی ممکن ہے، پیشہ ور ماہرین نفسیات، سماجی کارکن یا ڈاکٹرز آہستہ آہستہ اپنے کردار میں تبدیلی لا رہے ہیں اور غیر متعلق ماہر۔۔۔۔ جیسے بڑا عالم فاضل سمجھا جاتا ہے۔۔۔۔ کے کردار کی بجائے مریض یا کلائنٹ کے ہم نشین سامع، استاد یا کائیڈ کی حیثیت میں آنا چاہتے ہیں۔موجودہ رضا کارانہ یا غیر منفعت بخش تنظیمیں۔۔۔۔ جو بنیادی طور پر دوسروں کی مدد کے لئے بنائی گئی تھیں۔۔۔۔اسی طرح یہ جاننے کی جدوجہد میں لگی ہوئی ہیں کہ وہ اپنی مدد آپ کے اصول پر مبنی تحریک کے ساتھ خود کو کیسے متوازن کرسکتی ہیں۔

اپنی مدد آپ کی تحریک سماجی دائرے کی تشکیل نو کر رہی ہے۔سگریٹ نوش، ہکلانے والے، خودکشی پر مائل لوگ، جواری، گلے کی تکلیف کے شکار، جڑواں بچوں کے والدین، پیٹو لوگ اور اسی طرح دوسرے گروہ ایسے مضبوط تنظیمی ڈھانچے تشکیل دے رہے ہیں جو ابھرتی ہوئی تیسری لہر کے گھرانے اور کاروباری ڈھانچوں سے ہم رنگ نظر آتے ہیں۔

ان کی سماجی تنظیم کے لئے اہمیت خواہ کچھ بھی ہو، درحقیت وہ ایک لاچار صارف سے مستعد صانف کی جانب بنیادی شفٹ کی نمائندگی کرتی ہیں۔ اس طرح ان میں معاشی معنوت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ مارکیٹ کی حتمی محتاجی اور دونوں باہم منسلک ہونے کے باوجود وہ معیشت کے سیکٹر ب سے سیکٹر الف کی جانب، تبادلے کے سیکٹر سے خود انحصاری کی سمت۔۔۔۔ پیداواری سرگرمی کو منتقل کر رہے ہیں۔ یہ تیز رفتار تحریک ہی ایسی اکیلی قوت نہیں۔بعض امیر ترین اور دیوہیکل کارپوریشنیں بھی اپنے ٹیکنالوجیکل اور معاشی وجوہات کی بنا پر صانف کے عروج کی جانب انتہائی تیز رفتاری سے بڑھ رہی ہیں۔

خود اپنا کام کرنے والے

1956ء میں امریکی ٹیلی فون اینڈ ٹیلی گراف کمپنی کمیونی کیشنز کی حد درجہ بڑھتی ہوئی طلب کے بوجھ تلے بری طرح دبی ہوئی تھی، چنانچہ اس نے جدید الیکٹرانک ٹیکنالوجی کا استعمال شروع کر کے فون کرنے والے کے لئے لمبے فاصلے کی کال براہ راست ملانا ممکن بنا دیا۔ اب تو سمندر پار براہ راست کالیں کرنا بھی ممکن ہے۔ صارف مخصوص نمبر دبا کر وہ کام کر لیتا ہے جس کے لئے اسے پہلے آپریٹر کی مدد لینا پڑتی تھی۔

1973-74ء میں عرب ایمبارگو کے نتیجے میں تیل کی قلت نے گیسولین کی قیمتیں آسمان پر پہنچا دیں۔ بڑی بڑی آئل کمپنیوں نے بے تحاشا منافع کمایا مگر مقامی پٹرول پمپ چلانے والوں کو اپنا معاشی وجود برقرار رکھنے کے لئے شدید کشمکش سے دوچار ہونا پڑا۔ اخراجات کو کم کرنے کے لئے کئی لوگوں نے سیلف سروس فیول پمپس متعارف کرا دیئے۔ شروع میں تو یہ خاصا احمقانہ لگا۔ اخبارات نے کئی مزاحیہ کہانیاں بنا ڈالیں کہ ایک گاڑی والے نے پٹرول کا پائپ گاڑی کے ریڈی ایٹر میں گھسانے کی کوشش کی، لیکن جلد ہی صارفین کے خود ہی اپنے لئے پٹرول ڈالنے کا منظر ایک عام سی بات بن گیا۔ 1974ء میں صرف 8% پٹرول پمپ سیلف سروس شروع کر چکے تھے اور یہ تجرباتی بنیاد پر کام کر رہے تھے۔ 1977ء تک یہ تعداد تقریباً 50% تک سیلف سروس شروع کر چکے تھے اور یہ پہنچ گئی۔ مغربی جرمنی میں 33500 سروس سٹیشنوں میں سے تقریباً 15% 1976ء تک 15% فیصد پٹرول پمپ تمام فروخت شدہ پٹرول 35% حصہ بیچ رہے تھے۔ صنعتی ماہرین کا کہنا ہے کہ جلد ہی 70% فروخت سیلف سروس پر چلی جائے گی۔ ایک بار پھر صارف صانع کی جگہ لے کر صانف بن رہا ہے۔

اسی دور میں الیکٹرانک بینکنگ متعارف ہوئی جس نے نہ صرف بینک کے اوقات کا اندازہ بدل ڈالا بلکہ بینک سٹاف کے کئے جانے والے سارے کام صارف کے ذمے ڈال کر آہستہ آہستہ رقم گننے والے کو بھی غائب کر دیا۔

صارف کے جڑوی کام کرانا۔۔۔۔ جسے معیشت دان ''محنت کی لاگت کا اخراج'' کہتے ہیں۔۔۔۔ کوئی نئی بات نہیں۔ سپر مارکیٹوں میں سیلف سروس کا نظام یہی کچھ تو ہے۔

پہلے سٹاک سے باخبر، مسکراتا کلرک اٹھتا اور آپ کی ضرورت کی چیز آپ کو لا دیتا۔ اب اس کی جگہ آپ چیز خود اٹھا کر شاپنگ ٹرالی میں ڈال لیتے ہیں۔ بعض صارفین ذاتی خدمت کے ان پرانے بھلے دنوں کو یاد کرتے ہیں جبکہ بہت سے لوگوں کو نیا سسٹم اچھا لگتا ہے۔ وہ اپنی مرضی کی چیزیں خود تلاش کرتے ہیں، اس طرح انہیں کچھ کم قیمت دینا پڑتی ہے۔ درحقیقت پہلے کلرک جو کام کیا کرتا تھا وہی کام خود کر کے اس کی اجرت خود رکھ لیتے ہیں۔

آج کل ''اخراج'' کی بالکل یہی شکل بہت سے دوسرے شعبوں میں بھی واقع ہو رہی ہے۔ ڈس کاؤنٹ سٹورز کا جنم اسی مست میں ایک جزوی قدم کو ظاہر کرتا ہے۔ کلرک بہت کم اور دور دور فاصلے پر ہوتے ہیں۔ صارف کچھ کم قیمت ادا کرتا ہے مگر اسے ذرا زیادہ محنت کرنا پڑتی ہے۔ جوتوں کے سٹورز بھی، جہاں عرصے تک مفروضہ طور پر ایک ماہر کلرک کی موجودگی لازمی سمجھی جاتی تھی، کام کو صارف پر منتقل کر کے سیلف سروس کی جانب رواں ہیں۔

یہی اصول کہیں اور بھی تلاش کی جا سکتا ہے۔ کیرولین برڈ نے اپنی مشاہداتی کتاب"Crowding Syndrome" میں لکھا ہے۔ ''گھر پر ممکنہ طور پر آسان پرزے جوڑنے کے لئے بہت سی چیزوں کی ضرورت نہیں رہتی۔۔۔۔ اور کرسمس کے دنوں میں قدیم نیویارک کے قابل فخر سٹوروں میں خریدنے والوں کو کلرکوں کے لئے فروخت کی تفصیلات خود ہی بنانی پڑتی ہیں کیونکہ کلرک یا تو انہیں بنا ہی نہیں سکتے یا بنانا نہیں چاہتے۔

جنوری 1978ء میں واشنگٹن ڈی سی میں تیس سالہ ایک حکومتی کارکن نے اپنے ریفریجریٹر میں سے عجیب وغریب آوازیں نکلتی سنیں۔ ماضی میں روایتی طریقہ تھا کہ مکینک کو بلا لیا جاتا اور اسے اجرت دے کر ٹھیک کرا لیا جاتا۔ زیادہ خرچ اور موزوں ٹائم پر مرمت کرنے والے کی حصولیابی میں درپیش مشکل کی وجہ سے بیری نس بام نیفریج کے ساتھ آنے والی ہدایات کو پڑھا۔ جن میں 1 سے 800 ٹیلی فون نمبروں کا پتہ چلا، جن کے ذریعے وہ مینوفیکچرز۔۔۔۔ ورل پول کارپوریشن آف بینٹن، مشی گن۔۔۔۔ سے بغیر کسی خرچ کے براہ راست رابطہ کر سکتا تھا۔

یہ ''سرد خط''(Cool line) ورل پول نے سروس کے مسائل کے سلسلے میں

صارفین کی مدد کے لئے قائم کیا تھا۔نس بام نے فون پر رابطہ کیا۔ دوسری جانب موجود آدمی سے مرمت کے بارے میں بات کی۔ تفصیلاً اسے بتایا کہ کون سے پیچ بدلنے ہیں، کیسی آوازیں سنائی دیتی ہیں اور یہ بھی بتایا کہ کونسا پرزہ مطلوب ہے؟ اس شخص نے'' نس بام کا کہنا ہے۔''کمال کی مدد کی۔ اسے اچھی طرح پتہ تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ اس میں خود اعتمادی پیدا کرنے کی زبردست صلاحیت تھی۔'' ریفریجریٹر آناً فاناً ٹھیک ہو گیا۔

ورل پول کا بنک نوکل وقتی اور بعض جزوقتی مشیروں پر مشتمل ہے۔ ان میں سے کچھ سابق سروس کے شعبے سے متعلق لوگ ہیں۔ یہ لوگ ہیڈ فون لگائے، ایسی کالیں سنتے ہیں۔ ان کے سامنے لگی ہوئی سکرین ہر متعلقہ چیز کی ڈایا گرام نظر آنے لگتی ہے(ورل پول فریزرز، برتن دھونے کی مشین، ائیر کنڈیشنرز اور ریفریجریٹر کے علاوہ اور گھریلو استعمال کی دوسری اشیاء بناتا ہے)اور صارف کی رہنمائی کرنے میں ان کی مدد کرتی ہے۔ صرف 1978ء میں ورل پول ے ڈیڑھ لاکھ ایسی کالیں نمٹائیں۔

خط سرد مستقبل کے مین ٹینس سسٹم کا ایک ابتدائی ماڈل ہے جس کے ذریعے گھر کا مالک وہ سب کام کر سکتا ہے، جو کبھی بیرونی مکینک یا ماہر اجرت لے کر کرتا تھا۔ ترقی کے ساتھ ساتھ طویل فاصلے کے ٹیلی فون کے کم ہوتے اخراجات سے یہ بھی ممکن ہو گیا کہ مستقبل کے سسٹم میں گھریلو ٹی وی سکرین پر کوئی ماہر ترتیب وار ہدایات دے کر بمع تصاویر، اشیاء کی مرمت اور درستگی میں مدد دے رہا ہو۔ اس طرح کے نظاموں کی توسیع کاریگر یا مکینک کو صرف خاص خاص کاموں کے لئے محدود کر دے گی یا مکینک کو (ڈاکٹر یا سماجی کارکن کی طرح)ضانفین کے لئے استاد، رہنما اور گرد کی حیثیت دے دے گی۔

ہمیں ایک ایسا پیٹرن نظر آتا ہے جو بہت سی صنعتوں میں۔۔۔۔ فزوں تر اخراج۔۔۔۔ صارف کی ان معاملات میں بڑھتی ہوئی شمولیت، جو کبھی دوسرے اس کے لئے انجام دیتے تھے۔۔۔۔ سے گزرتا ہے اور اس طرح ایک بار پھر معیشت کے سیکٹر ب سے سیکٹر الف کی، تبادلے کے سیکٹر سے خود انحصاری کے سیکٹر کی جانب پیداواری عمل کی منتقلی نظر آتی ہے۔

اپنی مدد آپ کی حامل کاریگری کو متاثر کرنے والی ڈرامائی تبدیلیاں اگر ہم بغور

MashalBooks.org

دیکھیں تو ہماری نظر کے سامن مقابلتاً کوئی غیر معمولی صورت حال نہیں آتی۔ اپنی مدد آپ کے ذریعے ہمیشہ ہی کھڑکیوں کے شکستہ پٹ، ہلکے پھلکے فرنیچر کی ٹوٹ پھوٹ یا چپس کے پتھروں کی اکھاڑ چھاڑ جیسے گھریلو کاموں کی درستگی ایک عام سی بات رہی ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تو پھر تبدیل کیا ہوا ہے۔۔۔۔ اور وہ بھی حیرت انگیز حد تک۔۔۔۔ تبدیلی آئی ہے خود اپنا کام کرنے والوں اور پیشہ ور معمار، بڑھئی، الیکٹریشن، پلمبر یا کسی بھی کاریگر کے مابین باہمی تعلق میں۔

ایک اہم صنعتی ریسرچ کمپنی فراسٹ اینڈ سولیون کے مطابق امریکہ میں 1974ء اور 1976ء کے درمیان اس سے بھی زیادہ اہم پیش رفت ہوئی، جب ''پہلی دفعہ آدھے سے زیادہ تعمیراتی ساز وسامان۔۔۔۔ ٹھیکداروں کی بجائے، گھر کے مالکان نے براہ راست خود خریدا۔'' اس میں گھریلو کاریگروں کے لگ بھگ 35 کروڑ ڈالر کے وہ اضافی اخراجات شامل ہیں جو 25 ڈالر سے کم کے کاموں پر خرچ کئے گئے۔

1970 کے عشرے کے شروع میں جب تعمیراتی ساز و سامان پر اخراجات 31% تک بڑھ گئے تو خود اپنا کام کرنے والے گھر کے مالکان کی خریداری 65% سے بھی زیادہ بڑھ گئی۔۔۔۔ دگنے سے بھی زیادہ تیز۔ یہ تبدیلی ایف اینڈ ایس رپورٹ کے مطابق۔ نہ صرف ڈرامائی بلکہ مسلسل جاری ہے۔ فراسٹ اور سولین کی ایک اور تحقیق کے مطابق ''ایسے اخراجات میں آسمان کو چھوتا ہوا اضافہ اور خود کفالت کی جانب قدر کی منتقلی کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔'' جہاں کبھی اپنے ہاتھوں سے کام کرنے کو (کم از کم متوسط طبقے میں) حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا، وہاں اب اس پر فخر کیا جاتا ہے۔ لوگ خود اپنے ہاتھوں کام کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔

سکول یونیورسٹیاں اور پبلشرز مختلف نوعیت کے کام خود کرنے کے آسان کورس اور کتابیں پیش کرنے میں مصروف ہیں۔ یو ایس نیوز اینڈ ورلڈ رپورٹ کا کہنا ہے۔ امیر اور غریب، دونوں ہی اس چکر میں پھنس گئے ہیں۔ کلیولینڈ میں، پبلک ہاؤسنگ پراجیکٹس میں گھریلو مرمت کی ہدایات دی جاتی ہیں۔ کیلیفورنیا میں مالکوں کے اپنے بنائے ہوئے بھاپی غسل خانے، معدنی چشمے اور سوئمنگ پول پر بنے چھلانگ لگانے کے تختے بہت مقبول ہیں۔

یورپ میں بھی نام ونہاد ''خود کفالتی انقلاب'' اپنے پاؤں جما رہا ہے۔۔۔۔قومی مزاج کے مطابق کچھ نہ کچھ فرق تو بہر حال اس میں نظر آتا ہے۔ (جرمن اور ڈچ خود اپنے پراجیکٹس کو بہت سنجیدگی سے لیتے ہیں، اعلیٰ معیار کا خیال رکھتے ہیں اور ضروری سازوں سامان کو بڑی احتیاط سے استعمال کرتے ہیں۔ اطالوی، اس کے برعکس، خود کفالتی تحریک کو ابھی جاننے کی ہی کوشش کر رہے ہیں۔ بہت سے بوڑھے شوہر اب بھی خود کام کرنا توہین سمجھتے ہیں)ایک بار پھر اس کی بہت سی وجوہات ہیں۔ افراط زر، بڑھئی یا پلمبر کے حصول میں مشکل ،نمائشی کام کاج،توسیع شدہ فارغ اوقات۔ ان سبھی کی اپنی اپنی اہمیت ہے۔ ایک خاصی باوزن دلیل اور بھی ہے جسے ''اضافی نامستعدی کا قانون'' کہا جا سکتا ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ ہم چیزوں کی پیداوار کو جتنا زیادہ خود کار کریں اور ان کا فی اکائی لاگت کم کرتے جائیں، اتنا ہی زیادہ ہم دستکاریوں اور غیر خود کار خدمات کی نسبتی لاگت بڑھا دیتے ہیں۔ (اگر ایک پلمبر، گھر میں ایک گھنٹے کے کام کے 20 ڈالر لیتا ہے اور 20 ڈالر میں ایک دستی کیلکو لیٹر مل جاتا ہے۔ پلمبر کی مزدوری میں خود بخود اضافہ ہو جائے گا، جب اسی بیس ڈالر میں کئی دستی کیلکو لیٹر ملنے لگیں گے۔ دوسری اشیاء کی لاگت کی نسبت اس کی اجرت، درحقیقت کئی گنا بڑھ گئی)۔

اسی طرح کی وجوہات کی بنا پر ہمیں آنے والے دنوں میں بہت سی خدمات کی قیمت مسلسل آسمان سے باتیں کرتی نظر آئے گی ۔اور جوں جوں یہ قیمتیں اوپر چڑھتی ہیں، ہمیں یہ توقع کرنا چاہئے کہ لوگ اپنے کام زیادہ سے زیادہ خود کرنے لگیں گے۔مختصراً افراط زر کے بغیر بھی قانون اضافی نامستعدی آہستہ آہستہ لوگوں کے لئے اپنے صرف کی پیداوار خود کرنے کے عمل کو ''منافع بخش'' بنا دے گا۔اس طرح کچھ مزید سرگرمیاں معیشت کے سیکٹر ب سے سیکٹر الف یا پیداواری تبادلے کی معیشت سے خود کفالتی معیشت کی طرف منتقل ہو جائیں گی۔

بیرونی اور اندرونی لوگ

اس ارتقاء کے وسیع وعریض مستقبل کی جھلکی دیکھنے کے لئے ہمیں خدمات کے ساتھ ساتھ اشیاء کو بھی دیکھنے کی ضرورت ہے۔ اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ صارف کو آہستہ

MashalBooks.org

آہستہ پیدواری عمل میں گھسیٹا جا رہا ہے۔ اسی لئے متفکر صنعت کار آج بھی اشیاء کے ڈیزائن میں مدد لینے کے لئے صارف کو بھرتی کرتے ہیں اور اجرت بھی دیتے ہیں۔ یہ بات صرف عوام کو براہ راست فروخت ہونے والی اشیاء۔۔۔۔خوراک، صابن، غسل خانے کا ساز و سامان وغیرہ۔۔۔۔ کی صنعتوں میں ہی درست نہیں بلکہ الیکٹرانکس جیسی انتہائی ترقی یافتہ صنعتوں میں۔۔۔۔ جہاں عمومی عدم پھیلاؤ کی رفتار بہت تیز ہے۔کہیں زیادہ صحیح ہے۔

''جب کبھی ہم نے ایک یا دو صارفین کی قربت میں کام کیا ہے ہم بہت زیادہ کامیاب رہے۔'' ٹیکساس انسٹرومنٹس کے پلاننگ سسٹم کے ایک مینجر کا کہنا ہے۔''باہر جا کر کسی شے کی موزونیت کی خود جانچ پڑتال کرنا اور ایک معیاری شے تیار کرنے کی کشش کرنا اس مارکیٹ میں کامیاب نہیں ہو سکا۔''

درحقیقت سرل ایچ براؤن (اینالاگ ڈیوائسز انکارپوریٹڈ) تمام اشیاء کو دو اقسام میں تقسیم کرتا ہے۔ اندرونی استعاراتی اشیاء اور خارجی استعاراتی اشیاء۔ آخرالذکر اشیاء کو مینوفیکچرز کے بجائے ممکنہ گاہک حتمی شکل دیتا ہے اور یہ خارجی استعارتی اشیاء براؤن کے مطابق آئیڈیل ہوتی ہیں۔ جتنا زیادہ ہم جدید مشینی پیداوار کی جانب بڑھتے ہیں اور جتنا زیادہ ہم پیداوار کی تخصیص اور گاہک کی ذاتی پسند کا خیال رکھتے ہیں، اتنا ہی زیادہ پیداواری عمل میں گاہک کی شمولیت بڑھتی جاتی ہے۔

آج کل کمپیوٹر ایڈڈ مینوفیکچرنگ انٹرنیشنل کے اراکین (CAM-I) پیداوار کو مکمل طور پر خودکار طور پر خودکار بنانے کے لئے پرزوں اور پراسیس کی درجہ بندی اور کوڈنگ پر خاصی محنت کر رہے ہیں۔ پین سٹیٹ کے صنعتی اور مینوفیکچرنگ سسٹم انجینئرنگ ڈیپارٹمنٹ کے پروفیسران یونگ ہام جیسے ماہرین کی نظر میں فی الحال اس کے امکانات زیادہ روشن نہیں۔تاہم بالآخر ایک گاہک اپنی مخصوص تفصیلات مینوفیکچرر کے کمپیوٹر میں براہ راست دے سکے گا۔

کمپیوٹر نہ صرف گاہک کی پسند کی دو چیز ڈیزائن کرے گا، پروفیسر ہام وضاحت کرتا ہے، بلکہ اسے مینوفیکچر کرنے کے عمل کا انتخاب بھی کرے گا۔ یہ مشینوں کو کام سونپے گا۔ مناسب اور ضروری مراحل، مثلاً رگڑائی، گھسائی سے لے کر رنگ کرنے تک کی ترتیب

بھی دے گا۔ مشینوں کو چلانے کا ذمہ دار، چھوٹے کمپیوٹروں اور عددی کنٹرول کے آلات کے لئے ضروری پروگرام ضبط تحریر میں لائے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ ''حالات سے مطابقت کرنے والا کنٹرول'' بھی داخل کردے جس کے ذریعے معاشی اور ماحولیاتی مقاصد کے لئے ان مختلف پراسیسز کو بہتر طریقہ سے استعمال کیا جا سکے گا۔

آخر یہ ہوگا کہ گاہک محض اپنی مخصوص تفصیلات ہی نہیں دے رہا ہوگا بلکہ اس تمام پراسیس کی تکمیل کے لئے بٹن بھی دبا رہا ہوگا۔ غرض وہ پیداواری عمل کا اتنا ہی اہم حصہ بن جائے گا جتنا کہ گزرے زمانے میں ڈینیم کلاڈ اسمبلی لائن کا کارکن ہوا کرتا تھا۔

ابھی گاہک کی مینوفیکچرنگ سسٹم میں اتنی سرگرم مداخلت دور از کار لگتی ہے لیکن کم از کم اس کا کچھ نہ کچھ Hardware موجود ہے۔ چنانچہ کم از کم نظریاتی طور پر کمپیوٹر سے چلنے والی لیزر گن کو، جو گارمنٹس انڈسٹری میں استعمال ہوتی ہے۔۔۔ (اسکا ذکر پندرھویں باب میں آچکا ہے) اگر ٹیلی فون یا ذاتی کمپیوٹر سے منسلک کردیا جائے تو گاہک اپنی مختلف پیمائشیں بتا سکتا ہے، مناسب کپڑا منتخب کرسکتا ہے اور پھر عملاً لیزر کٹر کو کام میں لگا دے۔ اس طرح گاہک اپنا گھر چھوڑے بغیر یہ سارے کام نمٹا رہا ہوگا۔ رینڈ کارپوریشن کے شعبہ اطلاعاتی خدمات کے سربراہ اور کمپیوٹرائزڈ مینوفیکچر کے ماہر رابرٹ ایچ اینڈرسن اس کی اس طرح وضاحت کرتے ہیں۔ ''آج سے بیس سال بعد ایک شخص کا سب سے تخلیقی کام یہ ہوگا کہ وہ خود کو ''تخلیقی صارف'' بنالے۔۔۔ بس یوں سمجھیں آپ گھر میں بیٹھے اپنے لئے کپڑوں کا ڈیزائن یا ایک معیاری ڈیزائن میں تبدیلیاں کرنے کا کام کر رہے ہونگے تاکہ کمپیوٹر عددی کنٹرولڈ مشین کے ذریعے ایک جوڑا آپ کے لئے، لیزر کے ذریعے کاٹ کر سی ڈالے۔

''کمپیوٹرز کی بدولت آپ اسی قسم کی خاص خصوصیات سے کار میں بھی جدت پیدا کرسکتے ہیں۔ وفاقی حفاظتی ضوابط اور ماحول سے مطابقت رکھتی ساخت کے پروگرام تو پہلے سے ہی اس میں موجود ہونگے تاکہ آپ حد سے زیادہ آزادروی اختیار نہ کرلیں۔

اور اب اس کے ساتھ ہی اگر ہم یہ امکان بھی شامل کرلیں کہ بہت سے لوگ جلد ہی مستقبل کے الیکٹرانک گاؤں میں اپنے گھر میں ہی کام کر رہے ہوں گے۔ ہم صارف

MashalBooks.org

کے پاس موجود ''اوزاروں'' میں آتی اہم تبدیلی کا تصور کر سکتے ہیں۔ بہت سے الیکٹرانک آلات، جو اجرتی کام کے لئے ہم گھر پر استعمال کررہے ہوں گے، انہی سے ہم اپنے لئے اشیاء وخدمات کی پیداوار ممکن بنا سکتے ہیں۔ اس نظام میں صانف جو پہلی لہر کی سوسائٹی میں چھایا ہوا تھا۔۔۔ معاشی عمل کے مرکز میں واپس لے آیا گیا ہے مگر۔۔۔ تیسری لہر کے اعلی ٹیکنالوجی کی بنیاد پر یہ واپسی ہوئی ہے۔ مختصراً ہم چاہئے اپنی مدد آپ کی تحریکوں کی طرف نظر دوڑائیں یا خود انحصاری کے رجحانات یا نئی پیداواری تکنیکوں کو جانچیں، صارف کی وہی قریبی شمولیت ہمیں پیداواری عمل میں جھلکتی نظر آتی ہے۔ ایسی دنیا میں صانع اور صارف کے مابین روایتی امتیاز غائب ہو جاتا ہے۔ ''خارج'' داخل بن جاتا ہے اور اس طرح معیشت کے سیکٹر ب سے سیکٹر الف کی جانب زیادہ پیداوار شفٹ ہو جاتی ہے، جہاں صانف کی حکمرانی ہے۔

یہ سلسلہ شروع ہوتے ہی ابتداء میں ہم آہستہ آہستہ اور پھر شاید انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ اپنے موجودہ اداروں میں سب سے بنیادی ادارے۔۔۔ مارکیٹ کی ہیئت بدلنا شروع کر دیں گے۔

صانف کے رہن سہن کے انداز

پیداواری عمل میں صارف کی ذاتی رغبت (عمل دخل) دور رس نتائج کی حامل ہے۔ اس کی وجہ سمجھنے کے لئے ہمیں یاد رکھنا پڑے گا کہ مارکیٹ، مختصراً صانع اور صارف کے مابین اس تقسیم سے عبارت ہے جو اب دھندلاتی جا رہی ہے۔ جب لوگ اپنی پیدا کردہ اشیاء خود ہی صرف کر لیا کرتے تھے تو کسی باقاعدہ مارکیٹ کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ یہ ضروری اس اس وقت بنی جب صرف کے عمل کو پیداواری عمل سے جدا کر دیا گیا۔

روایتی مصنفوں نے بڑے تنگ مفہوم میں مارکیٹ کو سرمایہ دارانہ، زر پر مبنی تصور قرار دیا ہے۔ حالانکہ مارکیٹ محض تبادلے کے نیٹ ورک کا دوسرا نام ہے اور تبادلے کے نیٹ ورکس کی بہت سی مختلف اقسام نہ صرف رہی ہیں (بلکہ اب بھی ہیں) مغرب میں منافع پر مبنی سرمایہ دارانہ مارکیٹ ہمارے لئے سب سے زیادہ مانوس ادارہ ہے لیکن سوشلسٹ مارکیٹیں بھی ہیں۔۔۔ یہ مارکیٹیں ایسے نیٹ ورکس ہیں جن کے ذریعے سموینگ کے ایوان

اوانوچ کی تیار کردہ اشیاء و خدمات کی، مشرقی برلن کے جوہن شمٹ کی پیدا شدہ اشیاء و خدمات کے ساتھ تجارت ہوتی ہے۔ زر پر مبنی مارکیٹیں ہیں۔۔۔۔لیکن بارٹر پر مبنی مارکیٹیں بھی ہیں۔ مارکیٹ نہ سرمایہ دارانہ ہوتی ہے اور نہ ہی سوشلسٹ۔ یہ تو صانع اور صارف کی باہمی جدائی کا براہ راست اور ناگزیر نتیجہ ہے۔ جہاں کہیں یہ جدائی جنم لیتی ہے۔ مارکیٹ ابھرنے لگتی ہے اور جہاں کہیں صارف اور صانع کے مابین فاصلہ کم ہوتا ہے، مارکیٹ کی تمام فعالیت کردار اور طاقت داؤ پر لگ جاتی ہے۔

خود انحصاری کی حالیہ آمد اسی لئے ہماری زندگی میں مارکیٹ کے کردار میں تبدیلی کا آغاز ہے۔ یہ جاننا ابھی خاصا قبل از وقت ہے کہ یہ لطیف مگر اہم دباؤ ہمیں کہاں لے جا رہا ہے۔ مارکیٹ کا وجود تو ختم ہونے سے رہا۔ ظاہر ہے کہ ہم مارکیٹ سے پہلے معیشتوں کی جانب واپس نہیں لوٹ سکتے۔ میں نے جسے سیکٹر ب کا نام دیا ہے یعنی تبادلے کا سیکٹر، نہ تو مرجھانے جا رہا ہے اور نہ غائب ہو رہا ہے۔ آنے والے طویل عرصے تک ہم بری طرح مارکیٹ کے محتاج رہیں گے۔

بہرحال خود انحصاری کی آمد پوری شدت سے سیکٹر الف اور سیکٹر ب کے مابین۔۔۔۔تعلقات کا ایک ایسا سیٹ، دوسری لہر کے معیشت دانوں نے جسے اب تک نظر انداز کئے رکھا۔۔۔۔ایک بنیادی تبدیلی کی جانب اشارہ کرتی ہے۔

چونکہ خود انحصاری کم از کم بعض سرگرمیوں کو مارکیٹ کے دائرے سے باہر نکال دیتی ہے اور اس طرح معاشرے میں مارکیٹ کا کردار فوری طور پر تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہ مستقبل کی ایک ایسی معیشت کا خاکہ ہے جس کا ہم نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔۔۔۔ یہ ایک ایسی معیشت ہے جو الف یا ب دونوں سیکٹروں میں سے کسی ایک کی جانب اپنا مخصوص جھکاؤ نہیں رکھتی۔ یہ ایک ایسی معیشت کی پیدائش کی جانب اشارہ ہے جو پہلی یا دوسری لہر کی معیشتوں سے کسی بھی طرح میل نہیں کھاتی بلکہ اس کے برعکس ان دونوں معیشتوں کی خصوصیات کے باہمی امتزاج کو ایک نئی تاریخی ترتیب دے گی۔

صانف کی آمد۔۔۔۔ جسے بہت سی اجرتی خدمات کی لاگت میں بے پناہ اضافے، دوسری لہر کی نوکر شاہی کی ٹوٹ پھوٹ، تیسری لہر کی ٹیکنالوجیز کی موجودگی، ساختہ

بے روزگاری کے مسائل اور بہت سے دوسرے عوامل کا اتصال نے حقیقی قوت بخشی ہے۔۔۔۔ نئے اندازِ کار اور زندگی گزارنے کے لئے انتظامات کی جانب لے جا رہی ہے۔ اگر ہم پہلے بیان کی گئی بعض تبدیلیاں مثلاً اوقات کی عدم مطابقت اور جز وقتی اجرتی کام کی جانب رخ، الیکٹرانک کاٹیج کا ممکنہ ظہور یا گھریلو زندگی کا تبدیل شدہ ڈھانچہ۔۔۔۔ اپنے ذہن میں رکھ کر اندازے لگانے کی کوشش کریں تو ہم انداز زندگی کی ان تبدیلیوں میں سے کچھ یقیناً شناخت کر سکتے ہیں۔

چنانچہ ہم مستقبل کی ایک معیشت کی جانب بڑھ رہے ہیں جس میں لوگوں کی زیادہ تر تعداد کے پاس کبھی بھی کل وقتی اجرتی کام نہیں ہو گا یا جہاں ''کل وقت'' کی ازسرنو تعریف کرنا ہو گی۔ (حالیہ برسوں میں بھی یہ ہوتا رہا ہے) تا کہ اس سے مختصر سے مختصر ہفتہ کار یا سال کار (Work year) کا مفہوم لیا جا سکے۔ (سویڈن میں، جہاں موجود قوانین، عمر یا سروس کی طوالت سے قطع نظر تمام کارکنوں کو پانچ ہفتے کی با تنخواہ چھٹیاں گارنٹی کرتے تھے، ایک نارمل سال کار 1840 گھنٹوں کا سمجھا جاتا تھا۔ وہاں عملاً غیر حاضری اتنی زیادہ بڑھ گئی کہ فی کارکن 1600 گھنٹے فی سال کی اوسط کو زیادہ حقیقی مان لیا گیا۔)

کارکنوں کی بہت بڑی تعداد پہلے ہی اوسطاً اجرتی کام بمشکل تین یا چار دن فی ہفتہ کرتی ہے۔ بعض اوقات یہ لوگ چھ مہینے یا سال بھر کی چھٹیاں تعلیمی مقاصد یا سیر و تفریح کی غرض سے لے لیتے ہیں۔ کارکنوں کی تعداد میں اضافے ہوتے ہی یہ رجحان زیادہ تقویت پکڑے گا۔ اجرتی کارکن کی مارکیٹ میں لوگ جتنے زیادہ ہونگے معیشت دانوں کے مطابق ''کارکن کی شرح اجرت'' اتنی ہی بلند ہو گی اور فی کارکن اتنے ہی کم اوقات کار بنیں۔

اس طرح فارغ وقت کا سارا مسئلہ ایک نیا رخ اختیار کر لیتا ہے۔ اگر ہم محسوس کرنے لگیں کہ ہمارے نام و نہاد فارغ اوقات کا زیادہ حصہ درحقیقت ہماری اپنی ضرورت کی اشیاء و خدمات پیدا کرنے میں صرف ہو جاتا ہے تو کام اور فراغت کے درمیان موجود واضح امتیاز ختم ہو کر رہ جاتا ہے۔ سوال کام اور فراغت کے مقابلہ کا نہیں بلکہ سیکٹر ب کے اجرتی کام کا سیکٹر الف کے بلامعاوضہ خود کردہ اور ذاتی نگرانی میں کیا گیا کام کے باہمی تقابل کا ہے۔

MashalBooks.org

تیسری لہر کے سیاق و سباق میں نیا انداز زندگی۔۔۔نصف تبادلے کے لئے پیداوار اور نصف ذاتی استعمال کی پیداوار کی بنیاد پر عملاً استوار ہو گا۔ صنعتی انقلاب کے ابتدائی دنوں میں اس طرح کا طرز زندگی دیہاتی آبادیوں میں عام تھا کیونکہ وہ آہستہ آہستہ شہری پر ولتاریہ میں جذب ہو رہے تھے۔ اس طویل عبوری دور میں لاکھوں لوگ فیکٹریوں میں جز وقتی کام کرتے رہے اور ساتھ ساتھ جز وقتی طور پر کاشت کاری میں بھی لگے رہے۔ وہ اپنی خوراک خود پیدا کرتے کچھ ضروری اشیاء خریدتے اور کچھ خود بنا لیتے تھے۔ یہ انداز اب بھی دنیا کے بہت سے ملکوں میں چھایا ہوا ہے مگر اس کی بنیاد ابتدائی ٹیکنالوجی پر ہے۔

اشیاء اور خوراک کی پیداوار کے لئے اکیسویں صدی کی ٹیکنالوجی کے ہمراہ طرز زندگی کا تصور تو کیجئے جبکہ خدمات کی پیداوار کے لئے اپنی مدد آپ کے نت نئے اور توسیع شدہ طریقے بھی سامنے ہونگے۔ مثلاً کسی لباس کے ڈیزائن کے بجائے کل کا صانف ایک ایسے پروگرام والی کیسٹ خرید سکتا ہے جو ایک ''سمارٹ'' الیکٹرانک سلائی مشین کو چلائے گی۔ ایک انتہائی سست رو گھریلو خاوند بھی اس طرح کی کیسٹ کی مدد سے اپنے لئے روایتی قمیض بنا سکتا ہے۔ معمولی مکینکل سوجھ بوجھ والے اپنی گاڑیوں کی محض ٹیوننگ سے کہیں زیادہ کام کر سکتے ہیں۔ درحقیقت وہ تو آدھی سے زیادہ گاڑی ٹھیک کر سکیں گے۔

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ صارف کے لئے کچھ عرصے بعد یہ ممکن ہو جائے گا کہ وہ کاروں کی مینوفیکچرنگ کے عمل میں اپنی مخصوص تفصیلات کمپیوٹر یا ٹیلی فون کے ذریعے پروگرام کر سکے۔ لیکن ایک اور طریقہ بھی ہے جس کے ذریعے صارف اب بھی کار بنانے کے عمل میں شریک ہوسکتا ہے۔

براڈلے آٹو موٹیو نام ایک کمپنی ''براڈلے جی ٹی کٹ'' پیش کرتی ہے جس کے ذریعے آپ ''اپنی شاندار سپورٹس کار کو خود ہی جوڑ کر تیار کر سکتے ہیں۔'' جزوی طور پر غیر تیار شدہ کٹ خریدنے والا صانف فوکس ویگن کے چیس پر فائبر گلاس کی باڈی چڑھاتا ہے۔ انجن کی تاروں کو جوڑتا ہے، سٹیرنگ کو اپنی جگہ سیٹ کرتا ہے، سیٹیں فکس کرتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

کوئی بھی شخص ایسی نسل کی تصویر کشی با آسانی کر سکتا ہے جو عمومی طور پر جز وقتی اجرتی کام پر زندگی گزار رہی ہو۔ بہت سی سستی، چھوٹی چھوٹی ٹیکنالوجیز اس کے گھر میں

موجود ہوں۔ اپنے دست و بازو کے استعمال کی شوقین ہو۔ غرض آبادی کے ایک بڑے حصے کا مزاج اس قسم کا ہو، آدھے مارکیٹ میں اور آدھے مارکیٹ سے باہر، تمام سال کام کرتے گزارنے کے بجائے وقفے وقفے سے پیداواری عمل میں شریک ہوں، بعض اوقات پورے پورے سال کام سے چھٹی پر ہوں، ممکن ہے وہ خاصا کم کما رہے ہوں مگر۔۔۔۔ بہت سے کاموں کے لئے (جن کے لئے آج کل رقم چاہئے) اپنی ذاتی محنت استعمال کر کے، وہ اس کی تلافی کر رہے ہونگے۔ اور اس طرح افراط زر کے اثرات کو غیر موثر کر رہے ہونگے۔
امریکہ کے مورمونز مستقبل کے ممکنہ طرز زندگی کے بارے میں ایک اور حوالہ پیش کرتے ہیں۔ بہت سے مورمونز اسٹیکس۔۔۔۔اسٹیکس کیتھولک چرچ کے زیر انتظام علاقہ کو کہتے ہیں۔۔۔۔ اپنے ملکیتی کھیتوں میں خود ہی کام بھی کرتے ہیں۔ اسٹیک اراکین، بشمول شہری ارکان، اپنا فارغ وقت کسانوں کی طرح خوراک اگانے میں رضا کارانہ طور پر خرچ کرتے ہیں۔ پیداوار کا زیادہ تر حصہ فروخت کرنے کے بجائے ایمرجنسی استعمال کے لئے جمع کر لیا جاتا ہے یا ضرورت مند مورمونز میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ ڈبے بنانے کے مرکزی پلانٹس، بوتلیں بنانے کی سہولتیں اور اناج اٹھانے والی مشینیں بھی وہاں موجود ہیں۔ بعض مورمون اپنی خوراک خود اگاتے ہیں اور اسے Cannery لے جاتے ہیں۔ بہت سے لوگ سپر مارکیٹ سے تازہ سبزی خرید کر اسے مقامی Cannery لے جاتے ہیں۔

سالٹ لیک سٹی کا ایک مورمون کہتا ہے۔ ''میری والدہ ٹماٹر خریدیں گی اور انہیں ڈبوں میں بند کر دیں گی۔ ان کی مددگار سوسائٹی، عورتوں کے باہمی تعاون کی سوسائٹی کے اراکین کسی بھی دن، سب کی سب اکٹھے ہوں گی اور اپنے استعمال کے ٹماٹر خود ہی پیک کر لیں گی۔ اسی طرح بہت سے مورمون نہ صرف اپنے چرچ کو چندہ دیتے ہیں بلکہ تعمیراتی کام یا ایسے ہی دوسرے کام بھی رضا کارانہ طور پر سرانجام دیتے ہیں۔ اس سارے تذکرے کا مقصد قطعاً یہ تجویز کرنا نہیں کہ ہم سب مورمون چرچ کے رکن بن جائیں یا ایک عالیشان مذہبی گروہ کی فرصت کے لمحات میں ایسی سرگرمیوں میں شمولیت دیکھ کر، مستقبل میں اتنے وسیع پیمانے کی سماجی اور کمیونٹی مشاغل کے لیسے ہی امکانات تلاش کئے جائیں لیکن اپنے استعمال کے لئے پیداوار کا اصول، چاہے وہ انفرادی سطح پر ہو یا منظم گروپ کی، مزید وسعت

MashalBooks.org

اختیار کرے گا۔

گھر میں کمپیوٹر موجود ہو، شہری بلکہ اپارٹمنٹ کاشت کے لئے تیار کردہ خصوصی بیج ہوں، پلاسٹک کے کاموں کے لئے سستے اوزار ہوں اور ٹیلی فون لائنز پر تکنیکی مشورے مفت حاصل ہو سکتے ہوں۔ ہدایات غالباً ٹی وی یا کمپیوٹر سکرین پر جھلملا رہی ہوں تو ایک مدور او متنوع طرز زندگی کو جنم دینا ممکن ہو جاتا ہے۔ جس میں دوسری لہر کی تہذیب کے مخصوص حالات کی نسبت کم یکسانیت، کہیں زیادہ تخلیقی اطمینان اور مارکیٹ کا خاصا کم کردار ہو۔

ابھی یہ جاننا قبل از وقت ہوگا کہ سیکٹر ب میں تبادلے کی سرگرمی کی سیکٹر الف میں خود انحصاری کی جانب منتقلی کہاں تک جائے گی۔ ایک ملک سے دوسرے ملک میں ان دونوں سیکٹروں کے مابین توازن کیسے بدلے گا اور اس سے زندگی کے کون سے خاص انداز جنم لیں گے۔ یہ امر بہرحال یقینی ہے کہ استعمال کی پیداوار اور تبادلے کی پیداوار کے مابین توازن میں کوئی اہم تبدیلی ہمارے معاشی سسٹم کے ساتھ ساتھ ہماری اقدار پر بھی گہرے اثرات رونما کرے گی۔

تیسری لہر کی معاشیات

کیا ممکن ہے کہ پروٹسٹنٹ اخلاقیات کار کا افسوس ناک زوال دوسروں کے لئے پیداوار سے ذاتی استعمال کی پیداوار کی جانب منتقلی سے منسلک ہے؟ وہ صنعتی جذبہ جس نے محنت مشقت کو رواج دیا تھا، ہر جگہ روبہ زوال نظر آتا ہے۔ مغربی منتظمین اس ''برطانوی بیماریوں کے متعلق منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے رہتے ہیں۔ اگر اس کا علاج نہ کیا گیا تو یہ ہمیں پائی پائی کو محتاج کر ڈالے گی۔ ''صرف جاپانی محنت سے کام کرتے ہیں'' وہ کہتے ہیں لیکن میں نے جاپانی صنعت کے اکابرین کو یہ کہتے سنا ہے کہ ان کی لیبر فورس بھی اسی تکلیف میں مبتلا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ''صرف جنوبی کوریا والے محنتی ہیں۔''

مفروضہ طور پر اپنے کام پر محنت نہ کرنے کے خواہاں افراد ہی درحقیقت وہ لوگ ہیں جو اپنے موعودہ کام سے ہٹ کر۔۔۔۔ غسل خانے کی ٹائلیں لگانے، قالین بانی، سیاسی مہم کے لئے اپنا وقت اور ذہن لگانے، اپنی مدد آپ سے متعلق میٹنگ میں جانے، سینے پرونے، باغ میں سبزیاں اگانے، مختصر کہانیاں لکھنے یا بالائی بیڈ روم کو سجانے سنوارنے

میں۔۔۔۔کہیں زیادہ محنت کر رہے ہیں۔کہیں یہ وہی زبردست جذبہ تو نہیں، جس نے سیکٹر ب کو تقویت دی تھی اور اب سیکٹر الف کی خود انحصاری میں کارفرما نظر آ رہا ہے۔

بھاپ کے انجن اور مشینی کھڈیوں کے علاوہ بھی دوسری لہر کے جلو میں اور بہت کچھ آیا تھا۔ رویوں میں ایک گہری تبدیلی بھی اس کے ساتھ آئی۔ پہلی لہر کے معاشروں سے دوسری لہر کے معاشروں کی طرف حرکت پذیر آبادیوں کے درمیان یہ تبدیلی واقع ہوتے ہوئے ہم آج بھی دیکھ سکتے ہیں۔۔۔۔مثلاً کوریا والے، جو ابھی تک سیکٹر الف کی قیمت پر توسیع میں لگے ہوئے ہیں اس کے برعکس، تیسری لہر کے اثرات کے گھائل، دوسری لہر کے ترقی یافتہ معاشرے میں۔۔۔۔جوں جوں پیداوار سیکٹر الف کے جانب واپس آ رہی ہے اور صارف کو پیداواری عمل میں شریک کیا جا رہا ہے۔۔۔۔کردار میں ایک اور تبدیلی شروع ہو رہی ہے۔ بعدازاں ہم اس دلکش اور مسحور کن تبدیلی کا جائزہ تفصیلی لیں گے۔ فی الحال ذہن میں صرف یہ رکھنا ہے کہ خود انحصاری کی آمد شخصیت کی ساخت کو بھی بہت زیادہ متاثر کرے گی۔

بہرحال صانف کی آمد کے ساتھ، سب سے زیادہ دھماکہ خیز تبدیلیاں معاشیات میں ہی رونما ہونی ہیں۔ اپنے تمام اسلحہ کی تربیت سیکٹر ب پر کرنے کی بجائے معیشت دانوں کو معیشت کا ایک جدید اور جامع تصور اجاگر کرنا ہو گا۔ انہیں یہ تجزیہ کرنا ہو گا کہ سیکٹر الف میں کیا کچھ ہوتا ہے اور ان دونوں سیکٹروں کے باہمی تعلق کے متعلق اچھی طرح جاننا ہو گا۔

تیسری لہر کے ہاتھوں دنیا کی تشکیل نو کے آغاز کے ساتھ ہی، اقتصادیات کے پیشے پر زبردست حملے شروع ہو گئے ہیں کہ موجودہ واقعات کی وضاحت کی اس میں صلاحیت ہی نہیں۔ اس کے سب سے قیمتی آلات بشمول کمپیوٹرائزڈ ماڈلز اور قالب ہمیں معیشت کی فعالیت کے بارے میں بہت کم بتا پاتے ہیں۔ درحقیقت بہت سے ماہرین معاشیات خود بھی اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ روایتی معاشی نظریہ چاہے وہ مغربی ہو یا مارکسی، انتہائی تیزی سے بدلتی حقیقت سے کسی بھی طرح لگا نہیں کھاتا۔

ایک بنیادی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اہم نوعیت کی زیادہ سے زیادہ تبدیلیاں سیکٹر ب۔۔۔۔تبادلے کے تمام عمل۔۔۔۔سے باہر وجود پذیر ہیں۔ معیشت دانوں کو حقیقت کی

جانب واپس لانے کے لئے تیسری لہر کے ماہرین معاشیات کو سیکٹر الف میں موجود عوامل کو بیان کرنے کی غرض سے، نئے ماڈل، پیمانے اور فہرست بنانے کی ضرورت ہوگی اور صانف کی آمد کی روشنی میں بہت سی بنیادی مفروضات کے متعلق دوبارہ سوچ و بچار کرنا ہوگا۔

جونہی ہم سیکٹر ب میں معلوم پیداوار اور سیکٹر ب یعنی مخفی معیشت میں غیر معلوم پیداوار کو باہم منسلک کرنے والے طاقتور تعلق کو تسلیم کر لیتے ہیں، ہمیں ان اصلاحات کی از سرنو تعریف کرنا پڑے گی۔1960ء کے عشرے کے دوران نیشنل بیورو آف اکنامک ریسرچ کے ماہر معاشیات وکٹر فچس نے اس مسئلے کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے اشارتاً کہا تھا کہ خدمات کی آمد نے روایتی پیداواری پیمانوں کو ناکارہ کر کے رکھ دیا ہے۔فچس نے صاف صاف بتلایا۔''صارف کی ایمانداری، علم، تجربہ اور قوت تحریک خدمات کی پیداواریت پر اثرانداز ہوتی ہے لیکن ان الفاظ میں بھی صارف کی ''پیداواریت'' صرف سیکٹر ب یعنی تبادلے کی پیداوار میں حصے کے طور پر۔۔۔نظر آتی ہے۔

ابھی تک یہ تسلیم نہیں کیا جا رہا کہ حقیقی پیداوار سیکٹر الف میں بھی پیدا ہوتی ہے۔۔۔یعنی اپنی ذات کے لئے پیدا کردہ اشیاء و خدمات بالکل حقیقی ہوتی ہیں اور وہ سیکٹر ب میں بنائی گئی اشیاء و خدمات کی ضرورت ختم کرسکتی ہیں یا ان سے قابل تبادلہ ہوتی ہیں۔ روایتی پیداواری اعداد وشمار، خصوصاً خام قومی پیداوار(GNP) اعداد وشمار اس وقت تک معنویت پیدا نہیں کرسکیں گے جب تک سیکٹر الف میں وقوع پذیر (پیداواری) عمل کو شامل کر کے، انہیں پوری وسعت نہیں دی جاتی۔

صانف کی موعودہ آمد بھی لاگت کو زیادہ واضح فوکس کرنے میں مدد دے رہی ہے۔اگر ہم یہ تسلیم کرلیں کہ سیکٹر الف میں صانف کی اثر پذیری سیکٹر ب میں کام کرنے والی کمپنیوں یا حکومتی اداروں کے اخراجات میں کمی بیشی کرسکتی ہے تو ہماری وسعت نظر میں بے پناہ گہرائی آ جائیگی۔

مثال کے طور پر کارکنوں میں نشہ بازی، غیر حاضری، نروس بریک ڈاؤن اور ذہنی پراگندگی، غرض یہ سب چیزیں۔۔۔سیکٹر ب میں انہیں با آسانی ناپا جاتا ہے۔۔۔ ''کاروباری لاگت''میں اضافہ کرتی ہیں، امریکی صنعت میں صرف نشہ بازی کی لاگت کا

اندازہ سالانہ پیداواری وقت کے دوران 20 بلین ڈالر لگایا گیا ہے۔ پولینڈ اور سوویت یونین میں جہاں یہ بیماری کہیں زیادہ شدت سے موجود ہے، یہ اعداد وشمار اور زیادہ چونکا دینے والے ہوں گے۔ اپنی مدد آپ کرنے والے گروپس، جس حد تک کارکنوں میں یہ مسائل حل کر سکیں، اسی حد تک یہ جاریہ لاگتیں کم ہوتی جائیں گی۔ صانف کی استعداد کار اس طرح پیداوار کی استعداد پر اثر انداز ہوتی ہے۔

کاروبار میں بعض لطیف سے عوامل بھی پیداوار کی لاگت پر اثر ڈالتے ہیں۔ کارکن کس حد تک پڑھے لکھے اور واضح شعور کے مالک ہیں؟ کیا وہ سب ایک ہی زبان بولتے ہیں؟ کیا وہ وقت بتا سکتے ہیں؟ کیا وہ ثقافتی طور پر کام کے لئے تیار ہیں؟ کیا گھریلو زندگی میں سیکھی گئی سماجی مہارتیں اس کی صلاحیتوں میں اضافہ یا کمی کا باعث ہوتی ہیں؟ سیکٹر ب یعنی تبادلے کے شعبے میں بلند پیداواریت کے لئے ضروری یہ تمام کردار خصوصیات، رویئے اقدار، مہارتیں اور تحریکیں سیکٹر الف میں پیدا ہوتی ہیں، بلکہ زیادہ صحیح طور پر، خود اپنے لئے پیدا کی جاتی ہیں۔ صانف کی آمد۔۔۔ صارف کی پیداواری عمل میں دوبارہ لازمی شمولیت۔۔۔ ایسے باہمی رشتوں کو کہیں زیادہ قریب سے دیکھنے پر مجبور کرے گی۔

یہی طاقتور تبدیلی ہمیں استعداد کی نئی تعریف کرنے پر مجبور کر دے گی۔ آج کل استعداد جانچنے کے لئے معیشت دان ایک ہی شے یا خدمت کو پیدا کرنے کے متبادل طریقوں کا باہم تقابل کرتے ہیں۔ لیکن انہوں نے سیکٹر ب میں پیداواری استعداد کا، کبھی بھی سیکٹر الف میں اپنے لئے صرف کردہ پیداواری استعداد سے موزانہ نہیں کیا، لیکن معاشی نظریات سے نابلد لاکھوں لوگ، بہر حال یہ کام کر رہے ہوتے ہیں۔ وہ اس جستجو میں ہیں کہ آمدنی کی ایک مخصوص سطح کے یقینی ہونے کے بعد، زیادہ رقم کمانے کی نسبت اپنی ضرورت کا کام کرنا، معاشی اور نفسیاتی طور پر زیادہ منافع بخش ہوگا کہ نہیں۔

ماہرین معاشیات یا کاروباری حضرات باقاعدہ طور پر سیکٹر الف پر سیکٹر ب کی استعداد کے منفی اثرات کا جائزہ نہیں لے پاتے۔ مثلاً جب کوئی کمپنی اپنے افسروں کی بہت زیادہ حرکت پذیری کی طالب ہوتی ہے اور اس طرح تھکاوٹ کے نتیجے میں بیماری، گھریلو جھگڑے یا زیادہ شراب نوشی کی لہر پیدا ہوتی ہے۔ ہم یہ بخوبی معلوم کر سکتے ہیں کہ روایتی سیکٹر

ب کی اصطلاح میں، جو کچھ غیر استعدادی لگتا ہے، درحقیقت حیرت انگیز حد تک مستعد لگتا ہے، بشرطیکہ ہم معیشت کے کے ایک جزو کے بجائے، پوری معیشت پر نظر ڈالیں۔ معنویت پیدا کرنے کے لئے ''استعداد'' کا حوالہ،محض ابتدائی ترتیب اور اثرات کے بجائے ثانوی نوعیت کا اور معیشت کے ایک حصے کے بجائے، دونوں سیکٹروں سے متعلق ہونا چاہئے۔

''آمدنی'' فلاح و بہبود'' ''غربت''یا ''بے روزگاری'' جیسے تصورات کا کیا کیا جائے؟ اگر کوئی شخص آدھا مارکیٹ سسٹم میں اور آدھا اس سسٹم سے باہر رہتا ہے، کن اشیاء، کو واضح غیر واضح طور پر اس کی آمدنی سے زیادہ اس کا اپنے لئے خود کیا ہوا کام ہو وہاں اس کی زری آمدنی کے اعداد کی کیا معنویت رہ جاتی ہے؟ ایسے نظام میں ہم فلاح و بہبود کی تعریف کیسے کریں گے؟ کیا بہبود حاصل کرنے والوں کو کام کرنا چاہئے۔ اگر ایسا ہوتو کیا یہ سارا کام لازماً سیکٹر ب میں ہونا چاہئے؟ یا بہبود یافتگان کی، خود اپنے لئے کام کرنے کے لئے حوصلہ افزائی کی جائے؟ بے روزگاری کے حقیقی معنی کیا ہیں، کام سے رخصت پر آیا ہوا ایک کار مکینک، جو اپنے گھر کے نئی چھت بناتا ہے یا اپنی کار پوری طرح درست کرتا ہے،کیا اسی مفہوم میں بے روزگار ہے جیسے کوئی گھر میں بیٹھا ٹیلی ویژن پر فٹ بال میچ دیکھ رہا ہو۔ صانفکی آمد،ایک طرف بے روزگاری کے جڑواں مسائل اور دوسری جانب نوکر شاہی کی فضول شان وشوکت اور آرام آسائش کے متعلق ہمارے تمام تر اندازنظر کو بحث طلب بنا رہی ہے۔

دوسری لہر کے معاشروں نے بے روزگاری پر قابو پانے کی خاصی کوشش کی ہے۔مثال کے طور پر، ٹیکنالوجی کی مزاحمت کر کے،نقل وطنی کو روک کے، تبادلہ محنت پیدا کر کے، برآمدات میں اضافہ اور درآمدات میں کمی کر کے،عوامی ورکس پروگرام بنا کے، اوقات کار کم کر کے،محنت کی حرکت پذیری بڑھا کے، ساری کی ساری آبادیوں کو جلا وطن کر کے اور یہاں تک کہ جنگ کے شعلے بھڑکا کر بھی معیشت کو متحرک رکھنے کی کوشش کی گئی۔ اس کے باوجود بھی بے روزگاری کا مسئلہ ہر روز زیادہ پیچیدہ شکل اختیار کئے جاتا ہے۔

کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ محنت کی رسد۔۔۔۔ کمی یا زیادتی دونوں۔۔۔۔ کے مسائل دوسری لہر کے معاشروں کے دائرہ کار میں، چاہے وہ سرمایہ دارانہ ہوں یا سوشلسٹ،

کبھی اطمینان بخش طریقے سے حل ہی نہیں کئے جا سکتے؟ معیشت کے کسی ایک جز پر فوکس کرنے کے بجائے، معیشت کو ایک اکائی کے طور پر دیکھنے سے کیا ہم مسئلے کو کسی نئے دائرہ عمل میں لا سکتے ہیں جو اس کو سمجھانے میں ہماری مدد کرے؟اگر دونوں سیکٹروں میں پیداواری جاری ہے۔ اگر لوگ ایک سیکٹر میں اپنے لئے اور دوسرے سیکٹر میں اداروں کے لئے اشیاء و خدمات پیدا کرنے میں مصروف ہوں تو کسی کے لئے کم از کم لازمی آمدنی کے موضوع پر یہ کیسے اثر انداز ہوسکتی ہے۔ دوسری لہر کے معاشروں میں عام طور پر آمدنی کا تبادلے کی معیشت کے لئے کام کے ساتھ انتہائی پیچیدہ تعلق رہا ہے لیکن مارکیٹ کا حصہ نہ ہونے یا جزوی شمولیت کے باوجود کیا صانف بھی کام نہیں کر رہے؟ کیا گھر میں رہنے والے بچوں کی پرورش میں مصروف مرد یا عورت، سیکٹر الف میں اپنی کوششوں کے ذریعے، سیکٹر ب کی پیداوار میں اپنا حصہ نہیں ڈال رہے؟ سیکٹر ب میں کوئی اجرتی حیثیت نہ ہونے کے باوجود، کیا انہیں کوئی آمدنی نہیں ہونی چاہئے؟

صانف کی آمد یقینی طور پر ہماری تمام معاشی سوچ کو بدل ڈالے گی۔ اس طرح معاشی تضاد کی بنیاد بھی تبدیل ہو جائے گی۔ کارکن ضانع اور منتظم صانع کے مابین مقابلہ بہر حال جاری رہے گا لیکن صانفیت میں اضافے اور تیسری لہر کے معاشرے کی جانب مزید آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ اس کی اہمیت کم ہوتی جائیگی۔

اس کی جگہ نئے سماجی تضادات ابھریں گے۔ یہ جھگڑے اٹھ کھڑے ہوں گے کہ کونسی ضروریات، معیشت کے کس سیکٹر کے ذریعے پوری کی جائیں۔ دوسری لہر کے کی قوتیں صانفین کی حرکت پذیری کو روک کر پیداواری کام اور منافع کو قبضہ کرنے کی کوشش کریں گی تو اجازت ناموں، تعمیراتی ضوابط اور اسی طرح دوسری چیزوں میں باہمی چپقلش تیز تر ہو جائے گی، اساتذہ کی یونین، تعمیراتی کاروبار کرنے والوں کے انداز میں ''جو اپنے فرسودہ تعمیراتی قاعدوں کو چھپاتے ہیں'' والدین کو کلاس روم سے باہر رکھنا چاہتی ہے حالانکہ جسمانی صحت کے بہت سے مسائل ''مثلاً زیادہ کھانے سے بدہضمی، ایکسر سائز نہ کرنا، سگریٹ نوشی'' کی طرح، جو مریض کی سرگرم شرکت کے بغیر ڈاکٹر کے اکیلے علاج سے حل نہیں ہو سکتے، بہت سے ایسے تعلیمی مسائل بھی ہیں جو والدین کے بغیر حل طلب رہیں گے۔ صانف

کی آمد تمام معاشی منظر نامے کو تبدیل کر دے گی۔

چنانچہ یہ تمام اثرات گہرے ہوتے جائیں گے اور ہمارے سامنے موجود ایک وسیع تاریخی حقیقت ساری عالمی معیشت کو بدل کر رکھ دے گی۔ بظاہر یہ وہ حقیقت ہے جسے دوسری لہر کے سارے معیشت دانوں اور مفکروں نے سرے سے نظر انداز کیا ہوا تھا۔ یہ آخری عظیم الشان حقیقت کچھ اسی انداز میں رونما ہو رہی ہے جیسے ہم موجودہ باب میں اس کا ذکر کرتے آئے ہیں۔

خرید وفروخت کا اختتام

مارکیٹ میں شراکت کے پیٹرن میں محض ایک تبدیلی کا مسئلہ نہیں بلکہ زیادہ بنیادی طور پر، مارکیٹ کی تشکیل کے تمام تاریخی عمل کی تکمیل ہی نظر انداز ہو کر رہ گئی۔ یہ اہم نکتہ اپنے مضمرات کے اعتبار سے بہت انقلابی ہے لیکن اتنا ہی لطیف بھی کہ دوسری لہر کے مباحث میں گم سرمایہ دارانہ اور سوشلسٹ مفکرین دونوں ہی نے اس کی علامتوں کا ذرا بھی نوٹس نہیں لیا۔ ان کے نظریات میں اس کی سرے سے کوئی گنجائش ہی نہیں، اسی وجہ سے یہ نکتہ ان کے لئے سربستہ راز ہی رہا۔ کم از کم دس ہزار سال سے، نسل انسانی تبادلے کا ایک بین الاقوامی نیٹ ورک۔۔۔ مارکیٹ۔۔۔ تعمیر کرنے میں لگی رہی ہے۔ گذشتہ تین سو سالوں میں جب سے دوسری لہر کا آغاز ہوا، یہ عمل انتہائی برق رفتاری سے آگے بڑھا۔ دوسری لہر کی تہذیب نے پوری دنیا کو ''مارکیٹ بنا ڈالا''۔ آج جب کہ صانفیت دوبارہ چانے آ رہی ہے۔۔۔ یہ عمل اپنے اختتام کو پہنچ رہا ہے۔ اس کی حقیقی تارخی معنویت کو تبادلے کے نیٹ ورک یا مارکیٹ کے متعلق واضح ہوئے بغیر، سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔ جب دنیا میں دوسری لہر کی آمد کے ساتھ صنعتی انقلاب کے دھماکے ہونا شروع ہوئے تو اس وقت اس کرہ ارض کے بہت کم باشندے نظام زر سے منسلک تھے، تجارت بیشک تھی مگر معاشرے سے اس کا بالکل سطحی تعلق تھا۔ کام کرنے والوں، تقسیم کاروں، تھوک فروشوں، پرچون فروشوں، بینکوں اور تجارتی نظام کے دوسرے عوامل کے مختلف نیٹ ورک چھوٹے چھوٹے اور ابتدائی نوعیت کے تھے جو اشیاء اور زر کے بہاؤ کے لئے چند ایک تنگ پائپ لائنیں مہیا کرتے تھے۔ تین سو سال تک ہم زمین کا سینہ چیر کر توانائیاں حاصل کر کے اس پائپ لائن کی تعمیر میں لگے

رہے۔ اس کی تکمیل تین طریقوں سے ہوئی۔ پہلے طریقے میں دوسری لہر کی تہذیب کے تاجر اور لوٹ مار کے عادی زر پرست پوری دنیا میں پھیل کر نئے علاقوں کے لوگوں کو مارکیٹ۔۔۔۔ زیادہ پیداوار کرنے اور اسے اپنے لئے کم استعمال کرنے۔۔۔۔ میں شامل ہونے کی دعوت یا ترغیب دینے لگے۔ خود کفیل افریقی قبائل کو زری فصلیں پیدا کرنے اور تانبا (زمین سے) نکالنے پر مجبور کر دیا گیا۔ خود کفیل ایشیائی کسانوں کو ربڑ کے درختوں کی پیداوار پر لگا دیا گیا تا کہ اس طرح گاڑیوں کے ٹائر بنائے جا سکیں۔ لاطینی امریکہ کے لوگ یورپ اور امریکہ میں فروخت کرنے کے کافی اگانے لگے۔ اسی قسم کی ہر افزائش کے ساتھ پائپ لائن کی تعمیر میں جدت اور اضافے کئے جاتے رہے اور زیادہ سے زیادہ خطوں کو مارکیٹ پر انحصار کا عادی بنایا جاتا رہا۔

زندگی کی اشیاء پرستی کے اضافے کے رجحان کے ذریعے مارکیٹ کی توسیع دوسرا طریقہ تھا، نہ صرف بڑی بڑی آبادیوں کو مارکیٹ کے جال میں پھنسایا گیا بلکہ مارکیٹ کے لئے زیادہ سے زیادہ اشیاء و خدمات ڈیزائن کی گئیں۔ اس طرح نظام کے نکاس کی استعداد میں مسلسل اضافہ پائپوں کے قطر میں ممکنہ وسعت۔۔۔۔ کی ضرورت بڑھتی گئی۔ اور بالآخر مارکیٹ ایک اور طریقے میں پھیلی جوں جوں معاشرہ اور معیشت زیادہ پیچیدہ شکل اختیار کرنے لگے، صانع سے کسی شے، مثلاً صابن کی ٹکیہ کی صارف تک پہنچنے کے مراحل کی تعداد بڑھنے لگی۔ جتنے زیادہ مراحل ہوئے اتنی ہی زیادہ نکاسی کے راستوں یا پائپوں کی شاخدار بھول بھلیاں پھیلیں۔ نظام کی یہ مزید توضیح بذات خود ترقی کی ایک شکل تھی، یعنی پائپ لائن میں مزید خصوص ٹیوبوں اور والووں (Valves) کی گنجائش بن رہی تھی۔

آج مارکیٹ کی یہ تمام شکلیں اپنی انتہائی حدود کو چھو رہی ہیں۔ بہت کم خطے ایسے ہیں جنہیں ابھی مارکیٹ کے دائرہ کار میں نہیں لایا جا سکا۔ دور دراز علاقوں کے مٹھی بھر افراد ہی اب مارکیٹ سے نا واقف ہوں گے۔ غریب ممالک کے لاکھوں کروڑوں کسان بھی۔۔۔۔ کم سے کم معیار زندگی کے باوجود۔۔۔۔ جزوی طور پر بہر حال مارکیٹ اور اس کے ہمراہی نظام زر سے منسلک ہیں۔ اب صفائی ستھرائی کے عمل کے علاوہ اور باقی کیا رہ جاتا ہے۔ وسیع نئی آبادیوں کے مابین خلیج کو پاٹ کے مارکیٹ کسی بھی طرح مزید وسعت اختیار

نہیں کرسکتی۔ توسیع کی دوسری شکل کم از کم نظریاتی طور پر اب بھی ممکن ہے۔ تصور کے ذریعے ہم اب بھی بلاشبہ اضافی خدمات و اشیاء کی فروخت یا تبادلے کے متعلق سوچ سکتے ہیں۔ لیکن صورت حال یہ ہے کہ صانف کی آمد بہت اہم نوعیت کی ہے۔ سیکٹر الف اور سیکٹر ب کے مابین تعلق خاصا پیچیدہ ہے اور صانفین کی بہت سی سرگرمیاں مارکیٹ سے خریدے گئے خام مال اور اوزاروں کی مرہون منت ہیں لیکن اپنی مدد آپ خصوصی طور پر اور بہت سی اشیاء و خدمات کی ڈی مارکٹائزیشن یہ واضح کرتی ہے کہ یہاں بھی خرید و فروخت کا آخری سانس لیتا عمل دیکھا جا سکتا ہے۔

اور آخر میں ''پائپ لائن'' کی فزوں تر تجدید و توضیح۔۔۔۔ ڈسٹری بیوشن کی پیچیدہ نشوونما، درمیانی آدمیوں کی زیادہ سے زیادہ شمولیت۔۔۔۔ بھی نقطہ اختتام پر پہنچی نظر آتی ہے۔ بہت سے شعبوں میں تبادلے کی لاگت، روایتی پیمانوں پر ناپے جانے کے باوجود، اب پیدا شدہ اشیاء کی لاگت کو بھی مات دے رہی ہے۔ کسی نقطے پر تو اس کی بھی آخری حد ہو گی۔ کمپیوٹر اور ساتھ ہی صانف کو متحرک کرنے والی ٹیکنالوجی کا عروج دونوں ہی چھوٹی چھوٹی ایجادات، اور مزید پیچیدہ سلسلوں کے بجائے، آسان فہم ڈسٹری بیوشن کی جانب اشارہ کر رہے ہیں، ایک بار پھر مشاہدہ خرید و فروخت کے سلسلے کے، اگر ہمارے زمانے میں نہیں تو مستقبل قریب میں، خاتمے کی سمت اشارہ کرتا ہے۔ اگر ہمارا پائپ لائن پراجیکٹ مکمل ہونے کو ہے تو ہمارے کام، ہماری اقدار اور ہماری نفسیات کے لئے اس کی کیا معنویت ہو سکتی ہے؟ ایک مارکیٹ بہر حال فولاد، جوتوں، کاٹن یا ڈبوں میں بند خوراک پر تو مشتمل نہیں ہوتی جو پائپ لائن میں سے بہ جائے۔ مارکیٹ تو ایسا ڈھانچہ ہے جس کے ذریعے اشیاء و خدمات کی آمد و رفت کا راستہ بنتا ہے۔ مزید برآں یہ صرف ایک معاشی ڈھانچہ ہی نہیں یہ لوگوں کو منظم کرنے کا راستہ ہے، انداز فکر ہے، جذبہ ہے اور توقعات کا ایک مشترکہ ہجوم ہے۔ (جیسے یہ توقع کہ خرید شدہ اشیاء لازماً ڈیلیور کی جائیں گی) چنانچہ مارکیٹ ایک معاشی حقیقت ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نفسیاتی ڈھانچہ بھی ہے اور اس کے اثرات معاشیات کے دائرے سے کہیں ماورا ہیں۔

کروڑوں لوگوں کو منظم طور پر باہم منسلک کر کے مارکیٹ نے ایک ایسی دنیا کو جنم

MashalBooks.org

دیا جس میں کسی بھی فرد کا اپنی قسمت پر آزادانہ کنٹرول نہیں تھا۔ نہ کوئی فرد نہ کوئی قوم اور نہ ہی کوئی ثقافت، سب باہم منسلک تھے، یہ اپنے ساتھ یہ عقیدہ لائی کہ مارکیٹ کے ساتھ یک جہتی ارتقائی عمل ہے جبکہ خود کفالتی دقیانوسی عمل ہے۔ اس نے بے ہودہ مادیت پرستی کو فروغ دیا اور یہ عقیدہ پھیلایا کہ معاشیات اور معاشی تحریک ہی انسانی زندگی میں بنیادی قوتیں ہیں۔ اس نے زندگی کو معاہداتی مراحل کا ایک تسلسل قرار دیا اور معاشرے کو ''شادی کے معاہدے'' یا ''سماجی معاہدے'' کے ذریعے باہم اکٹھے رہنے کا نام دیا۔ چنانچہ مارکیٹ کے تشکیلی عمل نے خیالات اور اقدار کو شکل دینے کے ساتھ ساتھ کروڑوں افراد کے افعال بھی تشکیل کئے اور دوسری لہر کی تہذیب کا رنگ و روپ بھی نکھارا، اس نے وقت، توانائی، سرمایہ، ثقافت اور خام مال کی زبردست سرمایہ کاری حاصل کرنے کے بعد اس صورت حال کو جنم دیا جہاں ساؤتھ کیرولینا میں بیٹھا ہوا خریداری ایجنٹ جنوبی کوریا کے ایک نادیدہ اور انجان کلرک کے ساتھ کاروبار کر سکتا ہے۔۔۔ ہر ایک کے پاس اپنا کمپیوٹر اور گنتارا (Abacus) ہے۔ ہر ایک کا مارکیٹ کے متعلق ایک اندرونی تصور ہے، ہر ایک دوسرے کے بارے میں توقعات ہیں، ہر ایک قابل فہم افعال میں مصروف ہے کیونکہ دونوں ہی مخصوص کرداروں کے لئے طویل تجربے کیحامل ہیں، ہر ایک دیوہیکل عالمی نظام کا حصہ ہے جس میں لاکھوں نہیں بلکہ حقیقتاً کروڑوں افراد شامل ہیں۔

بڑے زور شور سے یہ دلیل دی جا سکتی ہے کہ انسانی رشتوں ک اس باکمال اور توضیحی ڈھانچے کی تعمیر اور کرہ ارض پر اس کا دھماکہ خیز پھیلاؤ تن تنہا دوسری تمام ٹیکنالوجی کامیابیوں سے کہیں زیادہ متاثر کن کامیابی ہے۔ اس میں سے گزرنے والی اشیاء و خدمات کے سیلاب سے قطع نظر تبادلے کے اس لازمی سماجی، ثقافتی اور نفسیاتی ڈھانچے کی مرحلہ تخلیق کو اہرام مصر، روم کی مصنوعی نہروں، دیوار چین اور ازمنہ وسطی کے کلیساؤں بشرطیکہ ان سب کی اجتماعی اہمیت کو ہزار گنا کر لیا جائے، جتنا اہم جا سمجھا سکتا ہے۔ پوری تاریخ کے اس عظیم الشان تعمیراتی پراجیکٹ نے تہذیب کی معاشی زندگی کی حرکت پذیری اور بہاؤ کے لئے ٹیوبوں اور نکاسی کے راستوں کے جال پھیلا کر دوسری لہر کی تہذیب کو ہر جگہ اندرونی قوت اور زبردست محرک فراہم کئے، اس مرتی ہوئی تہذیب کا بغور جائزہ لینے کے بعد کہا جا سکتا ہے

کہ اگر اس کا کوئی مقصد تھا تو صرف یہ کہ پوری دنیا کو مارکیٹ کی شکل دے دی جائے۔ آج یہ مشین تکمیل کو پہنچ چکا ہے۔

مارکیٹ کی تعمیر کا شاندار دور ختم ہو چکا ہے۔ اب ایک نیا دور اس کی جگہ لے رہا ہے۔ جس میں ہم پائپ لائن کو صرف برقرار رکھیں گے یا ضرورت کے مطابق اس کی تزئین و آرائش یا تصحیح کر رہے ہوں گے۔ البتہ اطلاعات کے حیرت انگیز حد تک بڑھتے ہوئے بہاؤ کی جگہ بنانے کے لئے ہمیں اس کے بعض اہم اجزاء کو نئی شکل ضرور دینی پڑے گی۔ الیکٹرانکس، بیالوجی اونئی سماجی ٹیکنالوجیز پر نظام کا انحصار بڑھتا جائے گا۔ اس کے لئے بھی بلاشبہ وسائل تصورات اور سرمایہ کی ضرورت ہوگی۔ لیکن دوسری لہر کی مارکٹائزیشن کی کوشش نا تمام کے مقابلے میں تجدید نو کا یہ پروگرام ہمارے وقت، توانائی سرمائے اور تصور کا بہت ہی معمولی حصہ جذب کرے گا۔ تعمیر کے اصلی عمل کی نسبت یہ کہیں کم ہارڈ ویئر اور افرادی قوت استعمال کر رہا ہوگا۔ بہر حال یہ پیچیدہ تبدیلی ثابت کر رہی ہے کہ مارکٹائزیشن کو اب تہذیب کے مرکزی پراجیکٹ کی حیثیت حاصل نہیں رہے گی۔

چنانچہ تیسری لہر تاریخ کی پہلی ماورائے مارکیٹ تہذیب کو جنم دے گی۔ ماورائے مارکیٹ سے میرا یہ مفہوم قطعاً نہیں کہ تبادلے کے نیٹ ورک کے بغیر تہذیب۔۔۔ ایک ایسی دنیا جسے چھوٹے چھوٹے تنہا مکمل طور پر خود کفیل کمیونٹیز (جو نہ باہمی تجارت کے قابل ہوں اور نہ ہی اس کے خواہاں)، کی جانب دھکیل دیا گیا ہو۔ میں اس سے پسپائی کا مفہوم نہیں لیتا۔ ''ماروائے مارکیٹ'' سے مراد میں ایک ایسی تہذیب لیتا ہوں جو مارکیٹ پر انحصار تو کرتی ہے لیکن اس کی تعمیر توسیع، تزئن و آرائش اور اس ڈھانچے کی مطابقت میں خود خرچ نہیں ہوتی۔ یہ تہذیب ایک نئے ایجنڈے کی تکمیل کے لئے آگے بڑھنے کی اہل ہے۔۔۔ کیونکہ مختصراً مارکیٹ کی جگہ متعین ہو چکی ہے۔ اور بالکل اسی طرح جیسے سولھویں صدی میں موجود کوئی شخص یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ مارکیٹ کی نشوونما۔۔۔ ٹیکنالوجی، سیاست، مذہب، آرٹ، سماجی زندگی، قانو شادی یا شخصیت کے ارتقاء کے مفہوم یمس دنیا کے ایجنڈے کو اس قدر تبدیل کرے گی۔۔۔ ہمارے لئے بھی مارکٹائزیشن کے خاتمے کے طویل المعیاد اثرات کا آج تصور کرنا مشکل ہے۔ پھر بھی اگر ہم پر نہیں تو ہمار بچوں کی زندگی کے

MashalBooks.org

ایک ایک گوشے پر ان اثرات کی شعائیں پڑیں گی۔ مارکٹائزیشن پراجیکٹ نے قیمت کا تعین کیا اگرچہ خالص معاشی مفہوم میں یہ بہت زیادہ تھی۔ پچھلے تین سو سال کے دوران جونہی نسل انسانی کی پیدواریت بڑھی اس پیداواریت کا ایک اہم حصہ۔۔۔۔ دونوں سیکٹروں میں۔۔۔۔ ایک طرف کر کے مارکیٹ کی تعمیر کے پراجیکٹ کے لئے مختص کر دیا گیا۔ بنیادی تعمیر کی تکمیل کے ساتھ، عالمی مارکیٹ کے نظام کی تعمیر میں مستعمل، بہت سی توانائیاں اب دوسرے انسانی مقاصد کے لئے موجود ہیں۔ صرف اسی ایک حقیقت کی وجہ سے تہذیبی تبدیلیوں کا ایک طویل وعریض سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ نئے مذاہب پیدا ہوں گے۔ آرٹ کے ناقابل تصور نمونے، ناقابل یقین سائنسی ترقی، اور سب سے بڑھ کر سماجی سیاسی اداروں بالکل ہی نئی اقسام۔

آج جو شے داؤ پر لگی ہوئی ہے وہ سرمایہ داریت یا سوشلزم سے زیادہ اہم ہے، توانائی، خوراک، آبادی، سرمائے خام مال یا نوکریوں سے بھی زیادہ جو شے داؤ پر لگی ہوئی ہے وہ ہے ہماری زندگیوں میں مارکیٹ کا کردار اور تہذیب کا خود اپنا مستقبل اور اس کے اندر سے ہی صانف کا عروج شروع ہوتا ہے۔ معیشت کے گہرے ڈھانچے میں تبدیلی بھی باہم منسلک تبدیلیوں کی اسی لہر کا حصہ ہے جو ہماری توانائی کی بنیاد، ہماری ٹیکنالوجی، اطلاعاتی نظام، ہمارے گھریلو اور کاروباری اداروں سے اس وقت ٹکرا رہی ہے۔ جواباً یہ سب (تبدیلیاں) یک جان ہو کر دنیا کے متعلق ہمارا نکتہءنظر ترتیب دیتی ہے۔ اس دائرے میں بھی ہم ایک تاریخی تبدیلی سے گزر رہے ہیں کیونکہ تہذیب کا تمام عالمی منظر۔۔۔۔ صنعتی دور کی حقیقت۔۔۔۔ اب مکمل انقلاب کی زد میں ہے۔

MashalBooks.org

باب 20

ذہنی گرداب

اتنے بہت سے ملکوں میں اتنے سارے لوگ۔۔۔۔ یہاں تک کہ تعلیم یافتہ اور بظاہر رکھ رکھاؤ والے لوگ بھی۔۔۔۔ متضاد، پریشان کن اور سماعت پہ بار تصروات کے گرداب میں پھنسے ہوئے پہلے کبھی بھی عقلی طور پر اتنے بے بس نہیں رہے۔ ہر دن کے جلو میں کوئی نہ کوئی اچھوتا خیال، سائنسی تحقیق، مذہب، تحریک یا منشور ہوتا ہے، فطرت کی پوجا، ای ایس پی، مقدس ادویہ، سماجی حیاتیات، انتشار پسندی، ترتیب پسندی جدید مارکسزم، نئی طبیعات، مشرقی تصوف، ٹیکنو فیلیا، ٹیکنو فوبیا، اور ایسی ہی ہزاروں دوسری موجیں اور متصاد موجیں اپنی اپنی سائنسی کہانت یا لمحاتی گرو کے ساتھ شعور کی سکرین پر ہر جانب بہتی نظر آتی ہیں۔ اداراتی سائنس پر ہمیں زبردست حملے ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ بنیاد پرستانہ مذہب کا جنگلی آگ کی طرح احیا ہو رہا ہے اور ایمان لانے کے لئے بری طرح کسی بلکہ کسی بھی چیز کی جستجو نظر آتی ہے۔ زیادہ تر پریشان خیالی دراصل ایک شدید ثقافتی جنگ۔۔۔۔ تیسری لہر کی ابھرتی ہوئی ثقافت اور صنعتی معاشرے کے محفوظ نظریات اور مفروضات کے مابین ٹکراؤ۔۔۔۔ کا نتیجہ ہے۔ جس طرح دوسری لہر نے روایتی نظریات کے بعد کو دور کر کے، میرے موسومہ نام، صنعتی دور کی حقیقت پر منظّم یقین پھیلایا۔ اسی طرح آج ہم گذشتہ تین سو سال سے حکمران مفروضات کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی غرض سے فلسفیانہ بغاوت کی شروعات دیکھ رہے ہیں۔ صنعتی دور کے بنیادی تصورات نا قابل اعتبار بے اثر اور نا قابل ترجیح ہوتے جا رہے ہیں یا کہیں زیادہ بڑے اور طاقتور نظریات میں مدغم ہو رہے ہیں۔

دوسری لہر کے تہذیب کے مرکزی عقائد کو پچھلی تین صدیوں میں شدید جدوجہد کے بغیر شرف قبولیت نہیں ملا، سائنس میں، تعلیم میں، مذہب میں اور دوسرے ہزاروں

شعبوں میں صنعتی نظام کے ترقی پسند مفکرین نے زراعتی معاشروں کے حامی اور استدلال کرنے والے رجعت پسند مفکرین کے خلاف زبردست جنگ کی اور آج صنعتی نظام کے محافظ ہیں۔ ان کی پشت دیوار سے جا لگی ہے کیونکہ تیسری لہر کی ثقافت اپنی تشکیل کا آغاز کر رہی ہے۔

فطرت کا جدید تصور

نظریات کے اس ٹکراؤ کی واضح تصویر کشی فطرت کے متعلق ہمارے اپنے بدلتے تصورات سے زیادہ کوئی اور چیز نہیں کر سکتی۔ پچھلے عشرے میں دنیا کے حیاتیاتی دائرے میں بنیادی اور خاصی خطرناک تبدیلیوں کے جواب میں عالمی سطح کی ایک ماحولیاتی تحریک نے جنم لیا ہے۔ یہ آلودگی، خوراک میں ملاوٹ، جوہری ری ایکٹرز، شاہراہوں اور بغیر سپرے ایروسولز پر صرف حملہ آور ہی نہیں ہوئی بلکہ باس نے ہماری فطرت انحصاری کے متعلق بھی از سر نو سوچنے پر مجبور کیا ہے۔ چنانچہ فطرت کے ساتھ خوفناک جنگ میں خود کو ملوث کرنے کی بجائے ہم ایک تازہ تناظر کی سمت بڑھ رہے ہیں جو کرہ ارض کے ساتھ طبعی یکسانیت اور مطابقت پیدا کرنے پر زور دیتا ہے۔ اس ضمن میں ہم مخالفانہ انداز چھوڑ کر، مفاہمانہ رویہ اختیار کر رہے ہیں۔

سائنسی سطح پر حیاتیاتی ماحول سے باہمی رشتوں کو سمجھنے کے لئے ہزاروں مطالعاتی تجزیے کئے گئے ہیں تاکہ فطرت پر ہمارے اثرات مثبت ہو سکیں یا انہیں تعمیری طریقے سے استعمال کیا جا سکے۔ ان رشتوں کی پیچیدگی اور قوت متحرکہ (Dynamism) کی داد دینا اور فطری نظاموں کی ری سائیکلنگ تجدید اور نقل و حمل کی استعداد کے مفہوم میں خود معاشرے از نو تصور ہونا شروع ہوا ہے۔ یہ سب کچھ فطرت کی جانب مقبول عام رویوں کی ایک مشابہ تبدیلی میں جھلکتا نظر آتا ہے۔ چاہے ہم رائے عامہ کا سروے کریں یا پاپ گانوں کی شاعری کا، اشتہارات میں تصویری تخیل دیکھیں یا مذہبی وعظوں کے مواد جانچیں، ہمیں فطرت کے احترام کا خاصا بلند و بالا اگرچہ عموماً رومانوی، مشاہدہ نظر آتا ہے۔

لاکھوں شہری باشندے دیہاتی فضا کے خواہاں ہیں اور اربن لینڈ انسٹی ٹیوٹ کے مطابق ایک غیر معمولی آبادی نے دیہاتی علاقوں کا رخ کر لیا ہے۔ قدرتی غذاؤں، بچوں کی

MashalBooks.org

فطری پیدائش، ماں کا دودھ پلانے، جسمانی موزونیت یا صحت کے خیال میں ذاتی دلچسپی، حالیہ سالوں میں بڑی تیزی سے بڑھی ہے۔ٹیکنالوجی کے بارے میں عوامی اوہام اتنے زیادہ بڑھ گئے ہیں کہ خام قومی پیداوار کا شدت پسند حامی بھی کم از کم زبان کی حد تک یہ کہنے پر مجبور ہے کہ فطرت کا تحفظ ہونا چاہیئے اس کے ساتھ زنا نہیں ہونا چاہیئے۔۔۔۔یعنی فطرت پر ٹیکنالوجی کے غیر مدافعانہ اثرات کا پیشگی اندازہ کر کے ان سے بچاؤ کا سوچنا چاہیئے انہیں نظر انداز نہیں ہونا چاہیئے۔ کیونکہ فطرت کو نقصان پہنچانے کی ہماری طاقت بہت تیزی سے بڑھی ہے اور اب زمین کو دوسری لہر کی تہذیب کے وہم وگمان سے بھی کہیں زیادہ نازک قرار دیا جا رہا ہے اور بیک وقت۔۔۔۔ ہر گزرتے لمحے میں وسیع تر اور پیچیدہ تر ہوتی کائنات میں۔۔۔۔اسے خفیف ہوتے نقطے کی طرح دیکھا جا رہا ہے۔

پچیس سال پہلے جب تیسری لہر کا آغاز ہوا تو سائنس دانوں نے فطرت کی دور دراز منزلوں کی تحقیق کے لئے نء اوزاروں کی مکمل بیڑی تیار کی۔جواباً ان لیزرز، راکٹوں کی رفتار بڑھانے والے آلات، خون کے بے رنگ مادے(Plasmas) حیرت انگیز تصویری صلاحیتیں، کمپیوٹرز اور شعاعی اختراعات(Beemdevices) نے ہمارے اردگرد کے ماحول کے متعلق ہمارے تصور کو پاش پاش کر دیا ہے۔ ہماری نظر اب ایسے مظاہر پر پڑ رہی ہے جو گذشتہ دوسری لہر کے زمانے میں جانچے اور پرکھے گئے مظاہر سے اپنے پھیلاؤ کی درجہ بندی میں کہیں زیادہ بڑے، زیادہ چھوٹے اور تیز تر ہیں۔ آج ایسے مظاہر قدرت کی تحقیق و جستجو میں مشغول ہیں جو ایک سینٹی میٹر کا 1,000,000,000,000,000-1واں حصہ (یعنی جسامت میں اتنے مختصر) ہیں اور دوسری جانب وسیع و عریض کائنات ہے جس کی کم از کم 100,000,000,000,000,000,000,000 میل دور ہے۔ اتنے مختصر دورانیے کے مظاہر ہمارے زیر مطالعہ ہیں جو بمشکل سیکنڈ کے 10,000,000,000,000,000,000,000 ویں حصہ میں وقوع پذیر ہوتے اس کے عکس ہمارے ماہرین فلکیات اور ماہرین نجوم کا کہنا ہے کہ یہ کائنات لگ بھگ 20ارب سال پرانی ہے۔ فطرت کا قابل تحقیق وجستجو (دائرہ) ہمارے گذشتہ کل کے بے حساب

MashalBooks.org

اندازوں سے بھی ماورا نظر آتا ہے۔

مزید برآں وسعت کے اس گرداب میں۔۔۔۔ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ۔۔۔۔ صرف زمین ہی حیاتیاتی کرہ نہیں ہے ماہر نجوم آٹوسٹرود کا کہنا ہے: بہت سے ایسے ستارے ہوں گے۔ جن کے اپنے اپنے سیارے(Planet) ہوں گے بہت سے ماہرین حیاتیات کے اخذ کردہ یہ نتائج کہ زندگی بعض پیچیدہ قسم کے(Molecules) یا ان کے مجموعے کی قدرتی خصوصیت ہے۔ پوری کائنات میں کیمیائی عناصر کی یکسانیت، سورج جیسے ستاروں سے روشنی اور حرارت کا اخراج اور پانی کی زمین کے علاوہ مریخ اور زہرہ پر بھی موجودگی، غرض یہ سب ہمیں اپنا انداز فکر بدلنے اور غیر ارضی زندگی کے اکانات پر غور کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ اس سے قطعاً انسانی وضع قطع کے چھوٹے اور سبز جاندار مراد نہیں اور نہ ہی ان کا مطلب (Ufo's) جیسی شے ہے۔ بلکہ یہ رائے کہ زندگی صرف کرہ ارض سے ہی مختص نہیں، فطرت سے متعلق ہمارے تخیل اور اس میں خود ہماری جگہ کے متعلق سوچ کے بارے میں مزید تبدیلیوں کا باعث بن رہی ہے۔1960ء سے سائنس دان اس امید پر تاریک خلا میں کان لگائے بیٹھے ہیں کہ کسی دور دراز فاصلے کی ذہین مخلوق کے سگنل لزسن سکیں۔ امریکی کانگریس کائنات میں کسی اور جگہ پر باشعور زندگی کے امکانات پر کئی اجلاس منعقد کر چکی ہے۔ اور خلاء میں جانے والے پائنیر 10 نامی خلائی راکٹ کے ساتھ غیر ارضی مخلوق کے لئے تصویری تہنیت(Greeting) بھیجی گئی تھی۔ تیسری لہر کے آغاز کے ساتھ ہی ہماری اپنی زمین بہت مختصر اور خاصی غیر محفوظ ہوتی جا رہی ہے۔ کائنات میں ہماری پرشکوہ حیثیت بھی گھٹتی محسوس ہوتی ہے۔ اور یہ دوراز کار امکان۔۔۔ کہ ہم اکیلے نہیں ہیں، ہمیں پس و پیش میں ڈال دیتا ہے۔ فطرت کے متعلق اب ہمارا وہ تصور نہیں رہا جو کبھی ہوا کرتا تھا۔

ارتقاء کی ڈیزائننگ

ماہرین حیاتیات، آثار قدیمہ کے ماہروں اور انسانیات سے متعلق مفکر رازہائے ارتقاء کو بے نقاب کرنے کی کوشش میں، یکساں طور پر خود کو ارتقاء کے پرانے تصور کی نسبت، ایک زیادہ بڑے اور پیچیدہ جہان میں موجود پاتے ہیں۔ اب انہیں پتہ چل رہا ہے کہ جن قوانین کو وہ عالمی اطلاق(Universal-Application) کا حامل سمجھتے تھے، درحقیقت

وہ خصوصی معاملات ہیں۔ نوبل انعام یافتہ ماہر تخلیقیات فرنیکوئس جیکب کا کہنا ہے ڈارون کے زمانے سے ماہرین حیاتیات نے۔۔۔ ارتقاء کی میکانیت کے چارٹ کی، جسے فطری چناؤ کا نام دیا گیا ہے تدوین کی ہے۔ اسی کی بنیاد پر۔۔۔ کائناتی، کیمیائی نظریاتی، سماجی۔۔۔ غرض تمام ارتقاء کی تصویر کشی کی اکثر کوششیں کی گئی ہیں کیونکہ یہ سبھی چناؤ کی یکساں میکانیت کے تحت آتے ہیں۔ لیکن ایسی توقعات پر پانی پھرنے لگتا ہے، جب یہی اصول ہر سطح علم پر بدلتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ حیاتیاتی سطح پر بھی وہ اصول جن کا اطلاق عالمگیر سمجھا جاتا تھا، شکوک کی زد میں ہیں۔ چنانچہ سائنس دان یہ پوچھنے پر مجبور ہیں کہ آیا تمام حیاتیاتی ارتقاء تبدیلی اور فطری چناؤ کا ہی نتیجہ ہے یا ڈارون کے فطری چناؤ کے عمل کے بغیر مالیکولر سطح پر بہت سی تبدیلیوں کا محتاج ہوتا ہے جو بل ارادہ تخلیق پر منتج ہوتا ہے۔ جاپان میں نیشنل جینٹک انسٹی ٹیوٹ کے ڈاکٹر موٹو کیمورا کا کہنا ہے: مالی کیولر سطح پر ارتقاء نیوڈارونزم کی توقعات سے بالکل مطابقت نہیں رکھتا۔

طویل عرصے سے قائم دوسرے کئی مفروضات بھی بری طرح ہل رہے ہیں۔ ماہرین حیاتیات نے ہمیں بتایا کہ یوکاریوٹس (انسان اور زندگی کی دوسری اکثر شکلیں) بالآخر پروکاریوٹس (جن میں بیکٹریا اور الگائی (Algae) شامل ہیں) کے سادہ خلیوں سے پروان چڑھتے ہیں۔ تازہ تحقیق کا مشاہدہ اور ہے، اس کے مطابق یہ بھی ممکن ہے کہ زندگی کی سادہ شکلیں زیادہ پیچیدہ اشکال کی مرہون منت ہوں۔ علاوہ ازیں ارتقاء کو حالات سے مطابقت کی ایسی صلاحیت دینی چاہئے جو بقاء کے مواقع بڑھاتا ہو۔ لیکن ہمیں ارتقائی تشکیل میں ایسی زبردست مثالیں مل رہی ہیں جو مختصر مدتی نقصانات کے عوض طویل فائدہ دیتی ہیں۔ ارتقاء کس کی حمایت کر رہا ہے؟ انتہائی حیران کن خبر، جس کی پہلے کوئی نظیر نہیں، آسٹریلیا کے گرانٹ پارک چڑیا گھر سے متعلق ہے جہاں کروموسومز کے بالکل ہی دو مختلف سیٹ والے دو گوریلوں کی نوع کے جانوروں کے اتفاقی ملاپ کے نتیجے میں پہلا مشہور دوغلا گوریلا (Hybirdape) پیدا ہوا۔ اگرچہ محققین دوغلے گوریلے کی نسل زرخیزی کے بارے میں پریقین نہیں، تاہم اس کی آدھا تیتر آدھا بٹیر تخلیقی شکل سے اس نظریئے کو مدد ضرور ملتی ہے کہ ارتقاء بے ترتیب حالت میں بھی ہوتا ہے اور چھوٹی چھوٹی تبدیلیوں کی نشوونما کے

ذریعے بھی۔ درحقیقت ارتقاء کو ایک مسلسل اور رواں عمل دیکھنے کے بجائے آج کے بہت سے حیاتیاتی سائنس دان اور ماہرین آثار قدیمہ نظریہ قیامت (Theory-of-Catostrophes) کا تجزیاتی مطالعہ کر رہے ہیں تاکہ ارتقائی ریکارڈ کی مختلف شاخوں میں کھائی اور چھلانگ کی وضاحت کی جا سکے۔ کچھ اور ماہرین ان چھوٹی چھوٹی تبدیلیوں کا مشاہدہ کر رہے ہیں جو ممکن ہے ساخت میں، اچانک ہیئتی تبدیلیوں میں، فیڈ بیک کے ذریعے سادہ شکل اختیار کر گئی ہوں، ان سارے مسائل پر گرما گرم مباحث نے سائنس کی برادری کو تقسیم کر دیا ہے۔ لیکن ان مباحث کو صرف ایک تاریخی تبدیلی لانے والی حقیقت نے بے معنی کر کے رکھ دیا۔

1953ء میں ایک نوجوان ماہر حیاتیات جیمز واٹسن کیمبرج (برطانیہ) میں ایگل پب میں بیٹھا ہوا تھا کہ اس کا ایک ساتھ ٹرانس کرک بڑے جوشیلے انداز میں اندر داخل ہوا اور دائرہ کی سماعت میں آنے والے ہر شخص کو زور زور سے بتانے لگا کہ ہم نے زندگی کا راز پالیا ہے۔ وہ واقعی یہ راز افشا کر چکے تھے کیونکہ واٹسن اور کرک نے DNA ساخت کو بے نقاب کر ڈالا تھا۔ 1957ء میں تیسری لہر کی ابتدائی ارتعاش محسوس ہونے لگا تھا۔ ڈاکٹر آرتھر کارن برگ نے یہ پتہ چلا لیا کہ DNA خود کو دوبارہ کیسے پیدا کر لیتا ہے۔ اس کے بعد کیا ہوا، ایک مقبول عام سمری اس کا تسلسل یوں بتاتی ہے ہم نے DNA کوڈ میں نقب لگا لی ہے۔۔۔ ہمیں پتہ چل گیا ہے کہ DNA خلیے تک اپنی ہدایات کس طرح پہنچاتا ہے۔۔۔ ہم نے حیاتیاتی عمل کا تعین کرنے کے لئے جرثوموں (Chromosomes) کا تجزیہ کر لیا ہے۔۔۔ ہم نے خلیہ مرتب کرنے کا کلیہ معلوم کر لیا ہے۔ ہم نے دو مختلف قسم کے حیوانوں کے خلیوں کو باہم ملا دیا ہے۔۔۔ ہم نے خالص انسانی جین کو علیحدہ کر لیا ہے۔۔۔ ہم نے جین کی ترتیب کا نظریہ قائم کر لیا ہے۔۔۔ ہم نے جینز کا نقشہ بنا لیا ہے۔۔۔ ہم نے ایک خلیے کی وراثت بدل ڈالی ہے۔۔۔ آج حیاتیاتی انجینئرز پور دنیا کی لیبارٹریوں میں بالکل ہی نئی حیاتیاتی اشکال پیدا کرنے کے قابل ہو چکے ہیں۔ انہوں نے ارتقاء کی دوڑ کو ہی ختم کر ڈالا ہے۔

دوسری لہر کے مفکرین نے انسانی Species کو ایک لمبے ارتقائی عمل کی معراج

MashalBooks.org

کے طور پر لیا۔ تیسری لہر کے مفکرین کو اب اس حقیقت کا سامنا ہے کہ ہم ارتقاء کے ڈیزائنر بننے ہی والے ہیں۔ ارتقاء اب اس طرح کا کبھی نہیں دکھائی دے گا۔ فطرت کے تصور کی طرح ارتقاء بھی برط طرح نئے تصوراتی عمل سے گزر رہا ہے۔

ترقی کا درخت

فطرت اور ارتقاء دونوں کے متعلق دوسری لہر کے بدلتے ہوئے نظریات کے ساتھ ساتھ یہ بات قطعی حیرانی کا باعث نہیں ہم ترقی کے متعلق دوسری لہر کے نظریات کو بھی تیزی سے دوبارہ جانچ رہے ہیں، صنعتی دور جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں، سیدھی سادھی رجائیت پسندی کا دور تھا جس کے مطابق ہر سائنسی ایجاد یا نئی پہلے سے بہتر چیز کو انسانی کمال کی جانب ایک ناگزیر پیش رفت کی شہادت کے طور پر لیا گیا۔ 1950ء کے عشرے کے عین درمیان جب سے تیسری لہر نے دوسری لہر کی تہذیب کا حلیہ بگاڑنا شروع کیا، اس خوش اعتقادی کے ساتھ جو سلوک ہوا، وہ شاید ہی کسی اور نظریئے کے ساتھ ہوا ہو۔ پانچویں اور چھٹے عشرے نے انسانی حالت کے متعلق رجائیت پسندی کے بجائے یاسیت پسندی کا نفوذ پذیر ثقافتی نظریہ دیا۔ ان لمحات نے شدید ترین رجائیت کو شدید ترین یاسیت میں بدلنے کے لئے اہم کردار ادا کیا۔ جلد ہی یاسیت پسندی نے جڑیں پکڑ لیں۔ 1960ء، 1950ء کی ہائی وڈ فلموں میں مثال کے طور پر 1930ء اور 1940ء کے عشروں کے چوڑے چکلے خوش باش ہیروز کی جگہ بد قماش اور بے راہ رو کرداروں بے مقصد باغی، منفرد انداز کے گن مین، نشہ آور اشیاء کے شائق، غضب ناک موٹر سائیکلسٹ اور بری طرح غیر واضح (لیکن دل نشین) انداز میں آنا شروع کر دیا۔ زندگی ایک ایسا کھیل نظر آئی جسے کوئی بھی نہیں جیت سکتا تھا۔

دوسری لہر کی بہت سی اقوام میں افسانے، ڈرامے اور آرٹ نے شدید ترین قنوطیت پھیلانا شروع کر دی۔ 1950ء کی ابتداء تک کامیو(Camus)ان نظریات کو اتنی واضح شکل دے چکا تھا کہ آنے والے بہت سے ناول نگار اس کی پیروی میں لگ گئے۔ ایک برطانوی نقاد نے ان نظریات کا خلاصہ اس طرح پیش کیا۔ ''انسان غلطی کا پتلا ہے، سیاسی نظریات اضافی ہوتے ہیں۔ خود کار ترقی محض ایک سراب ہے۔'' سائنس فکشن جو کبھی

MashalBooks.org

زبردست تخیلاتی مہمات سے بھری ہوتی تھیں، بھی قنوطیت اور دکھ کی لپیٹ میں آ گئیں۔ چنانچہ ہکسلے اور آرویل (Orwell) کی ان گنت فضول نقلیں پیدا ہونے لگیں۔

ٹیکنالوجی۔۔۔۔ترقی کے انجمن کے طور پر پیش ہونے کے بجائے۔۔۔۔آہستہ آہستہ کرشن مورتی کا وہ رتھ بن گئی جو انسانی آزادی اور قدرتی ماحول دونوں کی تباہی کے درپے ہو۔ بہت سے ماحولیات پسندوں کے لئے ''ترقی'' دراصل ایک گندا لفظ بن گئی۔ جانوروں کا معاشرہ، تاریک دور کی آمد، ترقی کے خطرات میں یا ترقی کی موت جیسے ٹائٹل والی ضخیم کتابوں کا، کتابوں کی دوکانوں پر، جمگھٹا نظر آنے لگا، جونہی دوسری لہر کی سوسائٹی 1970ء میں داخل ہوئی، نشوونما کی حدود پر روم کے کلب کی رپورٹ نے صنعتی دنیا کی ہلاکتوں اور بربادیوں کو پروجیکٹ کر کے باقی ماندہ عشرے میں ایک سوگواریت میں مزید اضافہ کیا۔

شدید اتار چڑھاؤ، بے روزگاری اور افراط زر نے۔۔۔۔1973ء میں تیل کی بندش ن یاسیت کی پھیلتی گھٹا اور ناگزیر انسانی ترقی کے نظریئے کی عدم قبولیت میں اور اضافہ کیا۔ مغرب کے زوال کے متعلق ہنری کسنجر نے سپنگلرئین لہجے میں ایسی باتیں کیں کہ بہت سے لوگوں نے اپنی ریڑھ کی ہڈیوں میں خوف کی سنسناہٹ محسوس کی۔

آیا یہ نا امیدی اور قنوطیت جائز تھی یا ہے، اس کا فیصلہ ہر قاری کو خود کرنا ہے، ایک چیز بہر حال واضح ہے۔ صنعتی دور کا ایک اہم ستون، یک سمتی ترقی کا ناگزیری نظریہ، دوسری لہر کی تہذیب کے خاتمے کے نزدیک معدودے چند لوگوں کی حمایت ہی حاصل کر سکا۔

پوری دنیا میں یہ بات اب تسلیم کی جا رہی ہے کہ ترقی کو صرف ٹیکنالوجی اور مادی معیار زندگی کے معنوں میں ہی نہیں ناپا جا سکتا۔۔۔۔یعنی ایک ایسی سوسائٹی جو اخلاقی، جمالیاتی، سیاسی یا ماحولیاتی گراوٹ کا شکار ہو، ترقی یافتہ معاشرہ کہلانے کی حقدار نہیں، چاہے وہ کتنی ہی دولت مند اور اعلی ٹیکنالوجی کی حامل کیوں نہ ہو۔ مختصراً ہم ترقی کے زیادہ جامع نظریئے کی جانب بڑھ رہے ہیں۔ ترقی خود بخود کچھ حاصل نہیں کر سکتی اور نہ ہی صرف مادی معیار پر اسے پرکھا جا سکتا ہے۔

ہم بھی ایسی سوسائٹی کے متعلق سوچ بچار کے لئے زیادہ دھیان نہیں دے سکتے جو خود کارانہ طریقے سے ایک ثقافتی پڑاؤ سے دوسرے پڑاؤ تک یک سمتی سفر میں لگی ہوئی ہو، صرف پہلے سے زیادہ (مادی طور پر) ترقی یافتہ مرحلے میں جا رہی ہو۔ ہونا یہ چاہئے کہ ایک ہی راستے کے بجائے بہت سی برانچ لائنیں ہوں اور معاشروں کو مختلف طریقوں سے جامع ترقی کا مقصد حاصل کرنے کے قابل ہونا چاہیئے۔

ہم ترقی کو ایک ایسے پھولدار درخت کی طرح دیکھنے کی ابتدا کر رہے ہیں جس کی بہت سی شاخیں مستقبل میں جا رہی ہوں اور جہاں انسانی ثقافت کا تنوع اور امارت دونوں ترقی کا پیمانہ بنیں۔ اس روشنی میں زیادہ رنگارنگ اور چھوٹے چھوٹے حصوں میں بٹی دنیا کی موجودہ ہئیتی انتقال پذیری کو آگے کی سمت ایک اہم جست کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے حیاتیاتی ارتقاء، میں عمومی تنوع او پیچیدگی کی جانب رجحان کی اس سے خاصی مشابہت ہے۔ آئندہ کیا ہونے والا ہے۔ بہرحال یہ ناممکنات میں سے ہے کہ ثقافت اسی سیدھے سادے اور یک تناظری پولی انیش(Pollyannaish)ترقی پسندانہ نظریئے کی جانب دوبارہ لوٹ جائے جو دوسری لہر کے دور کا خاصا رہا۔

چنانچہ پچھلے عشروں نے یکساں طور پر فطرت، ارتقاء اور نشوونما کے متعلق نظریات کو جبراً، ازسرنوتشکیل ہوتے دیکھا۔ یہ تصورات، بہرحال انتہائی ابتدائی تخیلات۔۔۔۔ زمان و مکان، مادے اور توجیہہ سے متعلق ہمارے مفروضات۔۔۔۔ پر مبنی تھے اور تیسری لہر ان مفروضات۔۔۔۔ وہ دانش مندانہ سریش(Glue) جس نے دوسری لہر کی تہذیب کو باہم ملائے رکھا۔۔۔۔ کو بھی تحلیل کر رہی ہے۔

وقت کا مستقبل

ہر ابھرتی ہوئی تہذیب اپنے ہمراہ صرف روز مرہ زندگی میں لوگوں کے وقت ہینڈل کرنے میں ہی تبدیلیاں نہیں لاتی بلکہ ان کے وقت سے متعلق ذہنی نقشوں میں بھی تبدیلیوں پیدا کر دیتی ہے۔ تیسری لہر وقت کے ان نقشوں کی از سرنو تشکیل کر رہی ہے۔

نیوٹن کے زمانے سے دوسری لہر کی تہذیب نے یہ فرض کر لیا تھا کہ وقت، ماضی کے دھندلکوں سے لے کر مستقبل بعید تک میں، ایک ہی لائن کے ساتھ ساتھ دوڑتا ہے۔ اس

MashalBooks.org

نے وقت کی کائنات کے تمام حصوں میں مطلق، غیر متغیر اور مادے اور مکانیت سے آزاد تصور پیش کی۔ اس کا مفروضہ تھا کہ ہر لمحہ یا وقت کا ہر جزو بالکل آئندہ لمحے جیسا تھا۔

آج ایک ماہر خلائی طبیعات اور سائنسی مصنف کے مطابق ''شاندار تعلیمی ریکارڈ اور برسوں کے تحقیقی تجربات کے حامل سنجیدہ سائنس دانوں نے انتہائی پر سکون انداز میں ہمیں بتایا ہے۔۔۔۔ وقت وہ چیز نہیں جو بے رحمانہ انداز میں آگے کی طرف یکساں اور ہموار طریقے سے۔۔۔۔ جیسا ہماری گھڑیوں اور کیلنڈروں میں ظاہر ہوتا ہے۔۔۔۔ بہتا جائے بلکہ اسے فطرت میں موڑ توڑ کر نئی شکل دے کر بالکل ہی مختلف حتمی چیز بنایا جا سکتا ہے البتہ اس کا انحصار اس پر ہو گا کہ آپ اس کی پیمائش کہاں سے کر رہے ہیں۔ مطلق انتہا پر بدترین تباہی کا شکار اشیاء اور سیاہ شگاف(Black Holes) اپنے علاقے میں وقت کو ٹھہرا کر، اس کی بالکل ہی نفی کر سکتے ہیں۔'' گذشتہ صدی کی ابتداء میں آئن سٹائن پہلے ہی ثابت کر چکا تھا کہ وقت کو دبایا اور کھینچا جا سکتا ہے۔ اس طرح وہ وقت کے مطلق ہونے کے نظریئے کو ریزہ ریزہ کر چکا تھا۔ اس نے دو مشاہدہ کاروں اور ریلوے لائن کا موجودہ کلاسیکی کیس پیش کیا جو کم و بیش کچھ اس طرح ہے۔

ریلوے لائن کے ساتھ کھڑا ہوا ایک شخص دو بیک وقت روشن (چمکتے) پیچ دیکھتا ہے۔۔۔۔ ایک لائن کے انتہائی شمال کی سمت اور دوسرا جنوب کی جانب، مشاہدہ کار دونوں کے عین درمیان موجود ہے۔ ایک اور شخص تیز رفتار ٹرین میں بیٹھا شمال کی جانب برق رفتاری سے چلا جا رہا ہے۔ جونہی وہ باہر موجود مشاہدہ کار کے پاس سے گزرتا ہے وہ بھی روشنی کے دونوں پیچ(Bolts) دیکھتا ہے۔ لیکن اسے یہ دونوں چمکتی اشیاء بیک وقت نظر نہیں آتیں کیونکہ ٹرین اسے انتہائی تیزی سے ایک شے سے دور اور دوسری کے نزدیک تر کر رہی ہے۔ ایک جانب کی روشنی اس کے پاس جلد ہی پہنچتی ہے جبکہ دوسری نسبتاً دیر سے۔ متحرک ٹرین میں بیٹھے شخص کو لگتا ہے کہ شمالی روشنی پہلے نظر آئی ہے۔

روز مرہ کی زندگی میں فاصلے بہت معمولی ہوتے ہیں اور روشنی کی رفتار اتنی تیز ہے کہ فرق کا احساس بھی نہیں ہو پاتا، ایسے میں آئن سٹائن کی مثال نے اس کے نکتے کو خاصا ڈرامائی بنا دیا کہ واقعات کے تاریخی تسلسل۔۔۔۔ یعنی وقت کے اعتبار سے پہلے دوسرے یا

آخری نمبر پر کون آتا ہے۔۔۔۔ کا انحصار مشاہدہ کار کی متحرک رفتار (Velocity) پر ہے۔ وقت مطلق نہیں بلکہ اضافی ہے۔

وقت کے اس نظریئے اور وقت کے اس تصور۔۔۔۔ جو کلاسیکی طبیعات اور صنعتی دور کی حقیت کی بنیاد تھا۔۔۔۔ کے درمیان طویل فاصلاتی بعد ہے۔ دونوں کا ہی یہ مفروضہ تھا کہ ''پہلے'' اور ''بعد'' کسی بھی مشاہدہ کار کی ضرورت سے بے نیاز اپنی غیر متغیر معنویت رکھتے ہیں۔

آج طبیعات اندرونی اور بیرونی دونوں اطراف میں دھماکے کر رہی ہے۔ ہر روز اس کے ماہر بنیادی اجزاء سے ستاروں تک جیسی عظیم الجثہ اشیاء کے متعلق خلائی طبیعاتی نظریات کی تحقیق و تشریح میں لگے ہوئے ہیں۔ ان میں سے کئی نظریات ہمیں وقت کے بارے میں ہمار پرانے تصور میں اضافی تبدیلیوں پر مجبور کر رہے ہیں۔

پیمانے کے ایک کنارے پر مثال کے طور پر آسمانوں کی حد مقرر کرتے ہوئے سیاہ شگاف، روشنی سمیت ہر چیز کو اپنے اندر کھینچتے ہوئے طبیعات کے قوانین کو اگر ختم نہیں کر رہے تو ان میں گڑ بڑ ضرور کر رہے ہیں۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ یہ سیاہ متلاطم گرداب ایسے انوکھے انداز میں ختم ہوتے ہیں کہ توانائی اور مادہ دونوں ہی غائب ہو جاتے ہیں۔ ایک اور ماہر طبیعات راجر پین روز کیڑوں کے پیدا کردہ شگاف (Wormholes) اور ''سفید شگاف'' کی موجودگی سے متعلقہ مفروضات کو بھی سچ تسلیم کرتا ہے۔ ان شگافوں کے ذریعے گم شدہ توانائی اور مادہ کسی اور کائنات میں (خدا جانے اس کا مطلب کچھ بھی ہو سکتا ہے) پہنچ جاتے ہیں۔

سیاہ شگاف کے قرب و جوار میں ایک لمحہ ممکن ہے زمین کے کروڑوں برس کے مساوی ہو۔ چنانچہ اگر کسی بین السیاراتی مشن کنٹرول کو ''سیاہ شگاف'' کی تحقیق کی خاطر خلائی جہاز بھیجنا پڑے تو عین ممکن ہے ک اس کی واپسی کے لئے ہمیں ایک ملین برس تک انتظار کرنا پڑے۔ حالانکہ کشش ثقل کی تشنجی کیفیت کی وجہ سے (حرکت رفتار کا تو ذکر ہی کیا) خلائی جہاز کے کلاک اس وقفے کو بمشکل چند منٹوں یا سیکنڈوں میں ہی ظاہر کریں گے۔

اور جب ہم خلائے بسیط کو چھوڑ کر خورد بنی اجزاء یا لہروں کی دنیا میں داخل

ہوتے ہیں تو ہمیں یہاں بھی ایسے یہ ملتے جلتے تصورات ملتے ہیں۔ کولمبیا یونیورسٹی کے ڈاکٹر جیرالڈ فائن برگ نے اسراعی اجزاء(Tachyones) کے متعلق یہ مفروضہ قائم کیا ہے کہ وہ روشنی کی رفتار سے بھی زیادہ تیزی سے حرکت کرتے ہیں اور ان کے لئے۔۔۔۔ ڈاکٹر فائن برگ کے بعض کارکن ساتھیوں کے مطابق۔۔۔۔ وقت پیچھے کی سمت متحرک ہے۔ برطانوی ماہر طبیعات جے جی ٹیلر ہمیں بتاتا ہے ''وقت کا خوردبینی نظریہ، اس کے macroscopic تصور سے بہت مختلف ہے۔ ایک اور ماہر طبیعات فرٹجاف کیپرا اسے زیادہ آسان انداز میں پیش کرتا ہے۔ اس کا کہنا ہے''وقت کائنات کے مختلف حصوں میں مختلف شرح سے بہہ رہا ہے۔'' لگتا ہے کہ ہم ''وقت'' کی واحد شکل کی بات بھی نہیں کر سکیں گے۔ ہماری کائنات یا کائناتوں کے مختلف حصوں میں مختلف اصولوں کے تحت گویا متبادل اور جمع ''اوقات'' چل رہے ہیں۔ دوسری لہر کے نظریہ آفاقی تناظری وقت کے تحت، مدور وقت کے قدیم نظریئے کا بدل قرار دیئے بغیر۔۔۔۔ قائم ستونوں (props) پر یہ جدید مفروضات دستک یہ دستک دیئے جا رہے ہیں۔

عین اس وقت جبکہ ہم وقت کے سماجی استعمال کے ڈھانچے کو انقلابی انداز میں بدل رہے ہیں۔۔۔۔ مثلاً معاشی کام کے لئے لچکدار اوقات متعارف کرا کے میکانیک ماحول لیس کارکنوں کو جدا کر کے اور کئی دوسرے طریقوں سے جن کا ذکر انیسویں باب میں آ چکا ہے۔۔۔۔ اور ساتھ ہی ہم وقت سے متعلق اپنے نظری تصورات کو بھی دوبارہ بنیادی طور پر ترتیب و تشکیل دے رہے ہیں۔ آج بظاہر ان نظری دریافتوں کا ہماری روز مرہ زندگی میں کوئی عملی استعمال نظر نہیں آتا، بالکل اسی طرح جیسے کبھی تختہ سیاہ پر چاک سے کھینچے گئے نشانات۔۔۔۔ وہ فارمولے جو بالآخر جوہری شکست وریخت پر منتج ہوئے۔۔۔۔ بے معنی نظر آتے تھے۔

خلائی مسافر

وقت سے متعلق ہمارے تصور میں ان بہت سی تبدیلیوں نے جگہ کے متعلق ہماری نظری تفہیم میں بھی بہت سے شگاف ڈال دیئے کیونکہ ان دونوں کا باہمی تعلق بہت ہی گہرا ہے۔

ہم وہ حقیقی جگہیں جہاں ہم سب رہتے ہیں، کام کرتے ہیں اور کھیلتے ہیں، تبدیل کر رہے ہیں۔ ہم اپنے کام تک کیسے پہنچتے ہیں، کتنی دور تک اور کتنی مرتبہ سفر کرتے ہیں، ہماری رہائش کہاں ہے۔۔۔۔ یہ عوامل مکانیت (Space) کے بارے میں ہمارے مشاہدے پر اثرانداز ہوتے ہیں اور یہ سب ہی تغیر پذیر ہیں۔ درحقیقت ہم تیسری لہر کی آمد کے ساتھ ساتھ مکانیت سے انسانی تعلق میں بھی ایک نئے مرحلے میں داخل ہو رہے ہیں۔

دنیا میں زراعت کو پھیلانے والی پہلی لہر، جیسا کہ ہم پہلے مشاہدہ کر چکے ہیں، اپنے جلو میں مستقل کاشت کاری کا انتظام لائی جس میں زیادہ تر لوگ اپنی ساری زندگی اپنی جائے پیدائش کے نزدیکی چند میلوں میں ہی گزار دیتے تھے۔ زراعت نے ایک غیر متحرک، مکانی طور پر محدود زندگی متعارف کرائی اور شدید مقامی محسوسات۔۔۔۔ دیہاتی ذہنیت۔۔۔۔ کو جنم دیا۔

دوسری لہر کی تہذیب نے اس کے برعکس بڑی بڑی آبادیوں کو عظیم الشان شہروں میں مرتکز کیا اور اپنی ضرورت کے مطابق لوگوں کو متحرک کیا کیونکہ اسے دور ونزدیک سے وسائل مجتمع کرنے اور اشیاء کی تقسیم کے لئے حرکت پذیری درکار تھی۔ اس کا پیدا کردہ کلچر مکانی طور پر دیہاتی مرکزیت کے بجائے شہر یا قوم کی حدود تک پھیلا ہوا تھا۔

تیسری لہر آبادی کو مرتکز کرنے کے بجائے اسے منتشر کر کے ہمارے مکانی تجربے کو بدل رہی ہے۔ جہاں دنیا کے صنعتی طور پر ارتقاء پذیر علاقوں میں کروڑوں لوگ شہروں کی جانب امڈتے جا رہے ہیں، وہاں تمام اعلیٰ ٹیکنالوجی کے حامل ممالک میں اس کے برعکس مخالف سمت میں بہاؤ کا مشاہدہ پہلے ہی کیا جا رہا ہے۔ ٹوکیو، لندن، زیورچ، گلاسگو اور درجنوں دوسرے بڑے شہروں کی آبادی کم ہوتی جا رہی ہے جبکہ درمیانے یا چھوٹے شہر آبادی کے لحاظ سے بڑھ رہے ہیں۔

بیمہ زندگی کی امریکی کونسل نے واضح اعلان کیا ہے کہ ''بعض ماہرین پر یقین ہیں کہ بڑا امریکی شہر اب ماضی کی چیز ہے۔ فارچون نامی رسالے کی رپورٹ ہے کہ ذرائع رسل و رسائل اور ابلاغیاتی ٹیکنالوجی نے وہ زنجیر توڑ ڈالی ہے جس نے بڑی کارپوریشنوں کو روایتی مرکزی شہر سے باندھ رکھا تھا اور بزنس ویک نے ایک مضمون کا یہ عنوان باندھا ہے۔

اہم شہروں کے بغیر ایک قوم کا ممکنہ تناظر۔

آبادی کی یہ ازسرنو تقسیم اور عدم ارتکاز ایک مناسب وقت میں ذاتی اور سماجی مکانیت کے متعلق فاصلوں کی قابل قبول تبدیلی کے متعلق گنجان رہائش اور بہت سی دوسری چیزوں کے بارے میں ہمارے مفروضات اور توقعات کو تبدیل کر ڈالے گی۔

ان تبدیلیوں کے علاوہ تیسری لہر ایک نیا نظریہ پیدا کرتی نظر آتی ہے جو بہت زیادہ مقامی ہونے کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی بلکہ کہکشانی بھی ہے۔ ہر جگہ ہمیں مقامی سیاست اور مقامی بندھنوں پر ''برادری اور ''ہمسائیگی'' کا ایک نیا ارتکاز نظر آتا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ لوگوں کو بڑی تعداد۔۔۔۔ عام طور پر وہی لوگ جو بہت زیادہ مقامی رجحان کے حامل ہیں۔۔۔۔ بین الاقوامی معاملات سے اپنی وابستگی بھی ظاہر کرتے ہیں او دس ہزار میل دور ہوتی جنگ یا قحط زدگی پر پریشان ہوتے ہیں۔ جوں جوں ترقی یافتہ ذرائع ابلاغ کا پھیلاؤ بڑھے گا اور ہم اپنا کام الیکٹرانک کاٹیج میں منتقل کرنا شروع کر دیں گے تو اس دوہرے رخ کے نئے فوکس کی مزید حوصلہ افزائی ہوگی۔ اکثریت ایسے لوگوں کی ہوگی جو مناسب حد تک اپنے گھروں کے قریب رہیں گے۔ اپنے علاقے کو بہت کم چھوڑنا چاہیں گے، کاروبار کی بجائے سیروتفریح کی غرض سے سفر کرنا زیادہ پسند کریں گے۔ جبکہ ان کے ذہنوں اور پیغامات کا دائرہ وسعت،صرف دنیا ہی نہیں بلکہ بیرونی خلا تک پھیلا ہوگا۔ تیسری لہر قربتوں اور فاصلوں دونوں سے تعلق کو ذہنی طور پر اکٹھا کر رہی ہے۔

ساتھ ہی ساتھ ہم تیزی سے مکانیت کے متحرک تر اور زیادہ حقیقت پسندانہ تصورات اپنا رہے ہیں۔ میرے اپنے دفتر میں سیٹلائٹ اور یو 2 کے ذریعے نیویارک شہر اور اس کے گرد نواح کی کھینچی گئی تصاویر کے بڑے بڑے Blowups ہیں۔ سیٹلائٹ کی تصاویر حد درجہ خوبصورت تخیل کی عکاس نظر آتی ہیں۔ گہرا سبز سمندر اور اس کے ساتھ ساتھ پھیلی ساحلی پٹی۔ یو 2 تصاویر میں شہر بنفشی سرخ شعاعوں میں ڈھلا لگتا ہے اور یہ عکاسی اتنی واضح ہے کہ اس میں میٹروپولیٹن عجائب گھر اور لاگارڈیا ائیرپورٹ پر موجود طیارے بھی صاف نظر آتے ہیں۔ لارگارڈیا پر موجود طیاروں کے حوالے سے میں نے ناسا کے ایک افسر سے پوچھا کیا تصاویر کو مزید بڑا کر کے رن وے کی لائنیں یا جہازوں کے پروں پر نقش

نشانات کو دیکھا جا سکتا ہے۔ اس نے انتہائی دلکش مسکراہٹ میری جانب پھینکتے ہوئے میری تصحیح کی۔ ''جی، کیلیں بھی'' اس کا جواب تھا۔

ہم صاف ستھری غیر متحرک تصاویر کے دور سے بہت آگے نکل چکے ہیں۔ یونیورسٹی آف وسکون سن کے نقشہ نویس پروفیسر آرتھر ایچ رابنسن کا کہنا ہے کہ ایک دوعشروں میں ہی سیٹلائٹ ہمیں شہر یا ملک کے زندہ نقشے۔۔۔۔ جان دار اور متحرک ڈسپلے۔۔۔۔ دیکھنے کے مواقع فراہم کرے گا اور سرگرمیوں کو روبہ عمل ہوتے دکھائے گا۔ جب ایسا ہو گیا تو نقشہ مزید ساکن رہنے کی بجائے متحرک نمائندگی۔۔۔۔ درحقیقت ایک متحرک ایکس رے کیونکہ وہ سطح زمین پر ہوتی سرگرمیاں ہی نہیں دکھائے گا بلکہ زمین کی سطح کے نیچے اور اوپر پرت در پرت بلندی یا گہرائی کے ہر لیول پر موجود اشیاء پر سے پردہ اٹھائے گا۔۔۔۔ کا حامل ہوگا۔ یہ نقشہ کسی بھی خاص علاقے اور ہمارے مابین موجود رشتے کے مسلسل بدلتے ہوئے اور حساس مناظر پیش کرے گا۔ بعض نقشہ نویس دوسری لہر کے کلاس روموں میں نظر آنے والے دنیا کے روایتی نقشوں کے خاصے مخالف ہوتے جا رہے ہیں۔ صنعتی انقلاب کے زمانے میں دنیا کا بہت زیادہ مستعمل نقشہ مرکیٹر کی منصوبہ بندی کے مطابق بنتا رہا ہے۔ اس قسم کا نقشہ اگرچہ بحری جہازوں کے چلانے کے لئے بہت آسان ہوتا ہے۔ تاہم یہ زمینی سطح کے پیمانے کو بہت بری طرح بگاڑ کر رکھ دیتا ہے۔ ایک فوری نظر اپنی دستی اٹلس۔۔۔۔ اگر وہ مارکیٹ نقشے کے مطابق بنائی گئی ہے۔۔۔۔ پر ڈالئے اس میں سیکنڈے نیویا، بھارت جتنا بڑا نظر آئے گا حالانکہ بھارت حقیقت میں اس سے تین گنا بڑا ہے۔

زمینی سطح کو باہم متناسب دکھانے کے لئے ایک جرمن تاریخ دان آرتو پیٹر کے تیار کردہ نئے منصوبے پر نقشہ سازوں کے درمیان گرما گرم بحث جاری ہے۔ پیٹرز کا الزام ہے کہ مرکیٹر کے نقشے کی مسخ شدہ صورت نہ صرف صنعتی اقوام کی انانیت کو جلا بخشی بلکہ ہمارے لئے غیر صنعتی اقوام کو ان کے صحیح سیاسی اور کارٹوگرافک تناظر میں دیکھنا بھی مشکل بنا دیا۔

''ترقی پذیر ممالک کو ان کی زمینی سطح اور ان کی اہمیت کے سلسلے میں مسلسل دھوکے میں رکھا گیا ہے۔'' پیٹرز اپنا خیال پیش کرتا ہے۔ اس کا نقشہ یورپی اور امریکی لوگوں کے

لئے عجیب سہی، یورپ کو سمٹا ہوا، الاسکا خ کینیڈا اور سوویت یونین کو خاصا عمودی اور نچڑا ہوا (squashed) اور جنوبی امریکہ، افریقہ، عربیہ اور ہندوستان کو خاصا وسیع وعریض دکھاتا ہے۔ ایک جرمن عیسائی مشن اور دوسری مذہبی تنظیموں کے ذریعے پیٹرز کے نقشے کی ساٹھ ہزار کاپیاں، غیر صنعتی مما لک میں تقسیم کی جا چکی ہیں۔

اس سارے بحث ومباحثہ سے یہ بات بہر حال ظاہر ہوتی ہے کہ کوئی ایک نقشہ بھی ''صحیح'' نہیں بلکہ مختلف مقاصد کی تکمیل کے لئے یہ محض مختلف رنگ کے زمینی خاکے ہیں۔ انتہائی حقیقی معنوں میں تیسری لہر کی آمد دینا کو دیکھنے کا ایک نیا طریقہ لا رہی ہے۔

کاملیت اور نصفیت

جونہی ہم دوسری لہر کی ثقافت سے باہر قدم نکالنے لگے، فطرت، ارتقاء، نشوونما، زبان اور مکان سے متعلق ہمارے نظریات میں یہ گہری تبدیلیاں مجتمع ہو کر آنا شروع ہو گئیں حالانکہ دوسری لہر اشیاء کا تجزیاتی مطالعہ انہیں ایک دوسرے سے الگ الگ کر کے کرتی تھی جبکہ تیسری لہر کی ثقافت سیاق وسباق، باہمی تعلقات اور کل کو اہمیت دیتی ہے۔

پانچویں دہائی کی ابتداء میں تقریباً انہی ایام میں جب ماہرین حیاتیات حیاتیاتی کوڈ معلوم کر رہے تھے، بیل لیبز (Bell Labs) میں ابلاغی نظریہ دان اور انجینئر، آئی بی ایم میں کمپیوٹر کے ماہرین، برطانوی محکمہ ڈاک کی لیبارٹری میں ماہرین طبیعات اور فرانس میں قومی سائنسی تحقیقاتی مرکز میں موجود خصوصی ماہرین نے کام کے انتہائی جوشیلے اور انتھک دور کا آغاز کر دیا تھا۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران تشکیل شدہ ''آپریشن ریسرچ'' پر توجہ مرکوز کر کے لیکن اسے بے انتہا ترقی یافتہ بنا کر اس عمل نے ''انقلاب خود کاریت'' اور ٹیکنالوجی کی نئی صورتوں اور جہتوں کو جنم دیا جو اب دفتر اور فیکٹری میں تیسری لہر کی پیداوار کو متشکل کر رہی ہیں۔ ہارڈویر کے ساتھ ساتھ سوچ کا بھی ایک نیا انداز پیدا ہوا کیونکہ انقلاب خود کاریت کی ایک بنیاد پراڈکٹ ''نظاماتی رسائی'' تھی۔

کارٹیسن (Cartesion) مفکرین عام طور پر سیاق وسباق کو اہمیت دیئے بغیر صرف اجزاء کے تجزیء پر زور دیتے تھے جبکہ نظاماتی مفکرین، نظاماتی نظریئے کے ابتدائی

حامیوں میں سے ایک سائمن رامو کے الفاظ میں ''مسائل پر جزوی نظر ڈالنے کے بجائے مجموعی نظر ڈالنے پر'' زور دینے لگے۔ 1950ء کے عشرے کے درمیان۔۔۔۔ جونہی یہ نظریہ لیبارٹریز سے باہر نکلا۔۔۔۔ سے ہی تحتی نظاموں (Sub-systems) سے حاصل شدہ تعلقات اور ان اکائیوں سے تشکیل شدہ نسبتاً بڑی مکمل اشکال کو اجاگر سے نظاماتی سوچ کے گہرے ثقافتی اثرات مرتب ہوئے۔ معاشرتی سائنس دانوں، ماہرین نفسیات، فلسفہ دانوں او غیر ملکی سیاسی تجزیہ نگاروں، توجیہہ پسندوں، لسانی ماہروں، انجینئروں اور ناظموں نے اس کی زبان اور تصورات کو استعمال کرنا شروع کر دیا۔لیکن نظاماتی نظریئے کے حامی پچھلے ایک دوعشروں میں مسائل کا زیادہ سالمانہ انداز اجاگر کرنے کی مہم میں اکیلے نہیں رہے۔

تنگ اور حد سے زیادہ تخصیص پسندی کے خلاف 1970ء کی ماحولیاتی مہم سے بھی بغاوت کی آگ مزید بھڑکی کیونکہ حیاتیاتی ماحول کے ماہرین آہستہ آہستہ فطرت کی ''پرت'' (Web) زندگی کی مختلف اشکال کا باہمی تعلق اور حیاتیاتی نظاموں کی کاملیت کو دریافت کرتے جا رہے تھے۔ بیری لوپز (Lopez) نے ماحولیاتی عمل (نامی کتاب) میں لکھا، ''غیر ماحولیت پسند، اشیاء کو اجزاء میں الگ الگ کر کے ایک وقت میں ایک ہی چیز کو حل کرنا چاہتے ہیں نے'' اس کے برعکس ''ماحولیت پسند چیزوں کو بالکل مختلف انداز میں دیکھتے ہیں۔۔۔۔ پوری کی پوری چیز کو متوازن کرنا، ان کی جبلت ہوتا ہے وہ کسی ایک حصے کو حل نہیں کرتے۔'' حیاتیاتی ماحول کی اپروچ اور نظاماتی سوچ باہم مل کر علم کی ترتیب و تدوین اور سالمیت کی جانب یکساں رویئے کے حامل ہو گئے۔ اسی دوران، بین الانضباتی سوچ کے حق میں یونیورسٹیوں میں آوازیں اٹھنے لگیں۔ زیادہ تر یونیورسٹیوں میں اب بھی شعبہ جاتی رکاوٹیں تصورات کی متضاد نمو (نشوونما) اور اطلاعاتی سالمیت کو روکے ہوء ہیں تاہم بین الانضباتی یا کثیر الانضباتی کام اتنا تیزی سے پھیلا ہے کہ ہر خاص و عام کی زبان پر ہے۔

دانش ورانہ زندگی میں یہ تبدیلیاں ثقافت میں بھی کہیں کہیں منعکس ہوئیں۔ مثلاً مشرقی مذاہب کا یورپی درمیانے طبقوں پر کچھ نہ کچھ اثر تو ہمیشہ ہی رہا ہے لیکن صنعتی معاشرے کی شکست وریخت کی ابتداء کے ساتھ ہی ہزاروں مغربی نوجوان ہندوستانی

MashalBooks.org

سوامیوں کی جانب تیزی سے متوجہ ہونے لگے، 16 سولہ گورو کا بھاشن سننے کے لئے آسٹروڈم میں تل دھرنے کو جگہ نہ رہی، مشرقی راگوں میں دلچسپی لینے لگے۔ ہندوطرز کے سبزی کھانوں کے ریستوران کھولے جانے لگے، ففتھ ایونیو پر رقص ہونے لگا۔ وہ دنیا جس کے بجن وہ گارہے تھے کارٹیسین چپس میں دریافت نہیں ہو پائی تھی۔ یہ تھی ''یکتائی''۔

ذہنی صحت کے شعبے میں نفسیاتی معالجوں نے گیسٹالٹ تھراپی(Gestalt) کے ذریعے ''مکمل شخص'' کا علاج کرنے کے طریقے تلاش کئے۔ گیسٹالٹ کی تہلکہ خیز آمد کے ساتھ ہی سارے امریکہ میں گیسٹالٹ معالجوں اور اداروں کا جال نظر آنے لگا۔ اس سرگرمی کا مقصد بقول ایک نفسیاتی معالج فریڈرک ایس پرلز انفرادی حسی آگہی، تصورات اور خارجی دنیا سے تعلقات مجتمع کرنے کے عمل کے ذریعے انسانی قوت میں اضافہ کرنا تھا۔

میڈیسن میں ''صحت کاملہ'' کی تحریک کے زور پکڑنے کی وجہ بھی یہی ہے کہ انفرادی بہتری اس کی جسمانی، روحانی اور ذہنی سلامتی پر منحصر ہے اس تحریک کو1970ء کے عشرے کے آخری حصے میں جدید طبی دریافتوں اور (ساتھ ساتھ) جعلسازی نے باہم مل کر زبردست تقویت بخشی۔

''چند سال پہلے تک'' سائنس نامی جریدے کی رپورٹ ہے۔''وفاقی حکومت ایک ایسی صحت کانفرنس کو۔۔۔ جس میں عقیدے کی صحت یابی، اریڈالوجی (Iridology)'' آکوپریشر، بدھ طریقہ مراقبہ اور الیکٹرو میڈیشن جیسے موضوعات شامل تھے۔۔۔ سپانسر کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔'' اس وقت سے صحت کاملہ کے نام متبادل طریق ہائے علاج میں بے تحاشا دلچسپی پیدا ہوتی چلی گئی ہے۔

اتنی بہت سی سطحوں پر اتنی زیادہ فعالیت کے ہوتے ہوئے ''کامل یا کاملیت، کی اصطلاحوں کا مقبول عام ذخیرہ الفاظ میں شامل ہو جانا قطعی حیران کن نہیں۔ آج یہ اصطلاح بلا امتیاز مستعمل ہے۔ عالمی بینک کا ایک ماہر''شہری تحفظ کے لئے۔۔۔ ایک مکمل افہام و تفہیم'' کی بات کرتا ہے۔'' امریکی کانگریس کا ایک تحقیقی گروپ متواتر ''جامع یا کامل'' تجرباتی مطالعے کا طلبگار ہے۔ ماہر نصاب تعلیم سکول کے بچوں کو لکھنا سکھانے کے لئے ''جامع پڑھائی اور حساب کا استعمال ضروری سمجھتا ہے اور بیورلے ہلز کا ایک ''مرکز صحت''

جامع ایکسرسائز کی پیش کش کرتا ہے۔ ان تحریکوں، تصورات اور ثقافتی لہروں میں سے ہر ایک کا جدا انداز ہے لیکن ان کا عمومی عنصر واضح ہے۔ اجزاء کے جداگانہ مطالعے کے ذریعے مکمل شے سے آگہی کے مفروضے پر حملہ آور نظر آتے ہیں۔ اس جاحانہ انداز کو ایک مشہور نظاماتی نظریہ دان اور فلاسفر ارون لاس زلو کے الفاظ میں اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے ''ہم فطرت کے ایک باہم منسلک نظام کا حصہ ہیں اور اگر ہمارے باخبر، عمومیت پسند، باہمی رابطے کے پیٹرن کے نظاماتی نظریات کو ترقی دینے کو اپنا فرض منصبی نہیں سمجھتے تو ہمارے مختصر دائراتی منصوبے اور محدود منضبط قابلیتیں ہماری اپنی تباہی پر منتج ہو سکتے ہیں''۔

جداگانہ، جزوی اور تجزیاتی طریقوں پر یہ حملہ حقیقتاً اتنا شدید نوعیت کا ہے کہ بعض متعصب کلیت پسند نا قابل بیان ''کل'' کی تلاش میں حصوں کو بلاوجہ ہی بھلا بیٹھتے ہیں۔ نتیجہ کاملیت کے بجائے ایک اور طرح کی شکست و ریخت میں نکلتا ہے۔ ان کی کاملیت دراصل نصفیت ہے۔

زیادہ سوچ بچار کرنے والے نقاد، بہرحال نئی ترتیب و تدوین پر کہیں زیادہ زور دین کے ساتھ، دوسری لہر کی تجزیاتی مہارتوں کو متوازن کرنے کی کوشش میں ہیں۔ یہ نظریہ انتہائی واضح انداز میں حیاتیاتی ماحول کے ماہر یوجین پی اوڈم نے اپنے ساتھی کارکنوں کو کاملیت اور تخفیف پسندی کو باہم مجتمع کرنے کے لئے زور دیتے ہوئے بیان کیا۔۔۔ کامل نظاموں کے ساتھ ساتھ ان کے اجزاء پر بھی نظر ڈالی جائے۔ ''کیونکہ اجزاء۔۔۔ نسبتاً بڑی فعال شے کو پیدا کرنے کے لئے اکٹھے کئے جاتے ہیں۔'' یہ خیال اس نے ان دنوں ظاہر کیا جب اس نے اپنے مشہور بھائی ہاورڈ کے ساتھ مشترکہ طور پر (Prix de l'nstitut de la vie) کا ایوارڈ حاصل کیا۔ ''ایسی نئی خصوصیات ظاہر ہوتی ہیں جو اس سے پچھلے یا نچلے لیول میں غیر موجود یا نا قابل شناخت تھیں۔''

''اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ہم تخفیف پسندوں کی سائنس کا راستہ روک رہے ہیں کیونکہ اس اپروچ سے انسانیت کے حق میں خاصے بہتر نتائج پیدا ہوئے ہیں۔'' لیکن وقت آ گیا ہے کہ ''وسیع البنیاد سالمانہ نظاموں کے تجزیاتی مطالعے کو برابر اہمیت دی جائے۔ نظاماتی نظریہ حیاتیاتی ماحول اور کاملیت پسندی کی سوچ پر عمومی زور، سب مجتمع ہو کر۔۔۔

MashalBooks.org

زمان اور مکان سے متعلق ہمارے بدلتے تصورات کی طرح۔۔۔۔ دوسری لہر کی تہذیب کے دانش ورانہ محاذ پر ثقافتی یلغار کا حصہ بنتے ہیں۔ ایک نیا ابھرتا ہوا تصور کہ اشیاء اپنی موجودہ ہیئت میں کیوں ہیں۔ اس یلغار کو عروج پر لے جا رہا ہے۔

کائناتی کھیل کا کمرہ

دوسری لہر کی تہذیب نے بہر حال ہمیں یہ اعتماد بخشا ہے کہ ہم چیزوں کے وقوع پذیر ہونے کی وجہ جانتے (یا کم از کم جان سکتے) ہیں۔ اسی نے ہمیں بتایا کہ ہر مظہر فطرت زمان و مکان میں اپنی جداگانہ اور متعین جگہ رکھتا ہے۔ اسی سے ہمیں پتہ چلا کہ یکساں حالات میں ہمیشہ یکساں نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ اس نے ہی بتایا کہ تمام کائنات بلیرڈ کی چھڑیوں اور اس کی گیندوں۔۔۔۔ یعنی وجوہات اور نتائج۔۔۔۔ پر مشتمل ہے۔

توجیہہ کا یہ میکانکی تصور بے پناہ مفید تھا اور آج بھی اس کا افادہ کم نہیں ہوا۔ یہ امراض کے علاج، عظیم الشان اور بلند و بالا عمارت تعمیر کرنے، نت نئی مشینوں کی ڈیزائننگ اور بڑے بڑے اداروں کو اکٹھا رکھنے میں ہماری مدد کرتا ہے۔ سادہ مشینوں جیسے محسوسات یا تصورات کی وضاحت میں طاقتور ہونے کے باوجود یہ نشوونما زبوں حالی اور اچانک عدم فعالیت کی نئی پیچیدہ سطحوں جیسے تصورات کی اطمینان بخش وضاحت نہیں کر سکا۔ ان میں اچانک رونما ہونے والی بڑی بڑی تبدیلیاں یا اس کے برعکس اتفاقاً بڑی بڑی دھماکہ خیز قوتوں کے درمیان بعض معمولی عوامل کا خود بخود پیدا ہو جانا بھی شامل ہے۔

آج نیوٹن کی پول ٹیبل (Pool table) کو کائناتی کھیل کے کمرے کے کونے میں دھکیلا جا رہا ہے۔ میکانکی توجیہہ کو تمام تصورات یا مظاہر کی بجائے بعض مظاہر میں ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ دنیا بھر میں ماہرین علم اور سائنس دان فطرت، ارتقاء، اور زمان و مکان اور مادے کی نشوونما کے متعلق ہمارے تیزی سے بدلتے ہوئے نظریات کو خصوصاً مدنظر رکھتے ہوئے اتفاق (chance) اور توجیہہ کا ایک نیا تصور تشکیل دے رہے ہیں۔

جاپانی نژاد، نظریہ معلومات کے ماہر مگور وہ مارویاما، فرانسیسی ماہر سماجیات ایڈگر مورن اور سٹیفورڈ بیئر اور ہنری لیبارٹ اور کئی دوسرے ماہرین اطلاعات توجیہہ کے متعلق۔۔۔۔ توجیہہ، ایسے غیر میکانکی نظاموں جو زندہ ہوتے ہیں، مرتے ہیں نشوونما سے

گزرتے ہیں اور ارتقاء اور انقلاب کے عمل کا سامنا کرتے ہیں۔۔۔۔مختلف سراغ مہیا کر رہے ہیں۔ بیلجیم کے نوبل انعام یافتہ الیاپریگوجن نظم اور بدنظمی اتفاق اور ضرورت کے تصورات کی متذبذب ترتیب اور ان کا توجیہہ سے تعلق پیش کرتا ہے۔

جزوی طور پر ابھرتی ہوئی تیسری لہر کی توجیہہ نظاماتی نظریئے کے بنیادی تصور، فیڈ بیک کے تصور سے، نمودار ہوتی ہے۔ اس کی وضاحت کے لئے گھریلو تھرموسٹیٹ کی کلاسیکی مثال دی جاتی ہے جو کمرے کے ٹمپریچر کو یکساں سطح پر قائم رکھتا ہے۔ تھرموسٹیٹ ہیٹر کو جلا دیتا ہے اور پھر بڑھتی ہوئی حرارت کو مانیٹر کرتا ہے۔ جب جب کمرے میں مناسب حرارت پیدا ہو جاتی ہے تو وہ ہیٹر کو بند کر دیتا ہے۔ کمرے میں جب حرارت کم ہونے لگتی ہے تو وہ اسے محسوس کر کے ہیٹر کو دوبارہ جلا دیتا ہے۔ یہی وہ فیڈ بیک کا عمل ہے جو توازن برقرار رکھتا ہے اور گھٹنے بڑھنے کی تبدیلی کو ایک خاص سحط سے بڑھنے نہیں دیتا۔ ''منفی فیڈ بیک'' سے موسوم یہ عمل، استحکام کے عمل کو قائم رکھتا ہے۔

منفی فیڈ بیک کے متعلق، 50-1940ء کے عشروں کے درمیان اطلاعاتی نظریہ دانوں اور نظاماتی مفکرین کی تحقیق وجستجو اور اس کی باقاعدہ تعریف کے بعد سائنس دان اس کی مثالوں یا موزونیت کی تلاش میں لگ گئے۔ جب انہوں نے ہر شعبہ میں استحکام کے یکساں حفاظتی نظام دریافت کر لئے تو ان کے جوش وخروش کی انتہاء نہ رہی۔ (مثلاً فزیالوجی میں وہ پراسس جن کے ذریعے جسم اپنی حرارت قائم رکھتا ہے۔ یا سیاست میں مخالف جب ایک متوقع سطح سے بڑھ جاتی ہے تو ''انتظامیہ'' اس بے چینی کے نکاس کا راستہ کھول دیتی ہے۔ غرض منفی فیڈ بیک چیزوں کو اپنا توازن یا استحکام قائم رکھنے میں مدد دیتے ہوئے ہمیں اپنے اردگرد ہر جگہ کارفرما نظر آتی ہے۔ 1960ء کے عشرے کی ابتداء میں پروفیسر مارویاما جیسے نقادوں نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا تھا کہ استحکام کو زیادہ توجہ دی جا رہی ہے جبکہ تبدیلی کو مناسب توجہ نہیں مل رہی۔ ان کی دلیل کے مطابق زیادہ ضرورت ''مثبت فیڈ بیک'' پر کہیں زیادہ تحقیق کی تھی۔ مثبت فیڈ بیک سے مراد وہ اعمال جو تبدیلی کو دبانے کی بجائے اسے سادہ اور آسان بناتے ہیں، استحکام کو قائم نہیں رکھتے بلکہ اسے چیلنج کرتے ہیں۔ بعض اوقات اسے حد سے زیادہ بوجھل کر کے ختم بھی کر ڈالتے ہیں۔ مثبت فیڈ بیک، مارویاما نے

مزید توضیح کی، نظام میں کوئی چھوٹا سا انحراف یا ٹکراؤ بھی جگہ لے سکتا ہے اور اسے بڑھا کر ڈھانچے کے لئے خطرناک زلزلہ بھی بنا سکتا ہے۔

اگر فیڈ بیک کی پہلی قسم تبدیلی کو گھٹانے والی یا ''منفی'' تھی تو یہ دوسری قسم اعمال کا ایسا مجموعہ ہے جو تبدیلی کو بڑھانے والی یا ''مثبت'' ہے۔ ان دونوں پر ہی مساوی توجہ کی ضرورت تھی۔ مثبت فیڈ بیک بہت سے پرانے پریشان کن اعمال کی توجیہہ پر روشنی ڈال سکتا تھا۔ کیونکہ مثبت فیڈ بیک استحکام کو توڑ کر اس کی جگہ خود کو لے لیتا ہے۔ اور یہ بے معنی شیطانی اور رحمانی دائروں کی وضاحت میں مدد کرتا ہے۔ ذرا تھرموسٹیٹ کا اس کے سنسر یا ٹرائیگر میکانزم کے الٹی جانب چلنے کا تصور تو کیجئے۔ جب بھی کمرہ گرم ہوا، تھرموسٹیٹ نے ہیٹر کو بند کرنے کی بجائے اسے آن کر دیا تا کہ ٹمپریچر گرم سے گرم تر ہوتا چلا جائے یا اجارہ داری کے (اسی مقصد کے لئے حقیقی زندگی کی معاشیات کا کھیل) کا تصور کیجئے، جس میں جس کھلاڑی کے پاس زیادہ پیسہ ہوتا ہے، وہ زیادہ جائیداد بنا سکتا ہے۔ اس طرح اس کی کرائے کی آمدنی مزید بڑھتی ہے اور اسے جائیداد بنانے کے لئے مزید پیسہ مل جاتا ہے۔ یہ دونوں مثالیں کام کے دوران مثبت فیڈ بیک کی ہیں۔

مثبت فیڈ بیک ذاتی جذبے کو ابھارنے والے کسی بھی عمل کو وضاحت میں مدد ہے۔ مثلاً ہتھیاروں کی دوڑ میں جب بھی سوویت یونین کوئی ہتھیار بناتا ہے، امریکہ اس سے بڑا ہتھیار بنا ڈالتا ہے، جواباً روس کو اور زیادہ بڑا ہتھیار بنانے کی تحریک ملتی ہے۔۔۔۔ یہ سلسلہ پاگل پن کی حد تک چلتا رہتا ہے۔ اور جب ہم منفی اور مثبت فیڈ بیک کو یکجا کر کے یہ دیکھتے ہیں کہ یہ دونوں مختلف اعمال کس شاندار طریقے سے انسانی ذہن سے لے کر معیشت تک کے پیچیدہ نظام میں باہم سرگرم ہوتے ہیں، حیرت انگیز تصورات جنم لیتے ہیں۔ ایک بار ہم اسے کلچر کے طور پر تسلیم کر لیں کہ کسی حقیقی پیچیدہ نظام میں، چاہے وہ حیاتیاتی ساخت ہو یا کوئی شہر ہو یا بین الاقوامی سیاسی نظام ہو۔۔۔۔تبدیلیوں کو بڑھانے اور گھٹانے والی دونوں خصوصیات بدرجہ اتم ہونگی اور مثبت اور منفی فیڈ بیک دونوں کے باہمی اثرات پھیلیں گے تو ہم اپنے اردگرد کی دنیا میں پیچیدگی کی ایک بالکل ہی نئی سطح کی جھلک دیکھنے لگیں گے، اس طرح توجیہہ سے متعلق ہماری آگہی میں پیش رفت ہوگی۔

اس آ گہی میں مزید برق رفتاری ممکن ہے بشرطیکہ ہم یہ بھی تسلیم کر لیں کہ تبدیلی کو گھٹانے اور بڑھانے والے یہ عوامل ضروری نہیں، حیاتیاتی یا سماجی نظاموں میں ابتداء ہی سے موجود ہوں۔ عین ممکن ہے شروع میں ان کا وجود ہی نہ ہو۔ بسا اوقات (ان کی افزائش محض اتفاقات کا نتیجہ بھی ہو سکتی ہے) کوئی اتفاقی واقعہ غیر متوقع نتائج کے حیرت انگیز سلسلے کی ابتداء بن سکتا ہے۔

اس سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ تبدیلی کی نشان دہی اور معلومام قدروں یا گوشواروں سے درست اندازے لگانا کیوں اتنا مشکل ہے۔ اسی وجہ سے سبک رفتار اور ہم آہنگ عمل اچانک ہی ایک دھماکہ خیز تبدیلی کی شکل اختیار کر لیتا ہے یا ایک دھماکہ خیز صورت حال اچانک ہی آہستہ روی اور ہم ہم آہنگی میں بدل جاتی ہے۔ یہ عمل ہی بعدازاں وضاحت کرتا ہے کہ یکساں ابتدائی حالات کیونکر بہت زیادہ متضاد نتائج۔۔۔۔ دوسری لہر کی ذہنیت کے لئے بالکل ہی اجنبی تصور۔۔۔۔ کے حامل ہو سکتے ہیں۔ دھیرے دھیرے تشکیل پاتی تیسری لہر کی توجیہہ باہم متقابل قوتوں کی ایک پیچیدہ دنیا کی، استعجاب سے بھرپور دنیا کی، جو اپنے جلو میں تبدیلی کو بڑھانے اور گھٹانے والے اور کئی دوسرے عوامل۔۔۔۔ کائناتی پول ٹیبل پر بلیرڈ کی گیندوں کے وقفہ وقفہ سے باہم ٹکرانے کے بجائے۔۔۔۔ کی تصور کشی کرتی ہے۔ یہ دنیا دوسری لہر کے تجویز کردہ سادہ میکانزم کی نسبت کہیں زیادہ اجنبی ہے۔

دوسری لہر کی میکانکی توجیہہ کے مطابق کیا اصولی طور پر ہر چیز کے متعلق درست اندازے لگ سکتے ہیں؟ یا میکامکیت کے نقادوں کے مطابق اشیاء کے بارے میں جبلی طور پر حتمی پیش گوئی کرنا ممکن ہی نہیں؟ کیا ہم اتفاق یا ضرورت کے محکوم ہیں؟

تیسری لہر کی توجیہہ اس قدیم تضاد کے بارے میں بھی خاصی ولولہ انگیز معلومات فراہم کرتی ہے۔ درحقیقت اس توجیہہ کی بدولت ہی ہم بالآخر اس جال سے آزاد ہونے میں کامیاب ہوئے جس نے طویل عرصے تک جبریت پسندوں اور اس کے مخالفوں۔۔۔۔ ضرورت بمقابلہ اتفاق۔۔۔۔ کو باہم متصادم رکھا اور غالباً یہی اس کی انتہائی اہم فلسفیانہ پیش رفت ہے۔

MashalBooks.org

دیمک کی عبرت انگیزی

ڈاکٹر ایلیا پریگوجن اور برسلز کی فری یونیورسٹی اور آسٹن میں ٹیکساس یونیورسٹی میں ان کی ٹیم کے ساتھیوں نے اس مشاہدے کے ذریعے کہ کیمیائی اور دوسری لہر ترا کیب اتفاق اور ضرورت کے باہم ملاپ کے ذریعے فرق اور پیچیدگی کی بلند تر مراحل کی جانب تیزی سے بڑھتی ہیں۔۔۔۔ براہ راست دوسری لہر کے مفروضات کو جھٹلایا ہے۔ پریگوجن کو اسی تحقیق کے سلسلے میں نوبل انعام سے نوازا گیا۔

ماسکو میں پیدا ہونا، بچپن ہی میں بیلجیم لایا جانا ور جوانی ہی سے وقت کے مسائل میں الجھے رہنا، ان سب باتوں کے پس منظر میں ایک ظاہری تضاد نے پریگوجن کو کو سراسیمہ کر دیا۔ ایک جانب، غیر منظّم کائنات پر ایک ماہر طبیعات کا عقیدہ۔۔۔۔ کہ کائنات تباہی کی طرف بڑھ رہی ہے اور اس کی تمام منظّم اشکال بالآخر شکست وریخت کا شکار ہو جائیں گی اور دوسری جانب ایک ماہر حیاتیات کے یہ محسوسات کہ زندگی بذات خود ایک تنظیم ہے اور ہم مسلسل زیادہ سے زیادہ بلند اور پیچیدہ تر تنظیم کو ابھارے جا رہے ہیں۔ غیر منظّم کائنات کے نظریئے کا اشارہ ایک جانب ہے جبکہ ارتقاء کا کسی اور جانب۔

تنظیم کی بڑی بڑی اشکال کس طرح وجود میں آتی ہیں۔ اس سوال کے جواب کے لئے پریگوجن کو کیمیا اور طبیعات میں سالوں تک تحقیق کرنا پڑی۔ پریگوجن کا خیال ہے کہ کسی بھی پیچیدہ نظام میں چاہے وہ کسی سیال کے سالمے ہوں، دماغی نیورون ہوں یا شہری ٹریفک، اس کے اجزاء میں مسلسل چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں۔ اس کے اندرونی حصے مسلسل متصادم رہتے ہیں۔ منفی فیڈ کے نتیجے میں یہ ہل چل تھم جاتی ہے یا کم ہو جاتی ہے اور نظام کا توازن قائم رہتا ہے۔ مثبت فیڈ بیک کی صورت میں یہی ہل چل بے پناہ بڑھ سکتی ہے یہاں تک کہ تمام نظام کو خطرے سے دوچار کر سکتی ہے۔ ایسے میں نظام کی خارجی تھرتھراہٹ اس کے اندر آ کر اس ہل چل کو مزید پھیلا سکتی ہے اور اس طرح تمام نظام ہی تہ و بالا ہو سکتا ہے۔

توازن کی تباہی عموماً افراتفری یا تعطل پر منتج نہیں ہوتی بلکہ ایک بلند سطح پر ایک نیا ڈھانچہ تشکیل پانے لگتا ہے۔ یہ نیا ڈھانچہ سابقہ ہیئت کی نسبت زیادہ متفرق، اندرونی طور پر

زیادہ فعال اور پیچیدہ تر ہو سکتا ہے، خود کو قائم رکھنے کے لئے اسے زیادہ توانائی اور مادے (شاید اطلاعاتی اور دوسرے وسائل) کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ کیمیائی اور طبیعاتی ردعمل میں یہ عمل۔۔۔۔ ستعدد سماجی مثالوں کے ساتھ۔۔۔۔ دیکھنے میں آتا ہے۔

پریگوجن کے مطابق ارتقاء ایسا عمل ہے جو جدید اور اعلیٰ تر کی مدد لیکر بتدریج پیچیدہ اور متنوع حیاتیاتی اور سماجی اجسام پیدا کرتا ہے۔ اس طرح تھرتھراہٹ سے ترتیب جنم لے سکتی ہے، پریگوجن کے ان خیالات کے صرف سائنسی مطالب ہی نہیں، سیاسی اور فلسفیانہ استعمال بھی ہیں۔ میکانکی طریقے سے ارتقاء کی کوئی پیش گوئی یا منصوبہ بندی ممکن ہی نہیں۔ نظریہ برقی مقداریت (quantum theory) کے منظر پر آنے سے پہلے دوسری لہر کے مقتدر مفکرین سمجھتے تھے کہ تبدیلی عمل میں ابتدائی صورت حالات میں ہی انجام متعین ہو جاتا ہے تاہم نیم جوہری طبیعات میں تبدیلی کے عمل میں اتفاقیات کا کردار خاصا اہم سمجھا جاتا ہے۔ کئی سائنس دانوں۔۔۔۔ حیاتیات میں جیکوئس موناڈ، سماجیات میں والٹر برکلے یا نظریہ علم و انقباتیت کے مارویاما۔۔۔۔ نے باہمی طور پر ان ہر دو متضاد تصورات کو یکجا کرنا شروع کر دیا ہے۔

پریگوجن نے انتہائی مشاقی سے اتفاق اور ضرورت کو باہم ملایا ہے بلکہ ان کے باہمی تعلق پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ مختصراً، پریگوجن کے مطابق پیچیدگی کے زینے پر چڑھتے ڈھانچے کے متعلق اس کی ممکنہ شکل کی پیش گوئی کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ (دوسری لہر سے تیسری لہر کی سمت پیش قدمی او کیمیائی ردعمل پر بھی یہ بات صادق آتی ہے)۔

ایک بار ارتقاء کے راستے کا تعین ہو جائے اور نیا ڈھانچہ معرض وجود میں آ جائے تو نظریہ جبر ایک بار پھر غالب آ جاتا ہے۔ وہ دیمک کے گھونسلا بنانے کے عمل کی مثال دیتا ہے۔ وہ ابتداء میں کسی بھی سطح پر بے ترتیبی کے ساتھ اپنا لعاب ذہن چھوڑتی رہتی ہے اس جمع شدہ لعاب کی تقسیم محض اتفاقی ہوتی ہے مگر اس میں شامل مادہ دوسری دیمکوں کو اپنی جانب متوجہ کر لیتا ہے۔ یوں یہ لعاب دہن چند جگہوں پر جمع ہونے لگتا ہے اور جلد ہی یہ مادہ ایک ستون کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اگر ان ستونوں کا درمیانی فاصلہ زیادہ ہو تو محنت بیکار ہو جاتی ہے اور اگر اتفاقاً ان کا باہمی فاصلہ کم ہو تو ان پر ایک قوسی شکل لگنے کے بعد ایک

MashalBooks.org

پیچیدہ نقشے والا گھونسلا تیار ہونے لگتا ہے۔ قطعی طور پر یہ ابتدائی لا یعنی کاروائی بالآخر بامعنی ڈھانچوں میں متشکل ہو گئی اور یہ وہ چیز ہے جسے پریگوجن معقول ڈھانچوں کی بلا آورد ساخت بے ترتیب میں سے تریب کی آورد۔۔۔۔کہتا ہے۔

اس سے کلاسیکی توجیہہ کے نظریئے کو خاصا دھچکا پہنچتا ہے۔ پریگوجن کے الفاظ میں ''توجیہہ'' کے قوانین کا دائرہ کار انتہائی محدود ہو گیا ہے۔ یہ اب چند ایک تصوراتی حالات پر ہی منطبق ہوتے ہیں۔ ''پیچیدگی کا علم ہمیں کسی اور جانب لے جاتا ہے۔ ہم میکانکی گھڑی کے اصول پر چلتی بند کائنات میں قید نہیں۔ یہ کائنات ایک لچکدار نظام ہے۔ جس میں ناپائیداری سے پیدا ہونے والے نئے جسم کا امکان ہمیشہ موجود ہوتا ہے۔ درحقیقت ہم ایک مفتوح کائنات کے باسی ہیں۔'' دوسری لہر کو پیچھے چھوڑتے ہوئے ہماری سوچ میں باہمی اثر پذیری، توسیع پذیری اور سکڑاؤ پذیر (reducers) نظاماتی تعطل، یکا یک انقلابی جست، شکستہ ڈھانچوں، اتفاق اور ضرورت کا باہم ملاپ کی اصطلاحات سرایت کرتی جا رہی ہیں۔ قصہ مختصر دوسری لہر کی اندھی کھائی عبور کرتے ہی ہم ایک بالکل ہی نئی ثقافت، تیسری لہر کی ثقافت میں داخل ہوتے نظر آتے ہیں۔ یہ نئی ثقافت۔۔۔۔تبدیلی اور فزوں تر تنوع کا تشخص لئے۔۔۔۔فطرت، ارتقاء اور ترقی کے متعلق جدید خیالات، زمان و مکان کے زیادہ مناسب تصورات اور کاملیت اور سکڑاؤ کے امتزاج کو ہم آہنگ کر کے توجیہہ کا بالکل ہی جدید نظریہ پیش کر رہی ہے۔

صنعتیت جو کبھی بے پناہ طاقتور اور جامع نظر آتی تھی، کائنات اور اس کے اجزاء سے متعلق ہر وضاحت اور تشریح اس کے پاس تھی۔ اس کی افادیت میں کئی شبہ نہیں مگر اس کا دعویٰ دوام بکھر کر رہ گیا۔ دوسری لہر کا عظیم تصور کل کے نقطہ نظر سے علاقائیت اور خودغرضی پر مبنی دکھائی دے گا۔

دوسری لہر کی تہذیب کی شکست و ریخت کی وجہ سے لاکھوں لوگ عالم یاسیت میں۔۔۔۔ٹیکساس کے تاؤ ازم سے سویڈش صوفیت تک۔۔۔۔کسی بھی عقیدے کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے ہیں۔ نئی دنیا کے تقاضوں کے مطابق نئی تہذیب کی تشکیل کی بجائے یہ لوگ گئے وقتوں کے دقیانوسی خیالات اور انتہاء پسند مذاہب کا احیا چاہتے ہیں۔ اسی

لئے عارضی تصورات کے فیشن کا جلوس چلے جا رہا ہے۔ لیکن ان تصورات کی زندگی محض لمحاتی ہوتی ہے اور اسی چکا چوند، روحانی مارکیٹ اور گمراہ عقائد کے درمیان آتے وقت کی موزوں نئی ثقافت جنم لے رہی ہے۔ حقیقت آگہی کے لئے نئے نئے استعارے اور تقابلی بصیرت پیدا ہو رہی ہے۔ تاریخ کی تیسری لہر صنعتیت کے ناکارہ تہذیبی اسباس بہا کر لے جانے کے ساتھ ساتھ ہمارے سامنے ایک نئی ترتیب و تشکیل کے آثار بھی نمایا کر رہی ہے۔ دوسری لہر کی صنعتیت نے دنیا کو چھوٹی چھوٹی خود مختار آزاد ریاستوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ یہ عمل صنعتی فطرت کے چھوٹے چھوٹے مجرد اجزاء پر مشتمل ہونے کے تخیل کا عکاس تھا۔ فطرت اور مادے کے متعلق آج ہمارے تصورات بدل رہے ہیں اور ساتھ ساتھ قومی ریاست کے مفروضات بھی۔ تیسری لہر کی ابھرتی تہذیب کی جانب یہ مزید پیش قدمی ہے۔

MashalBooks.org

باب 21

قومیت کی شکست وریخت

آج قوم پرستی کے شعلے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے ہیں۔ ایک جانب حبشہ اور فلپائن میں قومی آزادی کی تحریکیں پھیل رہی ہیں، ڈومینیکا یا فجی جیسے چھوٹے چھوٹے جزائر آزادی کا اعلان کر کے اپنے وفود اقوام متحدہ میں بھیج رہے ہیں اور دوسری جانب اعلیٰ ٹیکنالوجی کی دنیا میں ایک عجیب وغریب واقع ہو رہا ہے۔۔۔۔ نئ قوموں کے ابھرنے کے بجائے پرانی اقوام شکست وریخت کے خطرے سے دوچار ہیں۔ تیسری لہر کی دنیا میں طوفانی آمد کے ساتھ ہی قومی ریاست۔۔۔۔ دوسری لہر کے دور کی بنیادی سیاسی اکائی۔۔۔۔ بالائی اور زیریں، دونوں اطراف سے ہی شدید دباؤ کا شکار ہے۔ کچھ طاقتیں قومی ریاست سے سیاسی اقتدار کو نچلی سطح پر قومتوں اور علاقوں میں منتقل کرنا چاہتی ہیں جبکہ کچھ اور طاقتیں سیاسی طاقت کو قومی سطح سے بلند کر کے بین الاقوامی ایجنسیوں اور اداروں کے سپرد کرنا چاہتی ہیں۔ ان دونوں صورتوں کے نتیجے میں اعلی ٹیکنالوجی کی حامل اقوام شکست وریخت کا شکار ہو کر چھوٹی چھوٹی اور کم طاقت ور اکائیوں کی شکل اختیار کر رہی ہیں۔

انجازی اور ٹیکساسی باشندے

اگست 1977ء کے ایام ہیں۔ تین نقاب پوش آدمی لکڑی کی ایک شکستہ میز کے گرد براجمان ہیں۔ میز کے ایک کونے پر لالٹین اور دوسری سمت موم بتی جلتی نظر آ رہی ہے۔ درمیان میں ایک جھنڈا بچھا ہے جس پر کسی نوجوان کا غصیلا چہرہ واضح ہے۔ پیشانی پر ایک پٹی ہے جس پر F.L.N.C جلی حروف میں لکھا ہے۔ یہ تینوں نقاب پوش اخبار پوش اخبار نویسوں کے ایک گروہ کو اپنی تازہ کارروائی کے متعلق بتا رہے ہیں۔ اخبار نویسیوں کو یہاں تک آنکھوں پر پٹی باندھ کر لایا گیا ہے۔ یہ نقاب پوش سراڈی پینو ٹی وی بوسٹر کی تباہی کی

MashalBooks.org

ذمہ داری قبول کر رہے ہیں۔ یہ بوسٹر جزیرہ کارسیکا میں فرانسیسی ٹی وی پروگراموں کی ترسیل کا واحد ذریعہ تھا۔ ان کا مطالبہ ہے کہ کارسیکا کے جزیرے کو فرانس سے الگ کر دیا جائے۔

انہیں شکایت تھی کہ فرانسیسی حکومت نے ان کے جزیرے کی معاشی ترقی کے لئے کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ الجزائر میں جنگ کے خاتمے کے بعد فرانسیسی فوجی دستوں کی کارسیکا میں تعیناتی پر بھی جزیرے کے لوگ خاصے ناخوش تھے۔ کارسیکا والوں کا غصہ اس وقت مزید بھڑک اٹھا جب الجزائر سے لوٹنے والے فرنچ آبادکاروں نے کارسیکا میں انگوروں کے بہت سے باغ خرید لئے (یہ باغ سیاست ہی نہیں بلکہ ان کی معیشت کے لئے بھی ریڑھ کی ہڈی کا درجہ رکھتے تھے) جس سے اہل کارسیکا کو اپنے ہی جزیرے میں اجنبیت کا شدید احساس ہوا۔ فرانس کو بحیرہ روم میں واقع اپنے اس جزیرے میں آج کل شمالی آئرلینڈ کی طرح کا ہی مسئلہ درپیش ہے۔ ملک کے دوسرے کنارے پر بھی ایک طویل عرصے سے جاری علیحدگی پسندی کی لو اچانک بھڑکتے شعلے میں تبدیل ہو گئی ہے۔ برطانی میں۔۔۔ جہاں پورے فرانس کی نسبت سب سے زیادہ بے روزگاری اور کم تر اجرت کے مسائل ہیں۔۔۔ علیحدگی کی تحریک کو بے پناہ عوامی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ دو مخالف دھڑوں میں منقسم اس پارٹی کا دہشت گرد ونگ بھی ہے جس کے اراکین کو ورسیلز میں محل سمیت کئی عمارات کو بم سے اڑانے کے جرم میں گرفتار بھی کیا گیا ہے۔ ایلس (Alsace) اور لورین کی ثقافتی اور علاقائی خودمختاری کے مطالبات بھی پیرس کے گرد گھیرا تنگ کر رہے ہیں۔

رودبار کے پار، سکاٹ قوم پرست اپنے پیدا ہونے والے تیل پر اپنی ملکیت کے طلبگار ہیں۔ فولاد اور جہاز سازی کے بے نام صنعتوں کی جگہ وہ اپنے علاقے میں الیکٹرانکس اور دوسری نئی صنعتوں کے قیام کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ حالانکہ برطانیہ میں سیمی کنڈکٹر انڈسٹری کے قیام کا مسئلہ خاصا متنازع ہے، پھر بھی سکاٹ لینڈ۔۔۔ کیلی فورنیا اور میسا چوسٹس کے بعد۔۔۔ دنیا میں مکمل سرکٹ جوڑنے والوں میں تیسرے نمبر پر ہے۔

ویلز میں بھی علیحدگی کا دباؤ دیکھنے میں آ رہا ہے۔ کارنوال اور سسیکس میں بھی مقامی تحریکیں داخلی خودمختاری، اپنی قانون ساز اسمبلی اور فرسودہ صنعتوں کے بجائے اعلیٰ ٹیکنالوجی کی صنعتوں کا قیام چاہتی ہیں۔

MashalBooks.org

بیلجیم (جہاں والونوں، فلیمشوں اور برسلز والوں کے مابین تناؤ زوروں پر ہے) سے سوئٹزرلینڈ تک (جہاں انہی دنوں ایک گروہ نے اپنے جداگانہ تشخص کو منوانے کے لئے جورا(jura) میں اپنا صوبہ قائم کرنے کی جنگ جیتی ہے) اور مغربی جرمنی (جہاں سوڈیٹن جرمن اپنے سابقہ وطن چیکوسلواکیہ سے جا ملنا چاہتے ہیں) سے لے کر اٹلی کے جنوبی ٹائیرول، آسٹریا کے سلویک، اسپین کے باسک اور کیٹلان، یوگوسلاویہ میں کروٹس (Croats) اور براعظم یورپ کے درجنوں دوسرے گروہ، ہر جانب مرکز گریز دباؤ بڑھائے جا رہے ہیں۔

بحرادقیانوس کی دوسری جانب، کینیڈا کے صوبے کیوبک کا مسئلہ بھی ابھی حل طلب ہے۔ رینے لیوسک(Rene Levesque) نامی علیحدگی پسند رہنما کے کیوبک کا وزیراعظم منتخب ہون کے بعد کینیڈا کے فرانسیسی اور انگریزی بولنے والوں کے درمیان کشیدگی بہت بڑھ گئی ہے۔ اس پر مستزاد مانٹریال سے سرمائے او کاروبار کا فرار ہے۔ یہ ملک شکست وریخت پر بھی منتج ہو سکتی ہے۔ کینیڈا کے وزیراعظم ۔۔۔۔ جو قومی سلامتی کے زبردست حامیوں میں سے ہیں، نے اپنی ایک حالیہ تقریر میں یہ وارننگ دی ہے کہ مرکز گریز رجحانات کو نظر انداز کرنے کی صورت میں ملک کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے یا اختلافات کے بڑھنے کی وجہ سے ملکی استحکام ختم ہو جائے گا۔ کینیڈا کو کیوبک میں ہی ان مسائل کا سامنا نہیں بلکہ تیل کے مخزن البرٹا کے صوبے میں بھی علیحدگی کی تحریک شروع ہو چکی ہے تاہم دنیا اس سے ابھی بے خبر ہے۔

بحرالکاہل کے علاقے میں آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ میں بھی ایسی ہی کئی تحریکیں موجود ہیں۔ آسٹریلیا کے شہر پرتھ میں کان کنی کے بادشاہ لینگھان کوک نے یہ الزام لگایا ہے کہ معدنی دولت سے مالا مال مغربی آسٹریلیا کو مشرقی حصے سے مہنگی اشیاء خریدنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ مغربی علاقے کو یہ بھی شکایت ہے کہ آسٹریلیا جیسے وسیع ملک میں پرتھ تک ہوائی آمد ورفت کو جان بوجھ کر مہنگا رکھا گیا ہے یا کینبرا میں ان کی نمائندگی قطعی غیر مناسب ہے۔ مزید براں قومی سرمایہ کاری کی پالیسی غیر ملکی سرمائے کو مغربی علاقے میں آنے سے روک رہی ہے۔ لینگھان کوک کے دفتر کے باہر سنہری حروف میں لکھا ہوا، یہ بورڈ لگا

MashalBooks.org

ہے۔۔۔۔''مغربی آسٹریلیا کی علیحدگی کی تحریک۔''

نیوزی لینڈ بھی اپنی مشکلات سے دوچار ہے۔ جنوبی جزائر کے باشندے۔۔۔۔ کل آبادی کا ایک تہائی۔۔۔۔ اس بات پر شاکی ہیں کہ شمالی علاقے کے لوگ اپنی صنعتوں میں ان کی بجلی استعمال کرتے ہیں جن کا معاوضہ انہیں بہت کم ملتا ہے۔ چنانچہ جنوبی جزائر میں صنعتی ترقی نہیں ہو رہی۔ اس طرح ڈیونیڈن کے میئر کے دفتر میں ہونے والے جلسے میں جنوبی جزائر کی آزادی کی تحریک کی ابتداء ہوئی۔

ایسی مرکزی گریز طاقتیں دنیا میں ہر جگہ ہی نشوونما پا رہی ہیں۔ سوویت یونین اور امریکہ بھی اس صورت حال سے مبرا نہیں۔ بظاہر سوویت یونین کے ٹوٹنے کا کوئی امکان نہیں مگر ایک غیر مقلد مورخ آندرے امالرک(Amalric)اس کی واضح پیش گوئی کر چکا ہے۔ آرمینیائی قوم پرستوں کو ماسکو کے زیر زمین ریلوے اسٹیشن کو بم سے اڑانے کی کوشش میں سوویت حکمرانوں نے قید و بند کی سزائیں دی ہیں۔ ایک خفیہ سیاسی تحریک نے آرمینیائی علاقوں کو یکجا کرنے کا بیڑا اٹھا رکھا ہے۔ یونین کی دوسری ریاستوں میں بھی ایسی ہی تحریکیں سرگرم ہیں۔ جارجیا میں ہزار ہا شہریوں کے روزانہ جلوسوں نے بالآخر جارجیائی زبان کو سرکاری زبان منوا کر ہی دم لیا۔ میلسی ایئر پورٹ پر موجود چند غیر ملکی سیاح یہ اعلان سن کر حیران رہ گئے۔ ماسکو روانہ ہونے والی ایک پرواز کو ''سوویت یونین'' جانے والی پرواز کا نام دیا گیا۔

ایک جانب جارجیائی روسی اقتدار کے خلاف جلسے جلوس کر رہے تھے اور اسی پس منظر میں وہاں کی انجاری اقلیت، جارجیا سے آزادی کی طالب نظر آ رہی تھی۔ انجاری تحریک آزادی کی شدت کے ہاتھوں کیمونسٹ پارٹی کے کئی افسروں کو اپنے عہدوں سے علیحدہ ہونا پڑا۔ انجاریہ کی ترقی کے لئے یونین نے ساڑھے ساٹھ کروڑ ڈالر کی خصوصی منصوبہ بندی بھی کر ڈالی۔

سوویت یونین میں مرکز گریز سرگرمیوں کا احاطہ کرنا بہت مشکل ہے لیکن یقیناً وہاں بھی ایسی بہت تحریکیں چل رہی ہونگی جو ماسکو کے حکمرانوں کے لئے باعث اذیت ہونگی۔ اگر چین سے جنگ کی نوبت آ جائے یا مشرقی یورپ بغاوت کی زد میں آ جائے تو

یونین کو اپنی متعدد جمہوریتوں میں خودمختاری یا آزادی کی تحریکوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ امریکی تو اپنے ملک کی شکست وریخت کے بارے میں سوچ ہی نہیں سکتے (ایک عشرے قبل کینیڈین بھی اس انداز میں نہیں سوچتے تھے) لیکن مقامیت کا دباؤ یہاں بھی کم نہیں۔ کیلی فورنیا میں زیرِ زمین فروخت ہونے والا ایک ناول ملک کے شمال مغربی حصے کی علیحدگی کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ اس مقصد کے لئے نیویارک اور واشنگٹن میں ایٹمی سرنگیں بچھانے کی دھمکی تک۔۔۔۔کہانی کے منظر میں۔۔۔۔موجود ہے۔

کہا جاتا ہے کہ قومی سلامتی کے مشیر ڈاکٹر ہنری کسنجر کو پیش کی گئی ایک رپورٹ میں کیلی فورنیا اور جنوب مغربی علاقوں کو علیحدہ کر کے ہسپانوی زبان بولنے والوں کا ایک ملک بنانے کے امکانات پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ اخبارات میں بھی ایسے خطوط چھپتے رہتے ہیں جن میں ٹکیساس کو میکسیکو سے ملا کر تیل کی دولت سے مالا مال ایک عظیم طاقت ''ٹیکسی کو'' کے قیام کا ذکر ہوتا ہے۔

ٹیکساس کے شہر آسٹن میں حال ہی میں، میں نے ایک کھوکے سے ماہانہ ٹیکساس نامی رسالہ خریدا جس میں واشنگٹن کی میکسیکو پالیسی پر شدید تنقید کی گئی تھی۔ ''سابقہ برسوں میں ہمیں شدت سے یہ احساس ہوا ہے کہ ہمارے پرانے دشمن میکسیکو کے ساتھ ہماری مشترکہ اقدار، واشنگٹن کے قائدین کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہیں۔ امریکی گرینگو ہمارا تیل چرا کر لے جاتے رہے ہیں۔ میکسیکو بھی اسی قسم کے معاشی سامراج سے بچنا چاہتا ہے۔'' اسی کھوکے سے میں نے ایک کار سٹکر خریدا جس پر درج تھا ''علیحدہ ہو جاؤ''

ممکن ہے یہ محض خیالی پلاؤ ہو لیکن یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ ترقی یافتہ صنعتی ممالک کی قومی حکومتوں کو شدید علاقائی دباؤ کا سامنا ہے۔ پورٹوریکو اور الاسکا میں علیحدگی پسند تحریک کے امکانات اور دیسی امریکیوں کی قومی خودمختاری کے مطالبے کے علاوہ بھی بعض دوسری ریاستوں میں تناؤ کے خاصے آثار موجود ہیں۔ ریاستی اسمبلیوں کے قومی اجلاس کے ایک بیان کے مطابق امریکہ ایک بار پھر خانہ جنگی کی لپیٹ میں ہے۔ ایک جانب ترقی یافتہ صنعتی شمال مشرق اور وسط غربی ریاستیں ہیں اور دوسری جانب جنوب اور جنوب مغربی زرعی ریاستیں۔

ایک سرکردہ کاربواری شخص نے انہی دنوں ریاستوں کی خانہ جنگی کا سبب بتاتے ہوئے کہا ہے۔ ''ناہموار اقتصادی ترقی علاقوں کے مابین کشمکش کو تیز تر کئے جا رہی ہے۔'' اسی قسم کے خطرناک فقرے جنوبی اور مغربی ریاستوں کے اعلیٰ حکام کی زبان پر بھی عام ہیں۔ وہ بھی موجودہ واقعات کو خانہ جنگی کی اقتصادی شکل قرار دیتے ہیں۔ نیویارک ٹائمز کے مطابق وائٹ ہاؤس کی مجوزہ توانائی پالیسی کے ردعمل میں ان لوگوں نے اپنے تیل اور گیس کے ذخائر کو صنعتی علاقوں کے زیر استعمال آنے سے بچانے کے لئے علیحدگی سے کم، ہر قدم اٹھانے کی دھمکی دے ڈالی ہے۔

مغربی ریاستوں میں باہمی نا چاقی کے آثار بھی نظر آتے ہیں۔ ان کے متعلق یہ بات عام ہے کہ وہ خود کو کیلی فورنیا کی توانائی کی نوآبادیاں محسوس کرتے ہیں۔ 1970ء کے عشرے کے عین درمیان پٹرول کے قحط کے دوران ٹیکساس، اوکلے ہاما اور لوزیانا میں گاڑیوں پر لگائے جانے والے ایسے سٹکر بہت مقبول تھے۔۔۔۔ ''ان حرامیوں کو تاریکی میں سردی سے ٹھٹھرنے دیا جائے''۔ لوزیانا کے ریاستی حکام نے نیویارک ٹائمز میں ایک اشتہار دیا تھا جس میں قارئین کو متوجہ کیا گیا۔ ''ایک ایسے امریکہ کا تصور کریں جس میں لوزیانا شامل نہ ہو۔''

وسط غربی ریاستوں کے باشندوں کو صنعتی علاقوں کی جانب ہجرت سے گریز کی تلقین بھی کی جا رہی ہے تاکہ وہ خود ترقی یافتہ صنعتوں کا قیام عمل میں لاسکیں۔ ان میں علاقائی سوچ پیدا کی جا رہی ہے۔ نیویارک کے تحفظ کی ایک غیر سرکاری تنظیم نے حال ہی میں ایک اشتہار دیا تھا جس میں وفاقی حکومت پر الزام لگایا گیا کہ ''اس کی پالیسیوں کے نتیجے میں نیویارک یک آبروریزی ہو رہی ہے'' اور نیویارک کے باسی اس خطرے کا مقابلہ کرنے کے پوری طرح اہل ہیں۔

دنیا میں ہر جگہ ایسے مطالبات، احتجاجی جلوسوں اور تشدد انگیزی کا مقصد آخر کیا ہے؟ یہ دراصل صنعتی انقلاب کی وجہ سیقومی ریاستوں میں پیدا ہونے والے اندرونی دباؤ کا نتیجہ ہے۔ ان میں سے کچھ دباؤ تو توانائی کے بحران کا پیدا کردہ ہے اور کچھ دوسری لہر کی توانائی کی بنیاد سے ہٹ کر، تیسری لہر کی جانب نئی توانائی کی تشکیل اور دوسری لہر کی صنعت

سے تیسری لہر کی سمت سفر کا عبور دور بھی، ایسے مسائل (جن کا ذکر انیسویں باب میں آ چکا ہے) پیدا کر رہا ہے۔ کچھ علاقائی معیشتیں بھی اتنی مضبوط اور وسیع ہو گئی ہیں کہ انہیں خود مختاری یا آزادی کا تصور زیادہ اچھا لگنے لگا ہے۔

قومی حکومتیں پرچونیت کی روز افزوں لہر کی توقعات کے آگے ٹھہر نہیں پا رہیں۔ یہ بات بھی مرکز گریز تحریکوں کی حمایت میں جا رہی ہے۔ جوں جوں صنعتی عہد کی ''تھوک'' سوسائٹی تیسری لہر کی آمد کے ساتھ انتشار کا شکار ہو رہی ہے، علاقائی، مقامی، نسلی معاشی اور مذہبی ہم آہنگی کم ہوتی جا رہی ہے۔ حالات اور ضروریات میں تنوع پیدا ہو رہا ہے۔ انفرادی سطح پر بھی لوگ خاص خاص فرق تلاش کر کے ان کا اظہار کرنا چاہ رہے ہیں۔

ان حالات میں بڑی بڑی کمپنیاں نئی اشیاء مارکیٹ میں لاتی ہیں اور مارکیٹ کے حصے بخرے کرنے کے لئے پر جوش کاروباری تحریکیں چلاتی ہیں۔ اس کے برعکس قومی حکومتیں اپنی پالیسیاں اتنی تیزی سے نہیں بدل سکتیں۔ دوسری لہر کے اپنے سیاسی اور بیورو کریٹک ڈھانچے ہیں اس لئے ان کے لئے ہر ایک نسلی، مذہبی، معاشی اور جنسی گروہ سے الگ الگ معاملہ کرنا خاصا مشکل ہوتا ہے۔ قومی سطح پر فیصلہ کرنے والے عموماً تیزی سے بدلتے مقامی حالات اور ضروریات سے باخبر نہیں رہ سکے۔ اگر ایسی کوئی کوشش وہ کریں بھی تو بے تحاشا کوائف اور تفصیلا سامنے دیکھ کر پریشان ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ واشنگٹن، لندن، پیرس اور ماسکو کی قومی حکومتیں تنوع پذیر معاشرے پر یکساں معیار کی حکمت عملی ٹھونستی رہتی ہیں جن میں مقامی یا انفرادی ضروریات کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ یوں علاقائی مغائرت کے شعلے مزید بھڑکنے لگتے ہیں۔ پرچونیت میں اضافہ کے ساتھ ساتھ علیحدگی پسند اور مرکز گریز قوتوں کی سرگرمیاں بھی بڑھتی جاتی ہیں۔ انہی سرگرمیوں سے کئی قومی ریاستوں یک بقا خطرات کی نذر ہو سکتی ہے۔ تیسری لہر قومی ریاستوں پر زبردست زیریں سطح کا دباؤ ڈال رہی ہے۔

اوپر سے نیچے

بایں ہمہ ہمیں ایسی طاقتور انگلیاں بھی نظر آ رہی ہیں کہ قومی حکومتیں ان سے عملاً نپٹ ہی نہیں سکتیں۔ اسی طرح بعض ایسے بڑے بڑے مسئلے اٹھ رہے ہیں جن پر قابو پانا کسی

قومی ریاست کے بس کی بات نہیں۔ فرانسیسی ماہر سیاسیات دینی ویراج ماں لکھتا ہے۔ ''ایک قومی ریاست۔۔۔۔ جو اپنے اقتدار اعلیٰ پر کلی ایمان رکھتی ہے۔۔۔۔ اتنی چھوٹی ہے کہ عالمی سطح پر اس کا اپنا کوئی مخصوص کردار ممکن ہیں۔ ہمارے 28 یورپی ملکوں میں سے کوئی بھی تن تنہا اپنا دفاع کرنے کے قابل نہیں۔ نہ ہی وہ خوش حالی کی منازل طے کر سکتا ہے اور نہ ہی ٹیکنالوجی کے ذرائع۔ وہ نہ خود پر مسلط جنگ کو روک سکتا ہے اور نہ ہی ماحولیاتی حادثات۔'' امریکہ اور سوویت یونین بھی یہ سب کچھ تن تنہا نہیں کر سکتے۔

معاشی رشتوں کی موجودگی کے باعث کوئی حکومت بھی اکیلے اپنی معیشت نہیں چلا سکتی اور نہ ہی افراط زر کا خاتمہ ممکن بنا سکتی ہے۔ یورو کرنسی کا وسعت پذیر بلبلہ آسانی سے کسی ایک ملک کے قابو میں نہیں آ سکتا افراط زر اور بے روزگاری کے خاتمے کا دعویٰ کرنے والا سیاست دان یا تو اول درجے کا احمق ہے یا پھر وہ صاف جھوٹ بول رہا ہے کیونکہ آج کے معاشی امراض کو سرحدوں میں قید رکھنا ممکن ہی نہیں۔

ماحولیاتی قوتوں کے لئے تو قومی سرحدیں قطعی بے معنی ہوتی ہیں۔ اگر سوئٹزر لینڈ کی کوئی کیمیکل کمپنی اپنا صنعتی فضلہ دریائے رائن میں پھینکتی ہے تو اس کا زہر دریا کے ساتھ ساتھ جرمنی، ہالینڈ کے راستے شمالی سمندر میں جا پہنچتا ہے۔ جرمین اور ہالینڈ اکیلے اس دریا کا پانی صاف نہیں رکھ سکتے۔ حادثے کی صورت میں ٹینکروں سے ضائع ہونے والا تیل، فضائی آلودگی، موسمی تغیرات، جنگلوں کی کٹائی وغیرہ کے ضمنی اثرات کئی ملکوں کو اپنی زد میں لے لیتے ہیں۔ سرحدوں میں مسام پیدا ہو گئے ہیں۔

نئے عالمی مواصلاتی نظام نے بھی سرحدوں کو ختم کر کے رکھ دیا ہے۔ کینیڈا کو عرصہ سے شکایت ہے کہ امریکہ نے اس کی سرحدوں پر۔۔۔۔ باقاعدہ نشریاتی پروگراموں کے لئے۔۔۔۔ تقریباً ستر ٹی وی اسٹیشن قائم کر رکھے ہیں۔ تاہم تیسری لہر کی تہذیب۔۔۔۔ دوسری لہر کی ثقافتی یلغار کے اس انداز سے کہیں زیادہ عمدہ ذرائع۔۔۔۔ سیارچوں، کمپیوٹر، کیبل ٹی وی اور ٹیلی پرنٹر کی شکل میں اپنے ہمراہ لا رہی ہے۔

امریکی کانگریس کے رکن سینیٹر جارج ایس میک گورن کے مطابق کسی ملک پر چڑھائی کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ اس کی اطلاعات کے بہاؤ کو دبا دیا جائے تا کہ اس کی

بین الاقوامی کمپنیوں کا اپنی سمندر پار شاخوں سے رابطہ ختم ہو جائے۔ اس طرح اس ملک کے اردگرد اطلاعاتی فصلیں کھڑی کر دی جائیں۔ دنیا کے ذخیرہ الفاظ میں ایک نئی اصطلاح ''اطلاعاتی حاکمیت اعلیٰ'' کا اضافہ ہو رہا ہے۔

ریاستوں کے پاس اپنی سرحدیں بند کرنے کا کوئی کامیاب طریقہ نہیں رہا۔ تیسری لہر کی صنعتی بنیاد کی جانب پیش رفت کے لئے ایک متنوع، حساس اور کھلا اطلاعاتی نظام چاہیے۔ اگر کوئی ملک کوائف کے بہاؤ میں مداخلت کی کوشش کرے گا تو وہ اپنی ہی معاشی نشوونما کو نقصان پہنچا رہا ہو گا۔ ٹیکنالوجی میں ہونے والی ہر پیش رفت، قوم کی خارجی سرحدوں میں داخلے کو آسان تر بناتی جائے گی۔

غرض نئے معاشی مسائل، جدید ماحولیاتی خطرات اور مواصلاتی ٹیکنالوجی نے قومی ریاست کی حیثیت کو بری طرح ہلا کر رکھ دیا ہے او وہ بھی عین اس وقت جبکہ دنیا کے اسٹیج پر نئے طاقتور کردار۔۔۔ قومی ریاستوں کو للکارنے کے لئے۔۔۔ جنم لے رہے ہیں۔

عالمی کارپوریشن

ان نئے کرداروں میں سب سے اہم اور جانا پہچانا کردار عالمی کارپوریشن کا ہے۔ گذشتہ پچیس برسوں کے دوران پیداواری طریقوں میں حیران کن حد تک استحکام پیدا ہوا ہے۔ خام مال کی برآمد، مصنوعات کی بین الملکی ترسیل اور بین الاقوامی نظام پیداوار اس کی بنیادی وجوہات ہیں۔ ایک کثیر قومی کارپوریشن کا تحقیقی شعبہ ایک ملک میں ہوسکتا ہے، اجزاء کا پیداواری مرکز دوسرے ملک میں، ان اجزاء کو یکجا کرنے کی فیکٹری تیسری ملک میں، مصنوعات کی مارکیٹنگ کا مرکز چوتھے ملک میں اور اس کا منافع کسی پانچویں ملک میں جمع ہو سکتا ہے۔ اسی کی صنعتی شاخیں درجن بھر ممالک میں پھیلی ہو سکتی ہیں۔ 1950ء کے عشرے کے درمیان سے ایسی عالمی کارپوریشنوں کے سائز، اہمیت اور سیاسی قوت میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔ غیر اشتراکی صنعتی ممالک میں آج تقریباً دس ہزار ایسی کمپنیاں ہیں جن کی شاخیں مختلف ممالک میں موجود ہیں۔ ان میں سے دو ہزار سے زیادہ کمپنیوں کی سرگرمیاں چھ سے زیادہ ملکوں میں جاری ہیں۔

ایک ارب ڈالر سے زیادہ سالانہ فروخت کرنے والی 382 بڑی صنعتی کمپنیوں میں 242 ایسی ہیں جن کا 1/4 حصہ کاروبار غیر ملکوں میں ہوتا ہے۔ گو ماہرین معاشیات عالمی کارپوریشن کی ایسی تعریف یا کارکردگی کے معیار پر متفق نہیں تاہم یہ بات مسلم ہے کہ یہ کمپنیاں عالمی نظام میں اہم کردار انجام دے رہی ہیں اور قومی ریاست کو مسلسل چیلنج کئے جا رہی ہیں۔ ان کی اہمیت کا اندازہ اس لہر سے لگائیں کہ 1971ء کے کسی ایک دن ان کمپنیوں کے 268 ارب ڈالر مالیت کے نقد اثاثے تھے، امریکی کانگریس کی ذیلی کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق یہ رقم دنیا کے سارے بین الاقوامی اداروں کے اس دن کے اثاثوں کے مقابلے میں دوگنی ہے۔ اقوام متحدہ کے ادارے کا سالانہ بجٹ اس رقم کا صرف 1/268 یا 0.0037 ہے۔

1970ء کے عشرے کے ابتدائی سالوں میں امریکہ کی جنرل موٹرز کارپوریشن کی سالانہ فروخت بیلجیم یا سوئٹزر لینڈ کی کل قومی آمدنی سے زیادہ تھی۔ بین الاقوامی نگران ادارے کے صدر لیسٹر براؤن کا کہنا ہے۔ ”ایک زمانے میں برطانوی سلطنت پر سورج غروب نہیں ہوتا تھا لیکن اب برطانوی مملکت میں (مختصر رقبے کی وجہ سے) سورج غروب ہی رہتا ہے۔ لیکن اس کی جگہ آئی بی ایم، یونی لیور، فوکس ویگن اور ہٹاچی جیسی عالمی کارپوریشنوں پر کہیں نہ کہیں سورج جگمگاتا رہتا ہے۔ ایکسون کارپوریشن کے تیل برادر جہازوں کی تعداد سوویت یونین کے تیل برادر جہازوں کی نسبت دوگنی ہے۔ آسٹریلیا کے ملٹری کالج کے ایک پروفیسر نے مذاق مذاق میں حساب لگایا کہ 1973ء میں صرف دس عالمی کارپوریشنوں کے منافع سے دنیا کے 14 اشتراکی ممالک کی کمیونسٹ پارٹیوں کے پانچ کروڑ اسی لاکھ اراکین کو چھ مہینے کی چھٹی پر بھیجا جا سکتا ہے۔

عالمی کارپوریشنیں صرف دولت مند ممالک ہی میں نہیں ہوتیں۔ لاطینی امریکہ میں غذا، تعمیرات اور مشینری کی کئی ایسی کمپنیاں ہیں جن کی سرگرمیاں کئی ممالک میں پھیلی ہوئی ہیں۔ فلپائن کی کئی کمپنیاں خلیج فارس میں گہری بندرگاہیں بنا رہی ہیں۔ بھارت کی بین الاقوامی کمپنیاں یوگوسلاویہ میں برقیاتی مصنوعات اور الجزائر میں مشینی آلات بنانے میں مصروف ہیں۔ مارکسی نظریئے کے مطابق قومی حکومتیں ان عالمی کارپوریشنوں کے آگے لگی

MashalBooks.org

ہوتی ہیں، دونوں کا یکساں مفاد ہوتا ہے۔ بسا اوقات یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ یہ کارپوریشنیں اپنی حکومتوں کے مفاد کے خلاف بھی کاروبار کرتی ہیں۔

برطانوی کاروباری اداروں نے کئی بار اپنی ہی حکومت کی لگائی گئی پابندیوں کو نظر انداز کیا ہے۔ کئی امریکی کارپوریشنوں نے بھی عرب ممالک کے سلسلے میں اپنی حکومت کے قوانین کی خلاف ورزی کی۔ اوپیک کی جانب سے تیل بیچنے کی پابندی کے دوران، بین الاقوامی تیل کمپنیاں، حکومتی ترجیحات کے بجائے اپنے مفاد کو مدنظر رکھ کر تیل برآمد کرتی تھیں۔ عالمی کارپوریشنوں کا مطمح نظر صرف منافع ہے۔ وہ خدمات کو ایک سے دوسرے ملک میں منتقل کرتی رہتی ہیں۔ ماحولیاتی پابندیوں کو اکثر اوقات نظر انداز کرتی ہیں اور اپنے کاروباری فائدے کے لئے مختلف ممالک کے مابین غلط فہمی کے بیج بوتی ہیں۔

لیسٹر براؤن کہتے ہیں۔ ''پچھلی کئی صدیوں سے دنیا آزاد اور خود مختار ملکوں میں منقسم ہے۔ ہزاروں عالمی کارپوریشنوں کے ظہور کے ساتھ ہی معیشتی اداروں کے جال نے اس نظام کی جگہ لینا شروع کر دی ہے۔'' یوں قومی ریاست جو کبھی طاقت کا واحد سرچشمہ تھی۔ اپنی اہمیت میں کمی آتی دیکھ رہی ہے۔ بعض کمپنیاں اتنی وسیع اور طاقتور ہوگئی ہیں کہ قومی ریاست سے مشابہ لگتی ہیں۔ ان کے اپنے سفارت کار ہیں اور نہایت فعال خفیہ ادارے بھی۔

جم ہرگن نے غیر سرکاری خفیہ اداروں پر ایک رپورٹ ''سپوکس'' کے نام سے شائع کی ہے۔ اس کا کہنا ہے: عالمی کارپوریشنوں کو بھی خفیہ معلومات کی اتنی ہی ضرورت ہو گی جتنی امریکہ، فرانس یا کسی اور ملک کو۔ سی آئی اے اور کے جی بی کے تذکرے کے ساتھ اب ایکسون، چیز، مین ہٹن، میٹسو بیشی، لاک ہیڈ، فلپس کے خفیہ معلومات کے شعبوں کا ذکر بھی ہونا چاہئے۔'' یہ کمپنیاں کبھی اپنی حکومت سے تعاون کرتی ہیں اور کبھی اپنے مفاد میں انہیں استعمال بھی کر ڈالتی ہیں۔ لہٰذا انہیں اچھا یا برا میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ یاد رہنا چاہئے کہ آناً فاناً اربوں ڈالر ایک ملک سے دوسرے ملک پہنچانے، ٹیکنالوجی کے بھرپور استعمال اور تیز رفتاری میں یہ کمپنیاں اپنی قومی حکومتیں کو اکثر اوقات پیچھے چھوڑ جاتی ہیں۔ طاقت کے عالمی نظام میں بین الاقوامی کارپوریشنیں کے عروج نے عین اس وقت قومی

ریاست کے کردار کو کم کر دیا ہے جب وہ مرکز گریز طاقتوں سے نبرد آزما ہے۔

ظہور پذیر ٹی نیٹ

بین الاقوامی کارپوریشنیں تو مشہور ہیں ہی لیکن حال ہی میں بعض دوسرے ادارے بھی عالمی سطح پر خاصے متحرک ہوئے ہیں مثلاً بین الاقوامی ٹریڈ یونین۔ یہ یونین ایک لحاظ سے عالمی کارپوریشن کا ہی عکس ہے۔ اسی طرح مذہبی، ثقافتی اور لسانی تحریکیں اپنی اپنی ساخیں مختلف ممالک میں پھیلائے ہوئے ہیں۔ جوہری ہتھیاروں کے خلاف یورپ میں ایسے بہت سے مظاہرے ہوئے ہیں جن میں مختلف ممالک کے باشندے شریک ہوئے۔ اسی طرح بین الاقوامی سیاسی جھتھ بندیاں بھی ہو رہی ہیں۔ یورپ میں کئی ممالک کی کرسچین ڈیموکریٹ اور سوشلسٹ پارٹیاں اپنی اپنی براعظم تنظیمیں تشکیل دے رہی ہیں جو یورپی پارلیمنٹ میں اپنا اپنا سیاسی کردار ادا کر رہی ہیں۔

بہت سی غیر سرکاری انجمنیں تعلیم، کھیل، سائنس، خیرات وغیرہ کے شعبوں میں اپنے اپنے بین الاقوامی جال پھیلا چکی ہیں۔ ایسی تنظیمیں عموماً اپنی ہزار ہا شاخوں کے کروڑوں اراکین کی نمائندگی کرتی ہیں۔1963ء میں1300ایسی عالمی تنظیمیں موجود تھیں جو1970ء کے وسط میں بڑھ کر2600ہو گئیں۔ان کی تعداد1985ء تک ساڑھے تین یا چار ہزار کے لگ بھگ ہو جائے گی۔ اندازہ ہے کہ ہر تین دن میں ایک نئی عالمی تنظیم جنم لے گی۔

اقوام متحدہ کے ساتھ ساتھ، بظاہر نظر نہ آنے والی یہ تنظیمیں ایک متوازی عالمی نظام تشکیل دے رہی ہیں۔1975ء میں ان کے بجٹ کا اندازہ ڈیڑھ ارب ڈالر کے قریب تھا لیکن ان کے سوائل زیادہ تر ان کے ذیلی اداروں کے پاس ہوتے ہیں۔ بیلجیم کے دارالحکومت برسلز میں ان کی اپنی ایک مرکزی انجمن۔۔۔۔ یونین آف انٹرنیشنل ایسوسی ایشنز۔۔۔۔ ہے۔ باہمی رابطے کی کمیٹیوں کے علاوہ ان سب کی مقامی علاقائی قومی شاخیں بھی قائم ہیں۔

یہ تنظیمی ڈھانچہ بے پناہ گنجان ہے۔ برسلز کی یونین کے ایک جائزے کے مطابق 1977ء میں ایسے 1857 اداروں کی52075شاخیں اور ذیلی ادارے موجود تھے۔ ان

کے عہدے داروں کی سالانہ ملاقاتیں ہزاروں نشستوں میں منقسم ہوتی ہیں، تیز رفتاری سے وسعت پذیر یہ جال تیسری لہر کے نظام میں ایک اور جست کا اضافہ کرتا ہے۔ اس طرح قومی ریاست کا کردار مزید کم ہو رہا ہے۔قومی ریاستیں خود بین الملکی ادارے قائم کرنے پر مجبور ہیں یوں انہیں مرحلہ وار اپنی حاکمیت اعلیٰ اور آزادی پر نت نئی قدغنوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

مثال کے طور پر یورپی ممالک مشترکہ منڈی، یورپی پارلیمنٹ، یکساں مالی نظام اور کئی مخصوص ادارے قائم کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔مشترکہ منڈی کا ٹیکس کمشنر رکن ممالک پر، ٹیکس پالیسیاں بدلنے کے لئے دباؤ ڈالتا ہے۔لندن اور پیرس میں طے ہونے والی زرعی اور صنعتی حکمت عملی ابر برسلز میں متعین کی جاتی ہے۔ یورپی پارلیمان کے اراکین نے اپنی G3 حکومتوں کی مخالفت کے باوجود مشترکہ منڈی کے لئے ساڑھے آٹھ کروڑ ڈالر کا سالانہ بجٹ منظور کر ڈالا۔ یہ مشترکہ منڈی دنیا میں علاقائی اداروں کے قیام کی پہلی مثال ہے لیکن ایسے اور بھی بہت سے بین الحکومتی ادارے موجود ہیں مثلاً۔ عالمی تنظیم برائے موسمیات، بین الاقوامی ایٹمی توانائی ایجنسی، عالمی ادارہ برائے کافی (Coffee)، لاطینی امریکہ کی آزاد تجارت کا ادارہ اور پٹرول برآمد کنندہ ممالک کا ادارہ اوپیک۔ روز افزوں نقل وحمل، مواصلات، ذہنی صلاحیتوں اور چاول سے ربڑ تک میدانوں میں ربط پیدا کرنے کے لئے بین الاقوامی اداروں کی ضرورت بڑھتی جا رہی ہے۔1960ء میں ایسے اداروں کی تعداد 139 تھی جو1977ء میں262 تک پہنچ گئی۔

قومی ریاستوں نے بین الملکی لین دین کے مسائل حل کرنے کے لئے یہ ادارے تشکیل دیئے تھے مگر آہستہ آہستہ یہ معاملات پر فیصلے کرنے کا اختیار اپنے ہاتھوں میں لیتے جا رہے ہیں۔ عالمی کارپوریشن کا عروج، بین الاقوامی اداروں اور تنظیموں کا قیام قومی آزادی اور خودمختاری کی حقیقی قوت کو بتدریج کم کرتا جا رہا ہے اور اس طرح ان کا اقتدار بھی متاثر ہو رہا ہے۔

ہم ایک کثیر سطحی عالمی نظام تشکیل پاتا دیکھ رہے ہیں جس میں قومی ریاستوں کے ساتھ ساتھ کمپنیاں، مزدور یونین اور سیاسی، نسلی اور ثقافتی تنظیمیں اور عالمی ادارے بھی فعال

MashalBooks.org

کردار ادا کر رہے ہیں۔قومی ریاست پر مرکز گریز رجحانات کا دباؤ تو ہے ہی، یہ دباؤ اس کی آزادیٔ عمل کو مزید محدود کر رہا ہے۔

آفاقی شعور

قومی ریاست کا یہ تصادم، تیسری لہر کے ظہور کے بعد جنم لیتی نئی عالمی معیشت کی بھرپور عکاسی ہے۔قومی ریاستیں، اپنی قامت کے مطابق قومی معیشت کی افزائش کے لئے ضروری تھیں مگر کچھ علاقائی معشتوں نے خود کو بے پناہ طاقتور بنا کر قومی معیشت کا درجہ حاصل کرلیا۔ادھر بین الاقوامی معیشت بھی حیرت انگیز تبدیلیوں کی زد میں رہی ہے۔ دنیا کی معیشت پر بڑی بڑی کارپوریشنوں کا غلبہ ہے۔اس کی معاونت کے لئے برق رفتار بینکاری اور عالمی مالیاتی نظام بھی موجود ہے۔ ان میں پیدائش دولت اور قرضوں کے پھیلاؤ پر بقابو پانا کسی قومی ریاست کے بس میں نہیں۔ یہ نظام مخلوط معیشت کے اصولوں پر جاری وساری ہے جس میں سرمایہ دار اور سوشلسٹ ریاستی ادارے باہم نئے صنعتی اور تجارتی ادارے قائم کر رہے ہیں۔ یہ نظام نہ آزادی تجارت پر مبنی ہے اور نہ ہی مارکیٹ پر بلکہ اس کی بنیاد ہمہ جہتی ہے یعنی قوم پرستی کا تصور بھی فرسودہ ہو گیا۔

دوسری لہر کی تہذیب نے بھی آبادیوں کے چند ایسے حصے پیدا کئے تھے جن کے مفادات مقامی نہیں تھے۔ انہی گروہوں نے قومی نظریات تشکیل دیئے۔اسی طرح تیسری لہر نے بھی ایسے گروہ جنم دیئے ہیں جن کے مفادات محض قومی نہیں اور یہی عالمی نظریئے کی بنیاد بنتے ہیں جسے آفاقی شعور بھی کہا جاسکتا ہے۔

عالمی کارپوریشن کے حکام، لمبے بالوں والے ماحولیات کے حامی، سرمایہ کار، دانش ور، شاعر اور مصور اس جدید شعور کا حصہ ہیں۔ ایک امریکی جنرل نے ایک حالیہ ملاقات میں، مجھے یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ ''قومی ریاست انتقال پا چکی ہے۔'' آفاقی نظریہ صرف چند مخصوص گروہوں کے مفاد میں نہیں۔ جیسے قوم پرستی کا نظریہ پوری قوم یک ترجمانی کرتا تھا۔ اسی طرح آفاقی نظریہ ساری دنیا کا ترجمان بن کر آ رہا ہے اور یوں ہم ارتقائی زینے پر آفاقی شعور کی سمت پیش رفت کر رہے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ معیشت سے سیاست تک اور تنظیم سے نظریات تک کی مختلف سطحوں پر ہم دوسری لہر کے ستون ''قومی

ریاست'' پر لگاتار جارحانہ حملوں کے شاہد ہیں۔

ایک وقت تھا کہ صنعتی ترقی میں پیش رفت کے لئے قومی تشخص بہت ضروری تھا۔ آج بھی بہت سے ترقی پذیر ممالک اپنا قومی تشخص قائم کرنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں جبکہ امیر ممالک صنعتیت کی حدود سے گزر کر قومی ریاست کے کردار کو کم کئے جا رہے ہیں۔ یہ تضاد اگلے چند عشروں میں ''علاقائیت پرستوں اور بین الاقوامیت پسندوں'' کی نمائندگی کے قابل عالمی اداروں کے قیام پر اختلافات کی صورت میں واضح ہوگا۔

من گھڑت کہانیاں اور (حقیقی) ایجادات

روس اور امریکہ کے زبردست ماہرین سے لے کر ایک عام آدمی تک کوئی بھی اس نئے عالمی نظام کے ظہور اور علاقائی یا عالمی امن کے ذمہ دار اداروں کے قیام کے متعلق صحیح آگاہی نہیں رکھتا۔ لیکن اس ضمن میں کچھ ایسی من گھڑت کہانیاں بھی پھیلی ہوئی ہیں جن کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔

ایک کہانی یوں ہے کہ عالمی کارپوریشنوں کا ایک گروپ پوری دنیا پر قابو پا لے گا۔ اس نظام میں توانائی کی کارپوریشن، غذائی کا پوریشن، تفریح کی کارپوریشن، وغیرہ وغیرہ شامل ہونگی۔ ایک تصور اس طرح ہے کہ یہ سب درحقیقت ایک بہت بڑی کارپوریشن کے الگ الگ شعبے ہوں گے۔ یہ آسان فہم نظریہ دوسری لہر کے تخصیص، کثرت پسندی اور ارتکاز کار کے اصولوں سے نکلا محسوس ہوتا ہے۔ یہ تصور زندگی کے مختلف شعبوں میں بپا تنوع، اسراع تبدیلی اور صنعتی ممالک کی پرچونیت کی جانب پیش رفت کے عملی کی مکمل نفی کرتا ہے۔ اس کا یاک مفروضہ یہ ہے کہ توانائی، رہائش یا غذا یک ضروریات کو الگ الگ اور غیر متعلق حصوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ مزید براں یہ نظریہ کارپوریشن کے مقاصد اور اس کے ڈھانچے میں آنے والی بنیادی تبدیلیوں کو بالکل ہی نظر انداز کر دیتا ہے۔ دوسری فرضی کہانی ایک عالمی مرکزی حکومت کے گرد گھومتی ہے۔ ایسے ادارے کو آج کے کسی ادارے کی توسیع شدہ شکل سمجھا جاتا ہے مثلاً ''عالمی ریاست ہائے متحدہ'' یا ''محنت کشوں کی ارضی ریاست'' یا اقوام متحدہ کی ہی ایک نئی شکل۔ یہ سوچ بھی دوسری لہر کے اصولوں پر مبنی، ایک سیدھی سادی توضیح ہے۔

ظہور پذیر حقیقت نہ تو کارپوریشن کے طابع کوئی نظام ہو گا نہ عالمی حکومت کی کوئی شکل بلکہ صنعتی ممالک میں جنم لیتی قابلی تنظیم کا ایک پیچیدہ تر نظام ہو گا۔ اہرامی شکل کی بین الاقوامی نوکر شاہی کی تشکیل کے بجائے ہم مختلف اقسام کی تنظیموں کا ایک جال بن رہے ہیں۔ اس میں یکساں مقاصد والی تنظیمیں باہم مربطو ہوں گے۔ عین ممکن ہے کہ اگلے عشرے میں سمندری مسائل و وسائل میں دلچسپی رکھنے والوں کی ایک بحری تنظیم قائم ہو جائے جس میں قومی ریاستوں کے علاوہ علاقائی حکومتیں، شہر، کارپوریشنیں، ماحولیاتی ادارے اور سائنسی تنظیمیں بھی شامل ہوں۔ بعض شعبوں میں ایسے ادارے قائم بھی ہو چکے ہیں مثلاً فضائی، غذائی، مواصلات، توانائی وغیرہ۔ ان کے بے شمار باہمی ناطے بھی ہیں۔ غرض اس طرح جس زدہ یک رنگ اور بند عالمی نظام کی جگہ، ایک نیم منظّم اور مفتوح نظام ظہور پذیر ہو رہا ہے۔

قصہ مختصر ہم ایک ایسے عالمی نظام کی جانب گامزن ہیں جو نوکر شاہی کے شعبوں کی طرح منظّم نہیں ہو گا بلکہ اس کی ترتیب و تشکیل انسانی دماغ کے باہم مشترک نیوران کی طرح ہو گی۔ کیا موجودہ اقوام متحدہ صرف قومی ریاستوں کی تجارتی تنظیم ہی رہے یا اس میں علاقائی، مذہبی، کارپوریشنیں یا نسلی اقلیت جیسی مختلف طرح کی اکائیوں کو بھی شامل کیا جائے۔۔۔۔ ان مسائل پر بھی اقوام متحدہ میں بحث و تمحیص اور مجادلوں کا ایک طوفان اٹھ سکتا ہے۔ عدم استحکام کی فضاء، جنگ کے خطرات کے پس منظر میں بین الاقوامی اکھاڑ پچھاڑ اور تنظیم نو، عالمی سٹیج پر کارپوریشن اور دوسرے کئی نئے کرداروں کے جنم لینے کی وجہ سے ہمیں ایسی نئی سیاسی اشکال ترتیب دینی پڑیں گی جو دنیا کو امن و سکون کا گھوارہ بنا سکیں کیونکہ قومی ریاست، بہت سی وجوہ کی بنا پر آج دنیا میں ایک خطرناک غلطی کی صورت اختیار کر چکی ہے۔

MashalBooks.org

باب22

گاندھی سیارچوں کے جلو میں

خوف ناک سیاسی زلزلے۔۔۔ ناگہانی بغاوتیں۔۔۔ وحشیانہ ہلچل۔۔۔
اخبارات میں شہ سرخیاں لگانے والے عالم بدحواسی میں روز افزوں افراتفری کے اظہار کے لئے موزوں جملوں کے متلاشی ہیں۔ ایران کا اسلامی انقلاب انہیں حیران کر رہا ہے، ماؤزے تنگ کی پالیسیوں سے گریز، ڈالر کی قدر میں سکڑاؤ، غریب ملکوں میں فوجی اقتدار، ایل سلویڈور اور افغانستان میں مسلسل خانہ جنگی۔۔۔ یہ چونکا دینے والے واقعات بظاہر اتفاقی اور بے ربط نظر آتے ہیں۔ لگتا ہے دنیا تیزی سے انتشار کی گہری کھائی کی جانب بھاگی جا رہی ہے۔

لیکن یہ افراتفری کا عمل صرف سطحی ہے۔ دنیا میں جدید تہذیب کی آمد، پرانے رشتوں کی دھجیا بکھیرتی ہے، حکومتوں کے تختے الٹتے ہیں، عالمی نظام ڈگمگانے لگتا ہے۔ یہ انتشار دراصل نئی تہذیب کی جگہ بنانے کے لئے قوتوں کی ازبسرنو ترتیب کا علم ہے۔ وہ دن بھی آئے گا جب ہم دوسری لہر کی تہذیب کے خاتمے کا ذکر تاریخ میں پڑھا کریں گے۔

اس صنعتی ثقافت نے مرتے مرتے اپنے پیچھے ایک ایسی دنیا چھوڑی جہاں 1/4 انسانی آبادی ہر فکر سے بے نیاز ہے اور 3/4 (یعنی انسانی اکثریت) کسمپرسی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ 80 کروڑ افراد خط افلاس سے بھی نیچے زندہ ہیں۔ 70 کروڑ بھوک کی لپیٹ میں اور 120 کروڑ صاف پانی (پینے کے لئے) تک سے محروم ہیں۔

صنعتی دور کی میراث میں وہ 20 یا 120 کروڑ صاف پانی (پینے کے لئے) تک سے محروم ہیں۔

صنعتی دور کی میراث میں وہ 20 یا 30 صنعتی ترقی یافتہ صنعتی ممالک بھی شامل

ہیں، جن کی معاشی کامیابیوں کا رازسستی توانائی اور خام مال کی شکل میں حاصل شدہ مخفی مراعات ہیں۔ اس کے ورثے میں دوسری لہر کے مخصوص ممالک کے مفاد میں تجارتی اور مالیاتی نظام کو کنٹرول کرنے والا عالمی مالیاتی نظام (بین الاقوامی مالیاتی فنڈ، تجارت اور محصولات کا عام میثاق اور عالمی بینک وغیرہ) بھی شامل ہے۔کئی ایسے غریب ملک بھی ہیں، جن کی پوری معیشت کا انحصار امیر ممالک کو صرف فصل برآمد کرنے پر ہوتا ہے۔

تیسری لہر کا ظہور نہ صرف دوسری لہر کے سامراج کے خاتمے کا اعلان کر رہا ہے بلکہ اس سے دنیا میں غربت مٹانے کی روایتی حکمت عملی کی ناکامی بھی ثابت ہو رہی ہے۔

دوسری لہر کی حکمت عملی

1940ء کے عشرے سے غریب اور امیر کے درمیانی فرق کو گھٹانے کی ایک ہی حکمت عملی۔۔۔۔ اس دوسرے لہر کی حکمت عملی کا نام دیا جا سکتا ہے۔۔۔۔ پر عمل ہوتا رہا ہے۔ اس پالیسی کا بنیادی مفروضہ یہ تھا کہ دوسری لہر کے سماج ارتقائی عمل کی معراج ہیں اور مسائل کے حل کے لئے باقی دنیا کو بھی صنعتی انقلاب کے انہی مراحل سے گزرنا ہو گا جن سے مغربی ممالک، سوویت یونین اور جاپان گزرے۔ ترقی کا مفہوم ہی یہ ہے کہ آبادی کی اکثریت کو زراعت سے نکال کر تھوک پیداوار کے شعبے میں کھینچ لایا جائے۔ شہری زندگی کا رواج، معیاریت اور دوسری لہر کے موجود اصولوں پر کاربند رہنا، اس کی شرائط میں شامل ہیں۔ ایک متعین طریقہ پیداوار کا بھرپور رواج ہی دراصل ترقی ہے۔

بہت سی حکومتوں نے اس انداز کی نقالی کی کوشش کی۔ جنوبی کوریا اور تائیوان جیسے چند ایک ممالک ہیں، جو اپنے مخصوص حالات کی وجہ سے دوسری لہر کا سماج قائم کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں، لیکن زیادہ تر ممالک میں یہ تجربہ درست ثابت نہیں ہوا۔ غریب ممالک کی ناکامی کی بہت سی وجوہات بتائی گئی ہیں۔ نو آبادیاتی نظام، غلط منصوبہ بندی، بے ایمانی، رجعت پسندی، قبائلی نظام، عالمی کارپوریشن، سی آئی اے، ترقی کی رفتار میں آہستگی یا ناقابل برادشت تیزی وغیرہ۔ حقیقی وجوہات جو بھی ہوں، سچ یہ ہے کہ دوسری لہر کے انداز صنعتی ترقی کے حصول کی کوششیں کامیاب نہیں ہوسکیں۔

ایسی ہی ایک مثال ایران کی ہے۔1975 میں ایران کے مطلق العنان شہنشاہ کا

MashalBooks.org

دعویٰ تھا کہ وہ دوسری لہر کی حکمت عملی کے ذریعے ایران کو مشرقِ وسطیٰ کا ممتاز ترین صنعتی ملک بنا ڈالے گا۔ نیوز ویک نامی، رسالے کے مطابق ''شاہ کے معماروں نے ملوں، بندوں، ریل گاڑیوں اور سڑکوں کا جال بچھانے کی سرتوڑ محنت کی تاکہ بھرپور صنعتی انقلاب کے لئے ضروری بنیادی ڈھانچہ فراہم ہو سکے۔ جون 1978 تک عالمی بینکار ایرانی کارخانوں کو اربوں ڈالر کا قرضہ مہیا کرنے کی دوڑ میں سرگرم عمل تھے۔

ترقی کی سمت ان شاندار سرگرمیوں کے پس منظر میں، تہران شدید خباشتوں کی زد میں تھا، اصراف کے بھونڈے مظاہروں کی وجہ سے امیر اور غریب کا فرق نمایاں ہو رہا تھا۔ غیر ملکی مفادات کو، جن میں امریکہ سب سے آگے تھا، بے لگام آزادی حاصل تھی (تہران میں ایک جرمن مینجر کو اپنے ملک میں حاصل شدہ تنخواہ کا ایک تہائی زیادہ ملتا تھا جبکہ اسی کمپنی کے مقامی ملازمین کو جرمن کاریگروں کے مقابلے میں1/10اجرت ملتی تھی) شہری متوسط طبقے افلاس کے سمندر میں چھوٹے چھوٹے جزیروں کی طرح نظر آتے تھے، تیل کے علاوہ ملکی پیداوار کا2/3حصہ تہران کے باشندوں (کل ملکی آبادی کا دسواں حصہ) کے مصرف میں تھا، دیہی علاقوں کی اجرتیں شہر کے مقابلے میں پانچواں حصہ تھیں۔ ایرانیوں کی اکثریت غربت کی زندگی گزارنے پر مجبور تھی۔

مغربی تعلیم و تربیت سے بہرہ ور، ایرانی کروڑ پتی، فوجی جرنیل اور کرائے کے ماہرین تہران میں حکومت کو دوسری لہر کی حکمت عملی کے مطابق چلا رہے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ ترقی دراصل ایک معاشی عمل ہے۔ مذہب، ثقافت، خاندان، جنسی کردار، باہمی دوستی، ملک میں ڈالر کی فراوانی کے ساتھ خود بخود آ جائے گی۔ ثقافتی تشخص کی کوئی خاص اہمیت نہ تھی، کیونکہ صنعت کے مفروضوں کے مطابق دنیا کی متنوع او رنگا رنگ افرائش کی بجائے اسے ایک معیاری اکائی کی حیثیت میں دیکھا جانا تھا۔ کابینہ کے 90% اراکین۔۔۔۔ ہارورڈ، برکلے اور یورپی یونیورسٹیوں سے فارغ التحصیل ۔۔۔۔مغرب پر تنقید عمل کو دقیانوسی اور جہالت قرار دیتے تھے۔

تیل اور اسلام کی باہمی خصوصیات کو چھوڑ کر یہی حالات دوسری لہر کی حکمت عملی پر عمل پیرا دوسرے ایشیائی، افریقی اور لاطینی امریکہ کے ممالک میں بھی پائے جاتے تھے۔

شہنشاہ کا تختہ الٹنے کے بعد، منیلا سے میکسیکو سٹی تک، ترقی کی رفتار زیر بحث ہے۔ کیا ایران میں ترقی کی رفتار بہت تیز تھی؟ کیا ایرانی اپنے مستقبل کے بارے میں فکر مند تھے، کیا تیل کی کمائی سے کسی ملک میں کم سے کم وقت میں ایسا متوسط طبقہ مولویانہ نظام کے تسلط سے دوسری لہر کی حکمت عملی کے متعلق شکوک وشبہات پیدا ہونا قدرتی امر ہے۔

کیا کلاسیکی صنعت سازی ہی ترقی کا واحد راستہ ہے؟ کیا صنعتی تہذیب کے اختتام پر، اسے ترقی کا ماڈل بنانا کسی کے لیے بھی قابل قبول ہوگا؟

کامیابی کا شکستہ نمونہ

جب تک دوسری لہر کی اقوام ''کامیاب''۔۔۔۔مستحکم، امیر اور زیادہ امیر۔۔۔۔ رہیں، باقی دنیا کے لئے انہیں ترقی کے نمونے کے طور پر دیکھنا ایک فطری امر تھا لیکن 1960ء کے عشرے کے آخر تک صنعت سازی کا عمومی بحران شروع ہو گیا تھا۔ ہڑتالیں، بلیک آؤٹ، تالہ بندی، جرم اور نفسیاتی دباؤ دوسری لہر کی پوری دنیا میں جاری وساری تھے۔ رسالے شہ سرخیاں لگانے لگے۔ ''چیزیں کام کرنا کیوں چھوڑ رہی ہیں۔'' توانائی اور خاندانی نظام لرز کر رہ گئے۔ اقدار اور شہری زندگی کے ڈھانچے بکھرنے لگے۔ آلودگی، کرپشن، افراط زر، بیگانگی، تنہائی، نسل پرستی، بیوروکریسی، طلاق، بے جا اسراف، غرض ہر شے تنقید کی زد میں آ گئی۔ ماہرین معاشیات مالیاتی نظام کی مکمل تباہی کی پیش گوئی کرنے لگے۔

عالمی ماحولیاتی تحریک اسی خطرے سے آگاہ کر رہی تھی کہ آلودگی اور توانائی کے محدود وسائل جلد ہی دوسری لہر کے ملکوں کی عمومی سرگرمیوں کو ناممکن العمل بنا دیں گے۔ مزید براں اگر دوسری لہر حکمت عملی غریب ممالک کو ترقی یافتہ بنانے میں کامیاب ہو بھی گئی تو ساری دنیا ایک عظیم الشان فیکٹری میں تبدیل ہو کر ارضی ماحول کو تباہ و برباد کر دے گی۔

شدید صنعتی بحران کی وجہ سے امیر ترین ممالک میں یاسیت کے بادل چھا گئے۔ لاکھوں باشندے اپنے آپ سے یہ سوال کرنے لگے کہ دوسری لہر کی آخری سانسیں لیتی تہذیب کی پیروی کرنا کیا ضروری ہے؟

ایک اور واقعے نے دوسری لہر کی حکمت عملی کے دولت کے حصول کا واحد طریقہ ہونے پر شبہات کو جنم دیا۔ اس حکمت عملی کا بنیادی مفروضہ یہ تھا کہ پہلے ترقی کریں پھر

خوشحال بنیں۔ یعنی خوشحالی سخت محنت، بچت، مذہبی اخلاقیات اور دور رس معیشتی اور معاشی تغیرات کے نتیجے میں ملتی ہے۔ تاہم اوپیک کی تیل کی برآمد پر پابندی اور مشرق وسطی میں ڈالر کی بارش کے ہاتھوں یہ مفروضہ غلط ہو گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایران سعودی عرب، کویت، لیبیا اور دوسرے عرب ممالک میں ڈالر کی موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ ان ممالک میں معاشی تغیر سے پہلے ہی دولت کے بے شمار ڈھیر لگ گئے۔ مشرق وسطی میں دولت پہلے آئی اور ترقی کا عمل بعد میں شروع ہوا۔ اس سے پہلے کبھی اتنے بڑے پیمانے پر ایسا کوئی عمل واقع نہیں ہوا تھا۔

ادھر امیر ممالک کی باہمی مسابقت میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ نیویارک ٹائمز کے ٹوکیو کے نمائندے نے رپورٹ دی۔ جنوبی کوریا کا فولاد کیلی فورنیا کے تعمیراتی منصوبوں میں استعمال ہو رہا ہے۔ تائیوان کے ٹی وی یورپ میں بک رہے ہیں۔ بھارتی ٹریکٹر مشرق وسطی میں چل رہے ہیں۔ چین کے عظیم صنعتی طاقت بن کر ابھرنے سے جاپان امریکہ اور یورپ کو یہ فکر لاحق ہو گئی کہ کہیں ترقی پذیر ممالک ان کی صنعتوں سے بین الاقوامی منڈی کا حصہ نہ چھین لیں۔

فرانسیسی فولاد سازی کے ہڑتالی کارکن توقع کے عین مطابق بڑے خوبصورت انداز میں کہتے ہیں۔ صنعت کا قتل عام ختم کیا جائے۔ بعد ازاں انہوں نے ایفل ٹاور پر قبضہ کر لیا۔ صنعتی ممالک میں یکے بعد دیگرے دوسری لہر کی صنعتوں نے اپنے سیاسی حلیفوں کے ساتھ مل کر روزگار کی برآمد پر پابندی اور غریب ممالک میں صنعت سازی کی توسیع کی پالیسی کے خلاف انتہائی جارحانہ رویہ اختیار کیا۔ قصہ مختصر ہر سمت یہ شبہ سرایت کر گیا کہ آیا دوسری لہر کی حکمت عملی قابل عمل تھی بھی یا نہیں۔

پہلی لہر کی حکمت عملی

دوسری لہر کی حکمت علمی کی ناکامی، عالمی معاشی نظام کی مکمل اور ہالنگ کے لئے پسماندہ ممالک کے غصیلے مطالبات اور خود اپنے مستقبل کے بارے میں فکر مندی اور تشویش کا سامنا کرتے ہوئے امیر ممالک نے 1970ء کے عشرے میں غریب ممالک کے لئے ایک نئی حکمت عملی وضع کرنا شروع کی۔

کئی حکومتوں اور تقریاتی اداروں بشمول عالمی، بینک بین الاقوامی ترقیاتی ادارہ اور سمندر پار ترقیاتی کونسل نے اچانک ہی پہلی لہر سے مماثل حکمت عملی اپنا ڈالی۔ یہ فارمولا دوسری لہر کے مفروضوں کے برعکس تھا۔ کسان کی زندگی اجیرن کر کے اسے شہر کی جانب منتقل کرنے کی بجائے اب دیہی ترقی کو اہمیت دی جانے لگی۔ برآمدات میں اضافہ کے لئے نقد آور فصلوں پر زور دینے کی جائے غذائی خود کفالت کا درس دیا جانے لگا۔ قومی آمدنی کی شرح میں اندھا دھند اضافہ (تاکہ اس کے فوائد غریبوں تک منتقل ہو سکیں) کی بجائے اب یہ سبق دیا جانے لگا کہ وسائل براہ راست انسانی حاجات کی تکمیل میں استعمال کئے جائیں۔

محنت بچاؤ ٹیکنالوجی کے فروغ کے بجائے اس نئی اپروچ میں کم سرمایہ کم توانائی اور فنی مہارت پر مبنی پیداوار۔۔۔۔ مگر شدید محنت کے ساتھ۔۔۔۔ شامل تھی۔ عظیم الشان فولاد ساز ملیں قائم کرنے کے بجائے گاؤں کی سطح پر چھوٹے پیمانے کی صنعتیں لگانے کی تلقین کی جانے لگی۔

پہلی لہر کی ٹیکنالوجی کے حامیوں نے دلائل سے یہ ثابت کر دیا کہ غریب ممالک کو منتقل کی گئی ٹیکنالوجی تباہی کا شکار ہو چکی تھی۔ مشینوں کی ٹوٹ پھوٹ کی مرمت کا کوئی خاطر خواہ انتظام نہیں تھا۔ ان مشینوں کو چلانے کے لئے قیمتی درآمدی خام مال ضروری تھا۔ ہنرمند کاریگروں کا ملنا محال تھا۔ لہذا اب موزوں ٹیکنالوجی کی ضرورت پر زور دیا جانے لگا۔ امریکہ اور یورپ میں نئی ٹیکنالوجی کی تشکیل کے لئے کئی مراکز قائم کر دیئے گئے۔ ترقی پذیر ممالکوں نے بھی اپنے ہاں۔۔۔۔ کم درجے کی ٹیکنالوجی کی ایجادات کے لئے۔۔۔۔ ایسے ہی مراکز قائم کر لئے۔ مثلاً بوسٹوانا میں خچر یا بیل سے چلنے والا ایسا آلہ بنا لیا گیا جس سے کھیت میں کاشت بوائی کھاد اور بیج ڈالنا نسبتاً آسان تھا۔ گیمبیا کے زرعی محکمے نے سینیگال میں ڈیزائن کیا گیا ایک ایسا آلہ اپنا لیا جس سے کاشت کے علاوہ مونگ پھلی کی کھدائی بھی ممکن تھی۔ گھانا پیڈل کے ذریعے منجی سے چاول نکالنے والا آلہ اور کیلے کے چھلکے سے پانی نچوڑنے والی لکڑی کی مکمل مشین پر ابھی کام جاری ہے۔

پہلی لہر کی حکمت عملی کا وسیع پیمانے پر استعمال ہونے لگا۔ بھارت میں نہرو اور اندرا گاندھی کی دوسری لہر کی حکمت عملی کی ناکامی اور تیل اور کھاد کی قیمتوں میں بے پناہ

اضافے کے بعد، مکینکل ٹیکسٹائل صنعت کی توسیع پر پابندی عائد کر دی گئی اور دستی کھڈیوں پر کپڑا بنانے کی حوصلہ افزائی کی جانے لگی۔ مقصد صرف روزگار کے مواقع میں اضافہ کرنا ہی نہیں تھا بلکہ دستکاری کے فروغ کے ذریعے شہروں کی سمت آبادی کے بہاؤ کو روکنا بھی مقصود تھا۔

اس فارمولے میں بلاشبہ زبردست حکمت پنہاں ہے اس طرح نہ صرف شہری آبادی کے بوجھ میں اضافہ پر قابو پایا جا سکتا ہے بلکہ گاؤں کی طرز زندگی ـــــ جہاں عالمی آبادی کی اکثریت آباد ہے ـــــ کو بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ گاؤں میں ماحولیاتی ضروریات کا خیال رکھا جاتا ہے۔ مہنگے درآمدی خام مال کے بجائے مقامی دستیاب وسائل کا استعمال بڑھایا جاتا ہے۔ اس طرح عمدہ کارکردگی کے تنگ پیمانوں کو چیلنج بھی کیا جاتا ہے۔ ترقی کے اس نظریئے میں محض ٹیکنالوجی پر انحصار کی بجائے مقامی رسوم و رواج اور ثقافت کو بھی اہمیت دی جاتی ہے۔ دولت مندوں کے ہاتھ میں سرمایہ دے کر یہ توقع کرنا کہ ان کی محنت سے پیدا شدہ آمدنی کا کچھ حصہ زیریں جانب بہہ نکلے گا، عملاً ممکن ہی نہیں اس کے بجائے براہ راست غریبوں کی حالت بہتر بنانے پر زور دیا جاتا ہے۔

یہ واضح فرق اپنی جگہ مگر یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اس فارمولے کے ذریعے پہلی لہر کے بعض حالات میں بہتری تو لائی جا سکتی ہے مگر انہیں بدلا نہیں جا سکتا۔ یہ عارض مداوا تو ہو سکتا ہے، دائمی علاج ہرگز نہیں۔ دنیا کے اکثر ممالک کی حکومتوں نے یہ حقیقت بہر حال پہلے ہی سمجھ لی تھی۔ انڈونیشیا کے صدر سوہارتو کو شک تھا کہ یہ حکمت عملی ایک نئی سامراجی چال بھی ہو سکتی ہے۔ اس طرح مغرب ہمارے ہاں کچھ چھوٹے پیمانے کے دیہی منصوبے تو ضرور مکمل کر دے گا مگر ہم ترقی شاید کبھی نہ کر سکیں۔

محنت پر مبنی ایسی ترقی کی ترویج میں امیر ممالک کا اپنا مفاد بھی پوشیدہ تھا۔ پہلی لہر کے حالات میں غریب ملک جتنا وقت بھی گزاریں گے، ان کی مصنوعات صنعتی ممالک کی پیداوار کا مقابلہ نہیں کر سکیں گی۔ کھیتوں میں مصروف رہنے کی وجہ سے وہ تیل گیس اور دوسرے محدود وسائل کم مقدار میں استعمال کریں گے اور سیاسی طور پر کمزور رہیں گے تو دنیا کے لئے کم مسائل پیدا کریں گے۔ پہلی لہر کی اس حکمت عملی میں ایک پدرانہ مفروضہ بھی

MashalBooks.org

پوشیدہ ہے کہ پیداوار ے ضروری نہیں۔۔۔۔تھکا دینے اور کمر توڑ ڈالنے والا کاشت کاری یا چاول کی چھنائی کا کام بہت اچھا ہے، بشرطیکہ اسے کرکوئی اور رہا ہے۔ افریقہ کی معاشی ترقی اور منصوبہ ندی کے ادارے کا ڈائریکٹر سمیر امین کہتا ہے محنت پر مبنی ان طریقوں کی یک لخت مقبولیت کی وجہ ہی تصورات سنہری، دور اور شریفانہ وحشت کی دیومالائی کہانی کی جانب واپسی اور سرمایہ دارانہ دنیا کی حقیقت پر تنقید کا مرکب ہے۔ مزید براں پہلی لہر کا فارمولا سائنس اور ٹیکنالوجی کے کردار کی اہمیت خطرناک حد تک کم کر دیتا ہے۔ آج موزوں قرار دی جانے والی بہت سی ٹیکنالوجی امریکی کسانوں کے پاس 1776ء میں موجود ٹیکنالوجی سے بھی کہیں زیادہ قدیم ہیں۔ یہ درانتی کو ہارو سیٹر سے بہتر آلہ سمجھتی ہے۔ ڈیڑھ سو سال پہلے جب امریکی اور یورپی کاشت کار موزوں ٹیکنالوجی کا استعمال کرنے لگے اور لکڑی کے بجائے فولادی پٹری اور ہل بنوانے لگے تو انجینئرنگ اور میٹالرجی کا مجموعی علم ان کی نظروں میں تھا۔ انہوں نے اسے نظر انداز نہیں کیا۔1855ء میں پیرس میں منعقد نمائش میں ایک نئی ایجاد۔۔۔کٹائی کی مختلف مشینیں۔۔۔۔بھی رکھی گئیں اور انہیں ڈرامائی انداز میں کام کرتے بھی دکھایا گیا۔ ان مختلف مشینوں کی فی گھنٹہ رفتار کار کچھ اس طرح تھی۔

تھریشرز بمعہ دستی غلہ کوب۔۔۔۔گندم کے 36لیٹرز
بلجیم کی تھریشر مشین۔۔۔۔گندم کے 150لیٹرز
فرانسیسی تھریشنگ مشین۔۔۔۔گندم کے 250لیٹرز
برطانوی تھریشنگ مشین۔۔۔۔گندم کے 410لیٹرز
امریکی تھریشنگ مشین۔۔۔۔گندم کے 750لیٹرز

یہ تھریشر انسان کی نسبت 123 گنا زیادہ تیزی سے کٹائی کر سکتا تھا۔ ایسی مشین کی اہمیت کو وہ شخص ہی نظر انداز کر سکتا ہے جس نے کبھی محنت و مشقت دیکھی ہی نہ ہو۔

سائنس کی موجودہ ترقی امیر ممالک کے سائنس دانوں نے اپنے مسائل کے حل کے لئے نشوونما کی تھی۔ غریب ممالک کے مسائل کے حل پر تحقیق کے لئے کچھ کیا بھی گیا تو نہ ہونے کے برابر۔ ترقی کا ایسا لائحہ عمل، دنیا کے کروڑوں کسانوں کے ساتھ مذاق نہیں تو اور کیا ہے۔ بعض خاص حالات میں مخصوص جگہوں پر پہلی لہر کی حکمت عملی سے بہت سے

لوگوں کی زندگیا بہتر بنائی جاسکتی ہیں لیکن قبل از ٹیکنالوجی پالیسی کے ذریعے کوئی بھی ملک اپنی پیداوار میں اس قدر اضافہ نہیں کرسکتا کہ اس سے پیدا شدہ بچت کو تبدیلی کے لئے استعمال کر سکے۔ موجودہ دستیاب حقائق تو برعکس صورت حال پیش کرتے یں۔

ماؤزے تنگ کے چین نے انتہائی بہادرانہ جدوجہد سے پہلی لہر کی حکمت عملی اپنا کر قحط کی صورت حال کو قابو کر لیا تھا لیکن 1960ء کے عشرے کے دوران دیہی ترقی کا یہ نظریہ بے کار ہو چکا تھا۔ چین ممکنہ حد تک ترقی کر چکا تھا۔ پہلی لہر کا یہ فارمولا بھی دراصل ٹھہراؤ کا نسخہ ہے اور دوسری لہر کی حکمت عملی کی طرح اس کا اطلاق (طویل عرصے کے لئے) غریب ممالک کے لئے قطعی غیر مفید ہے۔ تیز رفتار تنوع کے ہاتھوں بگڑتی دنیا میں ہمیں بہت سی حکمت عملیاں ترتیب دینا ہوں گی اور اس مقصد کے لئے ہمیں موجودہ صنعتی دور یا قبل از صنعتی دور میں ماڈل تلاش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اب تو صرف نمودار ہوتے ہوئے سورج کی جانب دیکھنا چاہئے۔

تیسری لہر کا استفہام

کیا ہم انہی دونوں فرسودہ نظریات سے چمٹے رہیں گے۔ میں نے ان متبادل حکمت عملیوں میں فرق کی تشریح کے لئے غالباً مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے۔ عملی زندگی میں حکومتوں کے لئے مجرد تصورات پر عمل پیرا ہونا ممکن نہیں ہوتا وہ ان تصورات کو مناسب طریقے سے ملا کر اپنا لائحہ عمل طے کرتی ہیں۔ تیسری لہر کے ظہور کی بدولت ہمیں ان دونوں نظریات سے آگے جانے کا موقع مل گیا ہے۔ صنعتی دنیا کی وضع کردہ کوئی بھی حکمت عملی ترقی پذیر ممالک کے مسائل حل نہیں کرسکتی اور یہاں ترقی کا کوئی بھی موجود ماڈل سو فیصد قابل عمل نہیں لیکن غیر محسوس انداز میں پہلی لہر کے معاشروں اور ظہور پذیر تیسری لہر کی تہذیب کے مابین ایک عجیب سا رشتہ وجود میں آرہا ہے۔

بارہا ایسا ہوا ہے کہ پہلی لہر کے سماج کی ترقی کے لئے، اس پر دوسری لہر کے بے ربط اور فضول ڈھانچے مسلط کئے گئے۔ مثلاً تھوک پیداوار، ذرائع ابلاغ، فیکٹری کے انداز تعلیم، برطانوی پارلیمانی طرز حکومت اور قومی ریاست وغیرہ۔ ان تجربات کے لئے یہ حقیقتیں تک فراموش کر دی گئیں کہ ان اداروں کو چلانے کے لئے نہ صرف روایتی گھرانے

اور شادی کے رواج، مذہب اور کرداری ڈھانچوں کا تیاپانچہ کرنا ہو گا۔ بلکہ موجودہ ثقافت کو جڑ سے ہی اکھاڑ پھینکنا ہو گا۔

یہ حیرت انگیز اتفاق ہے کہ پہلی لہر کے سماج میں پائی جانے والی بہت سی خصوصیات تیسری لہر کی تہذب میں بھی منعکس ہو رہی ہیں۔ مثلاً پیداواری مرکزیت، توانائی کے قابل احیا ذرائع کا استعمال، شہری رجحان کی کمی، گھر میں ہی کام کے مواقع، صانفانہ پیداواریت کا رواج وغیرہ۔ لہٰذا تیسری لہر کے ظہور پذیر معاشروں میں دیہاتی ماضی کا جادو اب بھی چل رہا ہے پہلی اور تیسری لہر کی ثقافتوں کی باہمی مماثلت خاصی حیرت انگیز ہے۔ دوسری لہر کی تہذیب ان سے قطعی مختلف تھی۔ الغرض دونوں تہذیبیں متماثل ہیں۔

ماضی میں تو خیر یہ ممکن نہیں تھا لیکن پہلی لہر کے معاشروں کے لئے اب یہ ممکن ہو گا کہ وہ دوسری لہر سے گزرے بغیر براہ راست تیسری لہر کی کچھ خصوصیات حاصل کر لیں؟ کیا بعض ممالک روایتی صنعتی ترقی کے بغیر تیسری لہر کی خصوصیات آسانی سے اپنا سکیں گے؟ کیا موجودہ معاشرہ، تبادلے کی پیداوار پر شدید ارتکاز کئے بغیر، اعلیٰ مادی معیار زندگی حاصل کر سکے گا؟

تیسری لہر کی آمد انسانی عمل کے لئے نت نئی راہیں کھول رہی ہے۔ کیا کوئی قوم اپنی اقدار اور عقیدہ چھوڑے بنا اور مغربی مادیت جو دوسری لہر کے تہذیب کے پھیلاؤ کی بنیاد تھی، اپنائے بغیر بچوں کی اموات میں کمی، طوالت حیات، خواندگی، غذائیت اور زندگی کے عمومی معیار کے مسائل حل کر سکتی ہے۔ آئندہ ترقی کی حکمت عملی واشنگٹن ماسکو پیرس اور جنیوا کے بجائے افریقہ ایشیاء اور لاطینی امریکہ میں طے کی جائے گی، جو مقامی ضروریات سے خصوصی مطابقت رکھتی ہو گی۔ ایسی حکمت عملی میں ماحول ثقافت مذہب خاندانی ڈھانچوں اور زندگی کی نفسیاتی جہتوں پر معیشت کو فوقیت نہیں ہو گی، نہ ہی وہ پہلی دوسری یا کم از کم اس حد تک تیسری لہر کے خارجی نمونوں کی نقل کر رہے ہوں گے، بہر حال تیسری لہر کی آمد ہماری کوششوں کو ایک نئے تناظر میں ڈھال رہی ہے کیونکہ اس کے ذریعے دنیا کے امیر ممالک کے ساتھ ساتھ غریب ممالک کو بھی بے پناہ نئے مواقع حاصل ہوں گے۔

سورج، جھینگے اور چپس

پہلی اور دوسری لہر کی حیرت انگیز مماثلت سے یہ امکان پیدا ہوتا ہے کہ غربی عشروں میں ماضی اور مستقبل کے عناصر کو ملا کر ایک نئی اور بہتر صورت حال تشکیل دی جا سکتی ہے۔ توانائی کا مسئلہ ہی لے لیجئے۔ تیسری لہر کی جانب پیش قدمی کرتے ترقی یافتہ ممالک میں توانائی کے بحران کی باتیں تو ہوتی ہیں لیکن پہلی لہر میں موجود ممالک کے اپنے توانائی کے بحران کا ذکر نہیں ہوتا۔ توانائی کی کمزور بنیاد کی موجودگی میں یہ ممالک اپنی ضروریات کے لئے کس قسم کا نظام توانائی قائم کر سکتے ہیں؟ یقیناً انہیں دوسری لہر کے معدنی ایندھن سے چلنے والے بڑے بڑے مرکزی بجلی گھر چاہئیں لیکن ایک بھارتی سائنس دان ایمولیا کمار این ریڈی کے مطابق ان میں سے اکثر معاشروں کو شہروں میں وسیع و عریض مرتکز رسد کے بجائے دیہی علاقوں میں غیر مرتکز توانائی کی اشد ضرورت ہے۔ ایک بھارتی مزارع کا گھرانا کھانا پکانے کی خاطر لکڑی کا ایندھن تلاش کرنے میں روزانہ چھ گھنٹے صرف کرتا ہے۔ کنوئیں سے پانی لانے کے لئے انہیں مزید چار سے چھ گھنٹے کا وقت چاہے۔ بھیڑ بکریاں چرانے میں بھی اتنا ہی وقت لگتا ہے۔ اپنی غربت کی وجہ سے وہ کوئی کام کرنے والا نہیں رکھ سکتے اور نہ ہی کوئی مشین خرید سکتے ہیں۔ چنانچہ ایندھن کی ضروریات پوری کرنے کے لئے اس خاندان کو منطقی طور پر کم از کم تین بچوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس بھارتی سائنس دان کے مطابق دیہی علاقوں میں توانائی کی موجودگی، ایک بہتر مانع حمل کا کام دے سکتی ہے۔

دیہی توانائی کی ضروریات پر ریڈی کی تحقیق کے مطابق چھوٹ پیمانے کا ایک بائیو گیس یونٹ پورے گاؤں کی توانائی مہیا کر سکتا ہے۔ لہٰذا ایسے چھوٹے چھوٹے ہزاروں یونٹوں کا سلسلہ ماحول اور معاشی اعتبار سے چند عظیم الشان اور مرتکز بجلی گھروں سے کہیں بہتر رہے گا۔ اسی لئے بنگلہ دیش سے لے کر جزائر فجی تک بائیو گیس کے ایسے استعمال پر تحقیقی اور عملی کام کیا جا رہا ہے۔ بھارت میں فی الوقت ایسے 12000 یونٹ ہیں اور حکومت ان کی تعداد میں ایک لاکھ تک بڑھانا چاہتی ہے۔ چین کے صوبے زی چوان میں دو لاکھ گھریلو یونٹوں کی تنصیب کا کام جاری ہے۔ کوریا میں 29450 ایسے ہی بائیو گیس یونٹ ہیں جو 1985ء تک بڑھ کر 55000 ہو جائیں گے۔ نئی دلی کے نواحی باشندے جگدیش

MashalBooks.org

کپور۔۔۔مستقبلیات کے معروف رائٹر اور کاروباری شخصیت۔۔۔ نے دس ایکٹر بنجر رقبے پر بایوگیس کی مدد سے ایک شاندار شمسی فارم بنا ڈالا ہے جہاں اتنی زیادہ تعداد میں اناج پھل اور سبزیاں اگائے جاتے ہیں کہ ان کے سارے خاندان اور کارکنوں کی ضروریات پوری کرنے کے بعد بھی فالتو پیداوار مارکیٹ میں بھیجنا پڑتی ہے۔

انڈین ٹیکنالوجی انسٹی ٹیوٹ نے گھریلو استعمال کے لئے دس کلوواٹ کا ایسا شمسی پلانٹ بنایا ہے جو گھروں کے لئے روشنی واٹر پمپ چلانے کے لئے توانائی اور ایک دو ٹی وی اور ریڈیو سیٹوں کے لئے بجلی مہیا کرسکتا ہے۔ تامل ناڈو کے شہر مدراس میں شمسی توانائی سے چلنے والا پانی کا کھارا پن دور کرنے والا پلانٹ لگایا گیا ہے۔ نئ دہلی میں مرکزی برقیات نے ایک ایسا مشاہداتی گھر قائم کیا ہے جس کی ضروریات فوٹو وولٹائی سیلوں سے پیدا شدہ بجلی سے پوری کی جاتی ہیں۔ سالماتی حیاتیات کے اسرائیلی ماہر ہائیم ابیب نے مصر اور اسرائیل کے لئے ایک مشترکہ منصوبہ پیش کیا ہے جس کے ذریعے مصرف پانی اور آب پاشی کی اسرائیلی ٹیکنالوجی کے استعمال سے صحرائے میں(Cassara)اور گنے کی فصلوں کی افزائش ممکن ہوسکتی ہے۔ ایسی فصل کے کچھ حصہ سے گاڑیاں چلانے کے لئے ایتھائیل الکوحل بنایا جا سکتا ہے۔ گنے کی ضمنی پیداوار پر دنبو اور بکروں کی پرورش اور کاغذ کی صنعت قائم ہو سکے گی۔ اس طرح تمام ماحولیاتی عناصر کے مابین ربط کا تحفظ ممکن ہو گا۔ ہائیم ابیب کے مطابق اسی طرح کے کئ منصوبے، جنوب مشرقی ایشیاء اور لاطینی امریکہ کے مختلف علاقوں میں مکمل کئے جا سکتے ہیں۔

دراصل توانائی کا بحران دوسری لہر کی تہذیب کے پاؤں اکھڑ جانے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ غریب مملکوں میں اس کے حل کے لئے مرتکز اور غیر مرتکز چھوٹے یا بڑے پیمانے پر توانای کے پیداواری مراکز قائم کرنے کی تجاویز ہمارے سامنے آ رہی ہیں پہلی اور جنم لیتی تیسری لہر کے معاشروں میں کئ مسائل مشترک ہیں ان دونوں لہروں کے لئے دوسری لہر کے وضع کردہ نظام توانائی ناکام ہورہے ہیں۔

اب ایک نظر زراعت کے شعبے کی طرف، یہاں بھی تیسری لہر ہمیں نت نئ جہتیں دکھا رہی ہے۔ امریکی ریاست ایرزونا کے شہر ٹکسن میں قائم ماحولیاتی تحقیق کی تجربہ گاہ میں،

سبز خانوں میں موجود آبی حوضوں میں جھینگوں کی پرورش کے ساتھ ساتھ کھیرے اور سلاد بھی اگائے جا رہے ہیں۔جھینگوں کے حوض کا پانی سبزیوں کی آبیاری کے لئے استعمال ہوتا ہے ریاست ورماؤنٹ میں اس طرح گربہ ماہی ٹاؤٹ مچھلی اور سبزیاں حاصل کی جا رہی ہیں۔ مچھلی کے تالاب دن میں شمسی حرارت اکٹھی کر کے رات کے وقت اسے خارج کرتے ہیں تاکہ درجہ حرارت موزوں حدود میں رہے۔حوض کے پانی کو سبزیوں کی افزائش میں استعمال کرلیا جاتا ہے۔

میسا چیوسٹس میں جدید الکیمی انسٹی ٹیوٹ میں مچھلی کے ان تالابوں کے اوپر مرغبانی بھی ہو رہی ہے مرغیوں کے فضلے سے پانی میں کائی جمتی ہے۔ جو مچھلیوں کی غذا بنتی ہے۔ غذائی پیداوار اور جدید عملیات کے ان گنت طریقوں میں سے یہ صرف تین مثالیں ہیں۔

کیلی فورنیا یونیورسٹی مرکز تحقیق برائے مستقبل کی ایک رپورٹ کے مطابق اگلے بیس سال میں غذا کی فراہمی کے متعلق متعدد ممکنہ کامیابیاں ایسی حاصل ہوں گی جن کے ذریعے مصنوعی کھاد کا استعمال کم ہو جائے گا۔ علاوہ ازیں 1996ء تک کھاد کی اسی قسمیں پیدا ہو چکی ہوں گی جو شورینی کھاد کے استعمال کو 15% کم کر دیں گی۔ عین ممکن ہے کہ شورینی بیج کی دستیابی اس کیمیائی کھاد کی مانگ کو مزید کم کر دے۔ اس رپورٹ میں بیج کی مختلف اقسام کی دریافت کے متعلق پیش گوئی کی گئی ہے جن کے ذریعے نہ صرف فی ایکٹر پیداوار میں اضافہ ہوگا بلکہ ابتداء میں ہی فصل کی پیداوار کا صحیح اندازہ لگانا بھی ممکن ہوگا۔

مزید برآں کم پانی کے ذریعے، چارے کی فصل بنجر زمینوں پر اگانے سے، مویشی پالنے کی استعداد دگنی ہو جائے گی۔ غذائیت بخش مرکبات کی ایجاد سے بیج کے ساتھ ساتھ دوسری فصلوں میں بھی 30% اضافہ ہو گا۔ فصلی کیڑوں کے خاتمے کے بہتر طریقوں کی دریافت فصل میں ضیاع کا تناسب بہت کم کر دیگی آبپاشی کے سستے ذرائع معلوم ہوں گے اور ٹسیٹی مکھی پر قابو پانے سے وسیع رقبے پر مویشیوں کا پالنا آسان ہو جائے گا۔ ذرا وسیع تناظر میں دیکھا جائے تو زراعت کا بیشتر حصہ توانائی کے کھیتوں میں بدل جائے گا۔ جہاں صرف توانائی پیدا کرنے والی فصلیں کاشت ہوں گی۔ موسمی تبدیلیوں، کمپیوٹر، سیارچوں اور جنسیات کے باہمی ملاپ سے غذائی فراہمی میں انقلابی تبدیلیاں رونما ہوسکتی ہیں۔ گو یہ

امکانات بھوکے کسان کا پیٹ نہیں بھر سکتے تاہم پہلی لہر کی حکومتوں کو اپنی طویل منصوبہ بندی میں اس استعداد کو ملحوظ رکھنا چاہئے اور پھاوڑے اور کمپیوٹر کا باہمی ارتباط تلاش کرنا چاہئے۔

تیسری لہر کی ٹیکنالوجی اپنے دامن میں انسان کے لئے نت نئے امکانات لئے آ رہی ہے۔ حال ہی میں شائع شدہ ایک کتاب بنیادی انسانی ضروریات یہ مفروضہ پیش کرتی ہے کہ حیاتیاتی ٹیکنالوجی کی ترقی پہلی لہر کے معاشروں میں انتہائی دور رس تبدیلیاں لاسکتی ہے۔ سمندری کاشت سے لے کر کیڑوں مکوڑوں کا پیداواری استعمال سیلولوسی فضلات پر جرثوماتی عمل کے ذریعے گوشت کی افزائش اور یوفوربیا جیسے پودوں سے غیر گندھکی ایندھن کا حصول، سبز دواؤں۔۔۔۔ نئے نباتاتی وسائل سے دوا کی تیاری، یہ تمام عمل پہلی لہر کے ملکوں کے لئے بہت فائدہ مند ثابت ہو سکتے ہیں۔

علاوہ ازیں دوسرے شعبوں یں پیدا شدہ ترقی سے معاشی ترقی کے متعلق روایتی سوچ کی صحت پر شک سا ہوتا ہے۔ پہلی لہر کے کئی معاشرے ایسے ہی ایک مسئلے۔۔۔۔ بے روز گاری اور کم روزگاری۔۔۔۔ سے دو چار ہیں۔ اس مسئلے پر پہلی اور دوسری لہر کے حامیوں کے مابین زبردست بحث و مباحثہ ہو رہا ہے۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ تھوک پیداواریت میں محنت زیادہ استعمال نہیں ہوتی لہٰذا ترقی کی کسی بھی حکمت عملی میں چھوٹے پیمانے پر اور کم ٹیکنالوجی کی حامل فیکٹریوں پر زیادہ زور دیا جانا چاہئے تاکہ زیادہ روز گار کے مواقع پیدا ہوں اس طرح سرمایہ اور توانائی کا اصراف کم ہوگا۔ دوسرا گروہ ایسی صنعتوں کے قام کا حامی ہے جو صنعتی طور پر ترقی یافتہ ممالک سے منگوائی جا رہی ہے مثلاً فولاد، موٹر کار، جوتے، کپڑے وغیرہ۔

تاہم افراتفری میں دوسری لہر کی سٹیل مل قائم کرنا ایسے ہی ہے جیسے تانگہ چلانے والے چھینٹ کے کپڑے کی فیکٹری لگا لیں اور اپنی توجہ مرتکز کرنی چاہئے۔ سٹیل مل لگانے کی دماغی اور دیگر قومی وجوہات تو ہو سکتی ہیں لیکن مادی سائنس کی ترقی نے ایلومینیم سے کہیں ہلکی مگر فولاد سے زیادہ مضبوط اور سخت مادی اشیاء بنا ڈالی ہیں۔ ایسی ایجادات کی موجودگی میں ظاہر ہے، فولاد کی طلب کم ہو جائے گی۔ پھر اس کی پیداوار میں اضافہ کس منطق کے تحت کیا جائے؟ ایک بھارتی سائنس دان کے کہنے کے مطابق ایسی ترقی سے فولاد اور ایلومینیم کی

MashalBooks.org

پیداوار میں خطی توسیع بے معنی ہو کر رہ جائے گی۔ فولاد کے کارخانے قائم کرنے کے لئے قرضوں یا سرمایہ کاری کی تلاش کے بجائے پسماندہ ممالک کو مستقبل کے مادی دور کی تیاری کرنی چاہیئے۔ سویڈن کے ایک ماہر مور ہاؤس کے مطابق غریب ممالک کو مختصر الیکٹرانکس پر اپنی توجہ مرتکز کرنی چاہیے کیونکہ محنت پر مبنی صنعت کے لئے طویل پیداواری مدت چاہئے اور یہی طویل مدتی غریب ممالک کے لئے کٹھن ہو سکتی ہے۔ مور ہاؤس کی رائے میں کمپیوٹر چپس کی صنعت میں کارکردگی کا حیرت انگیز اضافہ کم سرمائے والے ممالک کے لئے اس صنعت میں ی یونٹ منافع میں اضافہ کریگا۔ مزید برآں ترقی پذیر ممالک سمال الیکٹرانکس کی بنیادی ٹیکنالوجی کو اپنے معاشی حالات اور موجود خام مال کے مطابق ڈھال سکتے ہیں۔ سمال الیکٹرانکس کی صنعت میں پیداوار با آسانی غیر مرتکز کی جا سکتی ہے۔ اس طرح شہری آبادی کے اضافہ کو بھی کنٹرول کیا جا سکے گا۔ اس صنعت میں توانائی کی زیادہ ضرورت نہیں ہوتی جب کہ الیکٹرانک اشیاء کی طلب اتنی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ (اور مقابل بھی سخت ہے) کہ ترقی یافتہ ممالک خواہش کے باوجود بھی اس میدان میں اجارہ داری قائم نہیں کر سکتے۔

سویڈن کے مور ہاؤس کے علاوہ اور بہت سے لوگ اس نظریئے کے حامی ہیں۔ امریکہ کی سٹین فورڈ یونیورسٹی کے ایک پروفیسر کا کہنا ہے کہ صنعتی دنیا کی صنعت سازی نے ساری پیداوار شہروں میں مجتمع کر لی اور اب ہم ان فیکٹریوں اور مزدوروں کو واپس دیہاتی علاقوں میں بھیج رہے ہیں لیکن چین سمیت کئی ممالک ایسے ہیں جو آبادی کو شہروں میں لائے بغیر ہی جدید صنعتی طریقے اپنا سکتے ہیں۔ اگر یہ کچھ صحیح ہے تو تیسری لہر غربت پر قابو پانے کے نئے راستے کھول رہی ہے۔

تیسری لہر اپنے ساتھ نقل وحمل اور مواصلات کے نت نئے زاویہ ہائے نظر لا رہی ہے۔ صنعتی انقلاب کے دوران معاشی اور سیاسی ترقی کے لئے سڑکیں لازمی تھیں اور آج ترقی کے لئے الیکٹرانک مواصلات کا ہونا بہت اہم ہے۔ ایک زمانے میں مواصلات کا نظام اقتصادی ترقی کے نیچے میں آتا تھا لیکن اب ٹیلی مواصلات ترقی کی بنیادی شرط ہے۔ مواصلات کی کم ہوتی ہوئی قیمتیں اس حقیقت کا اظہار ہیں وہ نقل وحمل کے بہت سے ذرائع کی جگہ خود لے رہی ہے۔ سڑکوں اور گلیوں پر قیمتی سرمایہ لگانے کے بجائے ترقی یافتہ

مواصلات کا جال بچھانا کہیں زیادہ منافع بخش ہو گا اور اس میں توانائی کا استعمال بھی کم ہو گا اور ایک طویل تناظر میں یہی زیادہ مناسب بھی رہے گا۔ سڑکوں کی ضرورت سے تو انکار ممکن نہیں مگر جس حد تک پیداوار کا ارتکاز کم ہو گا۔ نقل وحمل کے اخراجات میں اتنا ہی کمی واقع ہو سکے گی۔ اس طرح گاؤں کا گاؤں یا شہروں بلکہ باقی دنیا سے رابطہ ختم بھی نہیں ہو گا۔

پہلی لہر کے ممالک کے زیادہ تر رہنما مواصلات کی اہمیت اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ دنیا کے نئے الیکٹرانک سپیکٹرم پر ان کا اصرار اس کا ثبوت ہے۔ دوسری لہر کی طاقتوں نے ٹیلی مواصلات کی ایجاد کے ساتھ ہی اس پر اپنی اجارہ داری قائم کر لی تھی۔ امریکہ اور سوویت یونین دونوں مل کر شارٹ ویونشریاتی سپیکٹرم کا 25% خود استعمال کرتے ہیں۔ سپیکٹرم کے سب سے اعلیٰ حصوں پر ان کی اجارہ داری قائم ہے۔

سمندروں کی تہوں اور ارضی فضا کی طرح اس سپیکٹرم کو بھی چند لوگوں کے بجائے پوری انسانیت کے مشترکہ استعمال کے لئے دستیاب ہونا چاہئے۔ اسی لئے پہلی لہر کے ممالک اس میں اپنے جائزہ حصے کے طالب ہیں۔ چاہئے اس کے استعمال کے لئے ان کے پاس ضروری وسائل بھی نہ ہوں۔ (ان کا مفروضہ یہ ہے کہ وہ ضروری سامان کی غیر دستیابی کی صورت میں اپنا حصہ کرائے پر دے سکتے ہیں) امریکہ اور روس دونوں کی مخالفت کی وجہ سے وہ ایک نئے اطلاعاتی نظام کے خواہش مند ہیں۔ ان کا زیادہ پیچیدہ مسئلہ داخلی نوعیت کا ہے کہ وہ اپنے محدود وسائل کس طرح ٹرانسپورٹ اور ٹیلی مواصلات پر تقسیم کریں۔ یہی سوال ترقی یافتہ ممالک کے سامنے بھی ہے۔ فضائی مواصلات کے لئے سستے زمینی مراکز کی دستیابی، چھوٹی سطح پر آبپاشی کا کمپیوٹر سسٹم گاؤں اور دستکاری میں استعمال کے لئے ارزاں کمپیوٹر کی فراہمی سے پہلی لہر کے ممالک میں نقل وحمل کے بھاری ذرائع پر اخراجات میں بے پناہ کمی آ جائے گی۔ آج یہ سب کچھ خیالی پلاؤ کی طرح لگتا ہے مگر وہ وقت بھی آنے والا ہے، جب ایسی ٹیکنالوجی ہر کسی کی دسترس میں ہو گی۔

کچھ عرصہ قبل انڈونیشی صدر سوہارتو نے روایتی تلوار کے ذریعے ایک برقی بٹن دبا کر فضائی مواصلات کے نظام کا افتتاح کیا جس سے تمام انڈونیشی جزائر کے مابین رابطہ قائم ہو گیا، بالکل اسی طرح جیسے سو سال پہلے امریکہ کے مشرقی اور مغربی ساحل کے درمیان

شاہراہ کے ذریعے رابطہ قائم کیا گیا تھا۔ صدر سوہارتو نے ترقی کے متلاشی ممالک کے لئے تیسری لہر کی مہیا کردہ استعداد کا ایک مظاہرہ کیا ہے۔ توانائی، زراعت ٹیکنالوجی اور مواصلات میں ترقی کے ذریعے ایک گہری ترقی کی نشان دہی بھی ہو رہی ہے۔

ماضی اور مستقبل کا امتزاج، جدید ترین

معاشروں میں موعودہ تغیر کے لئے حکمت عملی اس طرح مرتب کی جاسکتی ہے کہ گاؤں میں کم سرمائے پر مبنی دیہی صنعتوں اور چند چنیدہ سرعت انگیز ٹیکنالوجی والی صنعتوں کو ترقی دی جائے اور مقامی معیشت کی درجہ بندی اس طرح کی جائے کہ دونوں قسم کی صنعتوں کو تحفظ اور رواج مل سکے۔ بھارتی ماہر مستقبلات جگدیش کپور کا کہنا ہے انسان کو دستیاب مقدم ترین ٹیکنالوجی اور گاندھی کی سرسبز چراگاہوں اور دیہی ریاست کے تصور کے مابین توازن قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ اس توازن کے لئے معاشرے کی مکمل تبدیلی درکار ہے، یعنی اس کے رموز اقدار نظام تعلیم توانائی کے وسائل کا بہاؤ سائنسی اور صنعتی تحقیق اور بے شمار دوسرے اداروں میں بنیادی تبدیلیاں پیدا کرنا ضروری ہوں گی۔ ایسے دور اندیش مفکروں، معاشی تجزیہ نگاروں اور سائنس دانوں کی ایک بڑی تعداد کو یقین ہے کہ ہم ایسی ہی تبدیلی سے گزر کر ایک انتہائی جدید تشکیل کی جانب رواں دواں ہیں جس کی بنیاد گاندھی کے طور طریقوں اور جدید سیارچوں کے ملاپ (ماضی اور مستقبل کا حسین امتزاج۔۔۔۔مترجم) پر ہو گی۔

حقیقی صانفین

اس انداز نظر میں زیادہ گہری سطح پر ایک اور تصور بھی کارفرما ہے اور وہ ہے لوگوں کا مارکیٹ کے ساتھ معاشی رشتہ۔ قطع نظر اس کے کہ وہ سرمایہ دارانہ مارکیٹ ہے یا سوشلسٹ، یہ تصور ہماری توجہ اس سوال پر مرتکز کرتا ہے کہ کسی شخص کے کل وقت اور محنت کا کتنا حصہ پیداوار کے لئے وقف ہونا چاہئے اور کتنا صانفیت کے لئے، یعنی مارکیٹ میں اجرتی کام اور اپنے لئے کام میں کیا تناسب ہونا چاہئے۔

پہلی لہر کے زیادہ تر معاشرے نظام زر کے تابع آچکے ہیں۔ مارکٹائز کئے جا چکے ہیں۔ ان حالات میں جب کہ غریب لوگ اپنی آمدنی سے نہ تو پیداوار تبادلہ حاصل کر سکتے

ہیں اور نہ ہی زندگی کی دوسری ضروریات بلکہ صانفیت ہی ضروریات اور آمدنی کا درمیانی خلا پورا کرتی ہے۔ تیسری لہر نئے سرے سے ان حالات پر نظر ڈالنے کی ہمت افزائی کرتی ہے۔ دنیا میں لاکھوں لوگ اس وقت بے روزگار ہیں۔ لیکن کیا یہ ممالک مکمل روزگار کا ہدف اپنانے کا سوچ سکتے ہیں۔ آخر وہ کونس حکمت عملی ہے جس سے ہماری اپنی زندگی میں ان سب افراد کو کل وقتی روزگار مہیا ہو سکے۔ کہیں بے روزگاری کا تصور بھی دوسری لہر کا تحفہ تو نہیں۔ سویڈن کے معیشت دان گنار میرڈل اس جانب پہلے ہی اشارہ کر کے ہیں۔

عالمی بینک کے پال سٹریٹن لکھتے ہیں۔ ''بے روزگاری مغرب کا تصور ہے جس میں جدید شعبہ جاتی اجرتی روزگار، محنت کی منڈی، تبادلہ محنت کے مراکز اور معاشی تحفظات کی موجودگی فرض کر لی جاتی ہے اور یہ کوئی مسئلہ نہیں۔۔۔۔ مسئلہ تو غریب کا اور خصوصاً دیہی علاقے کے غریبوں کا بلا اجرت اور غیر پیداوار کام کرنا ہے'' تیسری لہر کی جانب گامزن، دولت مند معاشروں میں صانفیت کی مقبولیت دوسری لہر کے معاشی ماہرین کے بنیادی مفروضوں کو مشکوک بنا رہی ہے۔ مغرب کے صنعتی انقلاب (جس نے بیشتر معاشی عمل شعبہ الف۔۔۔۔ صانفیت۔۔۔۔ سے دھکیل کر شعبہ ب۔۔۔۔ تبادلہ کی پیداوار۔۔۔۔ کی سمت منتقل کر دیا تھا) کی نقالی کرنا شاید غلطی ہو۔ صانفیت کو ماضی کی بچی کھچی تلغاہٹ سے بجائے مثبت قوت کے طور پر دیکھنا چاہئے۔ مزید براں اکثر لوگوں کو جز وقتی اجرتی روزگار درکار ہے اور صانفی عمل کی کارکردگی بڑھانے کے لئے اجرت مندانہ حکمت عملی چاہئے۔ ہر دو معاشی سرگرمیوں کا متناسب ربط کروڑوں لوگوں کی بقا کا ضامن بن سکتا ہے۔

امیر ممالک کی طرح ہی صانفانہ عمل کے لئے مستقل آلات سرمایہ فراہم کئے جانے چاہئیں۔ ان ممالک میں دونوں شعبوں میں ایک دلکش ہم آہنگی جنم لے رہی ہے۔ وہاں کی مارکیٹ صانف کے لئے طاقتور اور مستقل آلات سرمایہ۔۔۔۔ مثلاً واشنگ مشین، دستی ڈرل، بیٹری کا جانچ پڑتال والا آلہ مہیا کر رہی ہے لیکن غریب ملکوں میں اتنی غربت ہے کہ بظاہر ان کے لئے واشنگ مشین یا آلات توانائی کا ذکر ہی فضول ہے۔ پہلی لہر کی تہذیب سے پیش قدم معاشروں کے لئے کیا ان آلات کا کوئی متبادل بھی ہے یا نہیں؟ فرانسیسی نقشہ نویس اور منصوبہ ساز یونا فرائیڈ مان زور دے کر یہ کہتا ہے کہ دنیا کے غریبوں کو روزگار نہیں

بلکہ خوراک اور چھت کی ضرورت ہے۔ روزگار کی اہمیت یہی تو ہے کہ وہ بنیادی انسانی ضروریات کی تکمیل کرتا ہے۔ بسا اوقات آدمی اپنی خوراک خود ہی اگا سکتا ہے اور رہائش کا مسئلہ بھی حل کر لیتا ہے۔ یونیسکو کو پیش کی گئی ایک رپورٹ میں فرائیڈمان نے تجویز دی کہ حکومت کو صانفانہ عمل کی حوصلہ افزائی کے لئے اپنے تعمیراتی قوانین کو لچکدار بنانا چاہئے۔ یہ قوانین جھگی والوں کو اپنی جگہ میں تبدیلی یا اسی زمین پر نیا گھر بنانے کی اجازت نہیں دیتے۔

فرائیڈمان حکومتوں سے ان رکاوٹوں کو ختم کرنے کی اپیل کرتا ہے تاکہ لوگ اپنی رہائش کا خود انتظام کر سکیں۔ اس سلسلے میں حکومت کو تنظیم میں معاونت، ناقابل حصول سامان کی فراہمی اور اگر ممکن ہو تو پانی اور بجلی کی ترسیل کا ترقیاتی کام کرنے کی پیش کش کرنی چاہئے۔ فرائینڈ مان اور اس کے ہمنواؤں کا زور اس بات پر ہے کہ صانف کی کارکردگی میں اضافہ بھی روایتی خام قومی پیداوار کی اصطلاح میں ناپی گئی پیداوار سے کم اہمیت کا حامل نہیں۔

صانف کی کارکردگی بڑھانے کے لئے حکومتوں کو سائنس اور ٹیکنالوجی کی تحقیق کی حوصلہ افزائی کرنی چاہئے۔ گھروں کی تعمیر یا ترمیم کے لئے محنت کی سرمایہ کاری کرنے والوں کو سستے دستی اوزار، مقامی ورکشاپ اور ممکنہ مواصلاتی ذرائع کی فراہمی کے ذریعے ان کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ دوسری لہر کے پروپیگنڈے سے دنیا کے غریبوں کو یہ پیغام ملا ہے کہ مقامی صنعت، درآمدی تھوک پیداواری اشیاء کے مقابلے میں، بہرصورت ناقص ہے۔ مقامی پیداوار کو بہ نظر حقارت دیکھنے اور دوسری لہر کی اشیاء کو بہتر سمجھنے کی بجائے، خود تیار کردہ گھروں اور اشیاء کی حوصلہ افزائی کے لئے انعامات دیئے جانے چاہئیں۔ دولت مند لوگوں کا صانفانہ رجحان دیکھ کر غریب ترین لوگوں کا زاویہ نظر بھی بدل سکتا ہے۔ تیسری لہر کئی غیر معاشی اور غیر تکنیکی معاملات کو بھی بنیادی اہمیت دیتی ہے۔ مثلاً تعلیم کے متعلق یہ بنیادی سوال۔۔۔ کہ یہ سب کے لئے عام ہونی چاہئے۔۔۔ مگر کس قسم کی تعلیم؟

پہلی لہر کے باشندوں۔۔۔ افریقہ، ہندوستان اور دوسری نو آبادیوں۔۔۔ کے لئے سامراجیوں نے ایسا نظام تعلیم وضع کیا جس میں فیکٹری طرز کے سکول قائم کئے گئے یا ان کی اپنی اشرافیہ کے لئے مخصوص سکولوں کی گھٹیا نقلیں کھڑی کر دی گئیں۔ دوسری لہر کا

طرزِ تعلیم آج ہر جگہ تنقید کی زد میں ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ تعلیمی عمل میں محنت، سیاسی جدوجہد، سماجی خدمت اور سپورٹس کو بھی شامل کیا جائے۔ کیا خواندگی مناسب منزل مقصود ہے؟ اور اگر ہے تو اس سے کیا مراد لی جانی چاہئے؟ کیا خواندگی کے دائرے میں لکھنا اور پڑھنا دونوں ہی شامل ہیں۔ برطانوی ماہر انسانیات سر ایڈمنڈ لیچ نے انہی دنوں تجویز دی ہے کہ پڑھائی کی اہلیت لکھنے سے کہیں زیادہ سہل اور سود مند ہے اور تحریری قابلیت ہر کسی کے لئے ضروری بھی نہیں۔ مارشل میک لوہن تو پہلی لہر کی طرح کی زبانی ثقافت کی جانب واپسی کی بات کرتا ہے۔ گفتگو کو سمجھنے کی ٹیکنالوجی نت نئی ناقابل یقین راہیں کھول رہی ہے۔ سادہ زرعی آلات میں نہایت سستے مواصلات بٹن نصب ہو سکتے ہیں، یوں فعال خواندگی کی تعریف بھی از سرِ نو کرنا پڑے گی۔

تیسری لہر تحریک کے معاملے میں روایتی دوسری لہر کے مفروضات سے کہیں زیادہ آگے تک دیکھنے کی جرات پیدا کرتی ہے۔ اچھی غذا کروڑوں بچوں کی نہ صرف ذہانت اور عملی صلاحیت کی سطح کو بلند کرے گی بلکہ ان میں جرات اور قوت تحریک بھی بڑھائے گی۔ دوسری لہر کے لوگ بسا اوقات بھارتی دیہاتی یا کولمبیا کے کسان میں جمود یا عدم تحریک کی بات کرتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ غذا کی قلت، پیٹ کے کیڑے، موسم کی سختی اور جابرانہ سیاسی ادارے کافی حد تک اس جمود کے ذمہ دار ہیں مگر اس کی وجوہات میں آنے والے کل میں ترقی کے موہوم وعدے کی خاطر اپنا گھر بار اور سماجی ماحول کی توڑ پھوڑ سے احتراز بھی یقیناً شامل ہے۔ اگر ترقی کا مطلب خود پر ایک انجان اور ان دیکھی ثقافت ہی مسلط کرنا ہے جب کہ اس کے موجودہ پھل کا کوئی پتہ نہ ہو تو پھر کسان اپنے پاس موجود تھوڑے پر ہی قناعت کیوں نہ کریں۔

تیسری لہر کی تہذیب پہلی لہر سے خاصی مماثل ہے چنانچہ ایران یا چین یا کوئی بھی ملک ہو، اسے اپنانے میں کسی خاص اکھاڑ پچھاڑ کا شکار نہیں ہو گا۔ اس طرح تیسری لہر، ان ممالک میں موجود جمود کو بہتر انداز میں ختم کر سکے گی۔ غرض تیسری لہر توانائی، ٹیکنالوجی، زراعت اور معاشیات کے میدانوں میں ہی نہیں بلکہ انفرادی ذہن اور رویئے میں بھی انقلاب برپا کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہے۔

خط آغاز

تیسری لہر کی نمودار ہوتی تہذیب کے خدوخال ابھی واضح نہیں ہوئے۔ اس طرح یہ لہر غریب اور امیر دونوں کے لئے مفید امکانات پیدا کر رہی ہے۔ یہ نہ صرف پہلی لہر کی غربت و افلاس کی جانب توجہ مبذول کراتی ہے بلکہ اس تہذیب کی اچھائیاں بھی اجاگر کرتی ہے۔ دوسری لہر کے تناظر میں اس پرانی تہذیب کی جو برائیاں گنوائی جاتی تھیں، وہ تیسری لہر کے پس منظر میں مثبت امکانات میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ ان دونوں ثقافتوں کی مطابقت سے ہمیں دنیا کے غریبوں اور امیروں کے باہمی رشتے کے متعلق، ایک نئی طرز فکر ابھرتی نظر آتی ہے۔ ایک ماہر معاشیات سمیر امین ''غیر حقیقی معمہ'' کے پھیلاؤ کی مطلق ضرورت کے بارے میں بات کرتا ہے: آج کے مغرب سے نقل کی گئی جدید تکنیکیں یا سو سال سے پہلے حالات سے مطابقت رکھنے والی پرانی تکنیکیں (بلاحیل و حجت اپنا لی جائیں۔۔۔۔مترجم)۔ تیسری لہر ایسا ممکن العمل کر دیتی ہے۔ اس وقت غریب اور امیر دونوں ہی مستقبل کی جانب ایک نئی اور حیرت انگیز حد تک مختلف دوڑ کے خطِ آغاز پر جھکے کھڑے ہیں۔

MashalBooks.org

باب23

اختتامیہ: عظیم سنگم

پے در پے اور نامعلوم رشتوں سے باہم منسلک، تبدیلیوں کے ہاتھوں لرزاں و خیزاں، آج ہم جہاں کھڑے ہیں، صرف ایک عشرے پہلے وہاں موجود نہیں تھے لیکن اس افراتفری کے پیچھے ایک متماثل نقش ابھر رہا ہے۔ مستقبل تشکیل پا رہا ہے۔ تبدیلی کے بپھرتے ہوئے بہت سے دریا ایک عظیم تاریخی سنگم میں یک جا ہو کر تیسری لہر کا سمندر تشکیل دے رہے ہیں، ہر گزرتے لمحے جس کی قوت اور رفتار میں اضافہ ہو رہا ہے۔

تیسری لہر بیک وقت مختلف سطحوں پر انقلابی اور خود تقویتی تبدیلیاں بپا کر رہی ہے۔ اس کا مقصد محض پرانے معاشرے کا صفایا کرنا ہی نہیں بلکہ ایک جدید معاشرے کی بنیاد رکھنا بھی ہے۔ ہم دوسری لہر کے اداروں کی شکست و ریخت دیکھ رہے ہیں۔ بڑھتے ہوئے جرائم، گھریلو بد نظمی، تعفن زدہ نوکر شاہی اور لرزاں صنعتی معیشت، غرض ہم اپنے اردگرد زوال کا یہ منظر روزانہ دیکھ رہے ہیں۔ تاہم یہ معیشتی زوال نئی تہذیب کے لئے کھاد سے بھری کیاری ہے۔ توانائی، ٹیکنالوجی، خاندانی تشکیل، ثقافت اور کئی دوسرے شعبوں میں ڈھانچے زیر تعمیر ہیں جو مدعودہ تہذیب کے خدوخال متعین کریں گے۔ ہم ان بنیادی خدوخال کو کسی حد تک پہچان کر ان کے باہمی روابط کو سمجھ بھی رہے ہیں۔ یہ بات باعث مسرت ہے کہ تیسری لہر کی تہذیب نہ صرف ماحولیاتی اور معاشی اعتبار سے زیادہ فعال اور معقول ہے بلکہ پرانی تہذیبوں کے مقابلے میں اسے زیادہ شائستہ اور جمہوری بھی بنایا جا سکتا ہے۔

میں یہاں قطعاً کوئی حتمی یا تاریخی فیصلہ نہیں دے رہا۔ عبوری دور میں انتہائی سماجی کشمکش، معاشی ہل چل، تکنیکی حادثات، سیاسی مشکلات، فرقہ وارانہ فسادات، علیحدگی کی

MashalBooks.org

تحریکیں، ٹیکنالوجی کی خرابیاں اور تباہیاں، تشدد، جنگیں اور جنگ کے خطرات، یہ سب آنکھوں کے سامنے ہونگے۔ اداروں اور قدروں کی شکست وریخت کے دوران اقتدار کے بھوکوں کی طاقت کے مراکز پر قبضہ کی خواہش رنگ دکھا سکتی ہے۔ دو تہذیبوں کے اس ہولناک تصادم کے متعلق کوئی بھی حتمی بات ابھی قبل از وقت ہوگی۔

پھر بھی غالب گمان یہی ہے کہ اس معرکے میں فتح انسانیت کی ہوگی۔ لیکن اس کے لئے تبدیلی کی سمت کی جانچ اور ظہور پذیر معاشرے کے متعلق کئی بنیادی باتوں کا خاص خیال کرنا ہوگا۔

نئے کل کی مبادیات

گذشتہ تہذیب کی نسبت تیسری لہر کے زیر استعمال۔۔۔۔ ہائیڈروجن، شمسی، زمینی حرارت، سمندری، حیوانی کمیت(Biomass)، آسمانی بجلی اور حتمی طور پر شاید اعلی جوہری طاقت جیسی محیر العقول ذرائع توانائی کے ساتھ ساتھ توانائی کے وہ وسائل بھی بروئے کار آ رہے ہونگے جن کا تصور 1980ء کے عشرے میں ممکن ہے۔ (تھری مائل نایم جزیرے کے حادثے کے باوجود جوہری توانائی کے کچھ مراکز بدستور کام کرتے رہیں گے۔ لیکن کسی نہ کسی روز انسان یہ محسوس کرے گا کہ جوہری توانائی دراصل گھاٹے کا سودا ہے۔)

توانائی کی نئی بنیادوں کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے ہم جس عبوری دور سے گزر رہے ہیں، توانائی کی رسد میں کمی اور زیادتی اور قیمتوں کے بالائی اور زیریں جھٹکے اس کی خصوصیت ہے لیکن طویل تناظر میں پتہ چلتا ہے کہ نئی تہذیب توانائی کے کسی ایک ذریعے پر انحصار کرنے کی بجائے کئی مختلف اقسام استعمال کر رہی ہوگی۔ اس کی تعمیر توانائی کے ناقابل تجدید ذرائع کے بجائے قابل تجدید اور پائیدار توانائی کی بنیاد پر ہوگی۔ اس تہذیب کی تکنیکی بنیاد بھی خاصی متنوع ہو جو حیاتیات، جنسیات، برقیات اور مادی سائنس کے علاوہ فضائی اور سمندری تہوں کی سائنس سے اٹھے گی۔ بعض نئی ٹیکنالوجیز کے لئے تو خیر زیادہ توانائی درکار ہوگی مگر تیسری لہر کی عمومی ٹیکنالوجی کم توانائی صرف کرے گی اور دوسری لہر کی صنعت کے برعکس ماحولیاتی خطرات سے پاک ہوگی۔ ان میں سے بیشتر ٹیکنالوجیز چھوٹے پیمانے کی ہونگی اور ان کا استعمال خاصا آسان ہوگا۔ ایک صنعت کے فضلے کو دوسری صنعت

MashalBooks.org

میں باز دوری(Recycle) کے ذریعے خام مال کے طور پر استعمال کیا جا سکے گا۔

تیسری لہر کی تہذیب کا اہم ترین خام مال اطلاعات و تصورات ہونگے۔ اطلاعات وتصورات کی مدد سے موجودہ نا پائیدار وسائل کے متبادل تلاش کئے جاسکیں گے۔ البتہ ان متبادلات کے انتظامی عمل کے دوران شدید معاشی جھٹکے محسوس ہو سکتے ہیں۔ اطلاعات کی بنیادی اہمیت کے پیش نظر یہ تہذیب، تعلیم اور سائنسی تحقیق کی از سرنو تعریف کر کے ذرائع ابلاغ کی تشکیل کرے گی۔

موجودہ ذرائع ابلاغ، پرنٹنگ اور الیکٹرانک، دونوں قسم کے جدید مواصلاتی بوجھ کو سنبھالنے کے لئے ناکافی ہیں۔ تیسری لہر کے ذرائع۔۔۔۔ ابلاغ کی چند شکلوں۔ کے تابع ہونے کے بجائے۔۔۔۔ تفاعلی، غیر وسیع البنیاد اور انتہائی متنوع ہونگے ذرا دور مستقبل میں جھانکتے ہوئے، ٹیلی ویژن ک جگہ ''انفرادی ویڈیو'' مخصوص نشریات سے لے کر ایک خاص انتہا تک۔۔۔۔ جہاں تصورات بیک وقت ایک ہی فرد سے مخاطب ہوں۔۔۔۔ لے لے گا۔ بعدازاں ممکن ہے ہم ادویات کا استعمال کر کے انسانی دماغوں کے باہمی اور براہ راست اتصال اور الاغ اور بہت سے نامعلوم الیکٹروکیمیکل مواصلات کو جنم دے سکیں۔ یہ بات اپنی جگہ کہ ان کا استعمال حیرت انگیز اور لاینحل سیاسی اور اخلاقی مسائل کھڑے کر دے گا۔

موجودہ عظیم الشان مرکزی کمپیوٹروں کے ساتھ کولنگ سسٹم اور ٹیپ جیسے آلات تو ہیں ہی، آئندہ ان کے ساتھ ذہانت کے ان گنت چپس بھی منسلک ہو جائیں گے۔ جو کسی نہ کسی شکل میں ہر گھر، ہوٹل، ہسپتال، ہر گاڑی اور ہر آلے میں موجود ہونگے اور اس طرح پیدا ہونے والا عقل مند الیکٹرانک ماحول ہم سے گفتگو کررہا ہوگا۔ اس سے عمومی بدگمانیوں میں اضافہ تو ہوگا مگر اس اطلاعاتی، الیکٹرانک معاشرے میں مہنگی توانائی کا استعمال اور بھی کم ہو جائے گا۔ معاشرے کی اس کمپیوٹرزدگی (یا اطلاعاتی فعالیت) سے انسانی رشتے تجرد کا شکار بہر حال نہیں ہونگے، جیسا کہ ہم اگلے باب میں دیکھیں گے۔ لوگ شور شرابا، ہنسی مذاق، باہمی دلچسپی کے معاملوں، غرض ہر شے میں اسی طرح حصہ لے رہے ہونگے البتہ ان کے یہ سب افعال مختلف تناظر میں ہونگے۔

تیسری لہر کی توانائی کی مختلف شکلوں، ٹیکنالوجی اور ابلاغی وسائل کا باہم ادغام ہمارے عملی ماحول کو بھی تیز رفتار بنا دے گا۔ فیکٹریاں آج بھی بن رہی ہیں (اور یہ عمل کئی عشروں تک یونہی جاری رہے گا) لیکن تیسری لہر کی فیکٹریاں قدرے مختلف قسم کی ہونگی اور امیر ممالک میں فیکٹری کارکنوں کی تعداد مسلسل کم ہوتی جائے گی۔

تیسری لہر کی فیکٹری دوسرے اداروں کے لئے اپنی مثالی حیثیت قائم نہیں رکھ سکے گی اور نہ ہی تھوک پیداوار اس کا مطمع ہو گا۔ اب بھی کئی فیکٹریاں گاہک کی ضرورت سے مطابق رکھتی اشیاء کی جدید طریقوں سے خصوصی پیداوار میں مصروف ہیں۔ ان میں مزید ترقی، صنعتی پیداوار میں توانائی کا خرچ کم کر دے گی، خام مال کا ضیاع بھی کم ہو گا۔ پرزوں کی ٹوٹ پھوٹ میں بھی کمی ہو گی۔ اشیاء کی ڈیزائننگ میں ذہانت کا راج ہو گا اور اہم بات یہ ہے کہ اس فیکٹری کی مشینری، کاریگروں کے بجائے دور کہیں بیٹھے گاہک کے ہاتھوں متحرک ہو گی۔

دوسری لہر کے متواتر اور بے رحم میکانکی انداز کار میں خاصی کمی ہو گی اور کاریگروں کے اوقات کار ان کی سہولت کے مطابق ہونگے۔ فیکٹریوں کا ماحول خوشگوار، بنانے کے لئے مشینوں کے ساتھ خوبصورت پھول اور پودے بھی لگے ہونگے۔ کارکنوں کی اجرت کی شرح بھی انفرادی ضروریات کے مطابق ہو گی۔

تیسری لہر کی فیکٹریاں وسیع وعریض شہروں کی حدود سے کافی دور ہونگی۔ ان کے سائز اور تنظیم میں بھی قدرے کمی آئے گی اور اس طرح فیکٹری میں مختلف شعبوں میں خود انتظامی کا اصول مقبول ہو گا۔ اسی طرح تیسری لہر کا دفتر بھی موجود شکل سے خاصا مختلف ہو گا۔ کاغذ کا استعمال ختم تو نہیں ہو گا مگر اس میں بے پناہ کمی آ جائے گی۔ ٹائپ مشینوں کا شور ختم ہو جائے گا۔ فائلوں کی الماریاں سکڑ جائیں گی۔ برقیاتی آلات کی آمد سے سیکرٹری اور سٹینو کا کردار بھی تبدیل ہو جائے گا۔ دفتری میزوں کے مابین فائل کی ترسیل بھی بند ہو جائے گی اور دفاتر میں باہمی مشاورت کے ذریعے فیصلے تیزی سے ہوسکیں گے۔

تیسری لہر کے ان دفاتر کو چلانے کے لئے معمولی کی کارکردگی والے کارکنوں کی بجائے ہوشیار اور ذہین کارکنوں کی ضرورت ہو گی۔ ایسی افرادی قوت کی افزائش کے لئے

تعلیمی اداروں کو بھی نئے انداز اختیار کرنا ہوں گے۔

بہر حال تیسری لہر کی انتہائی اہم تبدیلی، کام کی دفتر اور فیکٹری سے واپس گھر میں منتقلی ہو گی۔ ظاہر ہے ہر طرح کا کام نہ تو لوگوں کے گھروں میں منتقل ہو سکتا ہے، نہ ہی ہو گا اور ہونا بھی نہیں چاہئے۔ لیکن موجودہ مہنگے ذرائع نقل و حمل کی جگہ سستے مواصلاتی وسائل کی موجودگی، پیداوار میں ذہانت اور تصور کا فزوں تر استعمال، محنت و مشقت اور معمول کی ذہنی کارکردگی میں مزید کمی کی بدولت تیسری لہر کے معاشرے میں کارکنوں کی ایک مناسب تعداد اپنے کام کا کچھ نہ کچھ حصہ گھر پر ہی کر رہی ہو گی۔ فیکٹریوں میں خالص مادی اشیاء کی ترتیب و تشکیل اور استعمال کا کام ہی رہ جائے گا۔

اس سے ہمیں تیسری لہر کی تہذیب کی اداراتی ساخت کا سراغ ملتا ہے۔ کچھ مبصروں کا کہنا ہے کہ آنے والے وقت میں اطلاعات کو مرکزی حیثیت مل جانے کی وجہ سے فیکٹری کی بجائے یونیورسٹی معاشرے کا کلیدی ادارہ بن جائے گی۔ لیکن یہ تصور صرف اساتذہ کا ہے اور اس کی بنیاد یہ مفروضہ ہے کہ صرف یونیورسٹیاں ہی علم کا گہوارہ ہوتی ہیں۔ اسے اساتذہ کی خوش فہمی ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ ملٹی نیشنل کارپوریشن کے منیجر اپنی حد تک اپنے دفتر کو مستقبل کا مرکز سمجھتے ہیں۔ اطلاعاتی منیجر اپنے کمپیوٹر کے مراکز کو نئی تہذیب کا دل سمجھ رہے ہیں۔ بعض اور لوگ جدید زرعی بستی کو یہ مقام دینا چاہتے ہیں۔ گذشتہ بیان کردہ وجوہ کی بنیاد پر ان میں سے کسی کے حق میں بھی میرا ووٹ نہیں۔ میرے خیال میں نئی تہذیب کا بنیادی ادارہ ''گھرانا'' ہو گا۔

مجھے یقین ہے کہ تیسری لہر میں گھرانے کی اہمیت بے پناہ بڑھ جائے گی۔ صانف کا ظہور، الیکٹرانک کاٹیج کا پھیلاؤ، نئی کاروباری شکلوں کی دریافت، خود کار اور پرچونی پیداوار کی شروعات، سب مل کر نئے معاشرے میں گھرانے کی اہمیت کا پتہ دیتے ہیں۔ ان کا اپنا خصوصی معاشی، طبی، تعلیمی اور سماجی کردار ہو گا۔ لیکن معاشرے میں بنیادی اہمیت کے باوجود گھرانا ماضی کے کلیسا یا فیکٹری کے کردار کا مقابلہ نہیں کر سکے گا، کیونکہ پہلے معاشرے میں ادارے ایک نظام مراتب میں منسلک تھے جبکہ نئی تہذیب کی خصوصیت ہی اداراتی جال ہو گا۔ اس طرح کارپوریشن کی دوسرے معاشی اداروں پر فوقیت کا خاتمہ ہو

جائے گا۔ تیسری لہر کی کارپوریشن ایک پیچیدہ اور کثیر المقاصد ہونگے۔ جیسے جیسے یہ کارپوریشنیں ماحولیاتی، سیاسی، معاشی، ثقافتی اور اخلاقی عوامل کی ذمہ داری اٹھائیں گی، ان کے مینجروں کی شرح اجرت بھی کثیر مقصدی اصول کی عکاس ہوگی۔

دوسری لہر کی کارپوریشن اکثر اپنے بالواسطہ اخراجات صارف یا ٹیکس گزار کے کھاتے میں ڈال دیتی تھی۔ ان اخراجات کا از سرنو تخمینہ۔۔۔۔ بشمول معاشی، مساجی اور دوسرے مخفی اخراجات۔۔۔۔ لگایا جائے گا۔ ''بچت کی سوچ''۔۔۔۔ دوسری لہر کے مینجروں کی ایک مخصوص کمزوری۔۔۔۔ کا عمومی انداز بھی پہلے سے گھٹ جائے گا۔

تیسری لہر کی تہذیب کی توضیح کے ساتھ ساتھ دوسرے اداروں کی طرح کارپوریشن کی بھی وسیع پیمانے پر نئی تشکیل ہوگی۔ تیسر لہر کے اوقات کار اور آہنگ، پیداوار سے ہم آہنگ ہونے کی بجائے لچکدار ہونگے۔ وسیع البنیاد معاشرے کے شخصی عمل، سوچ، زبان اور طرز زندگی کے اعلی معیاروں کی جگہ، تیسری لہر کا معاشرہ تقسیم اور تنوع کے اصولوں پر مبنی ہوگا۔ آبادی، توانائی کے بہاؤ اور زندگی کے دوسرے خدوخال کو مرتکز کرنے کی بجائے، تیسری لہر کا معاشرہ انہیں غیر مرتکز اور منتشر کر رہا ہوگا۔ ''جتنا بڑا، اتنا ہی بہتر'' کے اصول پر مبنی زیادہ سے زیادہ پیمانے کی پیداوار کی بجائے تیسری لہر کا معاشرہ ''موزوں پیمانے'' کا مفہوم بخوبی سمجھ رہا ہوگا اور انتہائی مرکزیت پسندی کے بجائے غیر مرکزی فیصلہ سازی کی اہمیت کو تسلیم کرے گا۔

ایسی تبدیلیوں سے قدیم انداز کی معیاری نوکر شاہی سے بالکل مختلف۔۔۔۔ حکومت، کاروبار، سکول اور مختلف النوع جدید طرز کے اداروں کی۔۔۔۔ نئی نئی تنظیمی اشکال جنم لیں گی۔ جہاں جہاں نظام مراتب کا رواج ہوگا، وہاں زیادہ بے جان پن اور عارضی پن نظر آئے گا۔ اکثر اداروں میں ایک کارکن، ایک باس کا نظریہ ختم ہو جائے گا۔ اس طرح ایک ایسی عملی فضا قائم ہوگی جس میں بہت سے لوگ عارضی فیصلے کرنے کے اہل ہونگے۔

تیسری لہر کی سمت گامزن معاشروں کو، عبوری دور میں، عارضی بے روزگاری کا مسئلہ درپیش ہوگا۔ 1950ء کے عشرے کے بعد سے معیشت کے سکڑتے ہوئے شعبوں سے نکالے گئے لاکھوں کارکنوں کو وائٹ کالر اور شعبہ خدمات میں نئے معاشی ذرائع مہیا ہو

گئے ہیں۔ کیا وائٹ کالر سرگرمیوں میں خود کاری کی ابتداء سے بڑھتی بے روزگاری کے خاتمے کے لئے خدمات کے شعبے میں مزید توسیع ممکن ہے۔ چند ممالک نے سرکاری شعبے میں ضرورت سے زیادہ ملازمتیں مہیا کر کے یا کاریگروں کو بیرون ملک روز دلوا کر یہ مسئلہ حل کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن دوسری لہر کے اصولوں کے مطابق چلنے سے ان مسائل کا حل تلاش کرنا ممکن ہی نہیں۔ اس سے ہمیں صانع اور صارف کے باہمی مجوزہ ملاپ کی اہمیت کی وضاحت میں مدد ملتی ہے۔ اس ملاپ کو ہی میں نے صانف کا نام دیا ہے۔ تیسری لہر کی تہذیب کیساتھ معیشت میں صانفانہ پیداوار (ذاتی استعمال کی پیداوار) کے زبردست شعبے کا احیاء ہو رہا ہے جس میں پیداوار تبادلے کے بجائے اپنے صرف کے لئے ہوتی ہے۔

تین سو سالہ مارکیٹ کے راج کے بعد، اس ڈرامائی تبدیلی سے ہمارے لئے بے روزگاری اور سماجی تحفظ سے لے کر تفریح اور عمل کے رویوں، سبھی معاشی مسائل کو ایک نئے انداز میں دیکھنا ممکن بھی ہو گا اور ضروری بھی۔ اس طرح معیشت میں گھریلو کام کاج کی اہمیت کا صحیح اندازہ لگایا جا سکے گا۔ اس کے ساتھ خواتین کے کردار میں بھی تبدیلی آئے گی، کیونکہ گھر چلانے کی بنیادی ذمہ داری بھی خواتین ہی کی ہے۔ دنیا میں مارکیٹ کا طاقتور کردار کم ہو رہا ہے، اسی ایک وجہ سے دنیا پر مستقبل میں نہ جانے کیسے کیسے اثرات مرتب ہو نگے۔

تیسری لہر کے لوگ اسی دوران فطرت، ترقی، ارتقاء، زمان و مکان، مادہ اور سببیت کی نت نئی تاویلیں گھڑ رہے ہونگے۔ مشین پر مبنی تماثیل کا ان کے ذہنوں پر کم اثر ہو گا اور عمل، فیڈ بیک اور عدم توازن کے تصورات کے ہاتھوں ان کی نئی ذہنی تشکیل ہو گی۔ نئے مذاہب، سائنسی تصورات، انسانی فطرت کے مناظر کے ساتھ آرٹ کی بھی نت نئی شکلیں ظاہر ہوں گی جو صنعتی دور کی نسبت کہیں زیادہ متنوع ہوں گی۔ اس کثیر ثقافتی دور میں ہیجان انگیزی کے علاوہ اجتماعی اختلافات کے حل کے نئے انداز بھی پیدا ہونگے۔ (موجودہ قانونی ضابطے تو ڈھیلے پڑ کر، ایک متنوع معاشرہ کے لئے ناکافی اور مناسب رہ گئے ہیں۔)

قومی ریاست، جو اب تک معیاریت کی بڑی قوت متحرکہ تھی، بڑھتے ہوئے معاشرتی امتیاز کی بدولت اپنے کردار میں کمی ہوتے دیکھے گی۔ تیسری لہر کی تہذیب میں

MashalBooks.org

طاقت کی از سرِ نو تقسیم کے ذریعے ریاست کے ساتھ ساتھ کثیر ملکی کارپوریشن سے لے کر خود مختار شہری محلے یا شہری ریاست، بہت فعال کردار ادا کریں گے۔ قومی معیشت اور مارکیٹ کی ٹوٹ پھوٹ کے نتیجے میں علاقائیت کی قوت مزید مستحکم ہو گی۔ جغرافیائی قربت کے بجائے ثقافت، ماحول، مذہب اور معاشی ہم آہنگی پر مبنی جدید علاقائی اتحاد قائم ہونگے مثلاً۔ شمالی امریکہ کا کوئی علاقہ، اپنے قریبی ہمسائے کے بجائے، یورپ یا جاپان کے کسی علاقے سے قریبی روابط قائم کر سکتا ہے یا وہ بالآخر اپنی قومی حکومت تشکیل دے سکتا ہے۔ اس طرح کے اتحادوں کے نتیجے میں دنیا میں وحدانی حکومت کی بجائے کثیر ملکی اداروں کا ایک گنجان جال پھیل جائے گا۔

دنیا کے تین چوتھائی غیر صنعتی آبادی، غربت کے خلاف جنگ میں جو آلات استعمال کرے گی، وہ دوسری لہر کی اندھی تقلید اور پہلی لہر کے غیر تسلی بخش حالات، دونوں کو ہی رد کر چکے ہونگے۔ ترقی کی بالکل نئی حکمت عملی تشکیل پذیر ہو گی جس میں ہر علاقے کے مذہبی اور ثقافتی تشخص کا خاص خیال رکھا جائے گا تاکہ شعوری کوشش کے ذریعے مستقبل کے کسی بھی ٹکراؤ کے امکانا کو کم سے کم کیا جا سکے۔

برطانیہ جرمنی امریکہ اور روس کی نقالی کی کوشش میں اپنی مذہبی روایات اور خاندانی زندگی کو تہ و بالا کرنے کی بجائے، کئی ممالک اپنے ماضی سے سبق سیکھ، کر پہلی لہر کی خصوصیات اور تیسری لہر کے ممالک میں (اعلیٰ ٹیکنالوجی کی بنیاد پر) ظہور پذیر ایسی ہی ترقی کی اشکال میں مطابقت پیدا کریں گے۔

تصوراتی عملیت کا تخیل

ہمارے سامنے نظر آنے والا یہ خاکہ ایک نئ طرز زندگی کا ہے جو صرف افراد ہی نہیں بلکہ پورے کرہ ارض کو اپنی گرفت میں لے رہا ہے۔ نئ تہذیب کا یہ نقشہ تصوراتی مثالی معاشرے کا تو بہرحال نہیں ہے کیونکہ اسے بھی کئی پیچیدہ مسائل۔۔۔۔ جن کا ذکر اگلے صفحات میں آئے گا۔۔۔۔ درپیش ہونگے، ذاتی اور اجتماعی مسائل، سیاسی مسائل، عدل و انصاف، مساوات اور اخلاقیات کے مسائل، نئ معیشت کے (مثلاً روزگار، سماجی تحفظ اور صانفیت کے باہمی تعلق کے) مخصوص اختلافات وغیرہ۔

MashalBooks.org

بہر حال تیسری لہر کی تہذیب تصوراتی جن کے برعکس بھی نہیں ہو گی سائنسی ادب مستقبل بج انتہائی مرتکز، نوکر شاہی کے ہاتھوں مجبور اور لاچار اور معیار پسند معاشرے کی تصویر پیش کرتا رہا، جس میں افراد کے مابین کوئی فرق یا تمیز نہیں ہو گی۔ ہم بہر حال اس کی بالکل الٹی سمت گامزن ہیں۔

اگرچہ تیسری لہر کے ساتھ ماحولیاتی خطرات، جوہری دہشت انگیزی اور الیکٹرانک فاشزم جیسے نت نئے چیلنج بھی نمودار ہو رہے ہیں، تاہم یہ محض صنعت دارانہ خطی توسیع نہیں ہے۔ یہاں ہم تصوراتی عملیت پرست دنیا کی جو جھلک دیکھ رہے ہیں، وہ نہ کوئی بہت ہی اعلیٰ دنیا ہو گی اور نہ بہت ہی بری۔ اس میں تصوراتی دنیا کے برعکس بیماری بھی ہو گی اور بے ایمانی اور سیاسی خباثتیں بھی۔ یوٹوپا کے اکثر تصورات سے ہٹ کر یہ کوئی غیر حقیقی منجمد اکائی نہیں ہو گی۔ نہ ہی اس کی بنیاد ماضی کے کسی فرضی ماڈل پر ہو گی۔ یہ غیر جمہوری یا فوجی ذہنیت سے پاک ہو گی۔ یہ اپنے شہریوں پر بے چہرہ یکسانیت نہیں تھوپے گی۔ اپنے ہمسایوں کے لئے خطرہ نہیں ہو گی اور نہ ہی ماحول کی دشمن ہو گی۔

مختصراً تصوراتی عملیت ایک ایسا مثبت اور انقلابی تصور ہے جو انسانی اختیار سے باہر بھی نہیں۔ تیسری لہر کی تہذیب، اپنی معنویت کے اعتبار سے تصوراتی عملیت کا مستقبل ہی ہے۔ یہ انفرادی، نسلی، علاقائی اور مذہبی تنوع کو دبانے کی بجائے، ان کے باہمی اختلافات (جیو اور جینے دو، کے اصول پر۔۔۔۔مترجم) کو کم کرائے گی۔ خاندان اس تہذیب کا مرکز و محور ہو گا۔ نئی نئی ایجادات اور دریافتیں اس کی خصوصیات ہوں گی۔ اسے اپنی صلاحیتیں مارکیٹ سازی پر ہی صرف نہیں کرنا پڑیں گی۔ اپنے عظیم جذبات کو فن تشکیل دینے کی اہل ہو گی۔ جنسیات اور ارتقاء کے میدان میں پیش رفت کے تاریخ ساز مواقع اس تہذیب کو حاصل ہوں گے اور ان سے پیدا شدہ پیچیدہ مسائل سے نمٹنے کے لئے جدید اقدار و اطوار بھی اسے ہی وضع کرنا ہونگے۔ ماحولیاتی عدم توازن اور باقی ماندہ دنیا کے استحصالی مفادات کے خطرات سے پاک ہو گی، بنیادی طور پر زیادہ جمہوریت اور انسانیت پسند ہو گی۔ اس تہذیب کی تشکیل میں انتہائی محنت درکار ہو گی مگر یہ انسانی پہنچ سے باہر نہیں۔

MashalBooks.org

غلط سوال

آخر یہ سب کچھ ہو کیوں رہا ہے؟ دوسری لہر ایک دم فرسودہ کیوں ہو گئی؟ وہ کیا چیز ہے جو پرانی تہذیب اور نئی لہر کی تہذیب کے باہمی ٹکراؤ کا باعث بن رہی ہے؟

صنعتی انقلاب کو بپا ہوئے تین سو سال گزر چکے مگر اب بھی اس کے بنیادی سبب کے متعلق شاید ہی کوئی ایک رائے ہو، ہر علمی اور فکری گروہ کی اپنی اپنی توجیہہ ہے۔ ٹیکنالوجی کو اہمیت دینے والے بھاپ کے انجن، صنعتی انقلاب کی بنیادی وجہ گردانتے ہیں۔ ماحولیت پسند برطانوی جنگلات کی تباہی کو اس کا بنیادی سبب سمجھتے ہیں اور معاشیات کے اساتذہ اون کی قیمت میں اتار چڑھاؤ کا ذکر کرتے ہیں۔ سولہویں صدی کی احیائے علوم کی تحریک بھی اس کی بنیاد سمجھی جاتی ہے۔

موجودہ دنیا میں تبدیلی کی بھی متعدد وجوہات بیان کی جا رہی ہیں۔ مثلاً تیل کے محدود ذخائر اور ان کی بڑھتی ہوئی طلب، آبادی میں بے تحاشا اضافہ، عالمی آلودگی کے سریع الاثر خطرات۔ بعض لوگ دوسری جنگ عظیم کے بعد رونما ہونے والی سائنس اور ٹیکنالوجی کے حیرت انگیز ایجادات اور ان سے پیدا شدہ سماجی اور سیاسی تغیرات کا ذکر کرتے ہیں۔ غیر صنعتی ممالک کا روز افزوں شعور اور اس سے پیدا شدہ اختلافات، تیل اور خام مال کی رسد میں رکاوٹیں وغیرہ بھی ان تبدیلیوں کا سبب کہی جاتی ہیں۔

اقدار میں جنم لیتی زبردست تبدیلیاں بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتیں۔ مثلاً 1960ء کے عشرے کا جنسی انقلاب اور عمل کے متعلق نئے نظریات کی آمد۔ اسلحہ کی دوڑ کی وجہ سے بھی ٹیکنالوجی میں خاصی پیش رفت ہوئی۔ اسی طرح تیسری لہر کے اٹھنے کی ثقافتی اور نظریاتی وجوہ بھی ممکن ہیں، جیسے اصلاح کلیسا اور احیائے علوم کی تریک نے اپنے زمانے میں بنیادی تبدیلیاں پیدا کی تھیں۔

غرض اس طرح کے سینکڑوں دھارے ایک عظیم سنگم میں جمع ہو رہے ہیں۔ سماجی نظام میں بعض حیرت انگیز مثبت اور منفی فیڈ بیک کے عوامل دریافت ہوئے ہیں، جو بعض تبدیلیوں کو تیز کر رہے ہیں جبکہ بعض دوسری تبدیلیوں کو جنم لینے سے روک رہے ہیں۔ ہمیں اس دور کشمکش میں ایلیا پریگوجن جیسے سائنس دانوں کی بیان کردہ۔ عظیم ''جست'' کی تلمیح بھی

نظر آسکتی ہے، جس میں ایک سادہ سا وجود، محض اتفاقاً اچانک ہی پیچیدگی اور تنوع کی ایک نئی سطح سامنے لے آتا ہے۔

اسی وجہ سے ہم تیسری لہر کے ابھرنے کی کوئی ایک بنیادی سبب یا تعلق تلاش نہیں کر سکتے۔ عین ممکن ہے ایسی تہذیبی تبدیلیوں کی کسی بنیادی وجہ کی تلاش ہی فضول اور غیر معقول ہو۔ اس کے متعلق سوال کرنا ہی غلط ہو۔ تیسری لہر کی آمد کا سبب کیا ہے؟ ممکن ہے یہ سوال دوسری لہر کے بطن سے پیدا ہوا ہو۔

یہ کہہ کر ہم سببیت کے تصور کی نفی نہیں کرتے بلکہ اس کی پیچیدگی کو تسلیم کر رہے ہیں۔ اس کا مطلب تاریخی جبریت کا سہارا لینا بھی نہیں۔ دوسری لہر شکست وریخت کے نتیجے میں ناکارہ ہوگئی ہے مگر اس کا یہ مفہوم ہرگز نہیں کہ تیسری لہر کا اٹھنا ناگزیر ہے۔ جنگ، اقتصادی کساد بازاری، ماحولیاتی گڑبڑ، ان میں سے کوئی عامل بھی ہمارے تناظر کو تبدیل کر سکتا ہے۔ اگرچہ تبدیلی کی اس نئی لہر کو روکنا ناممکن ہے تاہم اس میں ضرورت اور اتفاق، دونوں ہی عوامل کارفرما ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب قطعاً نہیں کہ ان پر اثر انداز نہیں ہوا جا سکتا۔ میں نے مثبت فیڈ بیک کے متعلق جو کچھ کہا ہے، اگر وہ درست ہے تو نظام کو لگنے والی ہلکی سی ٹھیس بھی وسیع پیمانے کے تغیرات کو جنم دے سکتی ہے۔

ذاتی، گروہی یا حکومتی پر کئے گئے موجودہ فیصلے تیز رفتار بہتے دھاروں کا رخ یا رفتار بدل سکتے ہیں دوسری اور تیسری لہر کے حامیوں میں بحث و مباحثے اور اختلاف کے متعلق ہر معاشرے کا اپنا نقطہ نظر ہوگا روسیوں کا ردعمل ایک طرح کا ہوگا، امریکیوں کا کچھ اور طرح کا۔ جاپان، جرمنی، فرانس اور ناروے کا بھی اپنا اپنا ردعمل ہوگا اس طرح یکسانیت کے بجائے ہمہ جہتی تنوع کا فروغ ہوگا۔

ایسی ہی تبدیلیاں، ملکوں میں، داخلی طور پر ہوں گی۔ کارپوریشنوں، سکولوں، گرجاؤں، ہسپتالوں اور محلوں میں ایک چھوٹی تبدیلی کے اثرات بہت بڑے بھی ہو سکتے ہیں غالباً، یہی وجہ ہے کہ لوگوں اور افراد کی کرداری اہمیت بھی مسلم ہے۔ خصوصاً اس لئے کہ پیش آمدہ تبدیلیاں اختلافات کا نتیجہ ہونگی۔ ان میں خود کار ارتقاء کا عمل دخل کم ہوگا۔ ترقی یافتہ ملکوں کے پسماندہ علاقے، اپنی صنعتی ترقی کو تیز رفتار کرنے کے لئے، اپنی صنعتوں اور

روزگار کو تحفظ دینے کے لئے اقدامات کرتے ہیں، اس کے نتیجے میں ان کا، صنعتی طور پر ترقی یافتہ علاقوں سے، جو تیسری لہر کی ٹیکنالوجیکل سرگرمیوں کے لئے اپنی بنیادیں قائم کر رہے ہیں، تضاد جنم لیتا ہے، یہ تضاد معاشرے کو جھنجھوڑ ڈالتا ہے اور نتیجتاً سیاسی اور سماجی فعالیت کے نئے مواقع پیدا ہونے لگتے ہیں۔

دوسری لہر اور تیسری لہر کے مابین بپا زبردست کشمکش ہر جگہ موجود ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ دوسری جدوجہد اور کاوشوں کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔ طبقاتی تضاد، نسلی منافرت، جدید اور قدیم کا فرق۔۔۔۔ جسے میں نے کسی اور جگہ ''درمیانی عمر کے لوگوں کا سامراج'' کے نام سے پکارا ہے۔۔۔۔ علاقوں، جنس اور مذہب کا تضاد بھی اسی طرح چلتا رہے گا۔ ان میں سے کچھ تضادات سریع الاثر ہونگے لیکن اکثر عظیم لہر کی جدوجہد کے تابع رہیں گے جو مستقبل کی تشکیل کر رہی ہے۔

تیسری لہر کے شوریدہ ماحول میں بھی، ہم دو عوامل کے اثرات واضح طور پر پہچان سکتے ہیں۔ پہلی معاشرے میں تنوع کی بلند سطح کی جانب منتقلی۔۔۔۔ وسیع البنیاد معاشرے کی غیر وسعت پذیری۔۔۔۔ اور دوسری اسراع۔۔۔۔ تاریخی تبدیلی کی رفتار میں اضافہ۔ یہ دونوں عوامل مل کر افراد اور اداروں پر زبردست دباؤ ڈال رہے ہیں، نتیجتاً عظیم جدوجہد کی شدت میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ کم تنوع اور سست رفتار تبدیلی کے خوگر افراد کو اس شدید تنوع اور تیز رفتار تبدیلی کے ساتھ قدم لا کر چلنا پڑ رہا ہے۔ اس شدید دباؤ سے ان کے فیصلہ کی صلاحیت سن ہوتی جا رہی ہے۔ نتیجہ ہے مستقبل کا تصادم۔ نئی حقیقتوں سے نمٹنے کے لئے، ہمارے پاس ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے اور وہ ہے اپنی انفرادی اور اداراتی تشکیل نو ے یہ وہ قیمت ہے جو ہمیں ایک قابل عمل اور شائستہ مستقبل میں داخل ہونے کے لئے ادا کرنا ہوگی۔ اور ضروری تبدیلیاں لانے کے عمل میں، ہمیں بہت سے ایسے گرما گرم مسائل کا سامنا کرنا پڑے گا، جن کے متعلق ایک بالکل نئے زاویہ کی ضرورت ہوگی۔

نتائج

MashalBooks.org

MashalBooks.org

باب24

نیا نفسیاتی دائرہ

ایک نئی تہذیب تشکیل پا رہی ہے لیکن اس میں ہماری اپنی حیثیت کیا ہے؟ کیا آج کی ٹیکنالوجیکل تبدیلیاں اور سماجی ہیجان انگیزی دوستی، محبت، لگاؤ اور خدمت کی قدریں ختم نہیں کر ڈالیں گی؟ کیا کل کی سائنس کے کرشمے انسانی رشتوں کو مزید کھوکھلا اور غیر یقینی نہیں بنا دیں گے؟

یہ بنیادی اور معقول سوالات ہیں جن سے کوئی سادہ لوح ٹیکنو کریٹ ہی با آسانی پیچھا چھڑا سکتا ہے۔ اپنے گرد و پیش میں نگاہ دوڑانے سے ہمیں وسیع و عریض نفسیاتی تعطل کے آثار محسوس ہوں گے جیسے ہمارے سماجی ''نفسیاتی دائرے'' کو بم سے اڑا دیا گیا ہو۔ ہم اپنے ارد گرد نہ صرف دوسری لہر کے تکنیکی دائرے کی شکست و ریخت بھی محسوس کر رہے ہیں۔

ہر جانب سماجی خدمات اور ذہنی صحت کے اداروں کی طلب میں اضافہ ہو رہا ہے۔ امریکی صدر کے قائم کردہ کمیشن برائے ذہنی صحت کے اعلان کے مطابق ہر چار میں سے ایک امریکی باشندہ کسی نہ کسی نفسیاتی دباؤ کا شکار ہے۔ قومی ادارہ ذہنی صحت کے مطابق کوئی امریکی گھرانا ایسا نہیں، جس کا کوئی نہ کوئی فرد کسی نہ کسی دماغی خلل کا شکار نہ ہو۔ مزید برآں، امریکی معاشرے کو غیر یقینی مستقبل کی وجہ سے حد درجہ نفسیاتی اضطراب کا سامنا ہے۔ وہ پراگندہ خیال، منقسم اور مستقبل کے لئے متفکر نظر آتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ طفلی تعریفیں اور ناقابل اعتبار اعداد و شمار ایسی عام فہم معاملات کو بھی شک و شبہ میں ڈال رہے ہیں اور یہ بھی بالکل سچ ہے کہ گذشتہ معاشرے مثالی ذہنی صحت کے حامل نہیں تھے۔ پھر بھی آج کوئی نہ کوئی بات بری طرح کھٹکتی ہے۔

روز مرہ زندگی اس قدر اضطراب کا شکار ہوگئی ہے کہ صراط مستقیم استرے کی دھار

MashalBooks.org

محسوس ہوتی ہے۔ اعصابی دباؤ کی بہت سی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ زمین دوز ریلوے اسٹیشنوں اور پٹرول پمپوں پر لگی قطاروں میں لڑائی جھگڑے اور مار پیٹ انسانی مزاج کی بڑھتی ہوئی درشتی کے عکاس ہیں۔ لوگ اس صورت حال سے عاجز آ چکے ہیں۔ انہیں روزانہ ہی منشیات کے عادی لوگوں اور نفسیاتی مریضوں کی فوج کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور انہی لوگوں کے سماجی دشمن رویوں کو ذرائع ابلاغ پر انتہائی خوبصورت بنا کر دکھایا بھی جاتا ہے۔ مغرب میں جنون اور دیوانگی کو مہلک رومانوی رنگ دیا جا رہا ہے۔ ناولوں میں دیوانگی کو دیو مالائی انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ برکلے میں ایک ادبی رسالہ نکلا ہے جو جنون، (غیر معمولی ذہانت اور درویشی کو ایک ہی قمرو کے باسی سمجھتا ہے اور انہیں یکساں نام اور مقام دلانے کا خواہاں ہے۔ دریں اثناء لاکھوں لوگ اپنے تشخص کی تلاش میں یا اپنی ذات کو شکست وریخت سے بچانے کے لئے کسی جادوئی علاج، وقتی دوستی یا لمحاتی خوشی کی پناہ لیتے ہیں یا ایسی دوائیں استعمال کرتے ہیں جن کے ذریعے انہیں ''اعلیٰ'' شعوری سطح تک رسائی ہو سکے۔

1970ء کے عشرے کے آخیر میں کیلی فورنیا سے شروع ہونے والی انسانی استعداد میں اضافے کی تحریک نے آٹھ ہزار قسم کے نسخوں کی فہرست بنائی تھی جس میں نفسیاتی تحلیل، مشرقی مذاہب، جنسی تجربات، کرداری کھیل اور قدیم مراقبہ وغیرہ شامل تھے۔ ایک تجزیاتی سروے کے الفاظ میں ''صاف ستھری پیکنگ میں یہ تکنیکیں ذہنی تحرک اریک اور سلوا دماغی انضباط کے نام سے ایک ساحل سے دوسرے ساحل تک باقاعدہ پھیلائی گئیں۔ وجدانی مراقبہ تو پہلے ہی بے پناہ مقبول تھا۔ سائنٹلوجی ڈائی نیٹکس اپنی مقبول عام دوائی 1950ء کے عشرے سے ہی وسیع پیمانے پر فروخت کر رہی تھی۔ اسی اثناء میں امریکہ میں عجیب وغریب مذاہب جنم لینے لگے جنہوں نے چندہ جمع کرنے اور پرچارکوں کی بھرتی کی تحریکیں ملک کے طول وعرض میں پھیلا دیں۔

انسانی صلاحیت میں اضافے کی اس صنعت سے بھی اہم انجیلی عقاید کی پرجوش تبلیغی تحریک ہے جس نے رفڈیو اور ٹی وی کے بھرپور استعمال سے اپنے غریب اور جاہل پروکاروں کو معاشرے سے دل برداشتہ کر ڈالا اور نجات کی تلاش میں انہیں احمقانہ حرکتوں پر

مجبور کر دیا۔

سارے ترقی یافتہ معاشروں پر یہ مصیبت یکساں طور پر حملہ آور نہیں ہوئی۔ اسی لئے میرے یورپی قاری شاید اسے امریکی لعنت سمجھیں جبکہ امریکہ میں بہت سے لوگ اسے کیلی فورنیا سے اٹھنے والی ایک اور قباحت قرار دیتے ہیں۔ دونوں نظریئے ہی غلط ہیں۔ اگر یہ نفسیاتی پریشانی امریکہ اور خصوصاً کیلی فورنیا کا خاصا ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ تیسری لہر نے ان علاقوں پر حملے آور ہو کر ان کے دوسری لہر کے تمام سماجی اداروں کو تہس نہس کر ڈالا ہے۔

دراصل ایسی وسوسہ انگیز تحریکیں، ترقی یافتہ معاشروں میں ان گنت جگہوں پر چل رہی ہیں۔ روم اور ٹورین پر دہشت گردوں کا قبضہ ہے۔ پیرس اور لندن میں غنڈے اور لٹیرے کھلے عام پھر رہے ہیں۔ شکاگو میں عمر رسیدہ لوگ شام کے بعد گھر سے باہر نہیں نکلتے۔ نیویارک کے سکول اور زمین دوز ریلوے تشدد کی زد میں ہیں۔ کیلی فورنیا کا ایک رسالہ اپنے قارئین کو بندوق چلانے، ڈاکوؤں کے حملے کا پتہ دینے والے گھریلو آلارم، ذاتی تحفظ کے لئے سدھائے ہوئے کتوں اور آلات، تیز کمپیوٹر کے حفاظتی نظام کے متعلق اطلاعات فراہم کرتا ہے۔ فضا میں موجود تعفن دوسری لہر کے قریب المرگ تہذیب کی سٹراند ہے۔

نئی ابھرتی تہذیب کی خاطر جذبات سے بھرپور زندگی اور پاک معقول نفسیاتی دائرہ تشکیل دینے کے لئے کسی بھی فرد کی تین بنیادی ضروریات۔۔۔۔ برادری، ساخت اور معنویت۔۔۔۔ ہیں۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ دوسری لہر کے معاشرے نے کس طرح ان بنیادی لوازم کو نظر انداز کر کے اپنی موت کو دعوت دی، ہم مستقبل میں اپنے اور اپنے بچوں کے لئے زیادہ بہتر، صحت مندانہ ماحول کی تشکیل سرانجام دے سکتے ہیں۔ کسی شائستہ معاشرے میں کم از کم برادرانہ جذبات و احساسات تو ہونے ہی چاہئیں۔ برادری کا وجود احساس تنہائی کو ختم کرتا ہے۔ اس سے باہمی انسیت جنم لیتی ہے۔ لیکن آج تمام ترقی یافتہ ملکوں میں وہی ادارے۔۔۔۔ جن پر برادری کا تکیہ ہے۔۔۔۔ بری طرح انتشار کا شکار ہیں چنانچہ تنہائی کا طواعون بڑھتا ہی جا رہا ہے۔

لاس اینجلز سے لینن گراڈ تک نوجوان، پریشان ازدواجی جوڑے، تنہا ماں باپ، محنت کش اور عمر رسیدہ لوگ عموماً تنہائی کا شکوہ کرتے ہیں۔ والدین کا کہنا ہے کہ بچوں کو ان سے ٹیلی فون پر بات کرنے کی بھی فرصت نہیں۔ تنہا اجنبی، بار یا لانڈریوں میں کسی سماجی ماہر کے بقول اپنے بے پایاں دکھ اور شکست خوردہ اعتماد' (کی تصویر ایک دوسرے کو) دکھا رہے ہوتے ہیں۔ مخصوص نائٹ کلبوں اور ڈسکوز میں مایوس اور نڈھال تنہا لوگ ایک رات کے ساتھ کی تلاش میں لڑکھڑاتے پھرتے ہیں۔ تنہائی ہماری معیشت کا مکمل طور پر نظر انداز شعبہ ہے۔ دولت مند گھرانوں کی بیگمات اپنے گھروں کی چبھتی ہوئی اکتاہٹ سے فرار کی کوشش میں نوکریاں ڈھونڈنے لگتی ہیں۔ پالتو جانور اور ان کے لئے ڈھیروں مخصوص غذا، گھروں میں ہل چل پیدا کرنے کے لئے بیچے اور خریدے جاتے ہیں۔ تنہائی سے تفریح اور سفر کی صنعتوں کو معاش حاصل ہوتا ہے۔ منشیات کا استعمال اور نفسیاتی دباؤ بڑھتا ہے، کارکردگی گھٹتی ہے۔ ایک اور نفع بخش کاروبار جس سے تنہا فرد کے لئے تسکین آمیز ساتھ کی تلاش کی جاتی ہے۔۔۔۔ بھی جنم لیتا ہے۔

تنہائی کا دکھ انسان کے لئے انوکھا یا نیا ہرگز نہیں لیکن آج یہ معاشرے میں اس بری طرح سرایت کر گیا ہے کہ سب کا مشترکہ مسئلہ بن گیا ہے۔ برادری کے لئے افراد کے درمیان محض تسکین آمیز جذباتی رشتوں کا ہونا ہی کافی نہیں بلکہ اس کے لئے لوگوں اور اداروں کے مابین وفاداری کے مضبوط رشتے بھی چاہئے ہوتے ہیں۔ لاکھوں لوگ آج ایسے اداروں کی تلاش میں ہیں۔ جن کے لئے ان کے دلوں میں احترام، مئودت اور وفادراری کا جذبہ پیدا ہو سکے کیونکہ وہ اپنے موجودہ اداروں سے بالکل لاتعلق ہو چکے ہیں۔

کارپوریشن اس سلسلے میں ایک مناسب مثال ہے۔ جوں جوں کمپنیاں پھیلی ہیں اور متعدد کاروباری شعبوں میں بٹتی گئی ہیں ان کے کارکنوں میں مشترکہ مقصدیت کا رشتہ کمزور پڑتا گیا ہے۔ آپس داری کا احساس ختم ہو گیا ہے۔ کارپوریٹ وفاداری کی اصطلاح فرسودہ سی لگتی ہے۔ کئی لوگ اپنی کمپنی سے وفا کو خود سے بے وفائی کے مترادف سمجھتے ہیں۔ نیپل کے معروف کاروباری ناول ''خط آخر'' ہیروین اپنے ایگزیکٹو خاوند کو کچھ اس طرح طعنہ دیتی ہے۔ ''کمپنی سے وفاداری! یہ سن کر میرا تو الٹی کرنے کو جی چاہتا ہے۔!

عمر بھر کی ملازمت اور کارپوریٹ پدریت کے مرکز جاپان کے علاوہ (وہاں بھی یہ رجحان کم ہو رہا ہے) دوران کار معمول کے رشتے غیر سکون بخش اور عارضی ہوتے جا رہے ہیں۔ اگرچہ کمپنیاں سالانہ پکنک، کرسمس، میلے اور کھیل کے ذریعے انہیں بہتر بنانے کی کوشش کرتی ہیں تاہم یہ سب کچھ اب محض دکھاوا ہی رہ گیا ہے۔

ان وجوہ کی بدولت ایسے افراد۔۔۔۔جنہیں اپنی ذات سے زیادہ بڑی اور بہتر کسی شے سے احساس وفاداری ہو۔۔۔۔ بہت کم ہونگے۔ اشتراک کا جذبہ کسی بحران، حادثے یا دباؤ کی صورت یا انقلاب میں تو فی البدیہہ پیدا ہو جاتا ہے مگر عمومی حالت میں نہیں۔ مثلاً 1960ء کے عشرے کے دوران طلبہ کی ہڑتالوں کے دوران بھائی چارے کا خوبصورت نمونہ نظر آتا تھا۔ جوہری قوت کے خلاف مظاہروں میں بھی ایسی یک جہتی دیکھنے کو ملتی ہے لیکن یہ سب وقتی ہوتا ہے۔ آج ہمیں بھائی چارے کا احساس غائب ہوتا نظر آ رہا ہے۔

تنہائی کی اس لعنت کا ایک سراغ آج ہمیں معاشرے میں فزوں تر تنوع میں دکھائی دیتا ہے۔ معاشرے میں تخصیص پیدا کر کے، انسان کا باہمی فرق واضح کر کے، انفرادی سطح پر احساس خودی کو جنم دے کے، ہم نے ہر ایک کو منفرد ہونے میں مدد دی ہے۔ اس طرح باہمی میل جول اور کم ہو گیا ہے۔ ایک شخص جتنا منفرد ہو گا، اتنا ہی اس کے لئے ایک ایسے ساتھ کی تلاش جس کے ساتھ اس کے مفادات، اقدار، اوقات کار یا مزاج ملتے جلتے ہوں۔۔۔۔ مشکل ہوتی جائے گی، دوستیاں بھی مشکل ہو جائیں گی۔ ہم با آسانی سماجی رشتے قائم نہیں کرتے، دوسروں ک بھی یہی حال ہوتا ہے۔ نتیجہ آج کے بے شمار ناموافق اور نا مناسب رشتے ہیں یا پھر سرے سے کوئی رشتہ ناطہ ہی نہیں ہوتا۔

ایک وسیع معاشرے کی شکستگی کے دوران انفرادی تکمیلیت کا بہتر امکان تو بہر حال ہو گا لیکن بظاہر تنہائی کا دکھ عام ہو رہا ہے۔ تیسری لہر کے ظہور پذیر معاشرے میں اگر کوئی دل ہے تو اسے اس مسئلہ کا فوری حل تلاش کرنا ہو گا۔ برادری کا جذبہ بیدار کرنا ہو گا۔

ہم اس کام کی ابتداء کیسے کر سکتے ہیں؟

ایک مرتبہ ہم یہ مان لیں کہ تنہائی کوئی انفرادی مسئلہ نہیں ہے بلکہ دوسری لہر کے

اداروں کی توڑ پھوڑ کی وجہ سے پیدا شدہ ایک عوامی مسئلہ ہے، تبھی اس کے علاج کے لئے مختلف اقدامات کئے جا سکتے ہیں۔ ابتدائی قدم برادری یا خاندان سے ہی اٹھایا جائے یعنی اس کے سکڑتے ہوئے کردار میں نئی روح پھونکی جائے۔

صنعتی انقلاب کی ابتداء سے ہی خاندان کے بڑے بوڑھوں کو الگ تھلگ کیا جاتا رہا ہے۔ غالباً اب انہیں واپس لانے کا وقت آ گیا ہے۔ ہم پنشن کا خاتمہ یا بزرگوں کو ماضی کی طرح خاندان پر بوجھ بنانا نہیں چاہتے۔ جو لوگ اپنے بزرگوں کا خود خیال رکھنا چاہتے ہیں، انہیں ٹیکسوں میں رعایت کیوں نہ دی جائے؟ جو لوگ پرانی نسل سے تعلق قائم رکھنا چاہتے ہیں، انہیں آسانیاں دینے کے بجائے ہم معاشی سزائیں دینے پر کیوں تلے ہوئے ہیں؟ یہی اصول گھرانے کے دوسرے افعال پر بھی منطبق کیا جا سکتا ہے مثلاً؟ اپنی اولاد کو گھر پر تعلیم دینے والے والدین کے لئے سکولوں کی جانب سے قانون کی خلاف ورزی کے الزام کے بجائے خصوصی امداد ملنی چاہئے۔ ساتھ ہی سکول کی سرگرمیوں میں والدین کا کردار بھی بڑھنا چاہئے۔ امتحانات کے ذریعے طالب علم کی انفرادی محنت پر نمبر دینے کے بجائے، اس کی جانچ کے ایک حصے کا دارومدار، پوری کلاس یا اس میں ایک ٹیم کی کارکردگی پر ہونا چاہئے۔ اس طرح ہم بچوں کو باہمی انحصار اور مشترکہ ذمہ داری کا سبق دے سکیں گے۔ سکول کے ذریعے برادری کا احساس پیدا کرنے کے اور بہتر طریقے اختیار کئے جا سکتے ہیں۔

کارپوریشنیں بھی اسی طرح انسانی رشتوں کی نئی تشکیل کر سکتی ہیں۔ تیسری لہر کے پیداواری طریقوں کو غیر مرتکز کر کے ان کے چھوٹے چھوٹے انفرادی حصے کرنا ممکن ہے۔ موجد کمپنیاں اپنے کارکنوں کو گروہی شکل میں ایسی چھوٹی کمپنیاں قائم کرنے کی ترغیب دے سکتی ہیں جن کی پیداوار مادر کمپنی خود خریدے۔ اس طرح نہ صرف کارکنوں کی حوصلہ افزائی ہوگی بلکہ ان کے دل میں کمپنی کی قدر بھی بڑھے گی۔

وسیع وعریض کارپوریشن چھوٹے چھوٹے خود انتظامی حصوں میں منقسم کرنے سے نہ صرف طاقتور پیداواری لہر اٹھیں گی بلکہ برادرانہ احساسات بھی ابھریں گے۔

ہفت روزہ اکانومسٹ کے ڈپٹی ایڈیٹر نارمن میکرے کی تجویز ہے کہ ''چھ سے سترہ تک افراد۔۔۔۔ جو دوستانہ طریقے سے مل جل کر کام کر سکیں۔۔۔۔ پر مشتمل ایسی خود مختار

ٹیمیں تشکیل دی جائیں جن سے مارکیٹ کے عوامل کو مدنظر رکھتے ہوئے مطلوبہ پیداوار اور اس کی فی اکائی قیمت طے کر لی جائے اور پھر انہیں اپنا پیداواری عمل اپنی مرضی سے جاری رکھنے کی آزادی دے دی جائے۔'' میکرے مزید کہتا ہے کہ ایسی کامیاب ٹیموں میں شامل لوگوں کے لئے خصوصی ٹیکس چھوٹ یا اعانت بھی ہونی چاہئے کیونکہ یہ لوگ سماجی بہتری کا کام بھی کر رہے ہونگے۔ کارپوریشنیں پنشن کے نظام پر بھی نظرثانی کر سکتی ہیں۔ کسی عمر رسیدہ کارکن کو ایک دم ملازمت سے علیحدہ کرنے سے نہ صرف اس کی آمدنی کم ہو جاتی ہے بلکہ معاشرے میں اس کا پیداواری کردار اور متعدد سماجی رشتے بھی ختم ہو جاتے ہیں۔ ملازمتوں سے یک لخت سبکدوشی کے بجائے کاریگروں سے رضاکارانہ طور پر یا جزوقتی اجرت پر سماجی خدمات بھی لی جا سکتی ہیں۔

کمیونٹی کی تشکیل کا ایک اور طریقہ بھی ممکن ہے۔ سبکدوش کارکنوں کا نوجوان سے رابطہ پیدا کیا جائے۔ ایسے بزرگوں کو سکول میں اضافی استاد کے طور پر رکھا جا سکتا ہے۔ وہ طلبہ کو اپنے پیشے کے کچھ ہنر سکھا سکتے ہیں۔ یہ کام رضاکارانہ بھی ہوسکتا ہے اور جزوقتی اجرت پر بھی۔ مثلاً؟ ریٹائرڈ فوٹوگرافر بچوں کو فوٹوگرافی کی تعلیم دے سکتے ہیں۔ مستری کار کی مرمت کے کچھ طریقے بتا سکتے ہیں اور اکاؤنٹس کے ماہر حساب کتاب کے کچھ گر اگلی نسل تک پہنچا سکتے ہیں۔ اس طرح استادی شاگردی کا ایک نیا سلسلہ جنم لے سکتا ہے۔

تنہائی کوئی گناہ نہیں اور تیزی سے متغیر معاشرے میں، ایسا ہونا کوئی شرم کی بات بھی نہیں۔ ہمیں تنہا لوگوں کو باہم مل بیٹھنے کے قابل عزت مواقع فراہم کرنے چاہئیں۔ بعض لوگ رسالوں میں طبع شدہ اکیلے لوگوں کے اشتہاروں کی مدد سے اپنے لئے ساتھ ڈھونڈتے ہیں۔ زیادہ دور نہیں، مقامی ٹی وی بھی اسی قسم کے اشتہارات دکھا رہے ہونگے۔ ان وڈیو اشتہارات میں چونکہ تنہا لوگ ایک دوسرے کو دیکھ بھی سکیں گے اس لئے ایسے پروگرام خاصے مقبول ہونگے۔ غور طلب نکتہ یہ ہے کہ ایسی خدمات صرف رومانوی ملاقاتوں تک ہی محدود کیوں رکھی جائیں ان پروگراموں میں شریک حیات کے علاوہ عمومی دوستی کے خواہاں لوگوں کی داد رسی کے لئے بھی ادارے بنائے جانے چاہئیں۔ سماج کو ایسی خدمات کی یقیناً ضرورت ہے جن کی بنیاد نیک نیتی اور شائستگی پر ہو، لہٰذا ان سے رجوع کرنے یا قائم کرنے

MashalBooks.org

میں کوئی ہچکچاہٹ بھی نہیں ہونی چاہئے۔

ٹیلی کمیونٹی

طویل المیعاد سماجی پالیسی کی سطح پر ہمیں انتہائی سرعت سے ''ٹیلی کمیونٹی'' کا رواج عام کرنا ہوگا۔ کمیونٹی کا احیاء کرنے والوں کو پیداواری نقل وحرکت او انتقال پذیری کے تباہ کن اثرات کی طرف متوجہ ہونا ہوگا۔ اس سلسلے میں میں اپنی کتاب ''مستقبل کا زلزلہ'' میں تفصیلاً لکھ چکا ہوں۔ اس لئے میں ان دلائل کا یہاں اعادہ نہیں کروں گا۔ بہرحال تیسری لہر کی جانب بڑھتے ہوئے کمیونٹی کا شعور بلند کرنے کے لئے، نقل وحمل کے ذرائع کی جگہ مواصلات کی تعمیر، کلیدی اقدامات میں سے ایک قدم ہوسکتا ہے۔

یہ عمومی خوف محض سادہ لوحی پر مبنی ہے کہ کمپیوٹر اور ٹیلی مواصلات کی وجہ سے بالمشافہ ملاقات کے مواقع کم ہو جائیں گے۔ انسانی رشتے کمزور ہو جائیں گے یا غیر حقیقی لگیں گے۔ عین ممکن ہے ایسی ٹیکنالوجی کے فروغ کا نتیجہ اس کے بالکل برعکس ہو۔ دفتروں اور فیکٹریوں میں کچھ عملی رشتے ضرور متاثر ہوں گے مگر گھروں او کمیونٹی کے باہمی تعلقات کو مزید تقویت مل سکے گی۔ کمپیوٹر اور مواصلاتی ٹیکنالوجی کمیونٹی کے احیاء میں معاون ثابت ہو سکتی ہے اور کچھ نہ بھی ہو تو اس ٹیکنالوجی کے استعمال سے ہمیں روزانہ کام کے لئے آمدورفت کے معمول سے نجات مل سکتی ہے، جس سے ہمارے گھریلو اور سماجی رشتے خاصے متاثر ہوتے ہیں۔ گھروں میں معاشی عمل کی اس استعداد کی بدولت، خاندانوں کو استحکام مل سکتا ہے۔ ممکن ہے الیکٹرانک کاٹیج اور مستقبل میں چھوٹے کاروبار کا ماڈل ثابت ہو، جس میں گھر کے افراد مل جل کر کام کر سکتے ہیں۔ (مزید پھیلاؤ کے ذریعے کچھ باہر کے لوگ بھی اس میں شامل ہو سکتے ہیں)

تمام دن گھر میں مصروف کار جوڑے شام کو گھروں سے باہر نکلنا چاہیں گے (آج کل تھکے ہارے لوگ شام کو گھر آ کر، گھر سے باہر نکلنے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔) ٹرانسپورٹ کی جگہ مواصلات کی آمد سے محلوں میں، ریستورانوں، سینما گھروں، کلبوں کا ایک نیا سلسلہ تعمیر ہوسکتا ہے جہاں لوگ بالمشافہ ہی ایک دوسرے سے مل رہے ہونگے۔

دیکھا جائے تو سب بالواسطہ رشتوں کو رد بھی نہیں کیا جانا چاہئے۔ مسئلہ رشتوں

میں واسطوں کا نہیں بلکہ ان میں پائی جانے والی عملی سستی اور جمود کا ہے۔ معذور اور شرمیلے لوگوں کے لئے ظہور پذیر اطلاعاتی دائرے میں دوسرے ہم مزاج لوگوں سے الیکٹرانک رابطے کرنا ممکن ہو جائے گا۔ شطرنج کے کھلاڑی، ڈاک ٹکٹ جمع کرنے والے، شاعری پسند یا کھیلوں کے شائقین ملک کے کسی بھی حصے میں ایک دوسرے سے گفتگو کر سکیں گے۔

چاہے یہ رابطے کتنے ہی بالواسطہ کیوں نہ ہوں لیکن علاج تنہائی کے طور پر، آج کا ٹی وی دیکھنے سے بہتر ہے کیونکہ ٹی وی میں تو پیغامات کا یک طرفہ بہاؤ ہی ہوتا ہے اور اس میں غیر متحرک ناظرین کی شمولیت ناممکن ہے۔ مواصلات کے چنیدہ استعمال سے ٹیلی کمیونٹی کے مقاصد کا حصول ممکن ہے۔ تیسری لہر کی تہذیب کی تشکیل کے دوران ہم کمیونٹی کے تحفظ اور ترویج کے لئے بہت کچھ کر سکتے ہیں۔

MashalBooks.org

باب25

مستقبل کی شخصیت

جوں جوں ہماری روزمرہ زندگی میں نئی تہذیب کے آثار نمودار ہوتے ہیں، ہم حیرت زدہ ہو کر سوچتے ہیں کہ کہیں ہم بھی فرسودہ تو نہیں ہو گئے۔ اپنی عادات، اقدار اور اوقات کار کے مشکوک ہو جانے سے ہم خود کو دوسری لہر کی تہذیب کی باقیات تصور کرتے ہیں۔ ہم آنے والے دور کے تقاضوں سے خود کو ہم آہنگ نہیں کر پائے تو کیا ہمارے درمیان کچھ اور لوگ ایسے بھی ہیں جو تیسری لہر کی تہذیب کے نمائندہ شہری سمجھے جا سکیں۔ اپنے گرد و پیش کی ٹوٹ پھوٹ سے بلند تر ہو کر کیا ہم مستقبل میں ابھرنے والی شخصیت یعنی ''نئے آدمی'' کے خدوخال دیکھ سکتے ہیں؟

اگر ہم مستقبل کے آدمی کا خاکہ تیار کر بھی لیں تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہو گی۔ آندرے ایڈلر نے اپنے ایک معرکہ الآرا مضمون میں نئے انسان کے متعلق پیش گوئیوں کا ذکر کیا ہے۔ اٹھارویں صدی کے آخر میں امریکہ میں ایسے ''امریکی آدم'' کا ذکر کیا گیا جسے شمالی امریکہ میں پیدا ہونا ہے جو یورپ کی تمام کمزوریوں اور برائیوں سے مبرا ہو گا۔ بیسویں صدی کے وسط میں اس نئے آدمی کی ہٹلر کے جرمنی سے اٹھنے کی پیش گوئی کی گئی۔ ہرمان روشنگ کے مطابق ''نازیت مذہب سے بھی بالاتر شے ہے۔ یہ سپر مین کی تخلیق کی خواہش ہے۔'' یہ آرین بیک وقت کسان، جنگی سپاہی اور دیوتا ہو گا۔ میں نے اس نئے آدمی کو دیکھ لیا ہے'' ہٹلر نے ایک دفعہ روشنگ کو اعتماد میں لے کر بتایا۔ ''وہ بڑا بے باک اور سنگدل ہے۔ میں تو اس کے سامنے خوف زدہ کھڑا رہا۔''

نئے آدمی کا تصور (کوئی بھی نئی عورت کی بات نہیں کرتا، سوائے پس اندیشی کی صورت کے) کیمونسٹوں کے ہاں بھی موجود ہے۔ روس والے اب بھی کہتے ہیں کہ وہ نیا

آدمی ''سوشلسٹ'' ہے لیکن ٹراٹسکی نے انتہائی جوشیلے انداز میں اس کی تصویر کشی کی ہے۔ ''وہ انسان ایسا ہوگا جس کی طاقت کا موازنہ ممکن ہی نہیں۔ وہ عقلمند اور زیادہ سمجھ دار ہوگا۔ اس کا جسم انتہائی سڈول اور آواز میں موسیقیت اور حرکات میں موزونیت ہوگی۔ اس کے طور طریقوں میں ڈرامائی خصوصیات ہوں گی۔ ایک اوسط آدمی میں بھی ارسطو، گوئٹے اور مارکس کی خصوصیات موجود ہوں گی۔''

غالباً ایک دوعشرے پہلے فرانز فینن نے بھی ایک نئے آدمی کی تخلیق کی خبر سنائی، جس کا ''نیا دماغ'' ہوگا۔ چی گویرا نے مستقبل میں اپنے آئیڈل آدمی کو ایک بھرپور داخلی زندگی کا حامل بتایا۔غرض ہر تصور مختلف ہے۔

ریسلر انتہائی مدلل طریقے سے اس حقیقت کی جانب اشارہ کرتا ہے کہ نئے آدمی کے ان تمام تصورات کے پیچھے وہی جانا پہچانا قدیم آدمی۔۔۔۔شریف النفس جنگلی، دیومالائی مخلوق، اپنی فطری صفات کے ساتھ۔۔۔۔ ہے، تہذیب نے جس کی فطرت کو مسخ کر کے رکھ دیا۔ ریسلر ابتدائی آدمی کے متعلق اتنی زیادہ رومانیت پسندی کو شک کی نظر سے دیکھتا ہے۔ وہ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ ''نئے آدمی'' کی افزائش کی حکمت عملی اختیار کرنے والی حکومتیں اپنے ملکوں کو ہولناک ''مطلق العنانیت'' کی تاریکی کی جانب دھکیل دیتی ہیں، لہٰذا ایک اور ''نئے آدمی'' کی تخلیق کا دعوی احمقانہ ہی ہوسکتا ہے۔ (گو حیاتیاتی انجینئروں کی تمام تر تحقیق کا ہدف بھی کچھ ایسا ہی ہے) اس تصور کے مطابق نقش اول یا کوئی ماڈل نظر آتا ہے جس کی نقالی ساری تہذیب پر لازم ہوتی ہے۔ تخصیص پسند معاشرہ ایسے کسی تصور کو ذرا بھی قبول نہیں کرسکتا۔

تاہم مادی حالات کے بدلنے سے انسانی شخصیت یا سماجی کردار میں بھی تغیرات پیدا ہوتے ہیں۔ سماج کے بنیادی ڈھانچے میں تبدیلیوں کے ساتھ انسانی فطرت بھی تغیر پذیر ہوتی ہے۔ غیر متغیر انسانی خطرے کے عمومی نظریئے سے مجھے قطعی اتفاق نہیں۔ تاہم بالفرض اسے مان بھی لیا جائے تو یاد رہے معاشرا چھی صفات کو نوازتا ہے اور بری حرکات پر سزا دیتا ہے اور سا عمل سے اوصاف میں ارتقائی تغیرات رونما ہوتے ہیں۔

نفسیاتی تجزیہ نگار ایرک فرام۔۔۔۔ غالباً سماجی کردار کے بہترین لکھاری۔۔۔۔

MashalBooks.org

نے اس کی تعریف یوں کی۔ ''کرداری ساخت کا وہ حصہ جو گروہ کے اکثر اراکین میں عام طور سے موجود ہو۔'' فرام کے مطابق کسی بھی سماج میں پائی جانے والی مشترکہ صفات۔۔۔۔جن کا مجموعہ سماجی کردار کہلاتا ہے۔۔۔۔ اس کے لوگوں کے عمل کے لئے قابل تقلید مثال سمجھی جاتی ہے۔

لہٰذا تیسری لہر کی تہذیب کسی مثال سپرمین کی تخلیق کے بجائے سماجی اوصاف کو تبدیل کر کے ایک نیا سماجی کردار پیدا کر رہی ہے۔ ایسے اوصاف صرف خارجی دباؤ سے پیدا نہیں ہوتے بلکہ انفرادی خواہشات اور سماج کی جانب سے پڑنے والے خارجی دباؤ کے درمیان تناؤ سے پیدا ہوتے ہیں لیکن ایک دفعہ تشکیل پا کر یہ مشترکہ کرداری صفات سماج کے معاشی اور سماجی ارتقاء میں انتہائی موثر عوامل بن جاتی ہیں۔ مثلاً دوسری لہر کی آمد کے ساتھ عمل کا پروٹسٹنٹ عقیدہ بھی عام ہوتا گیا جس میں کفایت شعاری، ان تھک محنت اور فوری تسکین سے گریز شامل تھا۔ اس سوچ نے معاشی ترقی کے لئے بے پناہ انسان قوت فراہم کی۔ اسی طرح دوسری لہر نے معروضیت، موضوعیت، انفرادیت، حاکمیت کے متعلق رویئے اور تجردی سوچ کی اہلیت، ذاتی پہچان اور تصور کی صلاحیت غرض سب میں تغیرات پیدا کئے۔

کاشتکاروں کو صنعتی قوت عمل کا حصہ بنانے کے لئے ان کی ابتدائی تعلیم بھی ضروری تھی۔ انہیں علم اور معلومات سے آگاہ کرنا تھا، ان میں تبدیلی لانا تھی۔ ان کے ذہنوں میں ایک اور طرز زندگی کا تصور پیدا کرنا تھا۔ چنانچہ ان کاموں کے لئے بہت سے کارکن لوگوں کی ضرورت تھی جو اس نئے کردار اور ماحول میں خود کو جذب کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ حال کے جبر سے انہیں ذہنی آزادی چاہئے تھی۔ چنانچہ کسی حد تک مواصلات اور سیاسیات کو جمہوری بنانا پڑا اور صنعتی نظام کو بھی تخیلات کو جمہوری بنانے پر مجبور ہونا پڑا۔ ان سماجی نفسیاتی تبدیلیوں کے نتیجے میں نئی صفات۔۔۔۔ ایک نئے سماجی کردار۔۔۔۔ نے جنم لیا۔ آج ایک بار پھر ہم ایسی ہی نفسیاتی سماجی تبدیلیوں کے کنارے پر کھڑے ہیں۔

ہم دوسری لہر کی آرویلین یکسانیت سے کٹتے جا رہے ہیں۔ یہ حقیقت نئی نفسیات کو عام کرنے کا عمل مشکل تر کر رہی ہے۔اس مقام پر ہم مستقبل کے بارے میں محض اندازے ہی لگا سکتے ہیں۔

بہر حال ہم تیسری لہر کے معاشرے میں نفسیاتی ارتقاء کو متاثر کرنے والی طاقت ور تبدیلیوں کی جانب اشارہ کر سکتے ہیں، جن سے بچوں کی مروجہ پرورش، تعلیم، بلوغت، کام اور خود شنائی کے طور پر طریقوں پر نت نئے اثرات مرتب ہونگے، تاہم مستقبل کے سماجی کردار میں گہری تبدیلیاں پیدا کئے بغیر یہ سب کچھ قطعی ناممکن ہوگا۔

نشو ونما کا مختلف انداز

پہلی بات تو یہ، کل کے معاشرے میں پروان چڑھنے والا بچہ ہمارے معاشرے کی نسبت کہیں کم مرکزی اہمیت کا حامل ہوگا۔ ترقی یافتہ صنعتی ممالک میں عمر رسیدہ لوگوں کو دیکھ بھال پر ارتکاز کی وجہ سے بچوں کی پرورش پر وہ خصوصی توجہ باقی نہیں رہی جو ضروری تھی۔ دوسری وجہ، خواتین کے ملازمتوں اور دیگر پیشوں میں چلے جانے کی وجہ سے، ان میں مامتا کا جذبہ ختم ہونا ہے۔ وہ ماں کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام نہیں دے سکتیں۔

دوسری لہر کے بچوں کی پرورش میں ان کے والدین کے خوابوں کا بہت ہاتھ ہوتا تھا کیونکہ اولاد کی پرورش میں ان کی یہ خواہش پنہاں ہوتی تھی کہ ان کی نسل معاشی اور سماجی طور پر ان سے آگے بڑھے گی۔ موجودہ متوسط طبقے کے گھروں میں بچوں کی کامیابی کے گرتے ہوئے معیار پر دکھ کا اظہار ہوتا ہے اور اس طرح والدین کے ذہنوں میں چھپے خواب جو بچوں کے ذریعے مکمل ہوتے۔۔۔۔ اپنی تعبیر سے محروم نظر آتے ہیں۔ انہی وجوہ کی بنا پر ممکن ہے کہ کل کا بچہ ایسے ماحول میں پلے، جہاں اس کی ضروریات، خواہشات، نفسیاتی نشو ونما اور تسکین میں کوئی خاص دلچسپی نہ لی جائے۔ اگر ایسا ہوا تو کل کا ڈاکٹر سپاکس ایک خوبصورت او بھر پور بچپن کی تشکیل پر زور دے رہا ہوگا اور والدین اس ذمہ داری سے بچ رہے ہونگے۔ نوجوانی کا مرحلہ بھی اتنا طویل اور تکلیف دہ نہیں ہوگا جتنا کہ آج ہے۔ لاکھوں بچے تنہا والدین کے ساتھ پرورش پا رہے ہیں۔ نوکری پیشہ ماں باپ سرعت انگیز معیشت میں پستے ہوئے، 1960ء کی دہائی کی پھولوں جیسی نئی نسل کو نہ ضروری آسائشات بہم پہنچا سکتے ہیں اور نہ ہی مناسب وقت۔

آگے چل کر پیدا ہونے والے بچے کاروباری یا الیکٹرانک کاٹیج میں پرورش پا رہے ہونگے۔ یہ بچے ابتدائی عمر ہی سے خاندانی کاروبار میں شامل ہو کر ایک ذمہ دارانہ

کردار ادا کریں گے۔ اس طرح ان کے بچپن اور بلوغیت کے درمیانی عرصہ میں کمی ہو گی تاہم اسی دوران ان کی ذمہ داری اور پیداواری صلاحیت میں اضافہ ہو گا۔ بڑوں کے شانہ بشانہ کام کرنے سے، ممکن ہے، بچے اتنا کچھ سیکھ جائیں کہ آئندہ زندگی میں کامرانیاں ان کی منتظر ہوں۔

نئی تہذیب کی جانب پیش رفت کے اس عبوری دور میں کم ذرائع معاش کی وجہ سے، عین ممکن ہے دوسری لہر کی مزدور یونین بچوں کے گھر سے باہر کام کرنے کی مخالفت کر لے۔ ایسی یونینیں یہ مطالبہ بھی کر سکتی ہیں کہ بچوں کی لازمی تعلیمی مدت میں اضافہ کیا جائے۔ اگر وہ کامیاب ہو گئے تو لاکھوں بچے توسیع شدہ نو بلوغت کی تاریکی میں بھٹکتے پھریں گے۔ یوں بچوں کی دو اقسام ہو جائیں گی۔ ایک ایسے بچے جو شروع سے ہی الیکٹرانک کاٹیج میں کام کاج کرتے جوان ہونگے اور دوسرے وہ جنگی پرورش ایسے تجربوں کے بغیر آہستہ آہستہ کی گئی ہو گی۔

بہر طور ایک طویل کج بحثی کے بعد یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ تعلیمی نظام میں بھی تبدیلی آئے گی۔ تعلیمی عرصہ مختصر ہو جائے گا۔ عمر کے تفاوت سے قطع نظر نوجوان اور عمر رسیدہ کارکن باہم مل بیٹھیں گے۔ تعلیم اور ہنر ایک دوسرے میں مدغم ہو کر عملاً پوری زندگی پر پھیل جائیں گے اور کام چاہیئے تبادلہ کی پیداوار کا ہو یا ذاتی استعمال کا۔۔۔۔ ابتدائی عمر سے ہی شروع ہو جائے گا۔ اسی بنا پر یہ قیاس ممکن ہے کہ تیسری لہر کے بچے مختلف صفات کے حامل ہونگے۔۔۔۔ اصراف میں کمی، باہمی حساسیت میں کم یا ور کم لذت پسندی وغیرہ۔ یہ ہو یا نہ ہو، ایک بات واضح ہے کہ نئی تہذیب میں پروان چڑھنا ایک بالکل مختلف تجربہ ہو گا اور اس طرح جنم لینے والی شخصیت بھی مختلف ہو گی۔

نیا کارکن

جب کوئی بالغ روزگار کی مارکیٹ میں داخل ہوتا ہے تو اسکے ذاتی اوصاف میں سے کچھ اس کے لئے فائدہ مند ثابت ہوتے ہیں اور بعض کی وجہ سے اسے مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

دوسری لہر کے دور میں فیکٹریوں اور دفتروں میں ایک مخصوص طرح کا کام، انتہائی

سرعت سے ہوتا رہا۔ کام کے زیادہ دباؤ کی وجہ سے مالکان اپنے ملازمین سے اطاعت گزاری، وقت کی پابندی اور مختلف النوع کاموں کے لئے ہمیں وقت موجودگی کی توقع کرتے تھے۔ اس قسم کی تربیت سکولوں میں ہی دی جاتی تھی اور کارپوریشن اس تربیت کا، گویا انعام دیا کرتی تھی۔

معاشرے میں تیسری لہر کی آمد کے ساتھ ہی کام کے دباؤ اور اس کے یکساں تواتر میں کمی آئی ہے۔ ہر کارکن کے حصے کے کام میں اضافہ، اوقات میں لچک اور رفتار کار کا ذاتی تعین جیسے عوامل نے کردار کی ہم آہنگی کی ضرورت کو ختم کر ڈالا ہے۔ کاری گروں کو تبادلے، پیداواری اشیاء میں تنوع اور تنظیمی رد وبدل کے علاوہ کام کے دوران رونما ہوتی اچانک تبدیلیوں کا بھی سامنا کرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ تیسری لہر کے آجروں کو ایسے کارکنوں کی ضرورت ہو گی جو زیادہ ذمہ دار ہوں، اپنے حصے کے عمل میں وسعت اور سرعت انگیز تبدیلیوں سے عہدہ برا ہوسکیں۔ ویسٹرن الیکٹرک میں تعلیمی شعبے کے جنرل مینجر ڈونلڈ کونور کے مطابق دوسری اور تیسری لہر کے کارکنوں کے درمیانی فرق کو کلاسکی مغربی موسیقی اور جاز کے فرق سے سمجھا جا سکتا ہے۔ کلاسیکی موسیقی کے آرکسٹرا کے اراکین اپنے سازوں پر متعین سر نکالتے ہیں جبکہ جاز گروپ کے ارکان ایک نغمے کا چناؤ کر کے باہم مل کر فی البدیہہ سروں کے زیر و بم کا فیصلہ کرتے رہتے ہیں۔

ایسے لوگ پیچیدہ، منفرد، دوسروں سے مختلف نظر آنے والے طور طریقوں پر نازاں نظر آتے ہیں۔ تیسری لہر کی صنعت کے لئے مطلوبہ مخصوص افرادی قوت کے لئے ان جیسے لوگ ہی موزوں ہوتے ہیں۔

رائے عامہ کے ایک محقق ڈینئیل یانکی لووچ کے مطابق امریکی کارکنوں کا صرف 56%۔۔۔۔خصوصاً عمر سیدہ لوگ۔۔۔۔ روایتی ترغیب سے متاثر ہوتا ہے۔ وہ کام میں سخت گیر رہنما خطوط اور واضح کاموں سے بہت خوش محسوس کرتے ہیں۔ وہ اپنے کام میں ''معنویت کی تلاش کی توقع ہی کرتے۔ اس کے برعکس تقریباً 17% افرادی قوت پہلے یہ تیسری لہر کی ابھرتی ہوئی نئی اقدار کو اپنا رہی ہے۔ نسبتاً جوان اور اوسط درجے کے مینجرز کام میں زیادہ ذمہ داری او رشعور کا مظاہرہ کرتے ہیں اور بہتر اجرت کے ساتھ ساتھ عمل کی

معنویت میں بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔ بقول یانکی لووچ کے یہ لوگ اپنی ذہانت اور مہارت کے جوہر دکھانے کے لئے زیادہ ذمہ داری اور زیاد محنت کا بوجھ اٹھانے کے لئے پاگل ہو تے ہیں۔''

ایسے کارکنوں کی بھرتی کے لئے کمپنیاں اجرت کی شرح، ہر کارکن سے الگ الگ طے کرتی ہیں۔ اس سے ان وجوہ کا پتہ چلتا ہے کہ بعض اعلیٰ ٹیکنالوجی کی حامل کمپنیاں، اپنے کارکنوں کی اجرتوں میں یکساں ضمنی فوائد کی شرح کو خیر باد کہہ کر امتیازی تعطیلات، طبی اخراجات، پنشن اور انشورنس کی مختلف شرحیں کیوں مقرر کر رہی ہیں۔ ہر کارکن، اپنی ضروریات کے مطابق ان میں سے چناؤ کر کے اپنے لئے پیکج کا خود تعین کر سکتا ہے۔ تمام کارکنوں کو زیادہ اور بہتر کام کی ترغیب کا کوئی واحد طریقہ باقی نہیں رہا۔ آسائشوں اور نقدی کے اس امتزاج میں نقد اجرت کی اہمیت اب مقابلتاً کم ہوگئی ہے۔

اس کا مطلب قطعی یہ نہیں کہ کاریگر پیسے لینا نہیں چاہتے لیکن آمدنی کی ایک سطح پر آ کر ان کی طلب اور خواہشات میں تنوع پیدا ہونے لگتا ہے۔ تنخواہ میں اضافہ ان کی عملی ترجیحات پر اتنا اثر نہیں ڈالتا جتنا اس کا اثر ماضی میں ہوتا تھا۔ سان فرانسکو میں بینک آف امریکہ نے جب اپنے اسسٹنٹ وائس پریذیڈنٹ رچرڈ ایزلی کو ترقی دے کر صرف 20 میل دور واقع ایک براچ میں جانے کو کہا تو اس کا جواب نفی میں تھا۔ وہ روزانہ کام کی خاطر اتنا طویل سفر کرنا نہیں چاہتا تھا۔ تبادلوں سے انکار کرنے والوں کی شرح اب 1/3 اور 1/2 کے درمیان تک آ گئی ہے۔ لبرل لنچ کے مطابق ''تبادلوں سے منسلک مراعات بھی انہیں اس انکار سے نہیں روک سکتیں۔''

تیسری لہر کی کارپوریشن کی طرح جس کے پیش نظر منافع کے علاوہ دوسری مقاصد بھی ہوتے ہیں، جدید دور کے ملازم کے پیش نظر بھی متعدد مقاصد ہوتے ہیں۔

اقتدار کے صدیوں سے منجمد نقوش بھی اب تغیر پذیر ہیں۔ دوسری لہر میں ہر کارکن کا ایک ہی باس ہوتا ہے۔ ملازمین کے باہمی جھگڑے اسی کو چکانے پڑتے تھے۔ موجودہ قالبی اداروں میں مکمل تبدیلی آ رہی ہے۔ ایک کارکن کے لئے بیک وقت کئی باس ہو سکتے ہیں۔ مختلف مرتبوں اور مختلف ہنر والے لوگ، وقتی طور پر قائم ٹیموں میں اکٹھے ہو کر

مسائل کا حل ڈھونڈتے ہیں۔ یہ بات طے ہوتی ہے کہ مسائل واقعی حل طلب ہیں اور گفتگو کے دوران اظہار خیال کی مکمل آزادی ہوتی ہے اور اختلاف رائے کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

ایسے نظام میں اندھی تقلید کے عادی کارکن پریشان ہوتے ہیں اور حدود میں رہتے ہوئے اپنی رائے کا دفاع کرنے والوں کو اچھی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ دوسری لہر کی صنعت میں کاریگروں کی جن صفات کو برا سمجھا جاتا تھا، تیسری لہر کی صنعتیں ان صفات کے بغیر چلائی ہی نہیں جاسکتیں۔ مثلاً معنویت کی تلاش، احکامات پر تنقیدی نظر، اپنے کام کے سماجی رخوں پر اصرار وغیرہ۔

صانف کی اخلاقیات

تیسری لہر کی تہذیب میں، شخصی تشکیل میں پرورش، تعلیم اور عمل کے علاوہ اور بھی کئی عوامل شامل ہونگے کیونکہ معیشت کا دائرہ عمل محض ملازمتوں اور اجرتی کام تک ہی محدود نہیں۔ میں پہلے ہی یہ تجویز دے چکا ہوں کہ ہم معیشت کو دو شعبوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک تبادلے کا پیداواری شعبہ اور دوسرا اپنے لئے کام کرنے کا۔ دونوں کا ضابطہ اخلاق اور اقدار الگ الگ ہیں اور دونوں میں کامیابی کے معیار بھی جدا جدا ہیں۔

دوسری لہر کے دوران مارکیٹ کی معیشت بہت پھلی پھولی۔ اس نے مالی تحصیل کی اخلاقیات کو حصولہ دیا او ذاتی یا شخصی کامیابیوں کو حقیقی کامیابی گردانا۔ تیسری لہر کی ترقی کے ساتھ ساتھ ایک نیا مظہر ابھرا، جس کی بدولت اپنی مدد آپ اور خود انحصاری کو فروغ مل صانفی پیداوار کو محض ذاتی استعمال یا شوق کے بجائے زیادہ معاشی اہمیت ملی کیونکہ صانفانہ عمل میں زیادہ وقت اور توانائی صرف ہوتے ہیں۔ یہ ہماری زندگیوں پر اثر انداز ہوتا ہے اور ہمارے سماجی کردار کو لچکیلا بناتا ہے۔

مارکیٹ کی اخلاقیات کی طرح فرد کو اس کے ملکیتی اعداد سے جانچنے کے بجائے، صانفانہ ضابطہ اخلاق میں اس کے عمل میں پہچانا جاتا ہے۔ امیر آدمی کی عزت تو ہے ہی لیکن زر کے علاوہ کرداری صفات کی بھی اہمیت ہوگی۔ ان میں خود انحصاری اور مشکل حالات سے مطابقت پیدا کر کے اپنی بقا کا ضامن بننا اور اپنے ہاتھوں سے کام کرنے کی صلاحیت حاصل

کرنا، چاہئے اس کا اظہار گھر کا جنگلا کھڑا کرنے، کھانا پکانے، کپڑے سینے یا کوئی چھوٹی موٹی مرمت کرنے سے ہی کیوں نہ ہو۔

مارکیٹ کی اخلاقیات میں ذہنی یکسوئی کی اہمیت ہوتی ہے جبکہ صانفیت میں وسعت نظر زیادہ افضل ہوتی ہے۔ تبادلاتی پیداوار اور صانفی پیداوار میں توازن کے امکانات کے ساتھ ہی متوازن طرز زندگی کی خواہش بھی بڑھ رہی ہے۔ فعالیت کے پیداواری شعبے میں صانفانہ (خودصرف پیداوار) شعبے کی جانب انتقال پذیری کی بدولت ایک قسم کے توازن کی بات بھی کی جا رہی ہے۔ تبادلاتی اشیاء کے کاریگر لفظ، عدد اور ماڈل کے تجریدی الفاظ کا استعمال کرنے لگے ہیں۔ ان تجریدی الفاظ کے استعمال سے بعض لوگ خوشی اور فائدہ حاصل کرتے ہیں۔ لیکن بعض افراد کے لئے بے جان حوالے انسانی جذبوں اور تصورات سے ان کا تعلق منقطع کر دیتے ہیں، لہٰذا دستکاری، باغبانی، کاشتکاری کے عمل کی پذیرائی سے پیدواری شعبے میں روز افزوں تجریدیت کی تلافی کی جا سکتی ہے۔

اس کے برعکس صانفیت میں ہم عموماً اشیاء اور افراد سے ابتدائی تعلق میں زیادہ ٹھوس اور فوری حقیقت کا سامنا کرتے ہیں۔ جوں جوں زیادہ لوگ جزوقتی کارکن اور جزوقتی صنف کی حیثیت میں اپنا وقت تقسیم کرتے ہیں، وہ سامنے نظر آتی حقیقت کو تجریدیت کے ساتھ ملا کر ذہنی اور دستی کام، دونوں کی لطف انگیزی کا مزا لینے کی پوزیشن میں ہوتے ہیں۔ ضابطہ اخلاق دستی کام کو ایک بار پھر قابل احترام بنا رہا ہے۔ جبکہ تین سو سال تک اسے حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا رہا ہے۔ یہ نیا توازن بھی شخصی اوصاف کی تقسیم پر اثر انداز ہونے جا رہا ہے۔

ہم نے یہ بھی دیکھا کہ صنعتی ابھار کے ساتھ کارکن مرد خود کو معروضی کہلانے لگے جبکہ خواتین خانہ موضوعیت (داخلیت) کا شکار ہوگئیں۔ اب خواتین بھی تبادلاتی پیداواری عمل میں شریک ہو کر اپنی موضوعیت کو تبدیل کر کے معروضی (خارجی) ہوتی جا رہی ہیں۔ انہیں ''مردوں کی طرح سوچنے'' کی ترغیب دی جا رہی ہے۔ اس کے برعکس مرد گھر پر زیادہ وقت گزارتے ہیں اور گھریلو کام کاج کی ذمہ داری لے رہے ہیں۔ اس طرح ان کی ''معروضیت'' گھٹ رہی ہے اور ان میں ''موضوعیت'' رہی ہے۔ تیسری لہر کی بڑی بڑی

کمپنیوں میں کام کرنے کے ساتھ ساتھ جز وقتی طور پر اپنے گھروں کے چھوٹے چھوٹے خود مختار یونٹوں میں صانفانہ عمل سے خواتین و حضرات کے درمیان معروضیت اور موضوعیت کا ایک نیا توازن قائم ہو رہا ہے۔ جنسی بنیاد پر علیحدہ علیحدہ مخصوص اور غیر متوازن رویوں کے بجائے ایسے توازن کو۔۔۔۔ جہاں دنیا کو ہر دو تناظر میں دیکھنے کا صحت مندانہ رویہ موجود ہو۔۔۔۔ معاشرہ یقیناً بنظر احسن دیکھے گا۔ معروضی موضوعیت پسندوں اور موضوعی معروضیت پسندوں کا توازن۔

مختصراً معیشت میں صانفیت کی بڑھتی ہوئی اہمیت کے ساتھ ہم نفسیاتی تبدیلی کا ایک اور لہرا بھرتی دیکھ رہے ہیں۔ تبادلاتی پیداوار اور صانفانہ پیداوار میں بنیادی تغیرات کا مشترکہ اثر بچوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت کے ساتھ مل کر ہمارے سماجی کردار کو اسی ڈرامائی انداز میں نئی ترتیب دینے جا رہا ہے جس طرح تین سو سال پہلے دوسری لہر نے تشکیل دیا تھا۔ غرض ہمارے درمیان ایک نیا سماجی کردار ابھر رہا ہے۔

درحقیقت ان فکر انگیز حقیقتوں میں سے اگر ہر ایک غلط ثابت ہو جائے، اگر وہ تمام تبدیلیاں، جو ہم نے دیکھنا شروع کی ہیں الٹی سمت ہونے لگے جائیں، پھر بھی ایک آخری اور بہت بڑا سبب باقی ہے جو نفسیاتی دائرے میں بہر صورت تبدیلی لائے گا اور اس سبب کو صرف دو لفظوں میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ ''مواصلاتی انقلاب''

میری ہیئت کذائی

مواصلات اور کردار کا درمیانی تعلق خاصا پیچیدہ مگر اٹوٹ ہے۔ ذرائع مواصلات میں دور رس تبدیلیوں کا اثر بہر صورت ہم پر پڑتا ہے۔ مواصلات میں انقلاب کا مطلب ہماری نفسایات میں انقلاب کا رونما ہونا ہے۔

دوسری لہر کے دوران لوگ بے پناہ پیدا شدہ تصورات کے سمندر میں تیر رہے تھے۔ مرکزی طور پر پیدا شدہ اخبارات و جرائد، ریڈیو اور ٹی وی نشریات کے ذریعے پورے معاشرے پر یکساں شعور مسلط کر دیا گیا تھا۔ افراد کے لئے چندگنی چنی شخصیات ہی ایسی تھیں جن سے وہ اپنی شخصیت اور طرز زندگی کا موازنہ کر سکتے تھے۔ اس طرح معاشرے میں قابل قبول مثالی شخصیات میں تنوع اور انکی تعداد محدود تھی۔

ذرائع ابلاغ کے ارتکاز سے مثالی شخصیات کا چکاچوند کرتا تنوع، ہمار موازنے کے لئے پیش کیا جا رہا ہے۔ مزید براں، میڈیا مکمل شخصیت کے بجائے اس کی تصویر کے ٹکڑے یا نقاط کے گچھے ہم تک پہنچا پاتا ہے جنہیں جوڑ کر ہم اپنی پسندیدہ شخصیت کی تصویر بنا لیتے ہیں لیکن اس عمل میں مشکلات بہر حال ہیں۔ لاکھوں ایسے لوگ آج اپنے تشخص کی تلاش میں دربدر بھٹک رہے ہیں۔ اس تلاش کا الجھاؤ ہم میں اپنی انفرادیت کا احساس شدت سے ابھارتا ہے اور یوں اپنے متعلق ہمارا تصور بدلتا ہے اور ہم سماج سے اپنی انفرادیت منوانا چاہتے ہیں اور یہ عین اس وقت ہو رہا ہے جب مروجہ پیداواری نظام بھی منفرد کارکنوں کا متلاشی ہے۔ اپنے ذاتی اوصاف کا احساس دلانے کے ساتھ تیسری لہر کا مواصلاتی نظام ہمیں اپنے شخصی تصورات کے صانف میں بھی تبدیل کر رہا ہے۔

ایک جرمن شاعر اور سماجی نقاد ہینز میگنس این سنز برگر کے مطابق ''گزرے کل کے ماس میڈیا میں پیغام وصول کرنے والوں اور ارسال کرنے والوں کے درمیان تکنیکی امتیاز، سماج میں محنت کی سماجی تقسیم کو صانع اور صارف سے ظاہر کرتا ہے۔ دوسری لہر کے پیشہ ور مبلغ سامعین، ناظرین اور قارئین کے لئے پیغام تخلیق کیا کرتے تھے اور یہ سامعین و ناظرین ان پیغامات کو صرف وصول کر سکتے تھے اور ان کے پیداواری عمل میں ان کا کوئی براہ راست یا بالواسطہ عمل دخل نہیں ہوتا تھا۔ اس کے برعکس جدید مواصلات زیادہ تر تفاعلی ہیں۔ جن کا ہر صارف ان کی مدد سے پیغامات نہ صرف وصول کر سکتا ہے بلکہ بھیج بھی سکتا ہے۔ دو طرفہ کیبل ویڈیو، آڈیو کیسٹ اور ریکارڈز سارے ذرائع ابلاغ کو ایک فرد کے تابع کر رہے ہیں۔ مستقبل میں یہ مرحلہ بھی ممکن ہے جب ٹی وی کے عام ناظرین آرچی بنکر یا میری ٹیلر مور کے پروگرام دیکھنے کے ساتھ ساتھ ان کے کرداروں سے گفتگو بھی کر سکیں گے اور ان پر اثرانداز بھی ہو سکیں گے۔ اب بھی کیو کیبل کا ایسا سلسلہ موجود ہے جسے دیکھنے والے، کسی پروگرام ڈائریکٹر کو، اس پروگرام کی کہانی کا اختتام اپنی مرضی سے تجویز کر سکتے ہیں یا اس کے ایکشن کو تیز یا سست کروا سکتے ہیں۔

مواصلاتی انقلاب ہماری اپنی شخصیت کا کہیں زیادہ پیچیدہ خاکہ ہمارے سامنے پیش کر رہا ہے۔ یہ ہمیں مزید مختلف رنگ دے رہا ہے۔ ہماری اپنی شخصیت کے مختلف خاکے ''ابھارنے میں'' ہماری فعالیت کو تیز تر کر رہا ہے اور ہم اپنے تراشیدہ تصور کو الیکٹرانک طریقوں سے پوری دنیا کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں۔ اس قدرت کے حصول کے بعد بھی

ہماری شخصیت پر اس کے کیا اثرات مرتب ہونگے، کوئی شخص بھی اس کا مکمل ادراک نہیں کر سکتا کیونکہ پہلی تہذیب کو اتنے طاقتور ذرائع مواصلات میسر نہیں تھے۔ ہم بتدریج شعور کی ٹیکنالوجی اپناتے جا رہے ہیں۔

ہم جس دنیا میں داخل ہونے جا رہے ہیں اسے ہمارے پرانے تجربات سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اسی لئے تمام نفسیاتی اندازے اور تخمینے مشکوک نظر آتے ہیں۔ یہ بات البتہ صحیح ہے کہ طاقتور لہروں کے دباؤ میں ہمارا سماجی کردار مکمل تبدیلی کی زد میں ہے۔ دوسری لہر کی تہذیب سے آگے بڑھ کر ہم صرف توانائی اور ٹیکنالوجی کی نئی بنیادیں ہی تخلیق نہیں کر رہے بلکہ انسان کے باطن میں انقلاب بھی بپا کر رہے ہیں۔ چنانچہ مستقبل کے خدوخال متعین کرنے کے لئے ہمارے ماضی کے سارے تجربات ناکارہ ہوگئے ہیں۔

ہمارے مفروضے اگر ذرا بھی صحیح ہیں تو آج کی نسبت مستقبل کے افراد کہیں زیادہ منفرد اور متنوع ہونگے۔ ان میں بیشتر لوگ اپنی ذمہ داریاں نسبتاً کافی پہلے سنبھال لیں گے۔ وہ فطرتاً خاصے لچکدار اور انفرادیت پسند ہونگے۔ پچھلی نسل کے مقابلے میں وہ احکامات کو زیادہ تنقیدی نظر سے دیکھیں گے۔ وہ پیسہ کمانے کے لئے کام کر رہے ہونگے مگر پیسہ کمانا ہی ان کا مطمح نظر نہیں ہوگا۔ وہ اپنی زندگیوں میں۔۔۔کھیل اور کام کے درمیان، پیداوار اور صانفانہ عمل کے درمیان، دماغی اور جسمانی کام کے درمیان، مجرد اور ٹھوس کے درمیان اور معروضیت اور موضوعیت کے درمیان۔۔۔توازن پیدا کر رہے ہونگے۔

تیسری لہر کی تہذیب دیومالائی دور کے تصوراتی باشندوں کی تہذیب نہیں ہوگی اور نہ ہی گوئٹے، ارسطو، چنگیز خان اور ہٹلر جیسے سپرمین کی دنیا بلکہ یہ توقع کرتے ہوئے فخر و انبساط کا احساس ہوتا ہے کہ وہ دنیا واقعی انسانی تہذیب کہلانے کی مستحق ہوگی۔

لیکن اس شائستہ اور جدید تہذیب کی جانب پیش رفت کے لئے ایک آخری اہم شرط۔۔۔ انقلابی سیاسی تغیر ہے اور اس کے انہی امکانات کا۔۔۔ جو دل دہلا دینے والے بھی ہیں اور طمانیت انگیز بھی۔۔۔ ان آخری صفحات میں جائزہ لیں گے۔ مستقبل کی شخصیت کو مستقبل کی سیاست سے لازماً ہم آہنگ ہونا چاہئے۔

باب26

سیاسی مقبرہ

نئی انقلابی لہر اپنے جلو میں توانائی، ٹیکنالوجی، خاندانی زندگی، جنسی رویوں اور مواصلات کے بیک وقت بہت سے انقلاب لا رہی ہے تو یہ ناممکن سا لگتا ہے کہ کسی دھماکہ خیز سیاسی انقلاب کی پیش رفت نہ ہو رہی ہو۔ صنعتی دور کے سارے سیاسی ادارے، جماعتیں، پالیمانی، قومی مجالس، صدارتیں، وزارتیں، عدالتیں اور عمومی محکمے غرض اعلیٰ سطحی فیصلے کرنے اور ان پر عمل درآمد کرانے کے سارے آلات یا تو ناکارہ ہو گئے یا بنیادی تبدیلیوں کی زد میں آ گئے۔ بہرحال دوسری لہر کا سیاسی ڈھانچہ تیسری لہر کی تہذیب کو چلا نہیں سکتا۔ جس طرح جاگیردارانہ نظام دوسری لہر کے انقلابیوں کے لئے ناکارہ اور فرسودہ تھا اسی طرح ہمارے لئے بھی سرمایہ دارانہ نظام کی جگہ نئے سیاسی آلات کی پیدائش ضروری ہو گئی ہے۔ یہی تیسری لہر کا سیاسی پیغام ہے۔

سیاہ سوراخ

ہمیں جس شدید بحران کا سامنا ہے اس کی سنگینی ابھی ہم پہچان نہیں پا رہے۔ یہ محض حکومتی بحران نہیں بلکہ نمائندہ جمہوری نظام کی ساری شکلیں ہی بحران کا شکار ہیں۔ ہر جگہ دوسری لہر کی سیاسی ٹیکنالوجی بری طرح لڑکھڑا رہی ہے۔

امریکہ میں سیاسی فیصلے کرنے والے قومی ادارے مفلوج ہو چکے ہیں۔ تیل کی فروخت پر اوپیک کی پابندیوں کو چھ سال گزر چکے ہیں مگر متعدد تجزیوں اور صدارتی وعدوں کے باوجود، امریکی سیاسی ادارے، ابھی تک توانائی کی کوئی مربوط حکمت عملی وضع نہیں کر پائے۔ حکمت عملی کا یہ خلا صرف توانائی کے شعبے ہی میں نہیں بلکہ شہری ماحولیاتی، خاندانی، ٹیکنالوجی کے معاملات، غرض سارے شعبوں میں ایسا ہی خلا محسوس ہو رہا ہے۔ غیر ملکی نقاد تو

یہ کہتے ہیں کہ امریکہ کی کوئی قابل ذکر خارجہ پالیسی ہی نہیں۔

اگر مندرجہ بالا ساری حکمت عملیاں موجود ہوتیں تو بھی امریکی سیاسی نظام میں انہیں باہم مربوط کرنے اور ترجیحی عملیت کی اہلیت سرے سے ہے ہی نہیں۔ یہ خلا فیصلہ سازی کے اتنے سنگین بحران کا عکاس ہے کہ صدر کارٹر کو ایک اہم تقریر کے دوران، اپنی ہی حکومت کی ''بے حسی، جمود اور غیر مقصدیت'' پر لعن طعن کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ فیصلہ سازی کا یہ فقدان کسی ایک پارٹی یا صدر کا ہی مسئلہ نہیں،1960ء کے عشرے سے اس میں زیادہ شدت آئی ہے اور اس کی وجہ پوشیدہ تحتی (ادارتی) مسائل ہیں جو موجودہ نظام کے دائرے میں رہتے ہوئے کوئی بھی صدر۔۔۔۔خواہ وہ ری پبلکن ہو یا ڈیموکریٹ۔۔۔۔حل نہیں کر سکتا۔ یہ سیاسی مسائل گھر،سکول اور کارپوریشن جیسے بنیادی سماجی اداروں پر بھی منفی اثرات ڈال رہے ہیں۔

گھریلو زندگی پر فوری اثرات مرتب کرنے والے درجنوں قوانین۔۔۔۔ باہم متصادم اور متضاد۔۔۔۔ خاندانی بحران میں مزید شدت پیدا کر رہے ہیں۔ سکول جانے والے بچوں کی تعداد میں اضافے کا احساس ہوتے ہی تعلیمی اداروں کا تعمیراتی فنڈ بے تحاشا بڑھا دیا گیا، ہوا یہ کہ سکول کی عمارتیں ضرورت سے کہیں زیادہ بن گئیں اور جب دوسرے مقاصد کے لئے فنڈز کی طلب ہوئی تو فوراً ہاتھ کھینچ لیا گیا۔ کارپوریشنوں کو سیاسی کھینچا تانی میں کام کرنے پر مجبور کر دیا گیا ہے۔ ان کی روز مرہ کارکردگی حکومتی توقعات کو پورا کرنے کے گرد گھومتی رہتی ہے۔ مثلاً پہلے کانگریس جنرل موٹرز اور دوسرے کار ساز اداروں سے ماحول کو مزید صاف ستھرا رکھنے کی غرض سے کیمیائی تبدیلی سے پیدا شدہ منفی اثرات کو ختم کرنے والے آلات نصب کرنے کا مطالبہ کرتی ہے اور جب جنرل موٹرز 300 ملین ڈالرز ان آلات پر خرچ کر ڈالتی ہے اور ان آلات میں استعمال ہونے والی قیمتی دھات کے حصول کے لئے دس سالہ 500 ملین ڈالرز کی مالیت کا معاہدہ کر لیتی ہے تو حکومت کا اعلان آتا ہے کہ یہ آلات پہلے سے بھی 35 گنا زیادہ سلفیورک ایسڈ خارج کرتے ہیں۔

اسی دوران حکومتی ضابطہ ساز ادارے 45'000 صفحے سالانہ کی رفتار سے قوانین کا ڈھیر لگائے جا رہے ہیں۔ صرف فولاد کی صنعت کے لئے 5600 وفاقی ضابطے ہیں اور ان

MashalBooks.org

پر عمل درآمد کے لئے 27 حکومتی ادارے مامور ہیں(فولاد کی کان کنی، شعبہ فروخت اور ذرائع رسل و رسائل کے لئے ہزار ہا فالتو ضابطے الگ ہیں)۔

ایک معروف دوا ساز کمپنی ایلی للّی، امراض قلب اور کینسر کی تحقیق کے بجائے اپنا زیادہ تر وقت حکومتی گوشوارے بھرنے میں صرف کرتی ہے۔ وفاقی ادارہ توانائی میں ارسال کی گئی، کسی آئل کارپوریشن کی ایک رپورٹ 4لاکھ پینتالیس ہزار صفحات پر مشتمل ہے، جس کا حجم ایک ہزار کتابوں کے برابر ہے۔ ایسی پیچیدگیاں معیشت کا بوجھ بن جاتی ہیں۔ حکومتی اداروں کے لمحاتی اور الٹے سیدھے فیصلے کاربواری افراتفری میں مزید اضافہ ہی کر سکتے ہیں۔ سیاسی نظام کی لمحہ لمحہ بدلتی فضا ہمارے بنیادی سماجی اداروں ک وجود کو برقرار رکھنا مشکل بنا دیتی ہے۔ فیصلہ سازی میں یہ پراگندگی صرف امریکہ کے لئے ہی مخصوص نہیں، فرانس، جرمنی، جاپان، برطانیہ اور اٹلی بھی اسی طرح افراتفری کا شکار ہیں۔ اشتراکی ممالک کا حال بھی کچھ مختلف نہیں۔ ایک جاپانی وزیراعظم کا کہنا ہے: ہم بتدریج عالمی سطح پر جمہوری بحران کا شور سن رہے ہیں۔ اس کے مسائل حل کرنے کی صلاحیت یا جمہوریت کی حکومت کرنے کی اہلیت مشکوک ہوتی جا رہی ہے۔ جاپانی پارلیمانی جمہوریت بھی کٹہرے میں کھڑی ہے۔''

ان تمام ممالک میں سیاسی فیصلہ ساز مشینری بتدریج غیر متعلقہ کوائف میں الجھنے، کام کی زیادتی اور بوجھ کی وجہ سے انجان خدشات وخطرات سے دو چار ہو رہی ہے۔ حکومتی فیصلہ ساز فوری نوعیت کے معاملات نمٹانے سے قاصر ہیں، (وہ جلد بازی میں غلط فیصلے کر ڈالتے ہیں) اور خود کو ہزار ہا غیر اہم یا فضول مسائل میں الجھائے رکھتے ہیں۔ اگر کچھ اہم حکومتی فیصلے ہو بھی جائیں تو تاخیر کی وجہ سے ان کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ ''ہم نہ قانون سازی کے ذریعے ہر مسئلہ حل کر ڈالا ہے۔'' ایک بوکھلائے ہوئے برطانوی قانون ساز کا کہنا ہے''افراط زر قابو کرنے کے لئے ہم نے سات قوانین پاس کئے ہیں۔ ہم ناانصافی کو بارہا ختم کر چکے ہیں۔ ماحولیاتی آلودگی کا مسئلہ بھی حل ہو چکا ہے۔ قانون سازی کے ذریعے ہر مسئلہ ان گنت مرتبہ حل کیا جا چکا ہے۔۔۔۔لیکن مسائل پھر بھی موجود ہیں۔ قانون سازی کا کوئی اثر ہی نہیں ہوتا۔''

ایک امریکی ٹی وی اناؤنسر نے ماضی کی ایک تمثیل کا سہارا لے کر ذرا مختلف انداز

میں یوں کہا۔ ''فی الوقت مجھے یوں لگتا ہے جیسے ہماری قوم ایک ایسی بگھی کی مانند ہے جسے گھوڑے سرپٹ بھگائے لے جا رہے ہیں۔ کوچوان انہیں روکنے کی کوشش میں ہے اور وہ اس کے اشاروں پر کان ہی نہیں دھر رہے۔''

اسی لئے بہت سے لوگ ۔۔۔۔ بشمول اعلیٰ عہدیدار ۔۔۔۔ انتہائی بے بسی محسوس کرتے ہیں۔ ایک معروف امریکی سینیٹر نے تنہائی میں، میرے سامنے اپنی انتہائی بے چارگی کا اعتراف کیا کہ وہ کوئی مفید کام کر ہی نہیں سکتا۔ وہ اپنی گھریلو کی بربادی، اپنے بدحواس وجود، گھنٹوں طویل محنت، مسلسل حالت سفر، کبھی نہ ختم ہونے والی کانفرنسیں اور لگاتار دباؤ پر اظہار تشویش کرتے ہوئے کہتا ہے۔ ''کیا اس سب کا کوئی فائدہ بھی ہے؟'' ایک برطانوی رکن پارلیمان یہی سوال دہرا کر مزید تاثر یوں دیتا ہے۔ ''دارالعوام ۔۔۔۔ آثار قدیمہ کا ایک عجائب گھر ہے۔'' وائٹ ہاؤس کے ایک اعلیٰ افسر نے بظاہر دنیا کے طاقتور ترین شخص ''امریکی صدر'' کی لاچاری کا گلہ مجھ سے یوں کیا۔ ''صدر کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ ٹیلی فون پر چیخ رہے ہیں اور دوسری جانب کوئی انہیں سننے والا ہی نہیں۔''

بروقت اور مفید فیصلے نہ کر سکنے کی یہ بیماری معاشرے میں طاقت کے رشتوں پر اثر انداز ہوتی ہے۔ عام اور غیر انقلابی حالات میں سماج کی اشرافیہ مروج سایسی نظام کو اپنا اقتدار مضبوط کرنے کے لئے استعمال کرتی ہے۔ کچھ کر گزرنے اور کچھ نہ ہونے دینے سے ان کی طاقت کی شناخت ہوتی ہے۔ اس کی بنیادی شرط حالات کا قابو میں ہونا ہے یعنی جب بھی وہ باگیں کھینچیں تو بگھی کے گھوڑے رک جائیں۔

موجود اشرافیہ اپنی کارکردگی کے نتائج کی پیش گوئی کرنے سے قاصر ہے۔ سیاسی نظام اتنا ناکارہ اور فرسودہ ہو چکا ہے کہ حالات پر حکمران طبقات کے مکمل کنٹرول کے باوجود نتائج اکثر ان کی مرضی کے خلاف نکلتے ہیں۔ اس کا قطعاً یہ مفہوم نہیں کہ طاقت اشرافیہ کے ہاتھوں سے نکل کر معاشرے میں پھیل گئی ہے۔ انتقال اقتدار نہیں ہوا ہے۔ اس کے استعمال میں اتفاقیت کا عنصر شامل ہو گیا ہے اور یوں لحہ لحہ کسی کو سمجھ نہیں آتی کہ کسی چیز کا ذمہ دار کون ہے اور اصل اقتدار کتنی دیر تک کس کے پاس ہے۔ اس نیم لاقانونیت کے ماحول میں عام لوگ اپنے نمائندوں کے کردار (اور نمائندگی کے تصور) کے متعلق کسی خوش

فہمی کا شکار نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ دوسری لہر کی تہذیب کی ''یقین دہانی کی رسم'' انتخابات سے لوگوں کا اعتبار اٹھتا جا رہا ہے۔ ہر امریکی انتخاب میں ووٹروں کے ووٹ ڈالنے کی شرح مسلسل کم ہوتی جا رہی ہے۔ 1976ء کے صدارتی انتخابات میں 46%ووٹر گھر سے باہر ہی نہیں آئے، یعنی رجسٹرڈ ووٹروں کی ایک چوتھائی تعداد نے امریکہ کے صدر کو منتخب کیا۔ پولسٹر پٹیرک کیڈل کے ایک حالیہ جائزے کے مطابق 12%ووٹر اب بھی ووٹ کی طاقت پر یقین رکھتے ہیں۔

اسی طرح سیاسی جماعتیں بھی اپنی عوامی کشش کھوتی جا رہی ہیں۔ 1960ء اور 1972ء کے درمیانی عرصے میں آزاد سیاسی کارکنوں کی تعداد میں 400%اضافہ ہوا جس کے نتیجے میں سو سال میں پہلی دفعہ آزاد کارکنوں کی تعداد دو بڑی سیاسی جماعتوں کے اراکین کے برابر پہنچ گئی۔

کچھ ایسا ہی رجحان دوسری جگہوں پر نظر آتا ہے۔ 1979ء تک برطانیہ پر حکمرانی کرنے والی لیبر پارٹی کے، کل ملکی آبادی ساڑھے پانچ کروڑ میں سے، صرف ایک لاکھ فعال کارکن تھے۔ جاپانی اخبار یومیوری شمبن کی رپورٹ کے مطابق ''ووٹروں کا اپنی حکومتوں پر اعتماد ہی نہیں رہا، وہ اپنے رہنماؤں سے کوئی تعلق محسوس نہیں کرتے، ڈنمارک میں بھی شدید سیاسی مایوسی کی لہر موجود ہے۔ ایک ڈینش انجینئر یہ کہتے ہوئے بہت سے لوگوں کی ترجمانی کرتا ہے: کیونکہ سیاست دان حالات پر قابو پانے میں ناکام رہے ہیں۔''

نیوزی لینڈ میں سیاسی اجنبیت کے شکار ایک دل جلے نے اپنا نام تبدیل کر کے مکی ماؤس رکھ لیا اور انتخابات میں امیدوار بھی بن بیٹھا۔ بعد ازاں، اور کئی امیدواروں نے اپنے عجیب و غریب نام رکھے مثلاً ایلیس سرزمین حیرت میں، پارلیمان کو اس رجحان کو روکنے کے لئے فوری قانون بنانا پڑ گیا کہ صرف چھ ماہ پہلے نام بدل لینے والا شخص انتخابات میں حصہ نہیں لے سکتا۔

سوویت یونین میں گذشتہ عشرہ، بقول ایک منحرف مصنف وکٹر نیکی پیلوف کے، انتہائی مایوس کن فوجی تیاریوں، بے تحاشہ معاشی افراتفری، اخراجات زندگی میں اضافہ،

ناکافی غذائی اشیاء، جرم اور منشیات کی زیادتی، کرپشن،ڈاکہ زنی سے عبارت ہے لیکن ان سب سے زیادہ ناقابل برداشت بات یہ ہے کہ موجودہ قیادت کا عوام میں کوئی احترام باقی نہیں رہا۔ سیاست دانوں اور سرکاری حکام کے خلاف عوام کا غم وغصہ اب تحقیر میں بدلتا جا رہا ہے۔ وہ اچھی طرح یہ سمجھتے ہیں کہ موجودہ سیاسی نظام بھنور میں پھنسے سماج کی کوئی مدد نہیں کرسکتا کیونکہ وہ خود شکست وریخت سے دوچار ہے۔

سیاسی تجزیہ نگاروں کی ایک ٹیم نے واشنگٹن ڈی سی میں یہ معلوم کرنے کی کوشش کی، اس جگہ کا انتظام کون چلا رہا ہے؟ انہیں ایک بہت ہی آسان مگر چبھتا ہوا جواب ملا۔ برطانوی یونیورسٹی آف ایسیکس (Essex) کے پروفیسر انتھونی کنگ کے الفاظ میں وہ کچھ یوں تھا، مختصر سا جواب ہونا چاہئے، کوئی نہیں، یہاں کوئی بھی انچارج نہیں'' امریکہ کے علاوہ دوسری لہر کے کئی اور ملک بھی تبدیلی کی تیسری لہر کی زد میں ہیں، اسی لئے معاشرے میں طاقت کا خلا۔۔۔۔ سیاہ سوراخ۔۔۔۔ پھیلتا ہی چلا جا رہا ہے۔

نجی افواج

طاقت کے اس خلا میں پوشیدہ خطرات کا اندازہ لگانے کے لئے، ذرا ایک نظر 1970ء کے عشرے کے وسط پر ڈالتے ہیں جب اوپیک کے زیر اثر توانائی اور خام مال کی رسد میں کمی ہونے لگی، ڈالر کی قدر گرنے لگی، افریقہ ایشیاء اور لاطینی امریکہ کے ممالک نئے عالمی معاشی نظام کی تشکیل کا مطالبہ کرنے لگے۔ یوں دوسری لہر کے مختلف ممالک میں سیاسی افراتفری کی آگ بھڑکنا شروع ہوگئی۔ سیاسی تحمل اور شائستگی کے مرکز برطانیہ میں پنشن یافتہ فوجی جرنیلوں نے ڈسپلن برقرار رکھنے کے لئے نجی افواج قائم کرلیں۔ فاشزم کی جدید تحریک نیشنل موومنٹ نے 90 پارلیمانی حلقوں میں اپنے امیدوار کھڑے کر دیئے۔ ان حالات میں فاشٹوں اور اشتراکی گروپوں کے مابین لندن کی گلی کوچوں میں لڑائی جھگڑے کے شدید امکانات تھے، اٹلی میں ریڈ بریگیڈ کی قتل اور اغوا کی تحریک زوروں پر تھی۔ پولینڈ میں افراط زر کی وجہ سے غذا کی قیمتوں میں اضافے کے خلاف عوام سڑکوں پر آ گئے تھے۔ مغربی جرمنی کی حکومت سیاسی دہشت گردی کے خلاف شدید تغزیری لیک کار تھائٹ قوانین نافذ کر رہی تھی۔

پیدا شدہ سیاسی عدم استحکام اور افراتفری پر معاشی حالات میں بہتری کی بدولت 1970ء کے عشرے کے اختتام تک کنٹرول کر لیا گیا۔ برطانیہ میں نجی افواج کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ ریڈ بریگیڈ کی سرگرمیاں، وزیراعظم آلڈومورد کے اغوا اور قتل کے بعد عارضی طور پر قدرے ٹھنڈ پڑ گئیں۔ ایک نئی حکومت نے جاپان میں پر امن طور پر اقتدار سنبھال لیا۔ پولینڈ میں بھی حکومت نے باغیوں سے بقائے باہم کی بنیاد پر صلح کر لی۔ صدر کارٹر نظام کے خلاف جنگ کے نعرے پر انتخاب جیتے تھے۔ اپنی مقبولیت میں بے تحاشہ کمی کے باوجود وہ اپنی مدت پوری کرنے میں کامیاب ہو گئے دوسری لہر کے مروجہ سیاسی نظام میں عدم استحکام کی یہ مثالیں ہمیں سوچنے پر مجبور کرتی ہیں کہ کیا یہ نظام آئندہ کسی بحران کو برداشت کر بھی پائے گا۔ بیشتر مبصروں کے خیال میں1980-90ء کے عشروں میں پیدا شدہ بحران نوعیت کے اعتبار سے موجودہ بحرانوں کہیں زیادہ خطرناک اور لرزہ خیز ہوں گے۔ اگر ایران میں تیل کے کچھ کنوئیں بند ہو جانے سے امریکہ کے پٹرول پمپوں میں لگی قطاروں میں تشدد کے واقعات ہونے لگتے ہیں تو سعودی خاندان کی مغرولی کے کیا اثرات ہوں گے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ چند شاہی خاندانوں کا یہ سلسلہ۔۔۔ دنیا کے 1/4 تیل کے ذخائر کے مالک۔۔۔ ہمیشہ اقتدار پر قابض رہے گا۔ جب کہ نزدیک ہی یمن مسلسل خانہ جنگی کی حالت میں ہے۔ ان کے اپنے ملک میں پیٹروڈالر کے سیلاب غیر ملکی کاریگروں اور انتہا پسند فلسطینیوں کی وجہ سے حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا یا محض غوار اور عبقیق کے آئل فیلڈ کو تباہ کر ڈالا گیا تو اس پر واشنگٹن، لندن، پیرس، ماسکو، ٹوکیو یا تل ابیب کے سیاست دانوں کا کیا رد عمل ہوگا؟

اگر شیخ یمانی کی پیش گوئی کے مطابق آبنائے ہرمز میں بارودی سرنگیں پھیلا دی جائیں یا دہشت گرد، وہاں سے گزرتے کسی جہاز کو ڈبو کر دنیا میں تیل کی آدھی رسد کا راستہ روک دیں تو اس صورت حال میں دوسری لہر کے ان تھکے ہارے اور پریشان حال رہنماؤں کا ردعمل کس طرح کا ہوگا؟ یاد رہے اس آبنائے کے ایک جانب ایران ہے جو اپنے داخلی مسائل میں الجھا ہوا ہے۔

دوسری جانب میکسیکو کے تیل کے ذخائر میں اگر میکسیکو اپنی زیر زمین دولت کو

MashalBooks.org

برآمد کر کے پیٹرو پیسو (میکسیکو کا زر قانونی) کمانا شروع کر دے تو اس کے اثرات کیا ہوں گے؟ کیا وہاں کے مراعات یافتہ طبقات اس دولت کی تقسیم میں غریب کسانوں کو بھی شامل کریں گے؟ کیا دولت کی یہ تقسیم امریکہ کی جنوبی سرحدوں پر ہونے والی گوریلا سرگرمیوں سے، میکسیکو میں بھرپور خانہ جنگی کے امکانات ختم کر سکے گی؟ اگر ایسا خانہ جنگی شروع ہو بھی گئی تو امریکہ پر اس کا کیا اثر ہوگا؟ ایسی افراتفری میں، کانگریس اور وائٹ ہاؤس ایسے بحران کے متعلق کیا کوئی دانش مندانہ فیصلہ کر سکیں؟ عالمی مالی نظام میں، اگر اقتصادی سطح پر عدم استحکام کی ایک لہر اور اٹھے تو داخلی طور پر ان شکست خوردہ حکومتوں سے اسے کنٹرول کرنے کی کیا توقع کی جا سکتی ہے؟ کیا اگلے سالوں میں اقتصادی استحکام کا کوئی امکان ہے؟ تیزی سے پھیلنے افراط زر، بے روزگاری اور کسی معیشتی حادثے یک صورت میں کیا ہم نجی افواج کے متحرک ہونے کی امید لگا سکتے ہیں؟

سوچنے کی بات یہ ہے کہ مذہبی گروہ بندی، جو آج کل اپنے عروج پر ہے، مزید طاقت ور ہو کر اگر خود کو سیاسی مقاصد کے لئے منظّم کرنے لگے تو کیا صورتحال ہوگی؟ تیسری لہر کی تخصیص پسندی کے تحت، موجودہ مذہبی گروہ اپنی نیم تنظیم قائم کر سکتے ہیں (سالویشن آرمی اس کی مثال ہے۔ مترجم) اس طرح پادریوں، واعظوں اور مذہبی اساتذہ کی ایک فوج ظفر موج جنم لے سکتی ہے۔

امریکہ میں یہ تصور ناممکنات میں سے نہیں کوئی نئی سیاسی جماعت بلی گراہم یا ایسی ہی کسی ولولہ انگیز شخصیت کو امن و امان کے استحکام یا فحاشی مخالف نعروں کی بنیاد پر انتخابات میں لا کھڑا کرے یا انیتا برائینٹ نامی کوئی نامعلوم خاتون ہم جنس پرستوں کو جیل میں ڈالنے کا مطالبہ داغ دے۔ ایسی مثالی سیکولر معاشروں میں مذہبی سیاست کے ابھرتے رجحانات کا پتہ دیتی ہیں۔ عین ممکن ہے کہ گروہی سیاست کی ایسی تحریکیں پیدا ہونے لگیں جن کی قیادات سمتھ شلز یا سائینتی نامی آیت اللہ کے ہاتھوں میں ہو۔

ضروری نہیں حالات بالکل اسی نہج پر آگے بڑھیں۔ یہ میری خام خیالی بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن پھر بھی نت نئے سماجی خطرات کا سامنا کرنے کے لئے ہمیں شعوری طور پر تیار رہنا چاہئے کیونکہ دوسری لہر کی سیاسی قیادت ان خطرات کا مقابلہ کر ہی نہیں سکتی اور دوسری

MashalBooks.org

لہر کے سیاسی ادارے 1970ء کے عشرے کی نسبت کہیں زیادہ فرسودہ ہو چکے ہیں۔

مسیحا کا خوش فہم تصور

قیادت میں تبدیلی لا کر حالات میں بہتری کی امید کرنا ہی دراصل مسیحا کا خوش فہم تصور ہے۔ تیسری لہر کے ابھار سے جنم لین والے مسائل کے سامنے اپنے سیاست دانوں کے بے چارگی کے قصے ذرائع ابلاغ سے سن سن کر ہم اپنی تمام مشکلات کی وجہ سیاسی قیادت کی نااہلی کو سمجھ بیٹھے ہیں۔ کاش کوئی مسیحا آ کر ہماری تمام مشکلات کا خاتمہ کر ڈالے۔ اپنی زبو حالی سے پریشان اچھلے بھلے لوگ بھی اب کسی نجات دہندہ اورمشکل کشا کی آس میں بیٹھے ہیں۔

امریکی غم و غصے کے عالم میں اپنے صدر کو نا اہلیت کا طعنہ دے رہے ہیں۔ مارگریٹ تھیچر کو ان کی سخت مزاجی کی وجہ سے وزیراعظم منتخب کر لیا گیا (وہ خاتون آہن مشہو ہوئیں) سیاسی رہنماؤں سے راہنمائی کی توقع رکھنا، جب کہ ہر جگہ گڑے مردے پھر سے اکھاڑے جا رہے ہوں، خاصا مشکل لگتا ہے۔ نیویارک ٹائمز کے مطابق تیس سال بعد فرانس میں چھوٹے چھوٹے موثر بنیاد پرست گروہ پھر سے ایسے نظریات کا پرچار کر رہے ہیں، جنہیں دوسری لہر جنگ عظیم میں فاشزم کے خاتمے کے ساتھ ہی بری طرح رد کر دیا گیا تھا۔

آرین برتری کے حامی اور امریکہ مخالف گروہ "لاف گارڈ" کے سنڈے میگزین میں اپنے نظریات کی باقاعدگی سے تشہیر کرتے ہیں۔ ان کے نظریات کے مطابق نسلی فرق مادی حقیقت ہے اور اس فرق کو قائم رہنا چاہئے وہ اپنے غیر جمہوری نظریات کو سائنسی رنگ دینے کے لئے کئی نسل پرست مصنفوں کے حوالے بھی دیتے ہیں۔ کچھ عرصے پہلے میں اور میر بیوی جاپان کے دورے پر گئے تھے۔ ٹریفک کے رش کی وجہ سے ایک جگہ ہم کوئی 45 منٹ تک پھنسے رہے۔ ہمارے سامنے ٹرکوں کا جلوس تھا جس میں اوباش قسم کے نوجوانوں فوجی وردی پہنے حکومتی پالیسی کے خلاف شدید نعرہ زنی میں مصروف تھے۔ جاپانی ساتھیوں نے ان کے بارے میں ہمیں بتایا کہ مافیا کی طرح فوجی تنظیموں سے ان کا تعلق ہے اور وہ جاپانی مطلق العنان شہنشاہیت کا احیاء چاہتے ہیں۔ اس ساری صورت حال پر بائیں بازو کا اپنا ردعمل چل رہا ہے۔ اشتراکی جمہوریت ک حامی دہشت گرد گروہ کلاشنکوف

اور بم دھماکوں کے بل پر معاشرے پر مطلق العنان قیادت مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ نسلی انتہا پسندی کا رجحان بھی امریکہ میں خاصی افراتفری کو جنم دے رہا ہے۔ 1978ء سے اب تک کوکلس کلان (Ku Klus Klan) کی تحریک کے کارکن صلیبیوں کو جلاتے رہے ہیں۔ سیاہ فام گرجوں اور یہودی ہیکلوں پر گولیاں برساتے پھر رہے ہیں۔ کیلی فورنیا سے کینکٹی کٹ 21 ریاستوں میں (KKK) نے اپنی سرگرمیاں انتہائی تیز کی ہوئی ہیں۔ تحریک کے پیرو نازی ارکان نے بائیں بازو کے پانچ کارکنوں کو سرعام موت کے گھاٹ اتار دیا۔

غرض ایک طرف مضبوط قیادت کی طلب ہے اور دوسری جانب فسطائی گروہ جمہوری بحران سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں، یوں سماج کی مکمل تباہی کا سامان ہو رہا ہے۔ مضبوط قیادت کی مانگ تین مغالطّوں کی وجہ سے ہے۔ پہلا یہ کہ کسی رہنما کے احکامات ہی معاشرتی حالات کو بدل سکتے ہیں۔ ایک ابہام یہ بھی ہے کہ آمریت کے دور میں ریل گاڑیاں بروقت چلتی ہیں۔ اداروں کی شکست وریخت کے اس دور میں لاکھوں لوگ یقیناً ایسے بھی ہوں گے جو اپنی شخصی آزادی کے ایک حصے کے بدلے سماجی معاشی اور سیاسی گاڑیوں کی بروقت آمدورفت کے خواہاں ہوں گے۔

تاہم قیادت کا (یا آمریت) کا عمدہ کارکردگی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ سوویت قیادت بے پناہ مضبوط اور امریکہ فرانس اور سویڈن سے کہیں زیادہ منظم ہے مگر وہاں اعلیٰ اور مثالی کارگردگی نظر نہیں آتی۔ فوج خفیہ پولیس اور نظام کے تحفظ کے ذمہ دار چند اداروں کے سوا سوویت اداروں میں کارکردگی کا معیار مایوس کن ہے بلکہ پورے ملک معاشرے پر غیر ذمہ داری جمود اور کرپشن کی فضا چھائی نظر آتی ہے۔ نازی جرمنی نے پوش روسی یہودی اور غیر آرین نسل کو ختم کرنے میں تو بڑی عمدہ کارکردگی دکھائی مگر اس کا سماجی نظام کارکردگی کے اعتبار سے پھسپھسا ہی رہا۔ جرمنی کا تعلیم یافتہ برطانوی پارلیمان کا ایک رکن۔۔۔۔ جسے جرمن معالات سے گہری دلچسپی ہے۔۔۔۔ ریمنڈ فیلچر ہٹلر کے نظام کے بارے میں اس طرح لکھتا ہے:

عموماً ہٹلر کا جرمنی مثالی کارکردگی کا حامل سمجھا جاتا ہے سچ یہ ہے کہ برطانیہ جرمنی کے مقابلے میں جنگ کے لئے زیادہ بہتر طریقے سے تیار تھا۔ نازی فیکٹریوں میں ٹینک اور

بکتر بند گاڑیاں اتنی زیادہ تیار ہوگئیں کہ انہیں ریل گاڑی کے ذریعے میدان جنگ تک لے جانا ہی ناممکن تھا انہوں نے اپنی سائنسی مہارت کا صحیح استعمال نہیں کیا۔ محض بدانتظامی کی وجہ سے 16'000 سائنسی ایجادات میں سے صرف چند ایک ہی صنعتی عمل میں لائی جاسکیں۔ نازی پولیس اپنے ہی لوگوں کی نگرانی میں لگی ہوئی تھی جبکہ برطانوی جاسوسی تنظیمیں انتہائی چابکدستی سے اپنا فرض ادا کر رہی تھیں۔ برطانوی عوام سے دفاع وطن کے لئے گھروں کی پرانی دیگچیوں اور لوہے کی بنی مختلف اشیاء چندہ میں دینے کی اپیل کی جا رہی تھی۔ برطانیہ میں عورتیں بھی فوج میں بھرتی کی جانے لگیں جبکہ جرمنی میں اس طرف کسی کا دھیان تک نہیں گیا۔ ہٹلر بروقت فیصلے کرنے کی صلاحیت سے عاری تھا۔ غرض جرمن کارکردگی ایک افسانے سے زیادہ کچھ نہیں۔

ریل گاڑیاں بروقت چلانے کے لئے صرف مضبوط قیادت ہی کافی نہیں۔ اس مطالبے میں ایک اور مغالطہ پوشیدہ ہے، کیا یہ ضروری ہے کہ ماضی میں کامیاب ہونے والی حکمت عملی حال یا مستقبل میں بھی لازماً اسی طرح کارآمد ہوگی۔ قیادت کا تصور ہمیشہ ماضی کی مثالوں پر مبنی ہوتا ہے۔ روز ویٹ، چرچل، ڈیگال، دراصل ہر تہذیب کو مختلف طرح کا قائدانہ صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ عین ممکن ہے ایک تہذیب میں قیادت کی جو صفت توانائی کی حامل ہو، دوسری تہذیب میں وہی کمزوری اور تباہی کا باعث بن جائے۔

پہلی لہر کی زرعی تہذیب میں قیادت کی کارکردگی کے بجائے پیدائش حق کے طور پر حاصل ہوتی تھی۔ بادشاہت کے لئے محض چند عملی مہارتیں۔۔۔۔ جنگ کے دوران فوج کی قیادت، جاگیرداروں اور نوابوں کو باہم دست و گریباں رکھنا اور اقتدار کی مضبوطی کے لئے مفید شادیاں۔۔۔۔ کافی ہوتی تھیں۔ ان خوبیوں میں تعلیم اور مجرد خیالی کی واضح طاقت کا کہیں کوئی ذکر نہ ہوتا تھا۔ مزید برآں ان مقتدر شخصیتوں کو کسی آئین یا قانون ساز ادارے یا عوام کی رائے جیسی روک ٹوک کے بغیر اپنی مرضی کے مطابق حاکمانہ اختیارات حاصل تھے۔ شاہی فیصلوں کو کسی خصوصی توثیق کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔ جو حکمران پانے وزیروں اور درباریوں کو قابو میں رکھتا، وہ مضبوط سمجھا جاتا تھا۔

دوسری لہر کی قیادت کو اس کے برعکس غیر شخصی اور مجرد طاقت کا استعمال کرنا تھا۔

MashalBooks.org

ذرائع ابلاغ کے صحیح استعمال کے ساتھ ساتھ اسے پیچیدہ معاشی مسائل سمیت اور بے شمار معاملات پر فیصلے کرنے پڑتے تھے۔ ان فیصلوں کو عملی شکل دینے میں جن اداروں اور ایجنسیوں کا عمل دخل ہوتا تھا، ان کے باہمی رابطوں کا تعین بھی قیادت کی ذمہ داری تھا۔ صرف تعلیم یافتہ ہونا اس کے لئے کافی نہیں تھا بلکہ مجرد توجیہہ کی صلاحیت رکھنا بھی لازمی تھا، چند جاگیرداروں اور نوابوں کی طاقت میں توازن رکھنے کے بجائے اس کا واسطہ اشرافیہ کے ایک بڑے طبقے سے تھا۔ مطلق العنان حکمران ہونے کی باوجود اسے ظاہراً آئین، قوانین، سیاسی جماعتی ضروریات اور عوامی رائے کا احترام کرنا پڑتا تھا۔

پہلی لہر کا انتہائی مضبوط لیڈر بھی دوسری لہر کے سیاسی قالب میں پنہاں ان رکاوٹوں کے سامنے مقابلتاً کمزور پریشان اور نااہل ہی لگتا۔ اسی طرح ظہور پذیر تہذیب کے اس عبوری دور میں روز ویلٹ، چرچل، ڈیگال، ایڈی نائیر اور سٹالن۔۔۔۔ صنعتی معشارے کے زبردست قائدین۔۔۔۔ اتنے یہ نا اہل ثابت ہوں گے جتنا کہ پاگل بادشاہ لڈوگ وائٹ ہاؤس میں۔۔۔۔ کینیڈی، کونالی(Connally) ریگن، شیراک یا تھیچر جیسے تیز طرار اور بروقت فیصلے کرنے والے رہنماؤں کی خواہش دقیانوسی مفروضوں اور بیمار ذہنیت کی عکاسی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ موجودہ رہنماؤں کی کمزوری ان کی شخصی نا اہلی کی وجہ سے نہیں بلکہ حکومتی اداروں کی شکست وریخت کا نتیجہ ہے۔

دراصل ان کی یہ ظاہری کمزوری ان کی طاقت میں اضافے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ تیسری لہر کے زیر اثر جنم لینے والا سماجی تنوع اور پیچیدگی رہنماؤں کو اپنے فیصلے پر عمل درآمد کرانے کے لئے لوگوں کو اچھی خاصی تعداد کا محتاج کر دیتا ہے۔ آواز سے تیز جنگی جہاز، جوہری ہتھیار، کمپیوٹر اور ٹیلی مواصلات جیسے طاقتور آلات رہنماؤں کی اس ضرورت میں کمی کے بجائے مزید اضافہ کر دیتے ہیں۔ طاقت اور محتاجگی کا یہ اٹوٹ رشتہ انتہائی پیچیدگیوں کا حامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امریکی صدر ایٹمی جنگ کے پش بٹن کے سامنے بیٹھ سکتا ہے جہاں اس کا ایک اشارہ سارے کرے کو ملیامیٹ کر سکتا ہے مگر پھر بھی وہ خود کو اتنا بے بس محسوس کرتا ہے، جیسے ٹیلی فون کے دوسرے سرے پر کوئی سننے والا ہی نہ ہو۔ طاقت اور بے طاقتی دراصل ایک ہی نیم موصل تراشے کی دو مختلف اطراف ہیں۔ انہی وجودہ بنا پر تیسری لہر

MashalBooks.org

کی ظہور پذیر تہذیب ایک بالکل ہی نئی قیادت کی طالب ہے۔ ان رہنماؤں کے کیا اوصاف ہوں گے؟ یہ ابھی واضح نہیں، ممکن ہے ان کے لئے حاکمانہ دبدبے کی جگہ دوسروں کے صائب مشوروں پر کان دھرنے کی اہلیت زیادہ اہم سمجھی جائے۔ زبردستی رائے ٹھونسنے کے بجائے ذہن کی تخیلاتی اڑان کو فوقیت حاصل ہو یا آمرانہ ذہن کی بجائے قائدانہ حدود کا واضح شعور رکھنا لازم ہو۔ کل کے رہنماؤں کو کہیں زیادہ غیر مرتکز اور شراکتی سماج آج سے بھی کہیں زیادہ متنوع، کا سامنا کرنا ہوگا۔ یہ بات ممکن ہی نہیں کہ ایک ہی آدمی میں ساری قائدانہ صفات موجود ہوں۔ قیادت کا مطلب یک شخصی حکمرانی کے بجائے زیادہ عارضی یا وقتی کثیر شخصی یا گروہی اور متفقہ رہنمائی بھی ہوسکتا ہے۔

گارڈین اخبار کی کالم نگار جل ٹوئیں ڈی نے اس تبدیلی کو محسوس کر لیا تھا۔ جمی کارٹر کو تنقید کا نشانہ بنانا بہت آسان ہے۔ اس نے لکھا: ممکن ہے وہ ایک کمزور اور متذبذب شخصیت کا مالک ہو۔۔۔۔ لیکن یہ بھی تو ممکن ہے۔۔۔۔ کہ کارٹر کا بنیادی گناہ اس کا یہی خاموش اعتراف ہو کہ دنیا کے سکڑنے کے ساتھ ساتھ مسائل بھی۔۔۔۔ اتنے عمومی، اتنے بنیادی اور باہمی طور پر ایک دوسرے کے اتنے دست نگر ہو گئے ہیں کہ ماضی کی طرح کسی ایک شخص یا حکومت کے لئے ان سب مسائل کا حل تلاش کرنا کار دارد کے سوا کچھ نہیں۔ مختصراً اس کا خیال ہے کہ نئے مسائل کی نوعیت ہی کچھ ایسی ہے کہ ایک نئی قیادت کا ابھرنا ضروری ہے۔ گزرے کل کے مرد آہن ممکن ہے آنے والے کل کے 90 پونڈ وزنی کانگڑی پہلوان ہی رہ جائیں۔ ممکن ہے یہ بات درست نہ بھی ہو لیکن اس توجیہہ میں ایک آخری مغالطہٗ اور بھی ہے کہ انہیں تباہی و بربادی سے بچانے کے لئے سیاسی مسیحا چاہئے۔ ان کے نزدیک سارا مسئلہ ہے ہی قحط الرجال کا، حالانکہ ایسا نہیں۔ ہمارے نظام کو چلانے کے لئے انتہائی دیندار، ذہن ترین اور ہیرو قسم کے لوگ بھی ہوتے، پھر بھی ہماری نمائندہ حکومت (دوسری لہر کی سیاسی ٹیکنالوجی) کا یہ بحرانی موڑ آنا ہی تھا۔

عالمی جالا

اگر ایک بہترین رہنما کا چناؤ ہمارے مسائل کے حل کا ضامن ہوتا تو پھر موجودہ سیاسی نظام ہی کافی تھا۔ مسئلہ درحقیقت بہت ہی گمبھیر ہے۔ مختصر بات یہ ہے کہ ہمارے

بہترین رہنما کے بے چارگی کی اصل وجہ ہمارے موجودہ ناکارہ ادارے ہیں۔ موجودہ سیاسی اور حکومتی ادارے اس وقت متشکل ہوتے تھے، جب قومی ریاست جنم لے رہی تھی۔ ہر حکومت کم و بیش آزادانہ طریقے سے ریاستی فیصلے کر سکتی تھی۔ اب یہ ممکن نہیں رہا۔ ریاستی اقتدار اعلیٰ تصور پر ایمان اپنی جگہ لیکن افراط زر ایک ایسا بین الاقوامی مرض بن گیا ہے کہ مسٹر برزنیف یا ان کا کوئی جانشین اسے سوویت سرحد عبور کرنے سے نہیں روک سکتا۔ اشترا کی صنعتی مما لک۔۔۔ جزوی طور پر عالمی معیشت سے غیر منسلک ہونے اور داخلی طور پر شدی منضبط نظام کے باوجود۔۔۔ تیل، غذا ٹیکناجی، قرضوں اور دوسری ضروریات کے لئے خارجی ذرائع کے محتاج ہیں۔ 1979ء میں سوویت یونین کو مجبوراً اشیائے صرف کی قیمتوں میں اضافہ کرنا پڑا۔ چیکوسلواکیہ میں پٹرول کی قیمت یک لحت دوگنی کر دی گئی۔ ہنگری میں بجلی کے نرخ 51 فیصد بڑھ گئے۔ ہر ملک کے معاشی فیصلوں کا اثر اس کے پروسی مما لک پر لازماً ہوتا ہے۔

فرانس نے کیپ ڈی لاہیگ کے مقام پر (جو برطانوی ونڈسکیل ری ایکٹر کی نسبت لندن کے زیادہ قریب ہے) جوہر پراسینگ پلانٹ تعمیر کیا ہے، جہاں سے تابکاری ذرات یا گیس ہوا میں خارج ہوں تو ہوا انہیں برطانوی حدود میں پھیلا دے گی۔ میکسیکو کے سمندر سے خارج ہونے والا تیل 500 میل کے فاصلے پر واقع ٹیکساس کے ساحلی علاقے کے لئے مصیبت کھڑی کر دیتا ہے۔ اسی طرح سعودی عرب یا لیبیا کے اپنے تیل کا پیداواری کوٹہ کم یا زیادہ کرنے کی صورت میں متعدد مما لک کا ماحول متاثر ہوتا ہے۔ قومی قیادت کے قول و فعل سے قطع نظر معاملات کی گمبھیرتا کے پیش نظر ان کی فعالیت بہت کم رہ جاتی ہے ان کے فیصلے عالمی اور مقامی سطح پر شدید، غیر ضروری اور متواتر خطرناک نتائج کو جنم دیتے رہتے ہیں آج کی دنیا کے لئے موجودہ حکومتی پیمانے اور فیصلہ ساز اتھارٹی کی تقسیم سرے سے ہی غلط ہیں۔

باہمی بنت کا مسئلہ

ہمارے سیاسی ادارے بھی علمی سطح پر فرسودہ ہو چکے ہیں۔ ہر حکومت نے خزانہ، امور خارجہ، دفاع گزراعت، تجارت، ڈاک خانے اور ٹرانسپورٹ کے لئے مختلف وزارتیں

MashalBooks.org

اور محکمے بنا رکھے ہیں۔ امریکہ کی کانگریس اور دوسرے قانون ساز اداروں نے انہی شعبوں کے معاملات طے کرنے کے لئے اپنی اپنی کمیٹیاں تشکیل دی ہوئی ہیں۔ دوسری لہر کی مضبوط ترین حکومت چاہئے کتنی ہی مرکزیت پسند اور مطلق العنان کیوں نہ ہو۔۔۔۔ باہمی بنت کا مسئلہ حل نہیں کر سکتی، یعنی کس طرح ان وزارتوں او کمیٹیوں کے فرائض میں باہمی رابطہ اور یکسانیت پیدا کی جائے تا کہ حکومتی کارکردگی میں محکماتی یا اداراتی اختلافات پر کنٹرول کیا جا سکے اور متضاد اور گڈمڈ قسم کے نتائج سے بچا جا سکے۔

گذشتہ عشروں سے ہمیں یہ سبق بہر حال ملا ہے کہ تمام سیاسی سماجی مسائل میں ایک مخصوص باہمی تعلق ہوتا ہے۔ مثلاً توانائی معیشت پر اثر انداز ہوتی ہے۔ معیشت صحت پر اور صحت تعلیم، ملازمت، گھریلو کام کاج اور دوسری بہت سی چیزوں پر اثر ڈالتی ہے۔ مسائل کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر کے حل کرنے کی کوشش محض افراتفری اور شکست و ریخت کو جنم دے گی۔ تنہا تنہا مسائل کا حل صنعتی سوچ کا انداز ہے اور دوسری لہر کی تنظیمی ڈھانچہ اسی سوچ کا عکاس ہے۔

اس فرسودہ ڈھانچے کی بدولت اداروں کے مابین اختیارات کی تقسیم کے فضول اور لاینحل جھگڑے پیدا ہو جاتے ہیں۔ اداروں کی باہمی رقابت مزید ضمنی مسائل کو جنم دیتی ہے۔ چنانچہ ایک مسئلہ حل کرنے کی حکومتی کوشش کئی نئے اور سنگین مسائل پیدا کر ڈالتی ہے۔ حکومتیں ان باہم منسلک مسائل کو کرنے کے لئے مزید ارتکاز عمل کی کوشش کرتی ہیں اور سرخ فیتے کو ختم کرنے کے لئے کسی زار کا چناؤ کر لیتی ہیں۔ وہ اپنے اقدامات کے ضمنی اثرات سے بے پروا تبدیلی لانا شروع کر دیتا ہے یا خود اسی سرخ فیتے کا شکار کر اقتدار سے محروم ہو جاتا ہے کیونکہ اختیارات کا ارتکاز زیادہ دیر چل نہیں پاتا۔ کچھ اسی قسم کی بدحواسی نظر ثانی کی بے شمار اداراتی کمیٹیوں کے قیام میں بھی نظر آتی ہے، اس طرح فیصلوں کی حتمی شکل ہونے تک ایک طویل تجزیاتی سلسلہ چلنا شروع ہو جاتا ہے اور نوکر شاہی کی بھول بھلیاں پیچیدہ تر ہوتی چلی جاتی ہیں۔ نتیجہ میں ایک اور مسئلہ جنم لیتا ہے۔

سرعت انگیز فیصلہ سازی

دوسری لہر کی حکومتیں اور پارلیمانی ادارے ایک انتہائی سست روز مانے کی پیداوار

ہیں۔ اس وقت ایک پیغام بوسٹن یا نیویارک سے فلاڈیلفیا بھیجنے کے لئے ایک ہفتہ درکا ہوتا تھا۔ آج اگر کوئی آیت اللہ تہران میں یرغمالیوں کو روک لیتا ہے یا قم میں کھانستا ہے تو واشنگٹن، ماسکو، پیرس یا لندن میں بیٹھے حکام کو منٹوں میں فیصلہ کر کے اس پر اپنا ردعمل ظاہر کرنا ہوتا ہے۔ سیاست دان اس برق رفتار تغیر کے ہاتھوں پریشان ہو کر رہ گئے ہیں۔ ان کے بے چارگی اور الجھن میں مزید اضافہ ہوا ہے۔ ایڈورٹائزنگ ایج لکھتا ہے۔ ''صرف تین مہینے پہلے وائٹ ہاؤس، امریکی صارفین کو خریداری میں جلد بازی نہ کرنے کے مشورے دے رہا تھا اور اشیاء کی قیمتوں کا اچھی طرح جائزہ لینے پر زور دے رہا تھا۔ اب وہی وائٹ ہاؤس کھل کر خرچ کرنے کی ترغیب دے رہا ہے۔''

جرمن امور خارجہ کا ایک جریدہ آوسن پولیٹیک لکھتا ہے: ''تیل کے ماہرین نے پٹرول کی قیمت میں اضافے کی پیش گوئی تو کر دی تھی مگر وہ اس کی ارتقائی رفتار سے بے خبر تھے۔'' 75-1974ء کی کساد بازاری کو جس نے امریکی پالیسی سازوں کو دہلا کر رکھ دیا تھا، فارچون نامی رسالے نے ''حیرت انگیز سرعت اور شدت سے موسوم کیا'' سماجی تبدیلی بھی برق رفتاری سے سیاسی فیصلہ سازوں پر اضافی دباؤ ڈال رہی ہے۔ بزنس ویک کے مطابق امریکہ میں صنعتی اور آبادی کی نقل مکانی کبھی کبھار ہی نظر میں آتی تھی، اس عمل نے قوم کو یکجا رکھنے میں بڑی مدد کی لیکن پچھلے پانچ سالوں میں نقل مکانی ہر امکانی حد کو عبور کر گئی کہ موجودہ سیاسی ادارے بے بسی سے منہ دیکھتے رہ گئے۔

سیاست دانوں کے اپنے کیریر میں بھی بے پناہ تیزی آئی ہے۔ یہ تیز رفتاری بعض اوقات انہیں حیران کر دیتی ہے۔ ابھی 1970ء کی بات ہے۔ مارگریٹ تھیچر کا خیال تھا کہ کم از کم ان کی زندگی میں کوئی عورت برطانوی حکومت میں وزارت تک نہیں پہنچ سکے گی اور 1979ء میں وہ خود وزیراعظم بن چکی تھیں۔ امریکہ میں جمی کارٹ۔۔۔۔ خاصے ایک غیرمعروف شخص۔۔۔۔ چند ہی مہینوں میں وائٹ ہاؤس پہنچ گئے، مزید برآں انہوں نے فوراً ہی صدارتی اختیارات کا استعمال کرنا بھی شروع کر دیا، حالانکہ امریکی صدر انتخابات کے بعد آنے والے جنوری میں اپنا عہدہ سنبھالتا ہے۔ رخصت ہونے والے صدر فورڈ کے بجائے کارٹر کو مشرقی وسطی، توانائی کے بحران اور دوسرے مسائل پر جواب دہی کا سامنا کرنا پڑا

MashalBooks.org

حالانکہ ابھی ووٹوں کی گنتی بھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ اس عبوری عرصے میں صدر فورڈ بالکل ہی بے اختیار ہو کر رہ گئے کیونکہ سیاسی وقت کا بے پناہ سکڑاؤ اور تاریخ کی تیز رفتار حرکت پذیری روایتی تاخیر کو برداشت کرنے پر تیار نہیں تھے۔

ذرائع ابلاغ کا نئے صدر کے ساتھ روایتی ہنی مون بھی ممکن نہیں رہا۔ کارٹر کو اقتدار سنبھالنے سے پہلے ہی کابینہ کے چناؤ کے سلسلے میں اتنے تند و تیز حملوں کا سامنا کرنا پڑا کہ انہیں سی آئی اے کی سربراہی کے لئے اپنی پسندیدہ شخصیت کی نامزدگی واپس لینا پڑی۔ پھر چار سالہ عہدہ صدارت کے عین درمیان ایک سیاسی نامہ نگار رچرڈ ریوز نے کارٹر کے مختصر کیریئر کی پیش گوئی کر ڈالی۔ موجودہ مواصلات نے وقت کو اتنا تیز رفتار بنا دیا ہے کہ چار سالہ دور صدارت میں (ماضی کے آٹھ سالوں کی نسبت) کہیں زیادہ واقعات کلات اور اطلاعات کا ہجوم جمع ہو جاتا ہے۔

سیاسی زندگی کی یہ ہمہ ہمی عمومی تغیر میں اسراع کی عکاس ہے، حکومتی تعطل میں مزید اضافہ کر رہی ہے۔ دوسری لہر کے اداروں کے ذریعے ہمارے رہنما واقعات کی تیز رفتاری کا ساتھ نہیں دے پا رہے۔ 1974ء میں جان ہاپکنز یونیورسٹی کے پروفیسر رابرٹ سکیڈل سکی کی یہ رائے تھی ''کانگریس میں پارٹی اکثریت کے باوجود حکومتی فیصلے اتنی تاخیر سے ہوتے ہیں کہ سرکار کی مالیاتی پالیسی ناکارہ ہو کر رہ گئی ہے'' اس تیز رفتار تبدیلی کے ہاتھوں ہمارے اداروں کی فیصلہ سازی کی اہلیت سلب ہو کر رہ گئی ہے۔ اسی لئے جماعتی منشور یا قیادت سے قطع نظر ہمارا سیاسی ڈھانچہ بالکل ہی فرسودہ ہو چکا ہے۔ یہ ادارے نہ صرف پیمانے اور ساحت کے مفہوم میں بلکہ رفتار کے اعتبار سے بھی (موجودہ صورت حال کے لئے) ناکافی ہیں۔ اور اسی پر معاملہ ختم نہیں ہو جاتا۔

اتفاق رائے کا خاتمہ

دوسری لہر نے ایک وسیع البنیاد معاشرے کو جنم دیا تھا اور تیسری لہر تمام سماجی نظام کو تنوع اور پیچیدگی کی بلند تر سطح پر لے جا کر، ہمیں زیادہ سے زیادہ تخصیص پسند (Demassify) کر رہی ہے۔ یہ انقلابی عمل۔۔۔عمل ارتقاء کے حیاتیاتی تفاوت سے خاصا میل کھاتا ہے اور اس کے ذریعے آج کے سب سے اہم سیاسی مظہر اتفاق رائے کا

خاتمہ کی وضاحت میں مدد ملتی ہے۔

صنعتی دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہمیں سیاست دان اپنا ''قومی مقصد'' کھو جانے پر ماتم کرتے نظر آتے ہیں اور ڈن کرک جذبے اور قومی اتحاد کے غائب ہونے اور طاقتور بے راہرو گروہوں کے منظر عام پر آنے کا رونا روتے ہیں۔ ہر طرف یک نکتہ منشور والے سینکڑوں سیاسی گروہ اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ اسقاط حمل، اسلحہ پر کنٹرول، ہم جنسوں کے حقوق، اسکول کے بچوں کے لئے بس کی سہولت، جوہری قوت اور ایسے ہی بہت سے ایک نکاتی پروگرام ہیں۔ مقامی اور قومی سطح پر اتنے متنوع اور مختلف مفادات پھیل گئے کہ سیاست دان اور حکام ان کا مزید حساب کتاب ہی نہیں رکھ سکتے۔ متحرک گھروں میں رہائش پذیر لوگ شہری علاقوں میں اپنے لئے جگہیں مخصوص کرانا چاہتے ہیں۔ کسان اپنے کھیتوں کے اوپر سے بجلی کی تاریں گزرنے کے منصوبوں کی مخالفت میں لگے ہیں۔ ریٹائرڈ لوگ اسکولوں پر نافذ شدہ ٹیکسوں کے خلاف مہم چلا رہے ہیں۔ یوں ہی خواتین کے حقوق کے حامی، قدیم میکسیکن، کان کن (Strip & Anti Strip) اسی طرح منظّم ہو رہے ہیں جیسے تنہا والدہ اور فحاشی اور عریانی کے مخالف گروہ برسر پیکار ہیں۔ وسطی مغرب کے ایک اخبار کے مطابق ہم جنس نازیوں کی تنظیم بنائی گئی ہے۔ جنس مخالف (کو پرکشش سمجھنے) والے نازیوں اور ہم جنس آزادی کی تحریک دونوں ہی کے لئے یہ بات بلاشبہ شرم اور پریشانی کی ہو گی۔

دوسری لہر جانب بڑی بڑی تنظیموں کا شیرازہ بکھرنے کے خطرات بڑھتے جا رہے ہیں۔ رضا کار تنظیموں کی ایک کانفرنس میں، ایک مندوب کے مطابق، مقامی چرچ قومی کلیسا کی قیادت کو مزید برداشت کرنے سے انکاری ہیں۔ اسی طرح مزدوروں قومی تنظیم کی مشترکہ سیاسی کوششوں کا ساتھ دینے کے بجائے اس، کے ذیلی ادارے اپنے اپنے مقامی مسائل کے حل کے لئے کوشاں ہیں۔ ایسے رضا کار اداروں کی اکثریت کی عملی زندگی زیادہ طویل نہیں ہوتی۔ کینیڈا کے ایک سرکاری افسر کا کہنا ہے: یہ رضا کار تنظیموں کی عمومی زندگی چھ سے آٹھ ماہ ہوتی ہے۔ جتنے زیادہ گروہ بڑھ رہے ہیں، اتنا ہی ان کی عملی عمر کم ہوتی جا رہی ہے۔ اس طرح اسراع اور تنوع باہم مل کر ایک بالکل ہی نئے سیاسی سماج کو جنم دے رہے

MashalBooks.org

ہیں۔

یہی ارتقائی عوامل سیاسی اختلاط، اتحاد اور مشترکہ محاذ سے متعلق ہمارے تصورات کو فرسودہ اور دقیانوسی بناتے جا رہے ہیں۔ دوسری لہر کے سماج میں آدھی درجن جماعتی اتحاد قائم رکھنا سیاسی رہنماؤں کے لئے قطعی مشکل نہ تھا۔ صدر روز ویلٹ نے 1932ء کے ایسا ہی جماعتی اتحاد بنایا تھا جو سالوں قائم رہا۔ آج ایسے اتحاد میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں ایک نکاتی گروہوں کو شامل کرنا ضروری ہے جن کا اتحاد زیادہ دیر چل نہیں پاتا۔ ایسے گروہ اکٹھے ہو کر ایک صدر کو ایک طویل وعریض منشور پر عمل درآمد کی ذمہ داری سمیت تنہا چھوڑ دیں گے۔ ٹیکنالوجی، پیداوار، مواصلات اور ثقافت کے شعبوں میں دراندازتخصیص پسندی اب سیاسی زندگی کا شیرازہ بھی بکھیر رہی ہے۔ چنانچہ سیاست دانوں کو قوت ادادی کم ہوتی جا رہی ہے۔ چند واضح حلقوں سے معاملات طے کرنے کے عادی سیاست دانوں کو بیک وقت بے شمار نظریاتی حلقہ بندیوں کا سامنا ہے۔ ان سب حلقوں کے بے شمار مطالبات پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا کم از کم سیاست دانوں اور حکام کے بس کی بات نہیں اور نہ ہی ان کے پاس اتنا وقت ہے۔ مزید برآں تبدیلی کے اسراع کی وجہ سے فیصلوں میں تاخیر عدم فیصلوں کی بہ نسبت زیادہ نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ ہر کوئی ہر معاملے پر فوری فیصلہ چاہتا ہے۔ چنانچہ کانگریس مسلسل مصروف رہتی ہے۔ کیلی فورنیا سے ایک ڈیموکریٹ رکن این وائی منیٹا کے مطابق اراکین کی باہمی ملاقات آنے جانے کے دوران ہی ہوتی ہے۔ ٹھنڈے دل سے کسی بھی معاملے پر سوچنے کا وقت نہیں ملتا۔

ہر ملک کے اپنے حالات ہوتے ہیں لیکن دوسری لہر کے فرسودہ اداروں۔۔۔۔ تبدیلی کے اسراع سے عدم مطابق، سماجی تنوع نئی سطحوں کے ساتھ ناموزونیت کے وجہ سے۔۔۔۔ کو تیسری لہر کے انقلابی چیلنج کا سامنا ہر جگہ ہے۔ یہ ادارے ایک انتہائی سست رو اور سادہ معاشرے کے لئے بنائے گئے تھے چنانچہ موجودہ حالات میں یہ خود کو انتہائی مشکل میں گھرا پاتے ہیں۔ اس چیلنج کا مقابلہ محض قوانین کے ہیر پھیر سے نہیں کیا جا سکتا کیونکہ دوسری لہر کے بنیادی مفروضے، نمائندگی کے تصور، سے ہی اس کا تضاد بنتا ہے۔ ہمارا سیاسی نظام نظریاتی طور پر اکثریت کے قانون پر مبنی ہے مگر تنوع اور ہمہ جہتی میں اضافے کی وجہ

MashalBooks.org

سے ہم اپنی بقا کے انتہائی اہم مسائل پر بھی اکثریتی اتفاق حاصل نہیں کر پاتے۔ اسی لئے اتفاق رائے کا فقدان صرف اور صرف اقلیتی حکومتوں کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے ان کی اتحادی جماعتوں میں نقطہ نظر کی کوئی ہم آہنگی ہوتی ہی نہیں۔ اکثریت کے حصول کے بغیر ہمارے جمہوری نعرے قطعی بے معنی ہو جاتے ہیں۔ اہم سوال یہ ہے کہ کیا اسراع اور تنوع کا یہ ملاپ حلقہ جاتی نمائندگی کا کوئی امکان رہنے بھی دیتا ہے یا نہیں۔ صنعتی سماج میں مطالبات عمومی نوعیت کے ہوتے تھے اور ان پر اتفاق رائے کا حصول بھی مشکل نہیں تھا۔ اجتماعیت کی زد میں آئے ہوئے سماج میں نہ صرف قومی مقاصد کا یقین مشکل ہو جاتا ہے بلکہ علاقائی، صوبائی اور مقامی مقاصد بھی باہم غلط ملط ہو جاتے ہیں۔ فرانس ہو جاپان ہو یا سویڈن، کسی ایک فرد کے لئے اپنے حلقے کی حقیقی نمائندگی کرنا ناممکن ہوتا جا رہا ہے کیونکہ اتفاق رائے ہی باقی نہیں رہا۔ اس صورت میں نمائندہ جمہوریت کی معنویت کیا رہ گئی؟ اس سوال کے ذریعے جمہوریت پر نکتہ چینی کرنا قطعاً مطلوب نہیں (ذرا آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ تیسری لہر کس طرح ہمارے لئے ایک وسیع تر اور صحت مند جمہوریت کی راہ کھول رہی ہے) بہر حال یہ حقیقت اپنی جگہ درست ہے کہ دوسری لہر کے اداروں کی طرح ان کے بنیادی مفروضات بھی ناکارہ ہو گئے ہیں۔ صنعتی دور کی فرسودہ اور بوجھل سیاسی ٹیکنالوجی۔۔۔۔ غلط پیمانے پر تشکیل شدہ ہونے، بین الاقوامی مسائل سے نمٹنے کی نا اہلیت، باہم مربوط مسائل کی تفہیم سے قاصر، اسراع اور تبدیلی کی بلند تر سطحوں سے عدم مطابقت۔۔۔۔ کی وجہ سے ہماری آنکھوں کے سامنے دم توڑ رہی ہے۔

فیصلہ سازی میں داخلی شکستگی

قیادت کے ایک تصوراتی فقدان کی بجائے بہت سے عجیب وغریب اور نامانوس مسائل کی تیزی سے بڑھتی تعداد کے متعلق فوری فیصلوں کی توقع ہی دراصل ہماری سیاسی اور حکومتی تنظیموں کی شکست کا باعث ہے۔ یہ ادارے فیصلہ سازی میں داخلی شکستگی کا شکار ہیں۔

فرسودہ سیاسی ٹیکنالوجی پر انحصار ہماری حکومتوں کی کارکردگی کو شدت سے متاثر کر رہا ہے۔ نیویارک کے ولیم شاکر نے ہارپر میگزین میں صدر نکسن اور ہنری کسنجر کی کمبوڈیا پالیسی کے بارے میں ایک مضمون میں لکھا: اگر سب فیصلے وائٹ ہاؤس میں ہی کئے جاتے

تھے تو پھر ان پر تفصیلی بحث کا وقت کہاں ملتا؟ ماحولیاتی آلودگی، ہسپتالوں میں علاج کے زور افزوں اخراجات، جوہری اسلحہ، بچوں کے لئے خطرناک کھلونوں کی ممانعت، غرض ہر مسئلے کے متعلق فیصلہ وائٹ ہاؤس کو کرنا ہوتا ہے۔ حال ہی میں ایک صدارتی مشیر نے مجھے بتایا کہ ہم سب مسلسل مستقبل کے بارے میں فکر مند رہتے ہیں۔ انتظامی ادارے بھی اسی افراتفرف اور انتشار کا شکار ہیں۔منوں فیصلوں کا بوجھ ہر محکمے کو کچلے جا رہا ہے۔ انہیں بے شمار فیصلوں اور ان گنت ضابطوں پر عمل درآمد کرانا ہوتا ہے، چنانچہ وہ متواتر اسراعی دباؤ کا سامنا کر رہے ہوتے ہیں۔ قومی اوقاف برائے فنون لطیفہ کی ایک حالیہ رپوٹ کے مطابق اس کی کونسل امداد کی ہر درخواست پر بمشکل ساڑھے چار منٹ صرف کرتی ہے۔ درخواستوں کی تعداد۔۔۔ اندازوں سے اتنی زیادہ بڑھ گئی ہے کہ ادارہ اپنے مقاصد کے فروغ کے لئے صحیح فیصلے نہیں کر پاتا۔

فیصلہ سازی کی اس ناکارگی(Logjam) پر تحقیق نہ ہونے کے برابر ہے۔ ایسی ایک تحقیق 1968ء کے ایک واقع کے متعلق کی گئی ہے جب شمالی کوریا نے امریکی بحری جہاز پیوبلو کو حراست میں لے لیا تھا اور دونوں ممالک حالت جنگ میں آ گئے تھے۔ رپورٹ کے مطابق پینٹا گون کے جس مجاز افسر نے اس مہم کے ممکنہ خطرات کا جائزہ لے کر اس کی اجازت دی، اسے ایک دن میں 76 مختلف فوجی مہمات کا تجزیاتی جائزہ لینا تھا۔ اس افسر نے یہ بتانے سے گریز کیا کہ پیوبلو کی مہم کا تجزیہ کرنے میں اسے کتنا وقت لگا تھا۔ اس رپورٹ می دفاعی ادارے کے محکمہ جاسوسی کے ایک افسر کے یہ تاثرات بھی شامل ہیں کہ ہو سکتا ہے اس افسر کو ان مہموں کی تفصیلات ایک دن صبح نو بجے ان ہدایات کے ساتھ ملی ہوں کہ انہیں دوپہر بارہ بجے تک واپس لوٹا دیا جائے۔ یہ تفصیلا ٹیلی فون ڈائریکٹری کی طرح اچھی خاصی ضخیم ہوتی ہیں۔ اس افسر کے لئے اتنے مختصر وقت میں مہم کی باریک بینی سے سے چھان بین کرنا ناممکن تھا۔ اس لئے وقت کی کمی کے دباؤ کی وجہ سے پیوبلو کی ہم کے خطرات کو غیر اہم قرار دے دیا گیا۔ اس نے ہر مہم کی جانچ پڑتال میں بمشکل ڈھائی منٹ صرف کئے۔ ایسے میں غلطیوں کی گنجائش تو باقی رہتی ہی ہے۔

بعینہ پینٹا گون کے حکام غیر ملکی اسلحہ کی خرید و فروخت میں 30 ارب ڈالر گم کر

بیٹھے۔ انہیں پتہ نہیں کہ آیا یہ خطیر رقم حساب کتاب کی غلطی کی وجہ سے غائب ہوئی، خریدار سے ہی کم طلب کی گئی یا کہیں خرد برد ہو گئی۔ پینٹا گون کے اکاؤنٹس کے ماہرین کے مطابق انہیں اس معاملے کی تہہ تک پہنچنے کے لئے پانچ سال کا عرصہ درکار ہو گا۔ اگر انتہائی سریع رفتار کمپیوٹروں اور زبردست ابلاغیاتی نظام کے باوجود پینٹا گون کی بدانتظامی اور ابتری کا یہ عالم ہے، پھر باقی حکومت کا تو خدا ہی حافظ ہے۔

عمومی فیصلہ سازی کے ادارے دنیا میں وسعت پذیر افراتفری کے عکاس ہیں۔ صدر کارٹر کے ایک مشیر نے سماج کے مفاد پرست گروہوں میں بٹ جانے کی بات کی ہے۔ اس کے نتیجے میں کانگریس میں بھی بہت سے ذیلی گروپ تشکیل پا گئے ہیں۔ ان حالات میں کسی صدر کے لئے، کانگریس سے اپنی مرضی کے فیصلے کرانا ممکن نہیں رہا۔ امریکی صدر روایتی طور پر کانگریس کی کمیٹیوں کے بااثر سربراہوں سے ساز باز کر کے یہ توقع رکھ سکتا تھا کہ وہ کسی مجوزہ قانون کی منظور کے لئے مناسب ووٹ حال کرنے میں مدد دیں گے۔ آج ان بااثر سربراہوں کا حال قومی کلیسا یا مزدوروں کی قومی تنظیم کا سا ہے۔ وہ اپنے ہی اراکین کی وفاداری کا یقین نہیں دلا سکتے، سچ یہ ہے کہ یہ اراکان احکامات پر چپ چاپ عمل کرنے کے بجائے، اپنا ذہن خود بنانے پر یقین رکھتے ہیں۔ اپنی موجودہ عملی صورت کے مطابق کانگریس کے لئے سکون سے قانون سازی کرنا یا قومی توقعات کے مطابق فوری فیصلے کرنا ناممکن ہو گیا ہے۔ ''ایک ہفتے کے دوران پرول کی قیمت میں کمی کے متعلق حکومتی ضوابط میں تبدیلی، رہوڈیشیا کا یک طرفہ اعلان آزادی، پنامانہر، ٹھوس فضلہ ٹھکانے لگانے کا انتظام، نئے تعلیمی شعبے کا قیام، فوڈ سٹیمپ کا اجراء، ریل گاڑی کا نظام، فضائی راستے کی توسیع کی منظوری، حیوانی نسل کو درپیش خطرات کا ازالہ، جیسے مسائل پر سیر حاصل بحث وتمحیص کرنے کے بعد کیا کانگریس، قومی امنگوں کے مطابق قوانین بنانے کے لئے وقت نکال سکتی ہے؟ انہی مسائل میں الجھنے کی وجہ سے قومی تخیلات عقل و دانش اور امنگوں کا مرکز کانگریس، آج قومی تمسخر کا نشانہ بن کے رہ گئی ہے۔''

ظاہر ہے مختلف صنعتی ممالک میں مختلف النوع سیاسی عمل ہو رہے ہوتے ہیں لیکن اب ان پر یکساں قوتیں اثرانداز ہو رہی ہیں۔۔۔۔''صرف امریکہ ہی پراگندگی اور جمود کا

MashalBooks.org

شکار نہیں۔'' امریکی نیوز اینڈ ورلڈ رپورٹ کے مطابق۔''سابق سوویت یونین پر ایک نظر ڈالئے۔۔۔۔ جوہری اسلحہ پر قابو پانے کی امریکی تجاویز پر کوئی ردعمل ہی نہیں ہے۔اشتراکی اور غیر اشتراکی ممالک سے تجارتی معاہدوں کی گفت وشنید میں طویل تاخیر۔۔۔۔ فرانسیسی صدر جسکارڈ دیستان کا کسی غیر ملکی دورے کے دوران، پریشان کن رویہ۔۔۔۔ مشرقی وسطی کے مسئلے پر تذبذب، مغربی یورپ کے کیمونسٹوں کی اپنی حکومتوں کی مخالفت یا حمایت کے متعلق متضاد آراء۔۔۔۔ یک جماعتی حکومت میں بھی مضبوط پالیسیوں کی تشکیل و ترویج یا گمبھیر مسائل کی حمایت فوری توجہ تقریباً ناممکن۔۔۔۔''

برطانوی پارلیمان کے ایک رکن کے مطابق''مرکزی حکومت بے پناہ برجھ تلے دب کر رہ گئی ہے۔'' برطانیہ کے ایک سابق وزیر کا خیال ہے۔'' برطانوی پارلیمانی نظام میں پچھلے ڈھائی سو سال سے کوئی بنیادی تبدیلی نہیں آئی۔مگر اب وہ موجودہ تنظیمی ضروریات کے مطابق فیصلے کرنے کا اہل نہیں رہا۔ پارلیمان کے ساتھ ساتھ کابینہ بھی ناکارہ ہوگئی ہے'' سویڈن بھی اپنی لڑکھڑاتی مخلوط حکومت کی وجہ سے ایک عشرے سے جوہری مسئلے کے حل پر انتشار اور افتراق کا شکار ہے۔اٹلی دہشت گردی اور سیاسی ابتری کے ہاتھوں اتنا مجبور ہے کہ اس کی کوئی حکومت بھی چھ ماہ سے زیادہ نہیں چل پاتی۔

درحقیقت ہمیں ایک نئی ہولناک حقیقت۔۔۔۔ سیاسی کپکپاہٹ اور ابتری۔۔۔۔ کا سامنا ہے۔ جب تک ہمارے راہنما فرسودہ، ناموزوں، شکستہ اور بوجھل اداروں پر تکیہ کرنا نہیں چھوڑیں گے، کسی سیاسی بحران کے حل کی اہلیت خود میں پیدا نہیں کرسکیں گے۔

فیصلے کرنا اور ان پر عمل درآمد کرانا ہی کسی سیاسی نظام کے لئے کافی نہیں۔ اس کے لئے ہم آہنگ حکمت عملیاں، سرعت انگیز فیصلہ سازی، معاشرتی تنوع کی عکاسی بھی اہم عوامل ہوتے ہیں۔کسی ایک جگہ بھی غلطی ساری نظام کو تلپٹ کرسکتی ہے۔''بائیں بازو یا دایاں بازو'' ہمارے مسئلے نہیں اور نہ ہی طاقتور یا کمزور قیادت۔ فیصلہ سازی کا سارا نظام ہی فرسودگی کا شکار ہو چکا ہے۔

انتہائی حیرت اس پر ہے کہ ہماری حکومتیں ابھی تک چل رہی ہیں۔کسی کارپوریشن کا صدر، ایک بڑی کمپنی کو چلانے کے لئے اٹھارویں صدی کے قدیم وضع شدہ انتظامی

ڈھانچے کوقطعی قبول نہیں کرے گا۔ کوئی ہوش مند پائلٹ سو سال پرانے فضائی طور طریقوں کے مطابق سپر سانک جہاز اڑانے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ تاہم سیاسی میدان، میں ہم کم و بیش اسی طرح کی حرکات کر رہے ہیں۔ دوسری لہر کا سیاسی نظام، ایک ایسی دنیا کے لئے۔۔۔ جو جوہری ہتھیاروں سے لیس ہے اور سماجی اور ماحولیاتی تباہی کے آتش فشاں پر کھڑی ہے۔۔۔ اندرونی اور بیرونی طور پر، امیر اور غریب، صنعتی، سبھی علاقوں کے لئے مزید جمود اور خطرات کے سوا کچھ نہیں دے سکتا۔ خطرہ ان طاقتوں سے نہیں جو اپنی قوت کا استعمال سوچ سمجھ کر کرتی ہیں بلکہ ان سیاسی اور افسر شاہی ڈھانچوں سے ہے جو فیصلے کے مجاز ہیں اور ان فیصلوں کے ضمنی اثرات اتنے خطرناک ہیں کہ انہیں قاتلانہ نوعیت کے بھی کہا جا سکتا ہے۔

مروجہ سیاسی نظام، صنعتی انقلاب کے زمانے سے بھی پہلے کے ماڈلز کی نقالی ہیں۔ اس وقت تک محفوظ غذائی پیکنگ، ریفریجریٹر، بجلی، ٹوٹ گرافی، ٹائپ رائٹر، ٹیلی فون، ہوائی جہاز، ریڈیو، ٹی وی، اعصابی گیس، فوٹو کاپی مشین، کمپیوٹر، ضبط تولید کی گولیاں، ٹرانسسٹرز اور لیزر، غرض کچھ بھی ایجاد نہیں ہوا تھا۔ وہ زمانہ مارکس، ڈارون، فرائیڈ، آئن سٹائن سے پہلے کا زمانہ تھا۔ وہ دنیا آج ہمارے تصور سے بھی باہر ہے۔ ہم مسائل در مسائل کا سامنا کرتے کرتے لڑکھڑانے لگتے ہیں۔ خواہش یہ ہوتی ہے کہ سٹالن اور ہٹلر اپنے کھنڈرات سے دوبارہ نمودار ہوں، ہماری مدد کو آئیں اور ہمیں بتائیں کہ ہم اپنے تمام فرسودہ اداروں کو اپنی آزادی سمیت، اٹھا کر پھینک دیں۔

دو سو سال پہلے امریکہ کی بنیادیں رکھنے والوں نے ماضی سے مکمل قطع تعلق کے بعد، نئے زمینی رشتے اور حقائق تلاش کئے تھے۔ تیسری لہر کی جانب تیز تر پیش رفت کرتے ہوئے ہمیں بھی نئے ادارے بنانا ہوں گے کیونکہ انسانی آزادی کی حفاظت کے لئے موجودہ اداروں کی حمایت کی ہی نہیں جا سکتی۔

باب 27

اکیسویں صدی کی جمہوریت

بانی آباؤ اجداد کے نام (ایک خط):

آج کی دنیا میں ناموجود ہونے کے باوجود تم ہی وہ مرد و زن، کسان، تاجر، دستکار، قانون دان، طابع و ناشر، دوکاندار اور سپاہی ہو، جنہوں نے یکجا ہو کر امریکہ کے دور دراز ساحلوں پر ایک نئی قوم کو جنم دیا۔ تم 1787ء کے چلچلاتے موسم گرما میں فلاڈیلفیا میں جمع ہونے والے ان پچپن بزرگوں میں سے ہو جنہوں نے اس حیرت انگیز دستاویز کو اتفاق رائے سے قبول کیا جسے ریاست ہائے متحدہ کا آئین کہا جاتا ہے، تم ہی اس مستقبل کے موجود ہو جو میرا حال بنا۔

کاغذ کا وہ ٹکڑا، 1971ء میں قانونی حقوق کی شمولیت کے بعد بلاشبہ انسانی تاریخ کی حیرت انگیز کامیابیوں میں سے ایک کا جیتا جاگتا نشان ہے اور بہت سے لوگوں کی طرح میں بھی مسلسل خود سے یہ سوال کیے جانے پر مجبور ہوں کہ سماجی اور معاشی ہیجان کے شدید دباؤ کے باوجود آپ لوگوں نے مستقبل کے لئے اتنا فہم و ادراک کیسے حاصل کیا؟ آنے والے وقت کی دور دراز سائیں سائیں سے کس طرح سے محسوس ہوا کہ پرانی تہذیب موت کے منہ میں جا رہی ہے اور ایک نئی تہذیب جنم پذیر ہے۔

میرا اپنا خیال ہے کہ واقعات کی گردابی قوت کے ہاتھوں آپ یہ سمجھنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ ناموزوں اصولوں اور فرسودہ ڈھانچہ پر تشکیل شدہ ناکارہ حکومت کسی بھی وقت ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو سکتی ہے۔ تاریخ میں شاید ہی ایسا ہوا ہو کہ اتنی مختلف النوع علاقائی وابستگیاں اور اقتصادی مفادات کے حامل، انتہائی ذہین، متضاد خیال اور انا پرست لوگ، حکومت کی غیر مستعدی اور نا اہلیت کے ہاتھوں اس قدر عاجز ہو جائیں کہ وہ جدید حاکمیت

کے لئے ایک بالکل ہی نئے اور حیرت انگیز اصولوں پر مبنی آئین تجویز کر ڈالیں۔

دنیا کے کروڑوں لوگوں کی طرح میں بھی ان اصولوں سے جذباتی لگاؤ محسوس کرتا ہوں۔ مجھے اعتراف ہے کہ جیفرسن یا پائنے(Paine) کے بعض اقتباسات پڑھنا آج بھی میرے لئے کٹھن مرحلہ ہوتا ہے۔ میں آنکھوں میں تیرتے آنسوؤں کو پار کئے بغیر ان کی خوبصورتی اور معنویت تک نہیں پہنچ پاتا۔

اسے ناموجود انقلابیوں! کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے حقوق کے بل کے ذریعے امریکہ کی انفرادی آزادی رائے کو تحفظ دیا۔ اسی بل کی وجہ سے آج میں اپنے غیر مقبول تصورات۔۔۔ چاہے بعض اوقات وہ احمقانہ یا غلط ہی کیوں نہ نظر آئیں۔۔۔ کو بے خوف وخطر پیش کر رہا ہوں۔ جو کچھ میں لکھنے جا رہا ہوں، وہ ممکن ہے میرے ہم عصروں کو با آسانی ہضم نہ ہو۔ وہ اسے میری یاسیت انگیزی کا شاخسانہ سمجھیں گے۔ ایک بار پھر آپ کا شکریہ کہ آپ کے وضع کردہ سماج میں میری زندگی کے پچاس سال گزر گئے۔ یہ وہ سماج ہے جہاں افراد کے بجائے قانون کی بالادستی ہے۔ پھر بھی یہ ایک تلخ اور دردناک حقیقت ہے کہ آپ کا وضع کردہ نظام حکومت اور اس کے بنیادی اصولوں بتدریج فرسودہ ہو کر، ہماری فلاح و بہبود کے لئے غیر ارادی طور پر جابرانہ اور خطرناک ہوتے جا رہے ہیں۔

لہٰذا اب وقت آ گیا ہے کہ اس نظام کی جگہ ایک نیا نظام حکومت۔۔۔ اکیسویں صدی کی جمہوریت پر مبنی۔۔۔ تشکیل پانا چاہئے۔

آپ مجھ سے کہیں بہتر جانتے تھے کہ کوئی حکومت، کوئی سیاسی نظام، کوئی آئین، چارٹر یا ریاست دائمی حیثیت کا حامل نہیں ہوتا۔ نہ ہی ماضی کے فیصلے تہذیب کا وضع شدہ ڈھانچہ کسی نئی تہذیب کے ساتھ چل سکتا ہے۔ اسی لئے امریکی آئین میں تبدیلیوں کے لئے دوبارہ غور وخوض کی ضرورت ہے۔ مسئلہ وفاقی بجٹ میں کٹوتی یا بعض پرانے اصولوں کی تبدیلی کا نہیں بلکہ ان ترامیم کا مقصد ہماری آزادی کو لاحق ان خطرات کا احاطہ کر کے (جو ماضی میں سوچے بھی نہیں جا سکتے تھے) ایسا نیا حکومتی ڈھانچہ تشکیل دینا ہے جو موجودہ دنیا میں ہمارے وجود اور بقاء کے لئے دانش مندانہ، ضروری جمہوری فیصلہ کرنے اور ان پر عمل درآمد کرانے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہو۔

MashalBooks.org

آنے والے کل کے کسی جدید آئین کے خدوخال میرے ذہن میں واضح نہیں۔ ابھی تو ہم سوالات مرتب کر رہے ہیں لیکن انتہائی حیرت یہ ہے کہ بعض مشکوک لوگ جوابات کا پلندہ لئے پھر رہے ہیں۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم بحث و مباحثے کے ذریعے اتفاق رائے حاصل کر کے مستقبل کی جمہوریت کا ایک ایسا نقشہ وضع کریں جو امریکی قوم کی تجدید کر سکے۔

آپ کو یقیناً اس ضرورت کا احساس ہو گیا ہو گا کیونکہ آپ کی نسل میں سے ایک شخص جیفرسن نے اس سلسلے میں کیا خوب عکاسی کی تھی۔ ''کچھ لوگ آئین کو کلیسا کے محراب کی مانند، مقدس سمجھ کر ہاتھ لگانے سے بھی گریز کرتے ہیں۔ وہ بزرگوں کی عقل و دانش کو موجودہ انسانی سوچ سے بلند اور نا قابل ترمیم سمجھتے ہیں۔۔۔۔ میں یقیناً آئین اور قوانین میں آئے دن کی غیر ضروری ترامیم کا قائل نہیں لیکن میں بخوبی جانتا ہوں کہ قوانین اور اداروں کو انسانی ذہن کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ چلنا چاہئے۔۔۔۔نئی دریافتوں اور حقائق کے انکشافات، بدلتے حالات کے جلو میں تغیر پذیر رویوں اور آراء کے ساتھ اداروں کو بھی وقت کے تقاضوں کے مطابق ارتقاء کی جانب بڑھنا چاہئے۔''

اس فہم و فراست کے لئے میں جیفرسن کا ممنون ہوں جس نے ایک ایسا نظام پیدا کرنے میں مدد دی جس نے ایک طویل عرصے تک ہماری ضروریات پوری کیں لیکن اب اسے لازماً دوسرے نظام سے بدل دیا جانا چاہئے۔ (ایلون ٹوفلر واشنگٹن، کنکٹی کٹ)

ایسا تصوراتی خط۔۔۔۔ بہت سی قوموں میں کئی دوسرے لوگ بھی یقیناً ہونگے جو موقع ملنے پر ممکن ہے اسی قسم کے جذبات کا اظہار کریں۔ موجودہ حکومتوں کی فرسودگی کی۔ صرف میں نے ہی نشان دہی نہیں کی اور نہ ہی یہ مرض صرف امریکہ تک محدود ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ پرانی تہذیب کے کھنڈرات پر ایک نئی تہذیب کا ڈھانچہ کھڑا کرنے کے لئے بہت سے ملکوں کو موزوں تر اور جدید سیاسی بنیادیں، بیک وقت استوار کرنا پڑیں گی۔ اس تکلیف دہ مگر لازمی پراجیکٹ کے لئے بے پناہ ذہنی صلاحیتیں اور کئی عشرے درکار ہونگے۔ بہر حال اس انقلابی اوور ہالنگ کے لئے ایک طویل جنگ ہونا لازمی ہے۔ امریکی کانگریس، اشتراکی صنعتی ممالک کی مرکزی کمیٹیاں اور پولٹ بیوروز، دارالعوام اور

دارالامراء، فرانسیسی ایوان نائبین، جرمن بندشٹاگ اور ڈائٹ بہت سی اقوام کی عظیم الشان وزارتیں اور نوکر شاہی، آئین اور عدالتی نظام۔۔۔ الغرض، وہ سب کچھ، جس کے بغیر نمائندہ حکومتیں بیکار محض ہوتی ہیں۔۔۔ از سر نو تشکیل و ترتیب کے عمل سے گزرنا چاہئیں۔

سیاسی جدوجہد کی یہ لہر قومی سطح پر ہی نہیں رکے گی بلکہ آنے والے عشروں میں تمام ''دنیا کی قانونی مشین''۔۔۔ اقوام متحدہ کی سطح سے لے کر مقامی شہری کونسل کی سطح تک۔۔۔ کو بالآخر مسلسل تعمیر نو کے ناقابل مزاحمت مطالبے کا سامنا کرنا ہوگا۔ یہ ادارے تبدیلی اور اسراع کا ساتھ دینے کے قابل نہیں رہے اس لئے انہیں اپنے سے بہتر نظام کے لئے جگہ چھوڑنا ہوگی۔

ایک قابل عمل حکومتی ڈھانچے کی ترتیب میں ہمیں تین بنیادی اصول یاد رکھنے چاہئیں۔ انہی اصولوں کو تیسری لہر کی حکومتوں کے لئے بنیادی حیثیت حاصل ہوگی۔

اقلیتوں کی طاقت

تیسری لہر کی حکومت کا پہلا اصول اقلیتوں کی طاقت کے بارے میں ہے۔ اس کے مطابق دوسری لہر کے دور کا بنیادی اور جائز اصول۔۔۔ اکثریت کی حکمرانی۔۔۔ بتدریج فرسودہ ہوتا جا رہا ہے۔ اب اکثریت کے بجائے اقلیت کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ ہمارے سیاسی نظام کو بھی اس حقیقت کا عکاس ہونا چاہئے۔ جیفرسن نے اپنی انقلابی نسل کے اعتقادات کا اظہار کرتے ہوئے با اصرار یہ کہا تھا کہ حکومتوں کو اکثریت کے فیصلوں کے آگے سر تسلیم خم کئے رکھنے کا رویہ رکھنا چاہئے۔ امریکہ اور یورپ۔۔۔ دوسری لہر کے دور کے آغاز میں۔۔۔ وسیع پیمانے کے صنعتی معاشروں کی تشکیل کے لئے اپنے طویل سفر کی ابتداء ہی کر رہے تھے۔ اکثریتی حکومت کا تصور ان معاشروں کی ضروریات سے مکمل مطابقت رکھتا تھا۔

آج ہم چونکہ صنعت کو پیچھے چھوڑ کر تیزی سے ایک تخصیص پسند سماج کی تشکیل کر رہے ہیں اس لئے اکثریت کو بلکہ مخلوط حکومت کو متحرک کرنا، نہ صرف مشکل بلکہ بسا اوقات ناممکن ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اٹلی اور ہالینڈ میں بالترتیب چھ اور پانچ ماہ تک کسی حکومت کی تشکیل تک نہ کی جا سکی۔ امریکہ کے ایک سیاسی مفکر والٹر ڈین برنہام کا کہنا ہے۔ کسی بھی

معاملے پر مجھے تو مثبت اکثریت کی کوئی بنیاد نظر نہیں آتی۔

دوسری لہر کی اشرافیہ اکثریت کی قسم کھاتی تھی کیونکہ ان کا اپنا حق حاکمیت منحصر ہی اکثریت پر تھا۔ امریکی حکومت بھی لوگوں کی ۔۔۔۔ کے ذریعے۔۔۔۔ اور کے لئے تھی۔ سوویت کمیونسٹ پارٹی مزدور طبقے کا نام لیتی تھی۔ مسٹر نکسن خود کو ''خاموش اکثریت'' کا نمائندہ سمجھتے تھے۔ آج امریکہ کے جدید قدامت پسند دانش ور، سیاہ فاموں، خواتین، ہسپانوی اقلیتوں کے مطالبات پر حملہ آور ہوتے ہوئے خود کو عظیم حقیقی میانہ رو اور عام اکثریت کے مفادات کا ترجمان گردانتے ہیں۔ دانش وروں کی یہ اکثریت شمال مشرقی امریکہ کی یونیورسٹیوں اور واشنگٹن سے تعلق رکھتی ہے ان میں سے اکثر نے وسطی امریکہ کی کوئی ریاست شاید ہی دیکھی ہو۔ بہرحال وہ اس علاقے کو گنوار کاریگروں کا علاقہ کہتے ہیں، تاہم یہاں کے باسی بھی چند ایک مسائل کے علاوہ کسی چیز پر متفق نہیں ہوتے۔ ممکن ہے جدید قدامت پسند دانش ور اقلیتوں کے خلاف اپنی تحریک کی حمایت، میں حقیقی اکثریت کے بجائے، فرضی اکثریت کا حوالہ دے رہے ہوں۔ مغربی یورپ کے ملکوں کی اشتراکی جماعتیں بھی محنت کش طبقات کی ترجمانی کا دعوی کرتی ہیں۔ صنعتی سماج کی حدود سے باہر نکلتے ہی مارکس کے مفروضات اپنی معنویت کھو بیٹھتے ہیں۔ تیسری لہر کی تہذیب میں عوام اور طبقات دونوں ہی اپنی معنویت کھو بیٹھتے ہیں۔ صنعتی سماج میں گروہی الحاق سے پیدا شدہ اکثریت کے بجائے ہم دراصل کثیر الجہت سماج کی جانب گامزن ہیں جہاں ہزارہا اقلیتوں کا باہم ملاپ نت نئے قلیل مدتی اور انوکھے نقوش ابھار رہا ہے۔ ایسے ماحول میں کسی بھی مسئلہ پر 51% اتفاق رائے ممکن ہی نہیں۔ تیسری لہر کی تذیب کی آمد موجودہ بہت سی حکومتوں کے حق حاکمیت کو خطرے میں ڈال رہی ہے۔

اسی طرح تیسری لہر اکثریتی حکومت اور سماجی انصاف کے باہمی تعلق کو بھی چیلنج کر رہی ہے۔ دوسری لہر کی تہذیب کے دوران اکثریت کی حکمرانی کی جدوجہد انسانیت کی بھلائی اور بہتری کے لئے کی جاتی رہی ۔جنوبی افریقہ جیسے ترقی پذیر صنعتی ممالک میں اب بھی یہی کچھ نظر آتا ہے۔ دوسری لہر کے معاشروں میں ہمیشہ غریب کے لئے اکثریتی حکومت کو بہتر سمجھا گیا کیونکہ ہمیشہ غریب ہی اکثریت میں ہوتے تھے۔ دوسری لہر کے دانش ور وسیع

MashalBooks.org

معاشرے کی شکست وریخت کے نتیجے میں ترقی کی نئی راہیں وا ہوتے نہیں دیکھ سکتے۔ انہیں تنوع میں عدم استحکام دکھائی دیتا ہے۔ اس سوچ کی وجہ اقلیتوں کی مفاد پرستی اور تنگ نظری ہی سمجھ میں آتی ہے۔ دراصل اقلیتوں کی بڑھتی ہوئی سرگرمیاں ان کی خودغرضی کی وجہ سے نہیں بلکہ موعودہ جدید پیداواری نظام کی ضرورت کی عکاس ہیں۔ دوسری لہر کے اداروں کے تحفظ کے لئے ہمیں یا تو معاشرے کو تنوع کی جانب بڑھنے سے روکنا ہوگا یا تنوع کو تسلیم کر کے سماجی اور معاشی اداروں کو اس کے مطابق از سر نو تشکیل دینا ہوگا۔

اول الذکر ردعمل صرف آمرانہ نظام میں ہی ممکن ہے جب کہ دوسری صورت میں سماجی ارتقاء ہے جس کے نتیجے میں اقلیتوں پر مبنی ایک جدید جمہوری عمل رواج پا سکتا ہے۔ تیسری لہر کے حوالے سے از سر نو جمہوری تشکیل کے لئے اس مفروضے۔۔۔۔تنوع میں اضافہ معاشرتی تناؤ کو جنم دیتا ہے۔۔۔۔کو سرے سے رد کرنا ہوگا۔ کسی بھی سماج میں مناسب حدود کے اندر ایسے اختلافات اور تناؤ ہوتے رہتے ہیں۔ موزوں تر سماجی تنوع تہذیبی استحکام کو مزید خوبصورتی اور مضبوطی عطا کرتا ہے۔

مناسب سیاسی اداروں کا فقدان اقلیتوں میں پیدا شدہ موجودہ ٹکراؤ کی بنیادی وجہ ہے۔ اقلیتوں کی ضد کی وجہ سے اکثریتی اتفاق رائے کا حصول بہت مشکل نظر آنے لگتا ہے۔ نئی تہذیب کی آمد کے ساتھ ہی اکثریت کی حکمرانی اور ووٹ سے اظہار رائے کا میکانیک طریقہ دونوں ہی مشکوک محسوس ہونے لگے ہیں۔ عین ممکن ہے مستقبل کا مورخ نظام رائے دہندگی اور اکثریت کی جستجو کو ابتدائی مواصلاتی انسان کی فرسودہ رسوم کا نام دے۔ بہر حال آج کے خطرناک دور میں ایک اقلیت کو دوسری اقلیتوں پر مسلط ہونے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ لہٰذا ہمیں اقلیتوں کی جمہوریت قائم کرنی ہوگی۔اس میں اختلاف رائے، فرضی اکثریت یا الیکشن کے ذریعے کسی طرح کی گڑ بڑ ممکن نہیں ہوگی۔ جدید نظام میں مختلف اقلیتوں کا کردار تسلیم کر کے ان کے باہم ملاپ سے اکثریت پیدا کرنے کی کوشش کی جانی چاہئے لیکن اس کے لئے جمہوریت کی علامت بیلٹ بکس کو بھی تبدیل کرنا ہوگا۔ دوسری لہر کے معاشروں میں ووٹنگ کے ذریعے عوامی رائے کا اظہار۔۔۔۔اشرافیہ کے لئے۔۔۔۔ فیڈ بیک کا اہم ترین طریقہ تھا۔ اکثریت ووٹ کے ذریعے اشرافیہ کے فیصلوں پر ناراضگی کا

اظہار کر دیتی تو انہیں اپنی حکمت عملیوں اور عملی اقدامات کو تبدیل کر کے عوامی رائے کے مطابق بنانا پڑتا تھا، اکثریت کی رائے لینے کے لئے ووٹنگ لوگوں کی گنتی کا ذریعہ تو تھی مگر اس سے ووٹوں کو تولا نہیں جا سکتا تھا۔ اس طرح کسی اقلیت کو درپیش اہم ترین مسئلے کی نشان دہی قطعاً نہیں ہو سکتی تھی۔ اکثریت کی حکمرانی میں یہ خامیاں اس لئے چلتی رہیں کہ اقلیتیں مجبور اور لاچار ہوتی تھیں۔ موجودہ ابلاغی سماج میں ایسے امکانات باقی نہیں رہے کیونکہ ہم میں سے ہر ایک کسی نہ کسی اقلیت سے تعلق رکھتا ہے۔

اب ووٹنگ میں ہاں یا نہ کا معاملہ ہی نہیں ہونا چاہیئے۔ صنعتی دور کی فیڈ بیک کا طریقہ اب فرسودہ ہو چکا ہے لہٰذا ووٹنگ اور الیکشن کے نظام میں اہم تبدیلیاں کرنا ہوں گی۔ ہاں یا نہ کے طریقے کے بجائے ہمیں اپنے حقیقی مسائل کے تعلق سے سوالات مرتب کرنے چاہئیں مثلاً اگر میں اسقاط حمل کے متعلق اپنا نقطہ نظر تبدیل کر لوں تو کیا آپ دفاعی اخراجات یا جوہری قوت پر میری حمایت کریں گے؟ یا پھر اگر میں آپ کے منصوبے کی تعمیر کے لئے اگلے مالی سال میں زیادہ انکم ٹیکس دینا مان لوں تو آپ میرے لئے کیا کریں گے؟

جدید ابلاغی ٹیکنالوجی کی موجودگی میں ایسے سوالات پر رائے کے اظہار کے لئے پولنگ سٹیشن پر جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہوگی۔ نیز ہمیں انتخابی نظام سے اقلیت گروہوں کے لئے، غیر منصفانہ قوانین کو بھی ختم کرنا ہوگا۔ ایک روایتی طریقہ تو مخلوط رائے دہی کا ہے جس کے ذریعے کئی کارپوریشنیں اپنے اقلیتی حصہ داروں کے حقوق کا تحفظ کرتی ہیں۔ اس طریقے میں ووٹر اپنی پسند و ناپسند کے اظہار کے ساتھ اپنے نقطہ نظر کی شدت اور ترجیحات بیان کر سکتا ہے۔ ہمیں اپنے فرسودہ سیاسی جماعتی نظام کو خیر باد کہنا ہوگا کیونکہ یہ ایک قدیم سست رو ماحول کی تخلیق ہے اور اس کی جگہ اقلیتوں کی مسلسل تبدیل ہوتی صورتوں سے منطبق ہونے کی اہل جماعتوں کو جنم دینا ہوگا۔ اقلیتوں کے مابین معاملات طے کرانے کے لئے باقاعدہ سفارت کاری شروع کرنا ہوگی۔ ہمیں اقلیتوں کے مابین اتحاد سنوارنے اور بگاڑنے کی خاطر نیم سیاسی ادارے بنانے چاہئیں۔ ان کے باہمی اختلافات طے کرانے کے لئے اور مختلف مسائل پر سمجھوتوں کی غرض سے پلیٹ فارم تشکیل دیئے جانے چاہئیں۔ اگر ڈاکٹروں موٹر سائیکلوں کے شیدائیوں، کمپیوٹر پروگراموں اور حضرت عیسیٰ کی دوبارہ واپسی کے

مقلدوں کو اکٹھا کر کے ان کے مسائل کا بہتر ادراک اور اختلافات کے حل کے لئے ماہرانہ امداد فراہم کی جا سکے تو ان کے مابین حیرت انگیز اور مثبت اتحاد قائم ہو سکتے ہیں۔

اسی طرح اقلیتوں کو اپنے معاملات طے کرنے کے لئے خود طویل مدتی مقاصد کا تعین کرنا چاہئے۔ مثلاً اقلیتوں کو محلّہ کی سطح پر خلاف قانون حرکات کرنے والے اپنے جوانوں کے لئے خصوصی عدالتیں قائم کرنی چاہئیں اس طرح وہ ریاستی عدلیہ پر بوجھ میں کمی کر رہے ہوں گے۔ ایسی تنظیمیں اقلیتی تشخص کو واضح کرنے کے ساتھ ساتھ امن عامہ کے تحفظ میں برابر کی شریک ہوں گی۔ ممکن ہے کہ ہمیں مزید اصلاحی اقدامات کرنا پڑیں۔ ایک اجتماعی سماج میں اقلیتی نمائندگی بڑھانے کے لئے قرعہ اندازی کے ذریعے چند افسران کے انتخاب کا طریقہ پھر سے رواج دینا ہوگا۔ عدالتی جیوری کے اراکین کی طرح قانون سازوں کے انتخابات کی تجاویز سننے میں آ رہی ہیں۔ ہوائی یونیورسٹی کے شعبہ سیاسیات کے ایک پروفیسر تھیوڈر بیکر نے یہ اہم سوال کیا ہے کہ: عدالتی جرگے کے اراکین اگر زندگی اور موت کے فیصلے خود ہی کر سکتے ہیں تو پھر بچوں کے تحفظ ترقی اور دفاع پر اخراجات کے فیصلے لوگوں کے نمائندوں پر کیوں چھوڑے جائیں؟

پروفیسر تھیوڈر بیکر۔۔۔۔ جو آئینی ماہر بھی ہیں۔۔۔۔ موجودہ سیاسی نظام پر الزام لگاتے ہوئے کچھ حقائق بیان کئے ہیں۔ ان کے مطابق امریکہ میں سیاہ فام آبادی 20% ہے جب کہ 1976ء میں ایوان زیریں میں ان کا تناسب صرف چار فیصد تھا اور سینٹ میں صرف ایک فیصد۔ 50% خواتین کی نمائندگی ایوان زیریں میں چار فیصد اور سینٹ میں سرے سے تھی ہی نہیں۔ اسی طرح غریبوں، نوجوانوں اور ذہین لوگوں کی بھی کوئی نمائندگی نہیں ہوتی۔ ایسا صرف امریکہ ہی میں نہیں ہو رہا، جرمن بند شٹاگ میں خواتین ارکان سات فیصد ہیں۔ اتنے غیر منصفانہ سیاسی نظام میں کم نمائندہ گروہوں کے لئے ہمدردی کی کیا توقع کی جا سکتی ہے؟ ایک تجویز یہ بھی ہے کہ امریکہ کانگریس کے 50 سے 60 فیصد اراکین کا چناؤ ایسی قرعہ اندازی سے کیا جانا چاہئے جیسی فوجی ملازمت کے لئے بھرتی کے وقت کی جاتی ہے۔ سوچنا صرف یہ ہے کہ آیا اس طرح چنے ہوئے لوگوں کی کارکردگی موجودہ منتخب نمائندوں سے بھی بری تو نہیں ہوگی۔

اراکین کا انتخابی نظام اگر برقرار رکھنا ہے تو کسی بھی مسئلہ پر ان کی رائے صرف 50% ووٹوں تک محدود کر دی جائے اور باقی 50% عوام میں سے اتفاقی طور پر لئے گئے لوگوں کے لئے مختص کر دیئے جائیں۔ 50% لوگوں کا اتفاق چناؤ کمپیوٹر اور ٹیلی مواصلات کے ذریعے قطعاً کوئی مسئلہ نہیں رہا۔ قانون سازی کے دوران قانون ساز اپنی روایتی بحث و تمحیص کے بعد قانون کو آخری شکل دے سکتے ہیں۔ رائے شماری کے وقت ایوان کے اراکین 50% ووٹ ڈال سکیں گے جب کہ باقی 50% ووٹ دفتروں اور گھروں میں بیٹھے لوگ الیکٹرانک ذرائع سے ڈالیں گے۔ اس طرح قانون سازی کے لئے بہتر نمائندہ رائے سامنے آئے گی اور مفاد پرست گروہوں کو بھی پارلیمان سے دور رکھنا ممکن ہو جائے گا۔ انہیں سمجھنا ہو گا چند اراکین کے رائے بدلنے کی بجائے انہیں عوامی رائے کی تشکیل میں حصہ لینا چاہیئے۔

مزید براں ایک حلقے سے ایک نمائندے کے بجائے ایک گروپ چنا جا سکتا ہے جو کانگریس کی کاروائی میں براہ راست شامل ہو اور اس گروپ کا ووٹ شماریاتی طور پر ایک ہی سمجھا جائے۔ جدید مواصلاتی ٹیکنالوجی کی مدد سے سیاسی نظام میں کئی نت نئی اختراعات کا اکان بڑھتا جا رہا ہے۔ موجودہ اداروں اور آئینی دستاویزات کے ناکارہ ہونے کا اعتراف کر لیا جائے تو نئی سوچ اور تصورات کی مدد سے نظام کی بہتری اور اصلاح کی گنجائش پیدا ہو سکتی ہے۔ بہر حال آنے والا سیاسی نظام اکثریت کے جبر پر مبنی ہونے کے بجائے اقلیتوں کی قوت کا جائز عکاس بھی ہو گا۔

نیم براہ راست جمہوریت

نیم براہ راست جمہوریت کا اصول کل کے سیاسی نظام کی دوسری بنیادی اینٹ ہونا چاہیئے۔ اپنی نمائندگی کے لئے صرف نمائندوں پر انحصار میں تبدیلی ضروری ہے۔ اتفاق رائے کے فقدان نے نمائندگی کے تصور کو بری طرح مجروح کیا ہے۔ رائے دہندگان سے مشورے کے بغیر یہ نمائندے آخر کس کی نمائندگی کر رہے ہوتے ہیں؟ ساتھ ہی قانون سازی میں مشاورت کے لئے پارلیمان کے اراکین ماہرین کی خدمات پر تکیہ کرتے ہیں۔ برطانوی دارالعوام کے رکن بغیر ذاتی سٹاف کے سرکاری افسروں کی رائے پر بھروسہ کر لیتے

ہیں۔ اس طرح حقیقی طاقت پارلیمان سے نوکر شاہی کی جانب منتقل ہوتی ہے۔

با اثر نوکر شاہی کا مقابلہ کرنے کے لئے کانگریس نے خود بھی ایک زبردست نوکر شاہی بنا ڈالی ہے۔ مثلاً بجٹ بیورو، ٹیکنالوجی کی جانچ کا مرکز وغیرہ۔ پچھلے عشرے میں کانگریس کے عملے کی تعداد 10700 سے بڑھ کر 18400 تک جا پہنچی تاہم مسائل جوں کے توں رہے۔ قانون ساز نمائندے زیر غور مباحث کے متعلق عموماً زیادہ نہیں جانتے چنانچہ ان کے فیصلے اوروں کی رائے کے محتاج ہوتے ہیں درحقیقت یہ نمائندے تو اپنی نمائندگی بھی نہیں کر سکتے۔ روایتی منتخب ایوانوں میں اقلیتوں کے متضاد مطالبات پر باہمی افہام و تفہیم کے ذریعے سمجھوتے ہو جایا کرتے تھے۔ لیکن اب اقلیتیں اتنی زیادہ ہوگئی ہیں کہ ہمارے نمائندے (سیاسی ٹیکنالوجی کی فرسودگی بھی ایک وجہ ہے) ان کے مفادات کا حساب رکھ ہی نہیں پاتے۔ امریکی کانگریس، جرمن بند شٹاگ اور ناروے کی سٹارٹنگ میں قانون سازی کے کام کی زیادتی حالات میں مزید پیچیدگی پیدا کر دیتی ہے۔

ایک نکاتی چھوٹے گروہ اسی وجہ سے تنگ نظری کا شکار ہو رہے ہیں کیونکہ ایوانوں میں انہیں گروہی مفاہمتوں کی کوئی صورت بنتی نظر نہیں آتی۔ نمائندہ نظام حکومت مختلف سماجی قوتوں کے مابین ہم آہنگی پیدا کرنے میں ناکام ہو کر رہ گیا ہے۔ یہ ذمہ داری بھی ووٹروں کے سر پر ہی آئے گی۔ ہمارے نمائندے اگر ہماری ضروریات کے مطابق قانون سازی نہیں کر سکتے تو ہمیں خود ہی قوانین بنانے ہوں گے اور اس کام کے لئے ہمیں نئے اداروں اور نئی ٹیکنالوجی کی ضرورت ہو گی۔

دوسری لہر کے انقلابیوں نے جب موجودہ جمہوری نظام تشکیل دیا تو انہیں نمائندہ جمہوریت اور براہ راست جمہوریت کا فرق اچھی طرح معلوم تھا۔ فرانسیسی انقلاب کے بعد 1793ء میں تدوین شدہ آئین میں براہ راست جمہوریت کے بعض پہلو بھی شامل تھے۔ امریکہ کی آزیادی کے ہیرو بھی اس آگہی سے بہرہ ور تھے۔ کارل مارکس اور ان کے پیروکار پیرس کمیون کو قانون سازی اور ان کے اطلاق کی براہ راست مثال سمجھتے تھے۔ تاہم اس وقت بھی براہ راست جمہوریت کی دو خامیاں سب کے سامنے تھیں۔ پہلی یہ کہ جذباتی عوامی فیصلوں کی روک تھام کی ضرورت اور دوسرے اس وقت کی غیر ترقی یافتہ ابلاغی

ٹیکنالوجی۔۔۔۔ اس وقت تمام شہریوں کو فوری اطلاعات پہنچانا ممکن نہیں تھا۔ یہ بات اپنی جگہ ہے کہ منتخب نمائندے عام لوگوں کی نسبت مسائل پر غیر جذباتی انداز میں سوچ سمجھ کر اپنی رائے قائم کرتے ہیں تاہم جذباتی عوامی رائے کو مختلف طریقوں سے عملدرآمد رو کے رکھا جائے یا روبہ عمل لانے سے پہلے رائے شماری کرالی جائے۔1970ء کے عشرے کے وسط میں سویڈن میں توانائی کی قومیں پالیسی مرتب کرنے کے لئے شہریوں کی شمولیت کا تجربہ کیا گیا تھا۔ حکومت نے شہریوں کو ضروری معلومات بہم پہچانے کے لئے دس گھنٹے کا ایک کورس تیار کیا جسے پاس کرنے والے شہری اپنی سفارشات پیش کر سکتے تھے۔ مزدور یونینوں اور سیاسی جماعتوں نے بھی ایسے معلوماتی کورسز کروائے جن میں80.000 شہریوں کی شرکت نے سبھی کو حیرت زدہ کر ڈالا جب کہ ان میں شرکت کی عمومی توقع دس ہزار سے زیادہ نہیں تھی۔ غرض مختلف طریقوں سے عوامی فیصلوں میں موجود جذباتیت کے عنصر کو کنٹرول کیا جا سکتا ہے۔ ذرائع ابلاغ میں بے تحاشہ پھیلاؤ نے بھی سیاسی نظام میں شہریوں کی براہ راست شمولیت کے بے شمار مواقع پیدا کر دیئے ہیں۔

کچھ عرصہ پہلے میں نے ریاست اوہائیو کے شہر کولمبس میں پہلے کیوب کیبل پر دنیا کی اولین الیکٹرانک بلدیہ کا اجلاس ہوتے دیکھا جس میں مضافاتی علاقے کے باشندے اپنے گھروں میں بیٹھے جدید ٹیکنالوجی کی مدد سے اجلاس کی کاروائی میں بھرپور حصہ لے رہے ہیں۔ ایجنڈے کے ہر نکتے پر بحث کے بعد باقاعدہ ووٹ ڈال کر فیصلے بھی کئے گئے۔

جدید کمپیوٹر سیارچوں اور ٹیلی فون وغیرہ کی مدد سے ایک تعلیم یافتہ سماج تاریخ میں پہلی مرتبہ براہ راست جمہوریت کو روبہ عمل لانے کا اہل ہو گیا ہے لہٰذا ہم باہ راست شہری جمہوریت کو نمائندگی کے نئے نظام سے مربوط کر کے ایک نیم براہ راست جمہوری نظام تشکیل دے سکتے ہیں۔ یہ طریقہ آسٹریا اور کیلی فورنیا میں بروئے کار لایا جا چکا ہے۔ جوہری افزائش جیسے معاملات پر رائے شماری کرائی جا سکتی ہے اور اس کے نتائج پر بحث کر کے قانون سازی کا حق کانگریس کو دیا جا سکتا ہے۔ براہ راست جمہوریت اور نمائندگی کو کئی مختلف انداز میں باہم مربوط کیا جا سکتا ہے تاکہ موجودہ مسائل کی گمبھیرتا سے صحیح معنوں میں نمٹا جا سکے۔

منقسم فیصلے سازی

نظام میں اقلیتی قوتوں کو تقویت دینا اور حکومتی معاملات میں شہریوں کی براہ راست شرکت کو یقینی بنانا دونوں ہی بہت ضروری ہیں لیکن یہ بھی کسی حد تک ہی ہمیں آگے بڑھا سکتے ہیں۔کل کی سیاست کا تیسرا اہم اصول فیصلہ سازی میں طاری جمود کو توڑنا اور متعلقہ جگہ پر ہی فیصلہ کرنا ہے۔ یہ صرف قائدانہ ردوبدل ہی نہیں بلکہ مفلوج سیاست کے لئے اکسیر کا درجہ رکھتا ہے۔ میں اسے منقسم فیصلہ سازی کا نام دیتا ہوں۔بعض مسائل ایسے بھی ہیں جو قومی سطح پر بھی حل نہیں ہو سکتے اور بعض ایسے معاملات بھی ہیں جن کا حل بیک وقت مختلف سطحوں پر کیا جانا چاہئے۔غرض کسی مسئلہ کے حل کے لئے ایک سطح یا مقام کا تعین ممکن ہیں کیونکہ یہ وقت اور ضرورت کے ساتھ بدلتے جاتے ہیں۔موجودہ اداروں پر بوجھ میں کمی کے لئے ضروری ہے کہ فیصلہ سازی کے مقام کو وقتاً فوقتاً معالمے کے نوعیت کے مطابق بدلتے رہنا چاہئے۔موجودہ درپیش مسائل کا حل تلاش کرنا آج کل کی حکومتوں کے بس میں ہے ہی نہیں لہٰذا ہمیں ایسے بین الاقوامی ادارے بنانے چاہئیں جو اس نوعیت کے مسائل حل کر سکیں۔مثلاً کثیر ملکی کارپوریشن کی سرگرمیوں سے پیدا شدہ مسائل پر قومی سطح پر کنٹرول ناممکن ہے، ان کے حل کے لئے بین الاقوامی انتظامات کی ضرورت ہو گی۔

بدعنوانی کا مسئلہ ہی لے لیں۔ امریکہ میں رشوت ستانی کے خلاف قوانین کی وجہ سے امریکی برآمدات پر اثر پڑتا ہے جب کہ کئی اور ممالک کی حکومتیں اپنی صنعتی اشیاء کی برآمد کے لئے باقاعدہ رشوت کے استعمال کی ترغیب دیتی ہیں۔ اسی طرح کئی کثیر ملکی ماحول دوست کمپنیوں کے لئے ایسی کمپنیوں سے مقابلہ کرنا خاصا دشوار ہے جو ماحولیات کا احساس ہی نہیں رکھتیں۔ یہاں کسی بین الاقوامی ڈھانچے کی ضرورت کا احساس ہوتا ہے۔ بدقسمتی سے ابھی تک ایسے اداروں کی صحیح نشوونما ہی نہیں ہو سکی۔صنعتی انقلاب کی ابتداء میں قومی ریاستی اداروں میں کچھ ایسی ہی کمزوریاں موجود رہی ہوں گی، جیسی ہمیں موجودہ بین الاقوامی نظام میں آج محسوس ہو رہی ہیں۔ بین الاقوامی نوعیت کے مسائل کو عالمی سطح پر حل کرنے کے عمل سے حکومتوں پر فیصلہ سازی کا بوجھ یقیناً ہلکا ہو گا۔

MashalBooks.org

بہت سے مسائل ایسے ہیں جن کا موزوں ترحل مقامی یا علاقائی سطح پر دریافت ہوسکتا ہے چنانچہ قومی حکومتوں کے سر سے انکا بوجھ ہٹا دینا چاہے اور ان کے لئے حل طلب مقامات کا ازسرنو تعین کیا جانا چاہئے۔ درحقیقت سیاسی مرکزیت مسائل کے حل کی ہرگز ضمانت نہیں۔ مقامی سطح پر فسطائیت یا جبر کا استعمال خاصا۔ مقامی سیاست میں بدعنوانی اور بے ایمانی قومی سیاست کی نسبت مرکزی طاقت کو زیادہ سے زیادہ مقامی یا علاقائی سطح پر منتقل کر دینا چاہئے اور حکومتی اداروں کو بھی معاشی ڈھانچے اور ذرائع ابلاغ کے ساتھ ساتھ بدلتے جانا چاہئے۔ دنیا بھر میں پیداوار اور معاشی سرگرمیاں قومی سطح سے علاقائی سطح پر منتقل ہو رہی ہیں۔قومی معیشت کی حیثیت۔۔۔۔ دنیا کی بنیادی اکائی کے طور پر اب ختم ہوتی جا رہی ہے۔ ہم پہلے بھی دیکھ چکے ہیں کہ ملک کے مخصوص علاقوں کی معاشی ترقی کی رفتار اور اسکے وسائل مختلف ہیں چنانچہ ایسی ذیلی معیشتیں جنم لے رہی ہیں جن کے مسائل ایک دوسرے سے خاصے مختلف ہیں۔ ایک جگہ بے روزگاری کا مسئلہ ہے تو دوسری طرف افرادی قوت کی کمی درپیش ہے۔ بلجیم میں ولوفیا والے فلانڈرز کی جانب صنعتوں کی منتقلی پر سراپا احتجاج بنے ہوئے ہیں۔ ادھر امریکہ میں کوہستانی ریاستیں مغربی ساحلی ریاستوں کا توانائی کے وسائل پر قبضہ پسند نہیں کرتیں واشنگٹن، لندن یا پیرس میں بنائی گئی معاشی پالیسیوں کا ان ذیلی معیشتوں پر مخصوص اور مختلف اثر پڑتا ہے لہٰذا معیشت سے متعلقہ فیصلہ سازی کو ان مقامی علاقوں میں منتقل کرنا پڑے گا۔

کسی بھی سماج کے لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ اپنے سیاسی نظام کی مرکزیت کو قائم رکھتے ہوئے اپنی معاشی سرگرمیوں اطلاعات کے بہاؤ اور ذرائع مواصلات کو لا مرکزی کر ڈالے۔ بجٹ، ٹیکسوں، زمین، توانائی اور دوسرے وسائل پر فیصلہ سازی کو مقامیم سطح پر لے جانا کوئی آسان کام نہیں لیکن ایسا کرنا بہرحال ناگزیر ہوتا جا رہا ہے۔ فیصلہ سازی کی سطح میں اس طرح کی تبدیلیوں سے مراعات یافتہ اشرافیہ پر گہرے اثرات مرتب ہوں گے۔

اشرافیہ کا پھیلاؤ

ہر سماج یک اپنی مخصوص نوعیت کی فیصلہ سازی کا سلسلہ ہوتا ہے۔ فیصلوں پر عمل درآمد کے لئے ایک خاص ڈھانچہ بھی موجود ہوتا ہے۔ فیصلوں کی رفتار، تعداد، پیچیدگی، اور

تنوع سب مل کر فیصلہ سازی کے بوجھ کا تعین کرتے ہیں۔مختلف ادوار میں اس بوجھ کی تقسیم سے سماج میں مروجہ جمہوریت کی سطح منعکس ہوتی ہے۔ صنعتی سماج سے پہلے تبدیلی کی رفتار سست اور محنت کی تقسیم ابتدائی نوعیت کی تھی لہٰذا اسے چلانے کے لئے چند سیاسی اور انتظامی فیصلوں کی ضرورت ہوتی تھی، غرض فیصلہ سازی کا بوجھ زیادہ نہیں تھا اور اس ڈھانچے کو اشرافیہ کی تھوڑی سی تعداد بھی با آسانی چلا سکتی تھی۔ صنعتی جمہوری دور شروع ہوتے ہی معاملات اشرافیہ کے بس سے باہر ہو گئے۔ تجارت میں پھیلاؤ اور محنت کی بہتر تقسیم کی بدولت سماجی پیچیدگیوں میں اضافہ ہونے لگا اور ساتھ ہی اشرافیہ کی قوت فیصلہ مفلوج ہو کر رہ گئی۔ فیصلہ سازی کی بڑھتی ہوئی ذمہ داری کو نباہنے کے لئے مزید ذیلی اشرافیہ کی ضرورت محسوس کی گئی اور سا طرح متوسط طبقہ فیصلہ سازی کے عمل میں شریک ہونے لگا۔ دوسری لہر کے زمانے میں میرٹ کی پالیسی کے نعروں کے باوجود کئی نسلی اور جنسی اقلیتوں کو فیصلہ سازی کے دائرے سے جان بوجھ کر باہر رکھا گیا۔ جب بھی موقع ملتا، یہ گروہ اپنے حقوق منوانے کے لئے سڑکوں پر آ جاتے، نتیجے میں اشرافیہ پر دباؤ ہوتا اور سماج میں بظاہر جمہوری عمل کو تقویت ملتی جاتی۔

اگر یہ نکتہ جزواً بھی صحیح ہے تو پھر یہ بات طے ہے کہ معاشرے میں جمہوری عمل کی کامیابی کا انحصار ثقافت، سیاسی طبقات یا سیاسی نعرہ بازی کے بجائے فیصلہ سازی کے بوجھ پر ہوتا ہے۔ اس بوجھ میں اضافے کے ساتھ ساتھ اسے اٹھانے کے لئے شہریوں کی وسیع تر شراکت ضروری ہو جاتی ہے چنانچہ جمہوریت محض پسند کا مسئلہ نہیں رہتی بلکہ ارتقائی لازمہ بن جاتی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ ہم ایک عظیم جمہوری جست کے کنارے پر کھڑے ہیں کیونکہ فیصلہ سازی کی قوت ہمارے صدروں، وزیراعظموں اور حکومتوں کے ہاتھ سے نکل کر۔۔۔۔صنعتی انقلاب کی بعد پہلی مرتبہ۔۔۔۔ سیاسی شراکت کی انقلابی توسیع کے پر جوش مواقع وا کر رہی ہے۔

آنے والی اعلیٰ جدوجہد

جدید سیاسی اداروں کی ضرورت، جدید گھرانے تعلیمی اور کارپوریٹ اداروں کی ضرورت سے کسی بھی طرح کم نہیں۔ یہ سب نئی توانائی کی بنیاد، نئی ٹیکنالوجیز اور جدید صنعتوں

کے لئے ہماری تلاش سے انتہائی گہری سطح پر باہم منسلک ہیں۔ ذرائع مواصلات کی ہوش ربا پیش رفت اور ترقی یافتہ دنیا کے غیر صنعتی ممالک کے ساتھ جدید رابطے بھی ان اسراعی تبدیلیوں کا عکس ہیں جو سیاسی میدان میں اکھاڑ پچھاڑ کا سبب بن رہی ہیں۔ تبدیلیوں میں یہ بنیادی ربط ذہن نشین کیے بغیر ہم اپنے اردگرد موجود شہ سرخیاں ہضم نہیں کر سکتے۔ آج کا دور امیر و غریب، حاکم و محکوم یا سرمایہ دار اور اشتراکیت کی سیاسی جنگ کا دور نہیں۔ اس فیصلہ کن معرکے میں ایک طرف وسیع البنیاد صنعتی سماج کے محافظ ہیں اور دوسری طرف اس مرحلے سے مزید پیش رفت کرنے کے خواہش مند۔ اور آنے والے وقت کی اعلیٰ جدوجہد انہی دونوں طاقتوں کی رسہ کشی سے عبارت ہے۔ صنعتی سماج کے محافظ جوہری گھرانے، وسیع تر تعلیمی نظام، عظیم الشان کارپوریشن، وسیع البنیاد مزدور یونین، مرکزی قومی ریاست اور نام و نہاد نمائندہ حکومت کی سیاست کو ہر قیمت پر بچانا چاہتے ہیں جبکہ پیش قدمی کے خواہاں لوگ آج کل کے حقیقی مسائل۔۔۔۔ توانائی، جنگ غربت، ماحولیاتی تخریب اور گھریلو رشتوں کی شکست وریخت۔۔۔۔ کے متعلق واضح ہیں کہ انہیں صنعتی تہذیب کے دائرے میں رہتے ہوئے حل نہیں کیا جاسکتا ان دونوں کیمپوں کو منقسم کرنے والے خطوط ابھی بہت واضح نہیں ہیں۔ انفرادی حیثیت میں ہم سے ہر ایک خود بھی منقسم ہے۔ ہمارا ایک پاؤں خط کے اس طرف ہے اور دوسرا دوسری طرف۔ پھر ہر کیمپ بھی اپنے اپنے مفادات کے حوالے سے مزید منقسم ہے۔ یہ بجا ہے کہ طابقات، نسلوں اور نظریات کے روایتی اختلافات ختم نہیں ہو پائیں گے بلکہ ممکن ہے کسی عظیم معاشی حادثے کی صورت میں ان اختلافات کی شدت بڑھ جائے۔ بہرحال یہ سب اختلافات اس اعلیٰ جدوجہد کے پیرائے میں ہی بیان ہوں گے۔

دوسری لہر کے حامی اقلیتی قوتوں کے مخالف ہوتے ہیں۔ وہ براہ راست جمہوریت کو بے معنی سمجھتے ہیں۔ لامرکزیت، علاقائیت اور تنوع کی راہ میں مزاحم ہوتے ہیں۔ صنعتی تہذیب کے اصولوں کی بالادستی قائم رکھ کر روایتی قوم پرستی کا نعرہ لگاتے ہیں تاکہ دنیا میں منصفانہ معاشی نظام کا قیام ممکن نہ ہو سکے، اس کے برعکس تیسری لہر کے حامی جمہوری عمل میں اقلیتی کردار کی شرکت کے بھرپور حامی ہیں، وہ براہ راست جمہوریت کے تجربات سے گریز نہیں کرتے۔ بین لاقوامیت کا فروغ اور طاقت کے مقامی مراکز کی جانب منتقلی ان

کے مقاصد میں شامل ہوتے ہیں۔ وہ وسیع و عریض نوکر شاہی کی طاقت گھٹانا چاہتے ہیں۔ یکساں اور سکہ بند تعلیمی نظام کے بجائے انفرادی تعلیمی ضروریات کا پیغام دیتے ہیں۔ غیر مرتکز نظام توانائی، ماحولیاتی تحفظ اور عالمی اقتصادی نظام میں توازن اور انصاف کا قیام ان کی ابتدائی ترجیحات ہیں۔ جہاں دوسری لہر کے حامی روایتی سیاسی عمل میں مشغول ہیں، وہاں تیسری لہر کے حامی سیاسی جماعتوں اور سیاسی راہنماؤں سے برگشتہ نظر آتے ہیں کیونکہ وہ اس حقیقت سے باخبر ہیں کہ موجود مسائل کا موجودہ سیاسی اداروں کے بس کی بات نہیں۔

موجودہ مراعات یافتہ طبقہ زیادہ تر دوسری لہر کے لشکر میں شامل ہے۔ سیاست دان، تاجر، مزدور لیڈ، اساتذہ، ذرائع ابلاغ کے کرتا دھرتا سبھی موجودہ نظام کی کمزوریوں سے واقفیت رکھتے ہیں مگر پھر بھی دوسری لہر کی تہذیب کا دم بھرتے ہیں۔ عام شہری اکثریت بھی بے سوچے سمجھے دوسری لہر کے محافظوں کے ساتھ ہے۔ تیسری لہر کے حامیوں کے اوصاف کا بیان خاصا مشکل ہے۔ ان میں کارپوریشن کے اعلیٰ انتظام کاروں سے لے کر صارفین کے حقوق کے لئے لڑنے والے تک، سبھی شامل ہوتے ہیں۔بعض ماحولیاتی مستقبل کی فکر میں گھل رہے ہیں،بعض توانائی کے متبادل ذرائع کی تلاش اور مواصلاتی انقلاب کے جمہوری مضمرات کے عاشق ہیں۔ ان میں سے کچھ کا تعلق دوسری لہر کے دائیں بازو سے تھا اور کچھ کا بائیں بازو سے۔بعض مذہب پرست تھے اور بعض بے دین۔ اس قسم کے مختلف افراد، کیا ایک ہی طبقے میں شامل کرنا ممکن ہے؟ اگر اس کا جواب اثبات میں ہے تو کیا آج کے تعلیم یافتہ، مزدور، دانش ور اور مستری کو اس طبقے کی نمائندگی حاصل ہے؟ تیسری لہر کے کیمپ میں شامل زیادہ تر لوگ متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اور ان میں سے اکثر کا تعلق ابلاغی پیداوار کے شعبوں یا خدمات کے شعبے سے ہوتا ہے۔ممکن ہے اس اصطلاح کو توڑ مروڑ کر ایک طبقے کا نا دیا جا سکے۔

دوسری لہر کے سماجی کابکوں میں بند خواتین جو اپنے حقوق کی خاطر لڑ رہی ہیں، کا شمار کس فوج میں ہو گا؟ اپنی مدد آپ کی تحریک میں شامل لاکھوں لوگ کس کی جانب گنے جائیں گے۔ نفسیاتی دباؤ اور تنہائی کے شکار مریض، ٹوٹے گھرانوں کے بچے، تنہا ماں یا باپ، جنسی اقلیتیں یہ سب کس کھاتے میں شمار ہوں گے۔ صنعتی معاشرے کے تخصیصی عمل

میں شامل کم تعلیم یافتہ نسلی اقلیتیں جن کے ہاتھ میں بریف کیس نہیں ہوتا، کس شمار میں جائیں گے؟ ایسے افراد سماج کے سارے ہی طبقات اور پیشوں سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ سب ہی تیسری لہر کی تحریک کے پیشرو ہیں یہاں تحریک کا لفظ شاید غیر موزوں ہو کیونکہ تحریک کے اراکین میں شعور آگہی کا ایک مربوط تصور موجود ہوتا ہے جو تیسری لہر کے حامیوں میں نظر نہیں آتا۔ انہیں طبقے کے طور پر جانا جائے یا تحریک کے طور پر، ان لوگوں کو موجودہ نظام کی فرسودگی نے یکجائی کا احساس دیا ہے کیونکہ یہ نظام ان کے نزدیک قطعی قابل عمل نہیں رہا۔

دوسری اور تیسری لہر کی قوتوں کے مابین وقوع پذیر۔۔۔اعلیٰ جدوجہد جس میں ہر عمر اقلیت اور طبقے کے لوگ شامل ہیں۔۔۔۔آنے والے مختصر تناظر میں سماجی افراد تفری اور بے چینی میں شدید اضافہ ممکن ہے۔ کئی ملکوں میں صنعتی تہذیب کے باقی ماندہ مفادات کی تقسیم اور موعودہ تہذیب پر تسلط کی جنگیں لڑی جانا ہیں۔ اس اعلیٰ ارفع جدوجہد میں ہم سب لوگ شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنا اپنا کردار ادا کر رہے ہیں یہ کردار تعمیری بھی ہوسکتا ہے اور تخریبی بھی۔

تخلیق کی منزل

بعض نسلیں تہذیب کی تخلیق کرتی ہیں اور باقی نسلیں اس کے تسلسل کو قائم رکھتی ہیں۔ دوسری لہر کی تاریخی تبدیلی لانے والوں کو حالات نے نئی تہذیب کی تخلیق پر مجبور کر دیا تھا۔ موجودہ اداروں کی شکلیں بنانے والوں۔۔۔۔مونٹے کیوز ملز اور میڈلنیز جیسے مفکرین کی قسمت میں یہی لکھا تھا کہ وہ دو تہذیبوں کے عبوری دور میں پیدا ہو کر نئے ادارے تخلیق کریں۔ زندگی کے ہر شعبے میں آج ہمیں تیسری لہر کے جدید ڈھانچے تشکیل دینے کی ضرورت کا احساس ہو رہا ہے۔ لاکھوں لوگوں کی اس سمت پیش رفت جاری ہے، لیکن ہمارا سیاسی نظام انتہائی فرسودہ ہو کر سماج کے لئے زبردست خطرہ بن چکا ہے اور حد یہ ہے کہ کوئی بھی بنیادی تبدیلیوں کے متعلق سوچن کے لئے تیار نہیں۔

آج جب کہ ہم بے پناہ تصورات تجربات اور مشاہدات سے لیس ہیں پھر بھی موجودہ نظام کی فرسودگی اس کے دقیانوسی مفروضات کی بے معنویت اور نظام میں ہمہ جہتی

MashalBooks.org

اصلاح و بہتری کی ضرورت کا اعتراف نہیں کر پا رہے۔ اس اعلیٰ جدوجہد کی شدت بڑھنے سے کسی زبردست انقلابی توڑ پھوڑ کی امید نہیں کی جا سکتی، تشدد آمیز عوامی ردعمل کی بھی کوئی توقع، نہیں دراصل تیسری لہر کے سیاسی ڈھانچوں کی تشکیل مختلف سطحوں اور مقامات پر ہزاروں چھوٹی موٹی اختراعات اور تصادم کے نتیجے میں واقع ہو گی تاہم تشدد کے عمومی واقعات خارج از امکان قرار نہیں دیئے جا سکتے کیونکہ دوسری لہر کے ابتدائی دور میں بھی بہت سے خونی انقلاب اور تشدد انگیز ڈرامے دیکھنے میں آئے تھے۔ اسراعی تبدیلیوں کے اس دور میں وقت کم ہو گیا ہے اور خطرات زیادہ، بہر حال اس کا دارومدار موجودہ اشرافیہ کے لچکدار اور ذہانت آمیز رویوں پر ہو گا۔ اگر وہ قدیمی مراعات یافتہ طبقوں کی طرح کند ذہن اور اجڈ بنے رہے تو دوسری لہر کے مداخلت میں تشدد اور تباہی کے امکانات کو تقویت ملے گی اور اگر انہوں نے توسیع شدہ جمہوریت کو قبول کر کے تیسری لہر کے جلو میں تیرنا شروع کر دیا تو پہلی لہر کی ذہین اشرافیہ کی طرح جدید تہذیب کی تعمیر میں بھرپور مثبت کردار ادا کر سکیں گے۔

ہم میں سے اکثر لوگوں کو زندگی میں بڑھتے ہوئے خطرات کا شدید احساس ہے ہمیں پتہ ہے کہ سماجی عدم توازن اور سیاسی بے یقینی تباہی کے دروازے کھول دیتے ہیں۔ تاریخ میں ایسے حالات ہمیشہ جنگوں اور معاشی تباہی پر منتج ہوتے ہیں اور سماجی نا اہلیت سے آمرانہ نظام پیدا ہوتے ہیں۔ دکھ یہ ہے کہ ہم اکثر و بیشتر ماضی اور حال کے مابین مثبت فرق کو بھلا دیتے ہیں۔ اگرچہ مختلف ملکوں کے حالات ایک جیسے نہیں ہوتے تاہم اتنے زیادہ تعلیم یافتہ صاحب فہم اور خوش حال لوگ تاریخ نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھے ہوں گے اور نہ ہی فاصلاتی قربت اور مواصلاتی ذرائع۔۔۔ اس بڑے پیمانے پر۔۔۔ پہلے کبھی موجود تھے۔

اشرافیہ کتنی ہی روشن خیال کیوں نہ ہو، عوامی تعاون کے بغیر نئی تہذیب کو جنم نہیں دے سکتی۔ لہٰذا ایک پرامن عبور دور کے لئے ہمیں متبادل سیاسی اداروں کے خدوخال ابھی سے وضع کر لینے چاہئیں اور ان کی بنیادی مذکورہ تین اصولوں۔۔۔ اقلیتی قوت کی اہمیت نیم براہ راست جمہوریت اور منقسم فیصلے فیصلہ سازی کے نئے مقامات کا تعین۔۔۔ پر رکھی جانی چاہئے۔ اس تبدیلی کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے سے محض خطرات ہی بڑھیں گے۔

تبدیلیاں خود کسی طرح کے خطرات پیدا نہیں کرتیں البتہ فرسودہ روایات کی اندھا دھند تقلید اور ان کے تحفظ کی کوششیں خون ریزی کا سبب بن سکتی ہیں۔ ایسی شکست وریخت کا راستہ روکنے کے لئے ہمیں ابھی سے دنیا بھر کے سیاسی ڈھانچوں کی فرسودگی پر اپنی توجہ مرکوز کرنا ہوگی۔ یہ مسائل صرف آئین وقانون کے ماہروں اور سیاست دانوں کے بس کی بات نہیں اس عمل میں ہمیں عوام اور عوامی اداروں، شہری، تنظیموں، مزدور یونینوں، کلیساؤں، نسلی اور مذہبی اقلیتوں اور خواتین کو پوری طرح شریک رکھنا ہوگا۔ پہلے مرحلے کے طور پر تیسری لہر کی تہذیب سے مطابقت رکھنے والے ایک نئے سیاسی نظام کی ضرورت اور اہمیت پر ہمیں عوامی بحث وتمحیص کا آغاز کرنا ہوگا۔ ہمیں کانفرنسوں، ٹی وی پروگراموں، مقابلوں، مختلف مشقوں، آئینی کنونشنوں کے بھرپور استعمال کے ذریعے نئی سیاسی اداراتی تشکیل کے لئے نئے تصورات اور نت نئے نظریات کو اجاگر کرنا ہوگا۔

تیسری لہر کی سماجی ضروریات اور لوازم کی تفصیل شاید کوئی بھی نہ جانتا ہو لہٰذا ہمیں وسیع پیمانے پر کسی ایک ہی نئے اداراتی سلسلے کی ضرورت نہیں بلکہ مقامی سطح پر فیصلہ سازی کی نئی صورتوں کو آزما کر قومی اور بین الاقوامی سطح پر بھی ان کا نطباق کرنا ہوگا لیکن ساتھ ساتھ ہی ہمیں نئے قومی اور کثیر قومی اداروں کی تشکیل نو کے لئے رائے عامہ کو بھی ہموار کرنا ہوگا۔ کیونکہ دنیا کی دوسری لہر کی حکومتوں کے خلاف مایوسی غم وغصہ اور تلخی کو ہتھیار بنا کر مہم جو گروہ مطلق العنانیت کی جانب بھی بڑھ سکتے ہیں اور صحیح سمت میں پیش قدمی جمہوری تعمیر نو کے لئے توانائی کا کام بھی دے سکتی ہے۔

سماجی آگہی کے وسیع عمل۔۔۔۔ بہت سے ممالک میں متوقع جمہوریت کے تجربات۔۔۔۔ کے ذریعے ہم اجتماعی اعتبار کی جاب نہ صرف واضح پیش رفت کر سکتے ہیں بلکہ متوقع بد حالی اور خوفناک بحرانوں کے مقابلے کے لئے لوگوں کو تیار بھی کر سکتے ہیں اور مروجہ سیاسی نظام پر ضروری تبدیلیوں کو تیز کرنے کے لئے سٹریٹجک دباؤ بھی ڈال سکتے ہیں۔ شدید تر زیریں دباؤ کے بغیر ہم اپنے موجودہ رہنماؤں سے اپنے ہی اداروں کے خلاف متحرک ہونے کی قطعاً توقع نہیں کر سکتے کیونکہ یہ ادارے کتنے ہی بے کار اور فرسودہ کیوں نہ ہوں، ان کے لئے عزت و احترام دولت اور طاقت کا تصور انہی اداروں کی بدولت ہے،

البتہ بعض دور اندیش اور غیر معمولی سیاست دان یا افسران سیاسی تبدیلیوں کی اس جدوجہد میں اپنا ابتدائی تعاون ضرور پیش کر سکتے ہیں۔ ان لوگوں کی اکثریت بحران کی شدت یا عوامی غم و غصے کی صورت میں ہی اس جانب متوجہ ہو گی۔

دراصل تبدیلی کی اصل ذمہ داری ہم پر ہے۔ ہمیں جدت طرازی کی سمت اپنا سفر جاری رکھنا چاہئے اور نئے تصورات کو بنا آزمائے محض لوگوں کے کہنے پر نا قابل عمل قرار دینے میں جلدی نہیں کرنی چاہئے۔ ہمیں آزادی رائے کے حق کا تحفظ کرنا چاہئے۔ چاہے وہ کتنی ہی غیر مسلم اور لایعنی کیوں نہ نظر آئے۔ اس سے پہلے کہ موجودہ سیاسی نظاموں میں مزید شکست وریخت ہمیں فسطائیت کے بند دروازے کی جانب دھکیل دے اور اکیسویں صدی کی جمہوریت کی جانب ہماری پر امن پیش رفت کو ناممکن بنا دے، ہمیں تعمیر نو کا یہ عمل ابھی سے شروع کر دینا چاہئے اس سمت سفر کے فوری آغاز سے ہم اور ہمارے بچے نہ صرف فرسودہ سیاسی ڈھانچوں کی از سر نو تدوین و ترتیب میں بلکہ نئی تہذیب کی تشکیل میں بھی بھرپور حصہ لے سکتے ہیں۔ ماضی کی انقلابی نسل کی طرح ہمیں بھی اپنا مقدر خود ہی تخلیق کرنا ہے۔

MashalBooks.org